

دسمبر 2017

بہنوں کا آپنا مہینہ

شعاع



بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

خط و کتابت کا پیٹہ

ماہنامہ شعاع

37 - اردو بازار، کراچی

آلہ و مہر اہل

مدرسہ — رخصتہ جمیل

مدرسہ مشہد — اقدس ریاض

مدرسہ قرآن — امیتہ المیور

فلاحی گھر — شامین رشید

اشہدائت — کمالہ جیلانی

رکن آل پاکستان نوزہ بیگم زوسمانی
رکن کونسل آف پاکستان نوزہ بیگم زالیہ طرز

MEMBER
APNS
CPNE





162 بندوبست کی بات ' شہرہ بخاری



58 شگون دلی شال ' اہل رضا
67 سنہری ڈور ' قرة العین ہاشمی
122 جند ' میمونہ صدف
152 افستانی ' حاجرہ ریکان
53 ٹیکنیکل آدمی ' رضیہ مہدی
255 محبتوں کے نصیب ' قرة العین سکندر



263 غزل ' احمد فراز
264 غزل ' قابل امین
264 غزل ' انور شعور
263 نظم ' امجد اسلام امجد

10 رخصت جلیل ' پہلی شعاع
11 ڈاکٹر محمد امین ' حمد
11 شاقب زیری ' نعت
12 ادارہ ' نبی کی باتیں



17 سمیر احمد ' کتاب کہانی
21 سمیع شانی ' بندھن
27 شاہین رشید ' دستک
31 س-ن ' جب تجھ سے تانا



36 عفت بھلاہر ' خواب شیشہ کا
228 صائمہ اکرم ' شہزاد



76 اسیمہ رزاقی ' تبدیلی آگئی ہے
126 سلوی علی بیٹ ' شہری دھوپ
196 سدہ حیات ' کچھ خواب ہیں

ذرا سا لٹریچر کیسے پڑھیں

پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ----- 6000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ----- 7000 روپے

انتباہ: ماہنامہ شعاع ڈائجسٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، یا سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جاسکتا ہے، نہ کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی ٹھیکیل اور سلسلہ وار قسط کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جاسکتی ہے۔



- | | | | | | |
|-----|-------------|----------------|-----|-------------|-------------------|
| 286 | امت الصور | تاریخ کے جھوکے | 271 | رضیہ جمیل | خط آپ کے |
| 284 | خالہ جیلانی | سوئم کے یگانہ | 265 | ادار | مُسکراہٹیں |
| 290 | ادار | خوبصورت بننے | 281 | واصفہ سہیل | ایٹینہ خالے میں |
| | | | 268 | شگفتہ جاہ | بالوں سے خوشبو لے |
| | | | 267 | خالہ جیلانی | کھٹنا کسی پہ |

دسمبر 2017
جلد 32 نمبر 4
قیمت 60 روپے

مطلوبہ کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل غلام حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: لاہور، پاکستان

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872

Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

تخصیص پیشکش

دسمبر کا شمار میلے حاضر ہیں۔

کائنات کی سب سے افضل ہستی جن کے ذکر کو خالقِ ارض و سہلے خود آسمانوں پر نعتِ بخشی - وہ اہم مبارک جو جوہرِ سوال سے دہریں اُجالا کر رہا ہے۔ جن کی تعلیمات ابد انقلاب آفرین پیغامِ درود آخر تک کائنات کو منور کرتا رہے گا۔ وہ عظیم ہستی جنہیں انبیاء علیہ السلام میں بھی سب سے افضل مقام حاصل ہے۔ غلامِ الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ کے بعد کوئی نبی، کوئی پیغمبر، کوئی رسول نہیں آئے گا۔

ذبیحِ الاول کے پیچھے کا آواز ہو چکا ہے۔ یہ وہ پہلے ہے جب کائنات کی کامل ترین ہستی کا ظہور ہوا۔ احمد مجتبیٰ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور تھری کائنات پر اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی رحمت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی توقع میں جن منسلے جلتے ہیں، سرگرمیوں، محبتوں میں چراغاں کیا جاتا ہے۔ طے جلوس نکلتے جلتے ہیں۔ حکمِ تمسبلا دیکھیں منقذ ہوتی ہیں۔ مسکین کیا ہم ایک لمحے کے لیے بھی سوچتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کیا تھیں؟ آپ کیا پیغام لے کر دنیا میں آئے۔ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر کتنا عمل کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ جو ہمارے لیے کامل نمونہ ہے۔ ہم اس کی کتنی پیروی کرتے ہیں؟

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کا ایک حسین پہلو اخلاقِ جماعہ میں دشمن بھی معترف تھے۔ آپ اخلاق کے بلند ترین درجہ پر فائز تھے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں آپ کے اخلاق کی تعریف فرمائی۔ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دشمن کے لیے بھی بڑا کلمہ زبان سے نہیں نکالا۔ گالی تو کیا کہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے کوئی نازِ مسالک بھی ادا نہیں ہوا، تحریف، بدگویی، بدگمانی، تہمت، بہتان تراشی کی سختی سے ممانعت فرمائی۔ اہم جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہیں۔ آپ کی محبت کے دعوے دار ہیں۔ اخلاقی لحاظ سے کہاں کو دے ہیں۔ جہاں دنیا، دانش و دانشمندان، علمائے دین، علماء زبان استعمال کر رہے ہیں، وہ اخلاق کے کسی معیار پر پورا نہیں اُترتے۔ انہیں بیوقوفی اور بددینی سے پرہیز کرنا چاہیے کیونکہ بہت سارے لوگ ان کی پیروی کرتے ہیں۔

سناخذاً احوالاً

ماہِ رسال کے سرخیزِ زندگی کے مختلف مرحلوں میں ہمارے سامنے، ہمارے رفیق، ہمارے رشتہ دار ہیں۔ بچھڑتے جلتے ہیں۔ ان کی عداوت کا ہم ایک کسک بن کر سامنے دیتا ہے۔ ان کی یادیں زندگی کا حصہ بن جاتی ہیں۔ میری بڑی بہن قریشہ آپ کے شریکِ حیات فاروقی عزیزِ افسردہ اس جہانِ فانی سے رحلت ہو گئے۔

اَسْتَغْفِرُكَ يَا رَبِّ اَلْحَبْلُ بَيْنِي وَبَيْنَكَ

ایک طویل مدافعت کے بعد ان کی عدالتِ قریشہ آپ کا اہم سب کے لیے بہت بڑا صدمہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ان کی مغفرت اور دائمی سکون کے لیے دعا گو ہیں۔
قاریین سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی درخواست ہے۔

اس شمارے میں،

- آسیہ دلتی کا مکمل ناول۔ تبدیلی آگئی ہے،
- مددہ حیات کا ناول۔ کچھ خواب ہیں ان آنکھوں میں،
- غرم بخاری کا ناول۔ بندوبست کی بات،
- ہائے اکرم جو دھری اور عفت محمد طاہر کے ناول،
- امین رضا، عزیز مہدی، کرۃ العین غم ہاشمی، میوہ صدف، باہرہ رحمان اور قرۃ العین سکندری کے افسانے،
- سبع ثانی اور شبنم ثانی کا چند من،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
- بیابانہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیاری باتیں اور دیگر مسائل سلسلے شامل ہیں۔



تُو حبیبِ ربِ حبیل ہے تری عظمتوں کا جواب کیا
تو مقامِ فخرِ خلیل ہے تری حرمتوں کا حساب کیا

تری اک نگاہ پڑی جہاں ہاں ظلمتوں کا گزر کہاں
ترے ایک جلوہ کے سامنے نہ وہر کی تبتاب کیا

تری عظمتوں کے نشان کبھی مٹیں گے تو رشِ کفر سے
یم بے کراں سے اُلجھ سکے گی حقیر جوئے کم آب کیا

جو ترے جمال میں کھو گیا ہوا بے نیازِ غم جہاں
وہ رہیں سودِ زبیاں ہو کیوں کغذاب کیا تو اب کیا

ترے میکہ سے جو پی گیا تر اکیف جس نے سمویا
اسے فکرِ عرصہ دہر کیوں اسے خوفِ وز حساب کیا

کہاں تُو کہ باعثِ کُن فکان کہاں فکرِ ثاقبِ خستہ جا
بھلا نہ متِ شمشیرِ انسِ جاں کرے مجھ سا خانہ خراب کیا

ثاقبِ زیرِ وی

رفعتیں تیرے لیے سب عظمتیں تیرے لیے
خالقِ حرف و بیاں سب مدحتیں تیرے لیے

زندگی تیرے لیے اور بندگی تیرے لیے
الفیتیں تیرے لیے سب چاہتیں تیرے لیے

تُو کہ لامحدود ہے، محدود کہاں بھی تجھ سے ہے
سرمدِ امکانِ تنک سب رفعتیں تیرے لیے

عقلِ حیراں ہے کہ کیسا ہے نظامِ کائنات
اے حکیم بے بدل! سب حکمتیں تیرے لیے

میں کہ بندہ ہوں تو بھر بندے کا کیا امتیاز
قادِرِ مطلق ہے تُو، سب قدرتیں تیرے لیے

حرف سب تیرے لیے ہیں لفظ سب تیرے لیے
صورتِ اظہار کی سب صورتیں تیرے لیے

ڈاکٹر محمد امین



بدلہ لینا

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے۔
”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی چیز کو عورت کو نہ خادم کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا۔ ہاں مگر آپ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے (جس میں آپ یقیناً دشمن کو مارتے) اور ایسا بھی کبھی نہیں ہوا کہ آپ کو کسی طرف سے کوئی تکلیف پہنچی اور آپ نے تکلیف پہنچانے والے سے بدلہ لیا ہو۔ ہاں، اگر اللہ کے محارم میں سے کسی چیز کی ہتک کی جاتی تو آپ یقیناً اللہ کے لیے انتقام لیتے (یعنی مرتکب حرام کو سزا دیتے۔) (مسلم)۔“

حسن اخلاق

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔
”میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلا جا رہا تھا اور آپ کے اوپر ایک مولے کنارے والی خیرانی چادر تھی۔ (راستے میں) ایک دیہاتی آپ کو ملا اور آپ کی چادر کوختی کے ساتھ پکڑ کر بھیجا۔ چنانچہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کندھے کی جانب دیکھا تو چادر کے کنارے ختی کے ساتھ کھینچنے کی وجہ سے اس پر نشان پڑ گئے تھے۔ پھر اس دیہاتی نے کہا۔“

”اے محمد! صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے پاس جو اللہ کا مال ہے، اس میں سے میرے لیے بھی حکم دو۔“
آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی طرف متوجہ ہوئے اور ہنس کر ان کے ہاتھ پر اسے دینے کا حکم فرمایا۔ (بخاری و مسلم)

فائدہ: اس میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن، خلق اور صبر و ضبط کا بیان ہے۔ آپ نے اس دیہاتی کی نازیبا حرکت کو ایک مسکراہٹ کے ساتھ نظر انداز فرمادیا اور اسے عطیہ دینے کا حکم فرمایا۔
حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔
”میں (اب بھی) گو یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انبیاء میں سے کسی نبی کا واقعہ بیان کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔“

”اس نبی کو اس کی قوم نے مار مار کر لہو لہان کر دیا تھا، وہ اپنے چہرے سے خون صاف کرتا تھا اور کہتا جاتا تھا۔“ اے اللہ! میری قوم کو معاف فرما دے کیونکہ وہ بے علم ہے۔“ (بخاری و مسلم)

فائدہ: علما نے لکھا ہے کہ اس سے مراد خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہی ہے اور یہ بھی آپ کا کمال اخلاق ہے کہ اپنے آپ پر غصی ہوئی چتا کو مبہم انداز میں بیان فرمایا اور اپنی قوم کی صراحت نہیں فرمائی۔

طاقت ور

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”طاقتور وہ نہیں ہے جو بچھاڑ دے۔ اصل طاقتور (پہلوان) تو وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے۔“ (بخاری و مسلم)

فائدہ: لوگ جسمانی لحاظ سے تومند اور طاقتور شخص کو پہلوان سمجھتے ہیں لیکن اصل پہلوان وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے جذبات پر قابو رکھے اور کوئی ایسا کام نہ کرے جس پر اسے بعد میں پشیمانی ہو، جیسے

ہے۔“ (حجرات اللہ سے مراد دین کے احکام و شرائع ہیں جن کی تعظیم ضروری ہے۔) (انج - 30) اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ”اگر تم اللہ کی مدد کرو گے، اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدموں کو مضبوط کر دے گا۔“ (محمد - 7)

فائدہ آیات: اللہ کی مدد کا مطلب ہے اس کے دین پر عمل کرنا اور کافروں سے اس کا دفاع کرنا۔ قدموں کو مضبوط کرنے سے مراد ہے۔ جہاد میں شہیں ہمت و ثابت قدمی عطا کرے گا۔
لوگوں کا خیال رکھنا

حضرت ابو مسعود عقبہ بن عمرو بدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔
فلاں آدمی کے ہمیں لمبی نماز پڑھانے کی وجہ

سے میں صبح کی نماز میں پیچھے رہ جاتا ہوں۔“
پس میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی وعظ میں اتنا غضب ناک نہیں دیکھا جتنا اس دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غصے کا اظہار فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

”لوگو! تم میں سے بعض لوگ نفرت دلانے والے ہیں، پس تم میں سے جو شخص لوگوں کی امامت کرائے اسے چاہیے کہ اختصار سے کام لے، اس لیے کہ اس کے پیچھے بوڑھے، بچے اور ضرورت مند لوگ بھی ہوتے ہیں۔“ (بخاری و مسلم)
فوائد و مسائل:

1۔ اس میں ایک تو ایسی بات کی شکایت کرنے کا جواز ہے جس سے لوگ تکلیف میں مبتلا ہوں۔ دوسرے، دین کے معاملے میں غضب ناک ہونے کا جواز ہے۔ تیسرے، امام کے لیے ضروری ہے کہ وہ مقتدیوں کا خیال رکھے اور زیادہ لمبی نماز نہ پڑھائے۔

2۔ مختصر قرات یا نماز کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ وہ طریقہ نبوی اور تعدیل ارکان ہی کا خیال نہ

عام لوگ غصے میں بہت سے ایسے کام کر لیتے ہیں اور بعد میں پھر ندامت کے آنسو بہاتے یا اس سے ہونے والی تباہی پر خون کے آنسو روتے ہیں۔
تعلیقیں برداشت کرنے کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ”اور غصے کے مٹنے والے اور لوگوں کو معاف کر دینے والے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ تینوں کاروں کو پسند فرماتا ہے۔“ (آل عمران - 13)
اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ”اور وہ شخص جس نے صبر کیا اور معاف کر دیا، بے شک یہ ہمت کے کاموں سے ہے۔“ (الشوری - 43)

تعلق جوڑنا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے کہا۔

”یا رسول اللہ! میرے کچھ رشتہ دار ایسے ہیں کہ میں ان سے تعلق جوڑتا ہوں، وہ مجھ سے تعلق توڑتے ہیں۔ میں ان سے حسن سلوک کرتا ہوں، وہ میرے ساتھ بدسلوکی کرتے ہیں۔ میں ان سے بردباری سے پیش آتا ہوں، وہ مجھ سے نادانی سے پیش آتے ہیں۔“

تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔
”اگر تو ایسا ہی ہے جیسا کہ تو نے بیان کیا ہے تو گویا تو ان کے منہ میں گرم راکھ ڈال رہا ہے اور جب تک تو ایسا کرتا رہے گا اللہ تعالیٰ کی طرف سے تیرے ساتھ ایک مددگار رہے گا۔“ (مسلم)

فائدہ: حدیث میں اس امر کی تاکید کی گئی ہے کہ اللہ کی رضا کے لیے لوگوں کی طرف سے پہنچنے والی تکلیفوں کو برداشت کیا جائے اور درگزر سے کام لیا جائے کیونکہ حسن اخلاق اور اسوہ حسنہ کی پیروی کا تقاضا یہی ہے۔

احکام شرعیہ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔
”اور جو اللہ کی محترم ٹھہرائی ہوئی چیزوں کی تعظیم کرے گا تو وہ اس کے لیے اس کے رب کے پاس بہتر

رکھے اور کوڑے کی ٹھونگیں مارنے کی طرح نماز پڑھا دے جیسا کہ بد قسمتی سے عام مسجدوں کے اماموں کا حال ہے کہ ان میں نماز کا کوئی رکن بھی سنت نبوی کے مطابق ادا نہیں کیا جاتا۔ اللہ وانا الیہ راجعون۔

3- غدر شرعی کی بناء پر جماعت سے پیچھے رہنا جائز ہے۔
4- امام کو ایسا وتیرہ اختیار نہیں کرنا چاہیے جس سے لوگ عبادت کی ادائیگی میں سے متنفر ہو جائیں۔

انصاف

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے۔
”قریش کو اس مخدوی عورت کے معاملے نے جس نے چوری کا ارتکاب کیا تھا پریشان کر دیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے (آپس میں) کہا: اس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کون بات کرے گا؟ انہوں نے کہا۔

یہ جرات تو صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہیتے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ ہی کر سکتے ہیں۔

چنانچہ حضرت اسامہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بات کی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
”کیا تو اللہ کی حدوں میں سے ایک حد پر سفارش کرنے لگا ہے؟“
پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر خطاب فرمایا۔

”تم سے پہلے لوگوں کو بھی صرف اسی چیز نے ہلاک کیا کہ جب ان میں کوئی معزز آدمی چوری کر لیتا تو اسے چھوڑ دیتے اور جب ان میں سے کوئی ضعیف آدمی چوری کرتا تو اس پر حد قائم کر دیتے۔ (یاد رکھو!) اللہ کی قسم! اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرنی تو یقیناً میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔“
(بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1- اس سے ایک بات تو یہ ثابت ہوئی کہ اللہ کی

حد میں کسی کے لیے سفارش کرنا جائز نہیں ہے اور اگر کوئی یہ جسارت کرے تو حاکم مجاز کے لیے اس کی بات ماننا جائز نہیں ہے۔

2- مجرم کا تعلق اگر کسی اونچے خاندان سے ہو تو یہ خاندانی شرف و عزت اس کی سزا میں رکاوٹ نہیں بنتی چاہیے۔ ہر بڑے اور چھوٹے، امیر و غریب دونوں کے لیے قانون اور سزا یکساں ہے۔ سزا اور قانون میں ان کے درمیان محض امارت و غربت کی وجہ سے فرق و تمیز کرنا بڑا جرم ہے۔ ایسا کرنا بلاشبہ اللہ کے غضب کو دعوت دینا ہے۔

قبلہ کا احترام

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبلہ (کی جانب دیوار) میں تھوک (لگا ہوا) دیکھا، آپ کو یہ بات بہت گراں گزری، حتیٰ کہ اس کے آثار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر دیکھے گئے۔ آپ کھڑے ہوئے اور اسے اپنے ہاتھوں سے کھرچ دیا اور فرمایا۔

”جب تم میں سے کوئی آدمی اپنی نماز میں کھڑا ہوتا ہے تو وہ اپنے رب سے سرکشی کرتا ہے، اور اس کا رب اس کے اور اس کے قبلہ کے درمیان ہے۔ چنانچہ تم میں سے کسی شخص کو قبلہ کی طرف نہیں تھوکتا چاہیے بلکہ (اگر تھوکنے کی ضرورت ہو تو) اسے بائیں جانب یا اپنے پیر کے نیچے (تھوک لے)۔“ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی چادر کا ایک کنارہ پکڑا اور اس میں تھوکا، پھر اس کے ایک حصے کو دوسرے حصے سے مسل دیا، پھر آپ نے فرمایا: ”یادو! اس طرح کر لے۔“ (بخاری و مسلم)

امام نووی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں: اپنے بائیں جانب یا پیروں کے نیچے تھوکنے کا حکم اس صورت میں ہے جب وہ مسجد سے باہر ہو لیکن مسجد میں اپنے کپڑے میں تھوکنے کے علاوہ کہیں نہ تھو کے۔

فوائد و مسائل:

1- اس میں مسجد کا ایک نہایت اہم ادب بیان



کیا گیا ہے کہ مسجد کے اندر قبلہ رخ نہ ٹھوکا جائے۔ حدیث میں اس کے لیے جو طریقہ بتلایا گیا ہے، عین نماز کے دوران اس پر عمل کیا جاسکتا ہے۔ تاہم اگر انسان نماز میں نہ ہو تو اب وضو خانوں میں داخلہ پانی کا اہتمام ہر مسجد میں ہوتا ہے، رومال یا چادر کا گوشتہ استعمال کرنے کے بجائے صفائی کے لیے یہ وضو خانہ ہی سب سے بہتر جگہ ہے۔

2- مسجد میں گندمی نظر آئے تو اسے فوری طور پر صاف کر دیا جائے اور مسجد کو گندمی سے ملوث کرنے سے مکمل کرین کیا جائے۔

نرخی اور شفقت کرنا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”اپنے پیروکار مومنوں کے لیے اپنے بازو پست رکھ۔“ (یعنی ان سے توسع سے پیش آ۔) (الشعراء: 215)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے، احسان کرنے اور رشتہ داروں کو دینے کا حکم دیتا ہے۔ اور بے حیائی، منکرات اور ظلم و زیادتی کرنے سے منع فرماتا ہے۔ وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو۔“ (النحل: 90)

ذمہ داری

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ۔

”تم سب ذمہ دار ہو اور تم سب سے اپنی رعیت (ماتحتوں) کے بارے میں پوچھا جائے گا: امام ذمہ دار ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ آدمی اپنے گھر والوں کا ذمہ دار ہے اور اس سے اس کی رعیت (اہل خانہ) کی بابت سوال ہوگا۔ عورت اپنے خاوند کے گھر کی ذمہ دار ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ خادم اپنے آقا کے مال کا ذمہ دار ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا۔ تم میں سے ہر ایک (اپنے اپنے معاملات کا) ذمہ دار ہے

اور اس سے اس کی رعیت (معاظی) کے بارے میں پوچھا جائے گا۔“ (بخاری و مسلم)

فائدہ: ارباب اختیار کی جو ذمہ داری ہے، اگر وہ اس میں کوتاہی کریں گے تو عند اللہ مجرم ہوں گے جس کی باز پرس روز قیامت ان سے ہوگی۔

دھوکا دینا

حضرت ابو یعلیٰ معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

”اللہ تعالیٰ کسی رعیت کی رکھوالی جس آدمی کے سپرد کر دے اور وہ انہیں دھوکا دیتے ہوئے مر جائے تو اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی۔“ (بخاری و مسلم)

ایک اور روایت میں ہے کہ۔

”اس نے خیر خواہی کے ساتھ ان کے حقوق کی حفاظت نہیں کی وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا۔“ مسلم کی ایک اور روایت میں ہے: ”جو حاکم بھی مسلمانوں کے معاملات کا ذمہ دار ہے، پھر وہ ان کے مسائل کے حل کے لیے بھرپور کوشش اور ان کی خیر خواہی نہ کرے تو وہ ان کے ساتھ جنت میں نہیں جائے گا۔“

فائدہ:

1- اس میں حکمرانوں کو ان کی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ یہ بہت ہی اہم منصب ہے۔ لاکھوں کروڑوں انسانوں کے مسائل و معاملات کے وہ ذمہ دار ہیں۔ اگر وہ پوری توجہ، ہمت اور خیر خواہی سے ان کے مسائل حل نہیں کریں گے تو اللہ کے ہاں وہ مجرم ہوں گے۔ ان کی رعایا تو اپنے ایمان و عمل کی بدولت جنت میں چلی جائے گی لیکن یہ اس سے محروم رہ جائیں گے۔

اس لیے حکمران اقتدار کے نشے میں بدست اور عوام کے معاملات سے غافل نہ ہوں بلکہ عند اللہ جواب دہی کے احساس سے سرشار ہو کر انہیں عدل و انصاف اور اسن و سکون مہیا کرنے کی بھرپور کوشش

کریں۔

زری کرنا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اس گھر میں فرماتے ہوئے سنا۔
 ”اے اللہ! جو شخص بھی میری امت کے کسی معاملے کا ذمہ دار بنے، پھر وہ انہیں مشقت میں ڈالے تو تو بھی اس پر سختی فرما۔ اور جو شخص میری امت کے کسی معاملے کا ذمہ دار بنے، پھر وہ ان کے ساتھ زری کرے تو تو بھی اس کے ساتھ زری فرما۔“
 (مسلم)

فوائد و مسائل:

1- کتنا خوش نصیب ہے وہ حکمران جو عوام کو عدل و انصاف مہیا کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائے خاص کا مستحق بن جائے اور اسی حساب سے کتنا بد نصیب ہے وہ حکمران جو عوام کے ساتھ نا انصافی کا ارتکاب کر کے اپنے آپ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بد دعاؤں کا مستحق بنالے۔
 2- اس میں عدل و انصاف سے حکمرانی کرنے

کی ترغیب اور عوام پر ظلم و زیادتی سے اجتناب کرنے کی تاکید ہے۔

3- اس میں حکمرانوں کے ماتحت افسر بھی آ جاتے ہیں کہ ان سے بھی اس کی باز پرس ہوگی، نیز ہر ذمہ دار جس کے ماتحت افراد ہوں اسے ان کے ساتھ زری کا معاملہ کرنا چاہیے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”بنی اسرائیل کی سیاست ان کے پیغمبر کرتے تھے۔ جب ایک پیغمبر فوت ہو جاتا تو اس کا جانشین دوسرا پیغمبر بن جاتا۔ اور (یاد رکھو!) میرے بعد کوئی پیغمبر نہیں، میرے بعد خلفاء ہوں گے اور کثرت سے ہوں گے۔“

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا۔

”یا رسول اللہ! پس آپ ہمیں کیا حکم ارشاد فرماتے ہیں؟

آپ نے فرمایا: ”جس سے پہلے بیعت کرو، اسے پورا کرو، پھر اس کے بعد والے سے بیعت کرو، پھر انہیں ان کا حق دو اور تمہارے اپنے جو حقوق ہیں، ان کا سوال اللہ سے کرو، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ان کی بابت، جن کا انہیں والی بنائے گا، خود ہی ان سے پوچھ لے گا۔“ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1- سیاست بڑی چیز نہیں۔ اگر بڑی ہوتی تو انبیاء سیاست نہ کرتے۔ انبیاء کے سیاست کرنے کا مطلب ہے: جہاں بانی اور حکومتی معاملات بھی ان ہی کے سپرد ہوتے تھے۔ یعنی دین اور دنیا، دونوں امور کے ذمہ دار انبیاء علیہ السلام ہوتے تھے۔ دین اور دنیا کے درمیان تفریق نہیں، یکپائی تھی، جیسے خلافت راشدہ اور اس کے کچھ عرصے بعد تک اسلام میں بھی یہ صورت رہی۔ اس لیے ایک نبی کی وفات کے بعد دوسرا نبی آ جاتا اور اس کا جانشین بن جاتا، جیسے حکمرانی کے منصب میں ہوتا ہے۔ ایک کے بعد کوئی دوسرا حکمران بن جاتا ہے۔

2- اس میں ختم نبوت کا مسئلہ بھی واضح فرما دیا گیا ہے کہ اب میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، البتہ خلفاء ہوں گے اور دعویدار ان خلافت زیادہ ہوں تو اس کا حل بھی بیان فرما دیا کہ پہلے خلیفہ کی بیعت پوری کرو۔ اس کی موجودگی میں کسی دوسرے مدعی خلافت کی طرف توجہ مت دو۔

3- حکمرانوں کی کوتاہیوں کا حل بھی تجویز فرما دیا اور وہ ان کے خلاف بغاوت اور احتجاجی مظاہرے نہیں بلکہ انتظامی معاملات میں ان کی اطاعت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور اس کی بارگاہ میں دعا کرنا ہے۔



کتاب کہانی

سمیر احمد

(ہی لکھوں گی۔)

اسی طرح اگر آپ رائٹر بننا چاہتے ہیں تو ایک چیز ”خدا داد صلاحیت“، آپ میں ہے یا نہیں اور آپ اس سے لاعلم ہیں تو آپ دوسری چیز کے بارے میں معلوم کریں۔ ”آپ میں جنون ہے؟، شوق ہے؟ اگر ہاں تو آپ خود سے یہ سوال بھی ضرور پوچھیں کہ ”کیا واقعی میں آپ رائٹر بننا چاہتے ہیں۔“ اگر ہاں تو کس لیے؟ شہرت کے لیے؟ پیسے کے لیے یا تخلیقات کے لیے؟

کچھ لوگ بس لکھنا چاہتے ہیں، کچھ بھی..... اپنا نام چھپا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں، کچھ تعریفیں وصول کرنا چاہتے ہیں۔ میرا خیال ہے ایسے لوگوں کو اس طرف نہیں آنا چاہیے کیونکہ یہ آرٹ کی تذلیل ہے۔ کچھ لوگ محض وقت گزاری کے لیے لکھتے ہیں۔ سائنس نے وقت گزاری کے لیے بیش بہا چیزیں دریافت کر لی ہیں، ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لیں لیکن لکھنے کا نہیں۔

لیکن اگر آپ واقعی رائٹر بننا چاہتے ہیں تو اس کے لیے قلم تیار کرنے سے پہلے آپ کو خود کو تیار کرنا ہے۔ چونکہ آرٹ میں کوئی بھی چیز حرف آخر نہیں ہوتی (کیونکہ یہ سائنس نہیں ہے۔ ویسے تو سائنس میں بھی کوئی چیز حرف آخر نہیں ہے۔) اس لیے ان باتوں سے آپ مدد لے سکتے ہیں لیکن یہ حرف آخر نہیں ہیں۔ یہ تھیک ہے کہ آرٹ ایک ایسا شعبہ ہے، جس میں باقاعدہ سیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ بے قاعدہ سیکھے بغیر صافین خود بخود بن جاتے ہیں۔ نصرت فتح علی خان کو خواب میں دھنیں مل جایا کرتی تھیں۔ ملتان کے ظروف سازوں کو پانی میں گھول کر کاشی گری سکھادی جاتی ہے۔ ہر

فریک زپا کا کہنا ہے کہ ”دماغ ایک پیراشوٹ کی طرح ہے، جب تک کھلے گا نہیں، کام نہیں کرے گا۔“ زندگی کا کوئی بھی شعبہ ہو، کام کرنے کے لیے دماغ کے پیراشوٹ کو کھولنا پڑتا ہے۔ کائنات میں کوئی ایک بھی چیز ایسی نہیں ہے جو رکی ہوئی ہو اور حرکت میں نہ ہو۔ اس لیے کوئی جذبہ ہو، قوت، یافن، اسے بھی ہمیشہ حرکت میں رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تخلیق کار کو ہر روز، ہر پل، ہر نئی چیز سے نئی سیکھنی ہوتی ہیں تاکہ وہ اپنے فن کو ہر قدم پر دو قدم آگے لے کر جاسکے۔

پچھلے کچھ عرصے سے ایک لفظ ”خدا داد صلاحیت“، بار بار سننے میں آرہا ہے۔ میں خدا داد صلاحیت کے ہونے پر یقین رکھتی ہوں، لیکن ایسا نہیں ہے کہ میں اسے ہی کل بھتی ہوں۔ یہ سچ ہے کہ ہمیں اپنی صلاحیتوں کو دیکھ کر اپنے شعبے کا انتخاب کرنا چاہیے لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ ہم کچھ کرنا چاہیں، کچھ سیکھنا اور پانا چاہیں اور ہم پر خدا داد صلاحیت کے نہ ہونے کا شائبہ لگا، ہمیں رد کر دیا جائے۔

ایک بات ہمیشہ یاد رکھیں، ہمارا رجحان ہماری منزل طے کرتا ہے لیکن ہمارا جنون، ہمیں منزل عطا کرتا ہے۔ جو ہم واقعی میں حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ پا ہی لیتے ہیں۔

نیوٹن کا باپ سائنس دان نہیں تھا، پھر بھی وہ سائنس دان تھا۔ ہٹلر آرٹسٹ تھا، گانے بھی گاتا تھا۔ لیکن وہ ایک لیڈر بنا کیونکہ وہ لیڈر بننا چاہتا تھا۔ (ظالم ہی سہی) تو وارثت، جیہز، اور خدا داد صلاحیت انسان کے ارادوں کے سامنے بے بس ہو جاتی ہے۔ (یہ ایک لمبا موضوع ہے جس پر میں جلد

فن کے لیے باقاعدہ یا بے قاعدہ بہت جان ماری پڑی ہے۔ تب ہی تخلیق کی کوئٹلیں، بجز زمین کو گلستاں کرتی ہیں۔

جے کے رولنگ کا کہنا ہے کہ،

”لکھنے کے لیے اتنا زیادہ پڑھ لیں جتنا زیادہ اور زیادہ سے زیادہ پڑھ سکتے ہیں۔“

پڑھے بغیر لکھنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی جادو سے، بغیر بیج کے گندم کا کھیت اُگالے۔ میں جانتی ہوں کہ نئے لکھنے والوں کی ایک بہت بڑی تعداد کا حلق ایسے علاقوں سے ہے جہاں مطالعہ کے لیے ڈائجسٹ کے

لیے علاوہ کچھ میسر نہیں۔ لیکن میرا یقین کیجیے، آپ بھی مطالعہ کر سکتے ہیں، اور بہت زیادہ کر سکتے ہیں۔ جس ماحول میں آپ رہتے ہیں اس کا، اپنے آس پاس کے لوگوں کا۔ ان کے جذبات، رویوں، اور ان کی مشکلات، ان کی زندگی کے اتار چڑھاؤ کا۔ موسم کا، سردی، گرمی، بہار کا، کھیت، درختوں اور پرندوں کا بھی۔

منشا یاد کی کہانیاں ہمارے معاشرے کی کہانیاں ہیں، اگر آپ ان کی کہانیاں پڑھیں تو آپ کو ایسا لگے گا کہ آپ اپنے ماحول کی کہانی پڑھ رہے ہیں۔ روس کے بہت سے ادیب ایسے ہیں جنہوں نے اپنے گاؤں، گاؤں کے ماحول کی کہانیاں لکھ کر ادب میں بڑا نام بنایا۔ کیوں؟ کیونکہ انہوں نے اپنے ماحول، اپنے لوگوں کا مطالعہ بہت شوق سے کیا تھا۔ آپ بھی کریں۔ جو کہانیاں ہمیں ہمارا ماحول سناتا ہے، وہ دنیا کی کسی کتاب میں پڑھنے کے لیے نہیں ملتیں۔ اس لیے اسے ماحول کی کہانیاں پڑھیں، سمجھیں اور انہیں لکھنے کی کوشش کریں۔ جب کوئی بھی راسخ معاشرے کی بند کتاب کو مشاہدے کی کھلی آنکھ سے پڑھنے لگتا ہے تو اسے، بڑا لکھاری بننے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

نئے لکھنے والوں کو سب سے پہلے اپنے اندر الفاظ کی روانی بڑھانی چاہیے۔ جب بچہ بولنا شروع کرتا ہے تو اس کے پاس ٹھوڑے بہت الفاظ تو ہوتے

ہیں لیکن ان کی درست ترتیب نہیں ہوتی۔ ایسے ہی جب کوئی لکھنا شروع کرتا ہے تو اسے لفظوں کو ترتیب دینے میں مشکل ہوتی ہے۔ ہمارا دماغ چونکہ روزمرہ کی باتیں سمجھنے، کا عادی ہوتا ہے، جس میں ہم گرائمر کی غلطیاں کرتے ہیں اور املا (سائونڈ) کی بھی، اس لیے قلم سے لکھتے ہوئے بھی دماغ ہمیں وہی معمولی کی باتیں دیتا ہے جو دراصل غلط، کمزور اور ناکافی ہوتی ہیں۔

اس لیے جب آپ لکھنا شروع کریں تو کہانیاں لکھنے سے بہت پہلے الفاظ لکھنے کی مشق شروع کریں۔ نئے الفاظ، زیادہ الفاظ بنانے کی مشق۔ کچھ بھی لکھیں۔

موسم پر، شہر پر، گاؤں پر۔ میں صبح اٹھی، ناشتہ کیا، گھر کا کام کیا۔ کھانا ایسے ایسے پکایا۔ مجھے فلاں فلاں چیز پسند ہے۔ معمولی، غیر معمولی سب باتیں۔ بس کچھ بھی۔ روز لکھیں، لکھ لکھ کر رکھتے جائیں۔ دس دن بعد انہیں پڑھیں۔ ان کی غلطیاں درست کریں۔ آپ نوٹ کریں گے کہ پہلے دن کی مشق سے دسویں دن کی مشق تک آپ کا قلم رواں ہونے لگا ہے۔ بہت سے نئے الفاظ اور نئے جملے خود بخود بننے لگے ہیں۔ یہ مشق مسلسل کریں، ہر روز کریں۔

مکالمہ لکھیں۔

آپ سادہ کاغذ پر صرف مکالمہ لکھیں۔ دو بہنوں میں، ماں بیٹی، دو دوستوں میں، بیچر اسٹوڈنٹ میں۔ کسی بھی موضوع پر، کچھ بھی۔ صرف اور صرف جملے لکھیں اور بنار کے لکھیں۔ اس مشق سے آپ کا دماغ خود کار طریقے سے کام کرے گا۔ آپ کے اندر سے خود بخود جملے نکلنے لگیں گے۔ ہر بار مشق میں کم سے کم بیس، تیس جملے لکھیں۔ دس، بیس دن بعد آپ نوٹ کریں گے کہ آپ کا مکالمہ مضبوط ہو رہا ہے۔ روانی آتی جا رہی ہے۔

اس مشق کے ساتھ ساتھ اب یہ کوشش کریں کہ جملوں کو دو ٹوک انداز میں لکھنا شروع کر دیں۔ اپنے جملے جو کردار کی خوبی یا خرابی کو ظاہر کریں۔ جو کردار کی

شخصیت پر روشنی ڈالیں۔ مثلاً،

”مجم مجھے چور کہہ رہی ہو؟ ان چوروں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے، جو ایوانوں میں بیٹھ کر چوری کرتے ہیں۔“

”چوری تخت پر بیٹھ کر کی جائے یا تخت سے نیچے رہ کر، بات بھی ایک ہی ہے اور گناہ بھی۔“

پہلا جملہ چور کا ہے، دوسرا جملہ چور کو چوری سے باز رکھنے کی کوشش کرنے والے کا ہے۔ یعنی اب اس طرح کے جملے لکھیں جن سے کردار کی شخصیت ظاہر ہو۔

بیانیہ:

کہانی کہنا بیانیہ کہلاتا ہے (کہانی بیان کرنا)۔ کہانی کی تین مرکزی بنیادیں ہیں۔ مرکزی خیال یعنی کہانی، کردار نگاری، اور کہانی کی ہنت۔ یہ تینوں حصے ایک چیز بیانیہ سے آپس میں جڑتے اور بیان کیے جاتے ہیں۔ جب آپ اُدھر درج دونوں مشق کر لیں گے تو اب کہانی بیان کرنے کی مشق کریں۔

ہمیشہ چھوٹی کہانیوں سے لکھنے کی ابتدا

کریں۔ افسانہ نویسی یا مختصر کہانی کہنے سے کہانیوں کے مرکزی خیال کو سمجھنے، بیان کرنے، کرداروں کے انداز و بیان کو پیش کرنے کے فن پر گرفت حاصل ہوتی ہے۔ جیسے اگر کوئی سمندر کو کوزے میں بھرنا سیکھ لے تو پھر کوزے سے سمندر نکالنا آسان ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال میں آپ کو پہاڑی بچوں سے دیتی ہوں جو موسم، ماحول، اور حالات کی سختی کے اتنے عادی ہو جاتے ہیں کہ میدانی علاقوں کی سختیاں انہیں سہل لگنے لگتی ہیں۔ افسانہ نویسی بھی کہانی کی دوسری اصناف کو آپ کے لیے آسان کر دے گی۔ باوقد سیر اشفاق احمد، ممتاز مفتی، ان سب بڑے ناموں نے پہلے صرف افسانے لکھے، مختصر نویسی کی۔

کہانی کے مرکزی خیال پر پوری طرح سے غور کریں۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا میں بنیادی طور پر چھتیس کہانیاں ہیں جنہیں ہر راسخ اپنے اپنے انداز میں لکھ رہا ہے۔ اس کا مطلب ہم جو بھی کہانی لکھتے ہیں، وہ روایتی ہی ہوتی ہے، جو زمانہ قدیم سے چلی آرہی ہے۔ تو نیا کیا ہوگا؟ نیا ہوگا ہماری سوچ کا انداز۔ کہانی



کو پیش کرنے کا انداز۔

کہانی کی بنت (treatment)۔ کہانی کے نئے پہلو، نئے الفاظ، نئے خیالات۔ کہانی لکھنا شروع کریں تو قلم روکیں نہیں۔ جو لکھا جا رہا ہے، جیسا بھی لکھا جا رہا ہے، وہ غلط ہے، درست ہے، کہانی کے مطابق ہے، کہانی کے مخالف ہے۔ جو بھی ہے بس رکیں نہیں۔ اسے ”رو“ (flow) کہتے ہیں۔ اس روانی کو نہیں روکنا چاہیے۔ دنیائے ادب میں جو کتابیں شاہکار تسلیم کی جاتی ہیں وہ اسی ”روانی“ کے زیر اثر تخلیق پائی ہیں۔

ان میں سے ایک زندہ مثال راجہ گدھ کی ہے۔ نئے لکھنے والے ہمیشہ یہ کہیں کہ جو کچھ بھی لکھیں، اسے لکھ کر رکھ لیں۔ اسی وقت پڑھنے یا ٹھیک کرنے کی کوشش نہ کریں۔ کچھ وقت بعد پڑھیں گے تو تحریر کا جھول اور خامیاں نظر آنے لگیں گی۔ ان خامیوں کو ٹھیک کریں۔ کہانی کو ترتیب دے دیں۔ ایک بار، دوبار، بار بار لکھ لیں، جب تک آپ کو خود یقین نہیں ہو جاتا کہ کہانی واقعی کہانی بن چکی ہے۔

بار بار کی درستگی سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ مشق کسی کو بھی اپنے فن میں ماہر کر دیتی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ جیسے بڑے ادیب ہر کہانی کو کم سے کم تین بار لکھتے ہیں۔ اپنے ناول ”بہاؤ“ کے لیے انہوں نے سالاؤں نوٹس بنائے تھے۔ اور ایک زبان بھی تخلیق کی تھی۔ علامہ اقبال — جو شعر لکھتے تھے، اس کی کانٹ چھانٹ کرتے رہتے تھے۔ الفاظ کی ترتیب بدلتے رہتے تھے۔ دنیائے ادب کے سب سے بڑے اور مشہور ادیب نالساٹی سو بار سے زیادہ اپنے مسودات پر نظر ثانی کرتے تھے۔

اگر آپ جلدت پسند ہیں، آپ میں صبر نہیں ہے تو پھر آپ بڑا کام تو کر سکتے ہیں لیکن بڑی تخلیق نہیں۔ ”کہاں، کتنا، اور کیا۔“ یہ تین پیمانے ہیں جن کے ملاپ سے ایک بہترین کہانی تیار ہوتی ہے۔ ہر لفظ، خیال، جملہ، جو رائٹر کے پاس ہوتا ہے، وہ ہر

کہانی کے لیے نہیں ہوتا۔ یہی رائٹر کی حقیقی قابلیت ہے کہ وہ سمجھ جائے کہ اسے کہاں، کیا، کیسے، اور کتنا لکھنا ہے۔ رائٹر بننے کے ساتھ ساتھ ایک نقاد بھی بنیں۔ اپنی تحریر کی خامیاں خود نکالیں۔ اپنی تحریر پر کڑی تنقیدی نظر رکھیں۔

آخر میں، میں یہ کہنا چاہوں گی کہ کیا ایسے اچھا لگے گا کہ دنیا بھر میں، کبہار، ترکھان، موچی، بادورچی، مستری، کاشی گر، وغیرہ تو اپنے اپنے کام میں ماہر ہوں۔ حتیٰ کہ مٹی کے بنے ریت میں بھوننے والا، اور دونوں کورنگے والا رنگ ساز تک اپنا کام ٹھیک ٹھیک کرتے ہوں لیکن لکھاری اپنے کام میں جھول رہنے دے۔ املا کی، گرامر کی بے شمار غلطیاں کرے۔ جس زبان کا وہ ادیب ہے، اسے وہ زبان ہی ٹھیک سے نہ آئی ہو۔

اس لیے وہ سب نئے لکھنے والے جو لکھنا چاہتے ہیں، وہ ڈائجسٹ کی کہانیاں پڑھ پڑھ کر اپنی املا اور گرامر کی غلطیاں ٹھیک کرنے کی کوشش کریں۔ اپنی اردو بہتر کریں۔ آپ کی کہانیاں جب ایڈیٹر کی میسرز پر آئیں، تو وہ اتنی جامع، مہمل، اور مستند ہوں کہ نہ صرف شائع ہوں بلکہ بہت زیادہ پسند کی جائیں۔

دنیا میں کوئی ایک بھی انسان ایسا نہیں ہے جو پرفیکٹ ہو۔ لیکن دنیا میں بہت سے ایسے انسان ہیں جو پرفیکٹ ہونے کے لیے ہردن، ہر لمحہ کوشش کرتے ہیں اور اپنی جدوجہد چھوڑتے نہیں۔ غور و فکر، مشاہدہ اور ہر روز کچھ نہ کچھ نیا سیکھنا، ایسی چابیاں ہیں، جو بہت سے بند دروازے کھلتی چلی جاتی ہیں۔ اگر کوئی بھی انسان کچھ سیکھنا چاہتا ہے تو اللہ اسے سکھاتا چاہتا ہے۔ بس سیکھنے والے کو شوق ہونا چاہیے۔ کیونکہ علم غافلوں پر مہربان نہیں ہوتا۔ نیکے، ست لوگوں کو پسند نہیں کرتا اور تنگ دلوں پر روتن نہیں ہوتا۔ اس لیے غفلت، سستی، اور تنگ دلی سے بچیں۔ رائٹر بننے کے لیے قلم سے پہلے خود کو تیار کریں۔

آئندہ ہم کہانی کے کچھ اور پہلوؤں پر بات کریں گے۔



سینم تانی ہمارے سیمٹ تانی

شاہین رشید

اور بچے کہتے ہیں، کیا کرتے ہیں؟“
 ”شادی کو ماشا اللہ 31 سال ہو گئے ہیں بلکہ
 جولائی 2018ء میں 31 سال ہوں گے..... اور
 ماشا اللہ ہمارے تین بیٹے ہیں..... بڑا بیٹا ”شاہ رخ“
 ہے جس کی شادی ہو چکی ہے اور ان کے دو بیٹے بھی
 ہیں، یہ کینیڈا میں رہتے ہیں۔ دوسرے بیٹے کا نام
 ”شاہ زیب“ ہے جو کہ ایم بی اے کر رہا ہے۔ تیسرا
 بیٹا ”شاہ رز“ ہے اور یہ اے لیول میں ہیں۔“
 ”اتنے سالوں میں مزاجوں اور شخصیت میں کیا
 فرق آیا اور لکھنے کا ادراک شادی سے پہلے ہی تھا یا
 شادی کے بعد ہوا؟“

”مزاجوں میں تو یہ فرق آیا ہے کہ طبیعتوں میں
 ٹھہراؤ آ گیا ہے۔ ایک دوسرے کی بات کو کل سے سنتے

نئے شادی شدہ جوڑوں کی سوچ اور پرانے
 جوڑے کی سوچ میں اور رکھ رکھاؤ میں کافی فرق ہوتا
 ہے..... کیونکہ پرانے یا سینئر جوڑے بہت سے
 تجربات سے گزر کر کندن بنتے ہیں تو جنہیں اپنا
 بندھن مضبوط کرنا ہے وہ سینئر کے تجربات سے ضرور
 فائدہ اٹھائیں۔

آج آپ کی ملاقات ایک سینئر جوڑے سے
 کروار ہے ہیں جو شو بز کا جانا پہچانا نام ہیں، سیمٹ تانی
 اپنی اداکاری اور سینم تانی اپنی تحریر اور اداکاری کی وجہ
 سے پہچانی جاتی ہیں۔

”کیا حال ہے شبنم صاحبہ؟“

”جی..... اللہ کا شکر ہے۔“

”مasha اللہ سے شادی کو کتنے سال ہو گئے ہیں

اور سمجھتے ہیں۔ دنیاوی رشتوں کی زیادہ سمجھ میں آگئی ہے۔ میچور پہلے بھی تھے اب اور زیادہ ہو گئے ہیں..... اور لکھنے کا رجحان تو بچپن سے ہی تھا کیونکہ میں سوچتی بہت تھی اور دنیا کو دیکھنے کا میرا لگ ہی زاویہ تھا اور اب میں نے خود ہی اس کو ”ڈسکورڈ“ کہا ہے..... شادی کے بعد جب اللہ نے نعمتوں سے نوازا تو انہی کے تعلیم و تربیت میں مصروف ہو گئی اور کچھ ایکسٹرا کام کرنے کا نام ہی نہیں ملا۔ اگر ملا بھی اور لکھا بھی تو سب کچھ اپنے پاس ہی

رکھا..... اور ابھی تک رکھا ہے..... تو لکھنے کا سلسلہ گاہے بہ گاہے جاری رہا مگر اپنے تک۔ مگر اب میرا دوسرا سیریل آنے والا ہے ”حنا“ کے نام سے اور ”نور جہاں“ سیریل تو آپ کو یاد ہی ہوگا، کافی مقبول ہوا تھا۔

”زندگی کے اس سفر میں کتنے دشوار گزار راستے آئے یا سب کچھ اچھا رہا؟“

الحمد للہ..... ایسے کچھ دشوار گزار راستے تو نہیں آئے۔ لیکن ظاہر ہے زندگی کسی کی بھی ٹریک پہ نہیں چلتی۔ دشواریاں آتی ہیں۔ زندگی ایک امتحان ہی تو ہے۔ خواہ امتحان چھوٹے ہوں یا بڑے..... زندگی تو بس سیکھنے کا عمل ہے اور یہ عمل ساری زندگی — جاری رہتا ہے۔ بہت شکر ہے اللہ کا کہ اس نے اچھا وقت گزار دیا..... اور آئندہ بھی گزارے اور ہمیشہ گزارا ہوا وقت اچھا لگتا ہے۔

”ازدواجی زندگی کو خوشگوار بنانے کے لیے لڑکیوں کو ہی قربانی دینی پڑتی ہے۔ آپ کے ساتھ مسائل ہوئے؟“

”جی..... یہ صحیح ہے کہ قربانی لڑکیوں کو ہی دینی پڑتی ہے اور مرد قربانی تو نہیں دیتا مگر اس میں صبر کا جذبہ زیادہ ہوتا ہے۔ تو الحمد للہ سب صابر رہے اور ہیں اور اب میں گزری زندگی کے بارے میں سوچتی ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ میں نے بہت قربانی دی۔ کرائس اس طرح کے آئے کہ کئی جگہوں پہ سب نہیں پہنچ پاتے تھے تو میں ہی جاتی تھی۔ سسرال والوں سے بھگانا۔ ہر چیز میں آگے آگے رہنا، بچوں

کی تربیت کی نوے فیصد ذمہ داری میں نے اٹھائی، سب اپنے کام کی وجہ سے زیادہ توجہ نہیں دے پاتے تھے۔ سب کے ساتھ کچھ اونچ نیچ ہوتی کسی بھی معاملے میں تو میں آگے آگے رہی اور سب کو ہمیشہ میں نے فری ہینڈ دیا..... تو اس لحاظ سے ساری قربانیاں میں نے ہی دیں۔“

”ساتھ تو دیا ہوگا آپ کا..... یا اس سفر میں اکیلا چھوڑ دیا؟“

”نہیں ایسا نہیں ہے..... سب نے میرا بہت ساتھ دیا..... راستے میں جو بھی مشکلات آئیں۔ سب میرے ساتھ ساتھ رہے۔ مگر سب کچھ ہینڈل کرنے کا اختیار بھی مجھے ہی دے دیا کہ ”تم دیکھ لو“ کیونکہ اگر دو لوگ کسی مسئلہ کو ہینڈل کرتے ہیں تو مسئلہ الجھ ہی جاتا ہے مگر چونکہ مجھے اختیار دیا تو میرے لیے بھی آسانی ہو گئی اور سب کے لیے بھی اور ہم الجھنے سے بچ گئے۔“

”سسرال والوں سے تعلقات کیسے رہے؟“

”سسرال والوں سے ماشا اللہ بہت اچھی تھی، کیونکہ میں انکوئی بہو تھی..... میری ساس بہت اچھی تھیں بالکل دوستوں کی طرح۔ بہت پیار دیا انہوں نے اور میں نے بھی، تقریباً سال قبل ان کا انتقال ہو گیا اور ان کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے..... نند میری ایک ہی ہیں جو کہ ملک سے باہر رہتی ہیں۔ بالکل سگی بہنوں کی طرح ہماری آپس میں محبت ہے..... اور میرے بچوں کے لیے بھی وہ بڑی بہنوں کی طرح سے ہی ہیں۔“

”آپ دونوں میں لڑائیاں ابھی بھی ہوتی ہیں کیا؟“

”ارے جناب لڑائیاں کب ختم ہوتی ہیں۔ گھر میں مل جل کر رہیں گے تو کچھ نہ کچھ تو ہوگا۔ چھوٹی مولی لڑائیاں تو ہر گھر میں ہوتی ہیں۔ مگر بچ بتاؤں، ہمارے درمیان لڑائی بہت کم ہوتی ہے۔ سبھی سالوں میں ایک آدھ بار..... مجھے ہی غصہ آ جاتا ہے،



”سچ کو نہیں۔“
”شادیوں کے رسم و رواج میں کیا فرق محسوس کرتی ہیں؟“

”شادیوں میں تو اب بہت فرق آ گیا ہے اب شادیوں میں شو آف زیادہ ہوتا ہے۔ پہلے گھر میں گھریلو ماحول میں ڈھوکی رکھی جاتی تھی اور بہت رونق ہوتی تھی مہمان آنا شروع ہو جاتے تھے تو بہت اچھا محسوس ہوتا تھا..... اب بہت بناوٹ آ گئی ہے۔ اب فیشن، ڈیزائننگ، پارلر اور اب گانوں سے زیادہ ناچنے پر زور ہوتا ہے۔ فوٹو سیشن..... بہت کچھ ہونے

لگا ہے۔ تو جو مزہ پہلے کی شادیوں میں تھا اب کی شادیوں میں نہیں ہے اب پیسہ بھی خرچ ہوتا ہے۔ تھکن بھی ہو جاتی ہے اور جو سکون و اطمینان حاصل ہونا چاہیے وہ نہیں ہوتا۔“

ہے تو احساس ہوتا ہے کہ اصل محبت تو یہی ہے اور اس میں ماشا اللہ اضافہ ہوا ہے۔“

”شوہر کی فیلڈ خطرناک فیلڈ بھی ہے تو کبھی خوف آیا یا احساس ہوا کہ سچ کو اس فیلڈ میں نہیں ہوتا چاہیے تھا؟“

”جی خطرناک سے زیادہ یہ ایک مشکل فیلڈ ہے۔ اس میں اگر قدم رکھا ہے تو پوری طرح رہیں نہیں تو پھر چھوڑ دیں اسے۔ اس فیلڈ میں مشکلات تو بہت آئیں اور ہمارے لیے تو کچھ زیادہ ہی آئیں..... سچ کو شہرت شروع میں ہی مل گئی تھی پر اسے برقرار رکھنا مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ سچ زیادہ سوشل نہیں ہیں بلکہ وہ میں ملنا ملنا انہیں پسند نہیں ہے

اب تو لکھنے کے حوالے سے میں بھی اس فیلڈ میں آ گئی ہوں۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ یہ فیلڈ ہم جیسے لوگوں کے لیے نہیں ہے۔“

”پہلی اولاد، پہلی سالگرہ اور پہلا تحفہ..... یاد ہو تو بتائیے؟“

”بچوں کی سالگرہ اور اپنی شادی کی سالگرہ اہتمام سے منائی ہیں آپ؟“

”بچے چھوٹے تھے تو ان کی سالگرہ مناتے تھے۔ ان کے دوستوں کو بلا کر اہتمام کر لیتے تھے ہم لیکن جب بچے بڑے ہوئے تو انہیں احساس ہوا کہ یہ تو فضولیات ہیں تو اہتمام ختم ہو گیا البتہ کیک کاٹ لیتے تھے گھر والے ہم سب مل کر..... یا ڈنر پر چلے جاتے ہیں سگراب یہ رجمان بھی کم ہو گیا ہے اور تحفے تخائف تو ماشا اللہ سارا سال ہی چلتے رہتے ہیں بس اب تو ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہیں اور ڈنر پر چلے جاتے ہیں۔“

”اتنے سالوں میں محبتوں میں کمی ہوئی، اضافہ ہو یا نارمل رہے؟“

”محبتوں میں تو اضافہ ہی ہوتا ہے اگر آپ ساتھ رہیں اور ساتھ بھی بہت اچھا ہو۔ اللہ تعالیٰ اس طرح سے ہمارا ساتھ رکھے۔ اور مزید اضافہ ہو۔ ہاں شکلیں بدل جاتی ہیں تو اظہار کے طریقے بھی بدل جاتے ہیں اور طریقہ ایک دوسرے کی عزت میں بدل جاتا ہے اور ایک دوسرے کا خیال رکھنے میں بدل جاتا

”جی..... اللہ کا شکر ہے۔“
 ”یہ بتائیے کہ شبنم کو شادی کے بعد کیسا پایا اور
 وقت کے ساتھ ساتھ کیا تبدیلیاں آئیں ان میں؟
 اچھی بیوی رہیں، نارمل یا لڑا کا؟“

”آپ نے ایک ہی سوال میں تین چار سوال
 پوچھ لیے..... لیکن میں ایک چھوٹی سی بات کرنا
 چاہوں گا کہ آج جہاں میں کھڑا ہوں یا میری فیملی
 کھڑی ہے۔ میرے بچے پروان چڑھ گئے ہیں اور

سب سیٹ ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ سب شبنم کی محنت
 ہے۔ شبنم صرف ایک اچھی بیوی، ایک اچھی بہو اور ایک
 اچھی ماں بنی نہیں ہے بلکہ ان میں اور بھی بے شمار خوبیاں
 ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ معلوم ہوئیں جس نے ہم
 سب کو بھی حیران کیا۔ اور دیگر لوگوں کو بھی تو میں تو یہ
 کہوں گا کہ مجھے ایک بہت ہی سمجھدار دوست اور سمجھ
 دار بیوی ملی اور بہو بھی بہترین ثابت ہوئیں کہ ان کی
 میری امی سے بہت اچھی دوستی تھی۔ اور چونکہ امی کو
 لڑکچہ سے پیارتھا تو انہی کا ذوق شبنم کے اندر بھی منتقل
 ہوا اور انہوں نے لکھنا شروع کیا اور میں بہت فخر سے
 کہوں گا کہ ہم ایک بہت اچھی اور خوش گوار زندگی گزار
 رہے ہیں اور اس کا محور صرف اور صرف شبنم ہیں۔“

”آپ کی امی کے ساتھ ان کے تعلقات کیسے
 تھے اور یہ ایک روایتی بہو تھیں یا مختلف؟“

”میری والدہ جو کہ اب ہمارے درمیان نہیں
 ہیں۔ پڑھنے لکھنے کی شوقین اور اسپورٹس کی دلدادہ
 تھیں اور اپنے وقت میں پاکستان کی نمبر 2 کھلاڑی
 تھیں۔ ٹینس مینس کی اور گراچی کا کالج فار وومن میں
 لیکچرار تھیں..... شبنم سے ان کی بہت دوستی رہی اور
 کبھی روایتی ساس بہو کی لڑائی نہیں ہوئی، کیونکہ
 دونوں طرف سے ہی پڑھے لکھے لوگ تھے، شبنم کا
 فیملی بیک گراؤنڈ بھی بہت اچھا تھا اور خود بھی پڑھی
 لکھی تھیں اور پھر چونکہ ہماری فیملی بہت چھوٹی تھی تو
 اتنے پر اہم نہیں ہوئے، بلکہ ہوئے ہی نہیں کہ کبھی
 ماں کو منارہا ہوں تو کبھی بیوی کو..... الحمد للہ بہت اچھی



”اولاد کی پیدائش اور پہلی اولاد کی پیدائش تو
 ایسی ہوتی ہے کہ لگتا ہے کہ جیسے کل کی ہی بات ہو۔
 مجھے اپنے تینوں بچوں کی پیدائش کا ایک ایک لمحہ ایسے
 یاد ہے جیسے یہ کل کی ہی بات ہو، بڑے بیٹے کی
 پیدائش تو ایسی لگتی ہے کہ جیسے وہ ابھی پیدا ہوا ہے۔
 ابھی میری گود میں آیا ہے..... اور پہلے بچے کی سالگرہ
 بھی بہت اچھے انداز میں منائی تھی۔ اور چہلی سالگرہ
 یہ سب خاص طور پر کویت سے آئے تھے..... کیونکہ
 میں پاکستان میں تھی اور سمجھنے میں مجھے پہلا تحفہ ایک
 انگوٹھی دی تھی۔ گولڈ کی اور وہ آج تک میرے پاس
 ہے اور شادی پہ انہوں نے مجھے ہیرے کی انگوٹھی دی
 تھی اور وہ بھی میرے پاس ہے۔ مجھے سب اہم دن
 اور سب تحفے یاد ہیں اور کچھ میں نے سنبھال کر بھی
 رکھے ہوئے ہیں۔“

اور اب کچھ باتیں سمیع ثانی صاحب سے
 ”بہت عرصے بعد آپ سے بات ہو رہی
 ہے۔ تو یہ بتائیے کہ کیسے ہیں آپ؟“

مہربان، تو پھر جب وہ مشہور ہوئی تو اندازہ ہوا کہ اس میں تو بہت ٹیلنٹ ہے۔ مگر پھر کچھ وجوہات کی بناء پر سلسلہ رک گیا..... اور اب تقریباً سال دو سال پہلے اس نے ڈراما سیریل ”نور جہاں“ لکھا جسے بہت پسند کیا گیا اور معروف رائٹر نے بھی تعریف کی۔ اور اب ”حنا“ کے نام سے ایک سیریل ڈائریکٹ کر رہا ہوں میں جو کہ شبنم نے ہی لکھا ہے اور جس سے آن ایئر ہو گا۔ تو شبنم Creative mind (تخلیقی ذہن) رکھتی ہے اور لکھنے کے معاملے میں ان میں بہت صلاحیتیں ہیں۔“

”آپ کی خوش حال ازدواجی زندگی کو دیکھ کر لوگ رشک کرتے ہیں یا کچھ کہتے ہی نہیں..... اور کبھی ایسا وقت بھی آیا کہ کسی نے آپ کا بندھن توڑنے کی کوشش کی ہو؟“

”کہتے ہیں نا کہ دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا، چہرے پہ مسکراہٹ سجانے والے کے دل کا حال تو آپ نہیں جانتے، شوہر میں رہتے ہوئے میری کوشش یہی رہی کہ گھریلو حالات خراب نہ ہوں تو میں نے اپنی طرف سے ایسے مواقع آنے ہی نہیں

زندگی گزری۔“

”شبنم نے روایتی بیوی کی طرح آپ کا خیال رکھا کہ کھانے بھی پکانے ہیں۔ استری بھی کرتی ہے۔ میاں کے سارے کام خود کرنے ہیں؟“

”میں اور شبنم آپس میں میاں بیوی سے زیادہ دوست رہے ہیں ایک دوسرے کے اور ہیں بھی روایتی میاں بیوی دالی زندگی نہیں گزاری کہ شوہر آ گیا ہے تو اس کی خدمت کرتی ہے۔ اس کے لیے کھانے پکانے ہیں اور ٹیبل پہ سجانے ہیں..... لیکن

ایک بات ہے کہ شبنم کے ہاتھ میں لذت بھی بہت ہے اور بہت پھرتی سے بناتی ہیں۔ یہ نہیں کہ ایک ہانڈی پکانے میں سارا دن لگا دیا اور پہلے دن سے جو ہمارا لائف اسٹائل ہے۔ وہ ہی آج تک ہے۔ پہلے وہ میرے اور امی کے لیے کرتی تھیں۔ پھر بچے ہوئے تو ان کے لیے کیا۔ تو عمر کے ساتھ ساتھ ذمہ داریاں بڑھتی جاتی ہیں اور ایک وقت آتا ہے کہ عورت بھی آرام کرنا چاہتی ہے۔ مگر شبنم آج بھی زیادہ کام خود ہی کرتی ہیں۔ خاص طور پر کھانا تو خود ہی پکاتی ہیں۔“

”شبنم اچھی ماں، اچھی بہو اور اچھی بیوی تو ثابت ہو گئیں۔ یہ بتائیے کہ یہ اچھی لکھاری بھی ہیں کیا؟“

”بہت سی اچھی ہوئی صلاحیتیں ایسی ہوتی ہیں جو بہت بعد میں پتا چلتی ہیں۔ شبنم میں بہت خداداد صلاحیتیں ہیں۔ یہ بہت کمانڈنگ ہیں اور قوت فیصلہ ان میں بہت اسٹرونک ہے۔ بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کرتی ہیں۔ شروع سے ہی لکھنے اور شاعری کرنے کا شوق تھا اور یہ اپنی شاعری اکثر مجھے سنایا کرتی تھیں اور میں کبھی داد دے دیتا تھا اور کبھی سنی ان سنی کر دیتا تھا اور پھر اس نے کہا کہ میں نے کہانیاں لکھی ہیں اور اب میں ڈراما لکھنا چاہتی ہوں تو وہ آپ نے سنا ہی ہو گا کہ گھر کی مرغی دال برابر ہوتی ہے تو بندہ توجہ نہیں دیتا پھر مجھے یاد ہے کہ 1998ء میں جب ہم نے پہلی ٹیلی فلم بنائی ”ایک مہمان

بارہ برجوں پر مکمل کتاب

آپ کا برج

مصنف: کیرو

قیمت: ---/- 150 روپے

منگوانے کا پتہ

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37- اردو بازار، کراچی۔

رہا ہے اور بے شک جوڑے آسمانوں پہ بنے ہوتے ہیں مگر پھر بھی جو ہوگا چھان بین کے بعد ہوگا۔“
 ”بہت شکریہ آپ دونوں کا کہ آپ نے ٹائم دیا۔۔۔ بس آخر میں شبنم صاحبہ سے ایک سوال کہ ”بیٹی“ نہیں ہے آپ کے پاس بیٹی کی کمی محسوس ہوتی ہے یا بہونے یہ کمی پوری کر دی؟“



”بیٹی تو پھر بیٹی ہی ہوتی ہے اور ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کی کمی محسوس نہ ہوئی ہو۔ میں خود اپنے ماں باپ کی ایک ہی بیٹی ہوں۔ تو بچپن سے خواہش تھی کہ بہن ہو، شادی ہوئی تو بیٹی کی خواہش ہوئی، کیونکہ بیٹی سے رونق ہی الگ ہوتی ہے بیٹے تو باہر کی دنیا میں گم ہو جاتے ہیں اور بیٹیاں ساتھ رہتی ہیں۔ ہم دونوں کو بیٹی کی بہت خواہش رہی۔ مگر اللہ کو منظور نہیں تھا اور بہو ایک تو ملک سے دور رہتی ہے اور پھر اتنا ساتھ بھی نہیں رہا ہمارا۔ مگر وہ بھی بہت اچھی ہے اگرچہ بیٹی کی کمی تو پوری نہیں ہو سکتی کیونکہ بیٹی سمجھ لینا اور بیٹی ہونا میں بہت فرق ہے۔ لیکن اگر آپس میں انڈر اسٹینڈنگ کے ساتھ چلیں تو پھر یہ رشتہ اور بھی خوب صورت ہو جاتا ہے۔ جیسے کہ میرا اور میری ساس کا آپس کا رشتہ تھا۔ میں نے اپنی ساس سے بہت کچھ سیکھا ہے اور انہوں نے سکھایا اپنی شخصیت سے۔۔۔ تو بہر حال میں بھی ایسا ہی چاہوں گی۔ مگر کمی تو بہر حال کمی ہی ہے۔“



دیے۔ شبنم تو اس فیلڈ میں بھی نہیں۔ جو کچھ ہونا تھا میری ہی طرف سے ہونا تھا مگر میں نے ہونے نہیں دیا۔۔۔۔۔ باقی ازدواجی زندگی میں اتار چڑھاؤ تو آتے ہی ہیں لڑائی جھگڑے بھی ہوتے ہیں مگر اللہ کا شکر ہے کہ ایکسٹریم (extreme)۔ کبھی بات گئی نہیں نہ میں نے کبھی سوچا۔ اور جہاں تک لوگوں کی بات ہے تو بظاہر ہنس کے ملتے ہیں مگر اندر ان کے کچھ اور ہوتا ہے ”کیونکہ“ ہوتا ہے پیٹھ کے پیچھے چھرا چھپایا ہوا ہوتا ہے۔ اس لیے نہ ہم لوگوں کی باتوں میں آتے ہیں نہ ان پر انحصار کرتے ہیں اور نہ ہی امیدیں باندھتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ زندگی بہت اچھی گزری اور گزر رہی ہے۔“

”اپنے بچوں کو ان کی پسند سے شادی کرنے کی اجازت دی ہے؟“

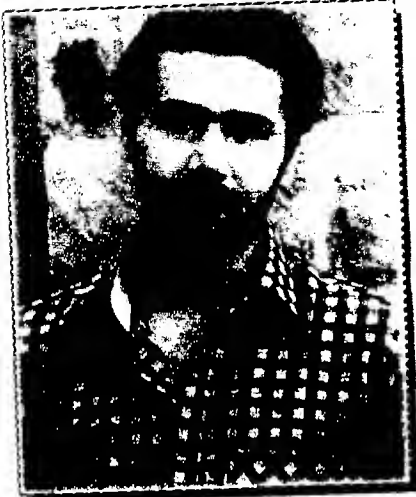
”جب ہم نے اپنی پسند سے شادی کی تو اپنے بچوں کو بھلا کیوں منع کریں گے۔ مگر اس میں والدین کی مرضی ضرور شامل ہونی چاہیے کیونکہ صرف لڑکی لڑکے کا ملاپ نہیں ہوتا بلکہ دو خاندانوں کا ملاپ ہوتا ہے۔ میں لبرل ضرور ہوں۔ مگر ہماری آنکھیں کھلی ہوئی ضرور ہیں، ہمیں سب پتا ہوتا ہے کہ کون کیا کر

سورق کی شخصیت

ماڈل عالیہ خان
 میک اپ روز بیوٹی پارلر
 فوٹو گرافی موسیٰ رضا

درستیکہ درستیکہ درستیکہ

شایین رشید



علی عباس

”کیا حال ہے اور کیا آن ایئر ہے اور کیا انڈر پروڈکشن ہے؟“

”جی الحمد للہ..... سب ٹھیک ہے اور کیا آن ایئر ہے تو ایک سیریل ”فیصلہ“ اور ”میں ماں نہیں بننا چاہتی“ آن ایئر ہیں اور ”خالی ہاتھ“ جو بہت پاپولر ہوا، وہ کچھ ہی عرصہ قبل ختم ہوا اور آن ایک سیریل ”سیٹ“ یہ ہے جو کہ سینتھ اسکاٹی کا ہے اور اس میں ”حرامانی“ میرے ساتھ لیڈ رول کر رہی ہیں۔“

”خالی ہاتھ“، ”فیصلہ“ اور ”میں ماں نہیں بننا چاہتی“ تینوں میں آپ کے ٹکٹورول ہیں..... تو تواتر کے ساتھ ٹکٹورول کرنے کی کیا وجہ ہے؟“

”خالی ہاتھ“ تو اب ختم ہو چکا ہے اور باقی دو جو آن ایئر ہیں، مجھے لگتا ہے کہ ان تینوں میں میرے ٹکٹورول نہیں تھے۔ مجھے لگتا ہے کہ میرا ایک ایچ بن چکا ہے ”اینگری بک مین“ کا اور اس ایچ کی وجہ سے جو کردار مجھے آخر ہوتے ہیں جس کو میری ایک اسپیشلی سمجھا جا رہا ہے۔ وہ ایک اینگری بک مین کا ہے۔ ”خالی ہاتھ“ میں اپنے کردار کو ٹکٹو اس لیے نہیں کہوں گا کہ وہ آخری قسط میں سب کی ”ہمدردیاں“ لے گیا۔ اس نے اپنی محبت ثابت کر دی ”مشعل“

کے لیے، اپنی جان دے کر۔ وہ اپنی طرف سے ہر چیز ٹھیک کر رہا تھا کیونکہ اسے اپنی محبت مانا تھی، اس کی شادی مشعل کی بہن سے زبردستی کرائی گئی تھی۔ اس طرح ”فیصلہ“ میں غصے کے نقصانات کو بتایا گیا کہ غصے میں ایک فیصلہ کیا بیوی کو طلاق دے دی اب وہ

اس فیصلے کو ٹھیک کرنا چاہا ہے اور ”میں ماں نہیں بننا چاہتی“ کا کردار بالکل مختلف ہے چونکہ وہ امیکریسیو ہے اسی لیے وہ ٹکٹو لگ رہا ہے۔ وہ ہیرو ہے مگر غصے والا ہیرو ہے۔“

”ان تینوں سیریلز میں اپنا بیٹ رول کون سا لگا۔ اور زندگی کے قریب کون سا لگا..... اور کیا یہ کردار ہمارے معاشرے میں نظر آتے ہیں؟“

”کردار آپ کے بچے کی طرح ہوتے ہیں اس لیے ان کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مجھے ان تینوں ڈراموں میں اپنے کردار بہت اچھے لگے تھے..... مگر پھر بھی مجھے لگتا ہے کہ ”خالی ہاتھ“ میرا اب تک کا سب سے بہترین کردار رہا ہے، کیونکہ اس کو

بہت زیادہ پذیرائی ملی ہے۔ باقی دوسریلز آن ایر ہیں..... اور ان دونوں سیریلز میں بھی مجھے بہت پذیرائی مل رہی ہے ماشا اللہ سے۔ آپ کے سوال کے دوسرے حصے کا جواب کچھ یوں ہے کہ ڈراموں کے کردار میں ہمیشہ عام زندگی کے لوگوں سے انساں ہو کر ہی دکھاتا ہوں..... اور رائٹرز کی نظر میں بھی یہ کردار ہوتے ہیں تب ہی وہ لکھتے بھی ہیں۔ ڈراما ”خالی ہاتھ“ کے دوران مجھے ایسے بہت سے نتیجے آئے کہ ہم ایسے انسان کو جانتے ہیں جس کو اپنی ”سالی“ پسندھی اور وہ اپنی بیوی سے زیادہ اپنی سالی پر توجہ دیتا تھا۔

اسی طرح فیصلہ میں ایک غصیلے انسان کا کردار تھا جو کہ ہمارے معاشرے میں بہت پائے جاتے ہیں..... اسی طرح جبران کا (میں ماں نہیں بننا چاہتی) کردار بھی عام زندگی سے متعلق ہے اس طرح ایک سیریل ”تیلی“ میں نے کیا تھا اور اس کے کردار کے بارے میں بھی میں ذاتی طور پر دو ایسے لوگوں کو جانتا تھا جن کے ساتھ بیگمات بہت برا سلوک کرتی ہیں مگر وہ پھر بھی رشتے کو نبھاتے رہے۔ اپنے فرض کو نبھاتے رہے..... تو ڈراما بنیادی طور پر معاشرے کی عکاسی کرتا ہے اور جب ہمیں اس میں اپنا عکس نظر آتا ہے تو ہم نظریں (ہم سے مراد لوگ) چرا لیتے ہیں..... لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہر کردار عام زندگی سے ہی لیا جاتا ہے۔“

”ان تین ڈراموں کا ذکر ہم بار بار کر رہے ہیں تو علی آپ یہ بتائیں کہ ان تینوں ڈراموں کی لڑکیوں ”ایمن“، ”رباب“ اور سونیا مشال میں کس کے ساتھ کام کر کے اچھا لگا کس کو زیادہ باصلاحیت پایا؟“ ”مجھے لگتا ہے کہ تینوں بہت باصلاحیت ہیں..... اور اپنی کو آرٹسٹ کے ساتھ میری بہت جلدی دوستی ہو جاتی ہے اور دوستی میں اس لیے بھی جلدی کر لیتا ہوں تاکہ ڈرامے میں ہماری یکسوئی اچھی رہے اور ہم ایک دوسرے کو اچھی طرح جان سکیں، کیونکہ میں ایک سیکور انسان ہوں۔ میری

شادی ہو چکی ہے۔ میرے ماشا اللہ دو بچے ہیں۔ اور میں اپنی بیگم اور اپنے بچوں سے بے انتہا محبت کرتا ہوں اور یہ بات پوری انڈسٹری کو پتا بھی ہے..... تو لڑکیاں بھی میری فرینڈلی نیچر سے واقف ہیں اور وہ بھی اپنے آپ کو سیکوئل کرتی ہیں..... اور اگر کوئی لڑکی ایمانداری کی بات ہے کچھ براہم کرتی بھی ہے تو میں اسے کلیئر بھی کر دیتا ہوں کہ تم بے فکر ہو جاؤ تم میرا ٹائپ ہی نہیں ہو..... میں اپنی بیوی سے محبت کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا..... اور اس کے بعد وہ ایزی ہو جاتی ہے خواہ کسی کو غلط فہمی ہو یا خوش فہمی، کیونکہ میرا ”چو آس آف اسٹینڈرڈ بہت ہانی ہے۔“

”کیا ہمارے ڈراموں کے موضوعات بہت بولڈ نہیں ہو گئے؟ ایک باپ، بیٹی کا نکاح ”حلالہ“ کی نیت سے کر داتا ہے۔ اور اسی طرح کے دیگر موضوعات؟“

”دیکھیں جی..... ہر ڈراما اچھا نہیں ہوتا..... جیسے ہر انسان اچھا نہیں ہوتا..... تو کچھ ڈرامے بُرے بھی ہوتے ہیں..... ڈرامے معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں..... مجھے بہت بُرے لگتے ہیں وہ لوگ جو صرف ڈرامے کا نام دیکھ کر تنقید شروع کر دیتے ہیں۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ڈرامے میں کیا پیغام دیا گیا ہے..... اب جیسے ”میں ماں نہیں بننا چاہتی“ کے لیے مجھے کئی لوگوں نے فون بھی کیے اور میسج بھی کہ ہم اپنے بچوں کو یہ ڈراما کیسے دکھا سکتے ہیں جس کا ٹائٹل ہی ایسا ہو..... میں سب کو یہ بات کہنا چاہتا ہوں آپ کے ”پلیٹ فارم“ سے کہ ”آپ ڈرامے کا ٹائٹل بہ اتنا سوچ رہے ہیں اس کے کائنات کو دیکھ بغیر جس میں ایک بہت اچھا سوشل میسج ہے کزن میرج پر، بچوں کے اپنا بل ہونے کے، تو ایک ڈرامے کے ٹائٹل میں اتنی بڑی سوچ ڈال دی ہے رائٹرز نے اور آپ ہیں کہ اتنا بڑا فیصلہ سنار ہے ہیں کہ یہ ڈراما نہیں دیکھنا اس کا ٹائٹل بدل دیں، ہمارے بچے کیسے دیکھیں گے یہ ڈراما۔

کاش کہ آپ اس ملک میں ”ووٹ“ ڈالنے



سے پہلے اتنا سوچتے..... آپ کاش اپنے بچوں کی تعلیم کے بارے میں اتنا سوچتے۔ کراچی شہر پھر سے بھرا ہوا ہے۔ کاش آپ کچرا پھیلانے سے پہلے اتنا سوچتے..... کاش آپ کسی کا دل دکھانے سے پہلے اتنا سوچتے..... تو زندگیاں ہماری بہترین جائیں..... ہمارے آج کل ڈرامے سوشل پرائزم پر مبنی کرتے ہیں اور ایسے ڈرامے بننے چاہئیں۔ اگر ہم سوسائٹی تک پہنچانا چاہتے ہیں تو ہمیں انہماک اور دماغ وسیع کرنا پڑے گا۔ ہمیں اپنی آنکھیں کھولنی پڑیں گی۔ اگر ہم جاہل رہنا چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے لیکن اگر ہم باقی معاشروں کی طرح آگے بڑھنا چاہتے ہیں تو ہمیں ان تلخ حقیقتوں کو پس کرنا پڑے گا۔ اپنے بچوں کو سکھانا پڑے گا یہ بہت ضروری ہے۔ ”بولڈ موضوعات سے منفی اثرات تو پڑتے ہیں“

”؟“

کریں۔ بند کرنا ہے تو ان گھنیا بلوسات کو بند کر دے جو آپ انڈین فلموں میں ان کو دکھاتے ہیں۔ اور گانوں کے تھرو دکھاتے ہیں۔

آپ مجھے خود بتائیے کہ ”من جاوے مینوں شاہجک کرا دے“ جیسے گانوں کی شاعری بچوں پہ غلط اثرات نہیں ڈال رہی، بہ حیثیت مسلمان اور بہ حیثیت ماں باپ کے آپ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ یہ چیزیں بچوں پہ غلط اثرات ڈال رہی ہیں..... لیکن اگر ڈراموں کے ذریعے اگر ہم ایک اچھا پیغام دے رہے ہیں تو اس پہ آپ کیوں اعتراض کر رہے ہیں۔“

”اپنے والد کے ساتھ کام کر کے کیسا لگتا ہے؟“

”والد صاحب کے ساتھ یہ میرا تیسرا سیریل ہے۔ لیکن تینوں سیریلز میں میرا ان کے ساتھ زیادہ کام نہیں تھا..... والد صاحب پاکستان کے بہترین اداکاروں میں سے ایک ہیں اور ان کے ساتھ کام کرنا ایک بہت مشکل کام ہے..... ان کی آنکھوں میں اتنا تاثر ہے کہ آپ ان کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر کام نہیں کر سکتے تو چونکہ وہ میرے والد بھی ہیں تو ان کے ساتھ کام کرنا مجھے مشکل لگتا ہے..... اور ”سین“ میں ظاہر ہے کہ وہ میرے والد نہیں ہوتے اور بعض سین

”میں ایک بیٹی کا باپ ہوں اور مجھے اپنی بیٹی سے بے حد محبت ہے..... لیکن میں شاید پڑھ لکھ گیا ہوں یا شاید کتابیں بہت پڑھتا ہوں..... یا شاید دماغ بہت کھل گیا ہے میرا، مجھے لگتا ہے کہ اگر میری بیٹی مجھ سے کوئی سوال کرے گی اور وہ ایک بولڈ سوال ہو گا لیکن اس کے جواب سے اگر میں اس کا فیوچر سیکور کر سکتا ہوں..... اس کے جواب سے اگر میں اسے یہ اعتماد دے سکتا ہوں کہ وہ مجھ سے چھپائے بغیر اپنی زندگی کی ہر بات مجھ سے کر سکتی ہے تو میں اس کی ضرور حوصلہ افزائی کروں گا..... یقین کیجیے ایسا ہی ہو گا۔“

مجھے اپنی بیٹی کو بیٹوں جیسا بنانا ہے۔ بہادر، عقل مند اور خود مختار۔ اور بولڈ ٹاپک بالکل ان کے سامنے لے کر آنے چاہئیں..... کم سے کم ”بے بی ڈول میں سونے دی“ ”چٹیاں کھائیاں دے“ جیسے گانے ہمارے بچے سن رہے ہیں اور ہم خود گھر میں لگا کر ناچ رہے ہیں اور گاڑی میں لگا کر انجوائے کر رہے ہیں، اس سے بہت بہتر ہے کہ ہم بولڈ موضوعات ان کے سامنے لے کر آئیں..... بند کرنا ہے تو پھر ان چیزوں کو بند

میں بد میزبی لکھی ہوئی ہوتی ہے..... تو..... میں ہمیشہ
یہی سوچتا ہوں کہ اگر میرے کسی سیریل میں وہ بھی
ہیں تو میرا ان کے ساتھ کم سے کم کام ہو۔“
”کلم کی آپ نے؟“

”کلم پروگریس میں ہے..... پاکستان میں اب تک
بہت سلوروس ہے فلم بننے کا..... تو دیکھیں جب فنوڈی
مکمل ہوگی تو پھر ضرور بتاؤں گا فلم کے بارے میں۔“

صبا قمر

”ڈراما سیریل باغی میں تو کمال پر فارمنس دی
ہے آپ نے آپ کو خود یہ سیریل کیسا لگا؟“
”جی..... کہانی اسرونگ ہو تو پھر کام کرنے

میں مزہ بھی آتا ہے اور باغی کی کہانی بہت اسرونگ
ہے..... ایک لحاظ سے میرے لیے چیلنجنگ رول
تھا۔“

”بہت کم وقت میں بہت زیادہ ترقی کی ہے
آپ نے؟“

”کم وقت کہاں..... 2006ء میں اس فیلڈ
میں آئی تھی..... اور اب دیکھیں کیا چل رہا ہے، تو
ٹائم تو کافی ہو گیا ہے۔“

”مگر شہرت کے حساب سے کم..... کیونکہ بعض
لوگ تو برسوں محنت کرتے ہیں تب کہیں جا کے صلہ ملتا
ہے۔“

”جی یہ تو ہے..... آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“
”ڈھیر سارے ڈراموں میں اپنے مشہور
ڈراموں کے نام گنوا سکتی ہیں.....؟“

”بہت مشکل سوال ہے۔ پھر بھی آج کل
”باغی“ بہت پاپولر ہو رہا ہے اور اس میں کام کر کے
مجھے بھی مزہ آ رہا ہے۔ کہاں تم کہاں ہم۔ میں
عورت ہوں۔ فصل جاں سے آگے۔ امرتیل۔ وہ صبح
کب آئے گی۔ تیری اک نظر۔ اڑان۔ بانی جیسا
پیار۔ ملال۔ مات“ اور ”ڈائجسٹ رائٹر“ ابھی تو یہی
ذہن میں ہیں میرے۔“

”کس آرٹسٹ کے ساتھ کام کر کے اچھا لگا؟“
”سب کے ساتھ..... سب ہمارے ساتھی..... ہمارے
دوست ہیں۔ نعمان اعجاز بہت اچھے اداکار بہت اچھے انسان
ہیں۔ ان کے ساتھ کام کر کے بھی بہت اچھا لگا..... طلعت
حسین میرے پسندیدہ آرٹسٹ ہیں۔“

”آپ خوش ہیں اس فیلڈ میں؟“

”جی..... بالکل خوش ہوں..... بہت اچھا لگ
رہا ہے سب کچھ یا کے..... اور اگر شو بزم میرے
نصیب میں نہ ہوتا تو پھر یقیناً میں ڈاکٹر یا ایک اچھی
فیشن ڈیزائنر ہوتی ہے۔“

”اس فیلڈ میں جب قدم رکھا تھا تو کیا امیدیں
تھیں؟“

”جب شو بزم میں قدم رکھا تھا تو ہرگز یہ نہیں سوچا
تھا کہ مجھے اتنی شہرت و عزت اور پیسہ ملے گا۔ میں یہ
عزت و شہرت ہمیشہ برقرار رکھنا چاہتی ہوں۔“

”لوگ ملتے ہیں تو انھیں کا شکار ہوتی ہیں؟“
”ارے نہیں..... لوگوں کی محبت نے ہی تو یہ

مقام دیا ہے۔ مجھے اس وقت بہت خوشی ہوئی ہے
جب کوئی مجھے پہچان کر میری تعریف کرتا
ہے..... میری اداکاری کی تعریف کرتا ہے تو بہت فخر
محسوس کرتی ہوں۔“

”ٹی وی فلم ماؤلنگ..... ترجیح کیا ہوگی؟“
”ٹی وی کے لیے اگر میں کہوں کہ میری پہلی

ترجیح ہے تو غلط نہ ہوگا کیونکہ ٹی وی نے ہی مجھے نامور
کیا..... اور ٹی وی کے ذریعے میں ہر طرح کے رول
کر کے مشہور ہوئی۔ سب کو پتا چلا کہ مجھ میں کیا کیا
صلاحیتیں ہیں۔“

”ہم سب امید سے ہیں جیسا پروگرام پھر
شروع نہیں ہوا۔ اس پروگرام نے بھی آپ کو شہرت
دوام دی؟“

”بالکل..... بہت مزہ آتا تھا“ ہم سب امید
سے ہیں“ کر کے..... ایسے پروگرام کی بہت
ضرورت ہے۔ یہ بہت اصلاحی پروگرام بھی تھا۔“





جب تجھ سے نانا جھوٹا ہے

سن

ج: 11 نومبر 2000ء -

س: شادی سے پہلے کیا مشاغل تھے؟

ج: میرے ابو صحابی تھے تو بس مطالعہ اور گھر

کے چھوٹے موٹے کام۔

س: رشتے میں مرضی؟

ج: میری مرضی اس حد تک تھی کہ لڑکا گاؤں

میں رہتا تھا مجھے گاؤں کی خوبصورتی بہت بھائی ہے تو

میری پسند بھی تھی، وہ غیر تھے ”دارن“ تو میری ٹیلی

کچھ کشش کا شکار تو تھی مگر زیادہ پریشانی نہیں ہوئی کچھ

اللہ کی بھی رضا تھی تو ہو گیا رشتہ۔

بہت پرانی قاری ہوں آپ کے پرچوں کی۔
میرے اس شوق پہ، صرف میں خود اپنے ہمراہ رہی۔
میرے میاں کے بقول انسان رسالے بڑھ کے
پاکل ہو جاتا ہے، اس لیے بھی انہوں نے خوشی سے
رسالے لے کے نہیں دے، ہر ماہ پاکٹ منی جمع
کر کے خود مارکیٹ سے ڈائجسٹ لے آتی اب عمر کی
نقدی ختم ہو رہی ہے تو میرا چھوٹا بھائی یہ فرض ادا کرتا
ہے ہر ماہ۔

چار، پانچ سال سے بلڈ کی کمی کا شکار ہوں،
میٹ کروائے، بیماری کوئی نہیں، بس ہر چھ ماہ بعد
بلڈ لگتا ہے جو کہ مشکل سے ملتا ہے۔ ”او، نیکو“ گروپ
ہے میرا،

میری ایسی حالت، شوہر اور کچھ سسرال کی وجہ
سے ہوئی اور کچھ میں جذباتی بھی ہوں۔

”جب تجھ سے نانا جوڑا ہے“ یہ کالم میں شوق
سے پڑھتی ہوں دل چاہتا کہ اس میں بھی شامل
ہوں مگر طبیعت کی خرابی کی وجہ سے رہ جاتی، خون کی
کمی سے چہرہ، ہاتھ پاؤں سو رہتے ہیں، کمزوری
رہتی ہے، مگر ایسی حالت میں بھی گھر اور بچوں کی ذمہ
داریاں آہستہ آہستہ پوری کرتی ہوں یہی دعا ہر لمحہ
ہونٹوں پہ رہتی ہے کہ یا اللہ مجھے کیسی کا محتاج نہ رکھ۔۔
آمین“

اب طبیعت کچھ بہتر ہے تو قلم اٹھایا ہے میں کوئی
لکھواری نہیں ہوں نہ ہی لفظوں سے کھیلنا آتا ہے مگر
چاہتی ہوں میرے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو، سکون سے
مروں، آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔ آپ کے
پرچے کے توسط سے میں کہنا چاہوں گی کہ میرا بلڈ
گروپ ”او، نیکو“ ہے، مجھے ضرورت ہے، کہ اپنے
بچوں کے لیے مجھے زندہ رہنا ہے، موت کو شکست
دینی ہے، پاکستان میرا اپنا ہے اور اس تکلیف میں
مجھے میرے انہوں کی ضرورت ہے میں تنہا ہوں میرا
ساتھ دیتیے۔“

س: شادی کب ہوئی؟

ج: شادی کے تین چار دن بعد پہلا کام میں نے گھر کی صفائی کی تھی۔ میرے میاں کی فیملی کی خواتین پھوپھو، بہن، ساس، سسر، خاتون نہیں ہیں۔ وہ ٹھونسنے پھرنے کی شوقین ہیں، ابھی یہاں بھی وہاں۔ انہوں نے گھر کی جانب توجہ دی ہی نہیں، میرے میاں یا میرے دیور گھر کی صفائی کرتے یا جیسا تیسرا کھانا بنا ہی لیتے۔ ان کے خاندان میں مردوں کی اتنی اہمیت نہیں، اندر باہر کی مالک عورتیں ہیں، میرے سسرال میں میری ساس سودا لاتی ہیں، شادی کے بعد میری نندیں اپنے گھر کے بجائے یہاں کی مالک ہیں، ہم بہویں مہمان ہیں، ہماری کوئی اہمیت نہیں۔ میرے سسر، میری ساس نے اپنی بیٹیوں کو گھر کا مالک بنایا ہے۔ سب خرچ ان کے ہاتھ میں ہے۔ میری بڑی نندرات کے وقت چینی کو ہوا، گوانی، چچ چینی تالے میں۔

میں دو تین سال اپنے سسرال والوں کے ساتھ رہی، میں خاصی پسند ہوں آج بھی اپنی بیماری کے باوجود میرا گھر چمکتا ہے، میرے بچے صاف ستھرے ہوتے ہیں۔ ٹائم پکھانا اور ہر چیز تیار ہوتی ہے۔ پانچ پانچ منٹ میں ریٹ کر کے سب خود کرتی رہتی ہوں، تو شادی کے بعد یہی صفائی والی عادت میری سزا بنی۔ میری بڑی نند کے بچے گندگی پھیلاتے، میں ان کو روکتی ایک دن میرے سسرال ساس نے میرے میاں کو بلا کے کہا کہ اپنے دانے

الگ کر لو، تمہاری بیوی بچوں کو روکتی ٹوکتی ہے۔ اس وقت ان کی جاب نہیں تھی۔ میری ساس نے سہاگ رات کو جو نوٹی ہوئی چار پانی سیٹ کی تھی وہ اٹھا کے لی گئیں اور پکھا بھی۔ آج تک میری ساس سسر نے مجھے کوئی چیز نہیں دی۔ شادی کے بعد جب لکڑیاں جلانے کی وجہ سے مجھے سانس کی بیماری ہوئی تو میں نے اپنے سونے کے بھمکے فروخت کیے، چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لیے میں اپنے چھوٹے موٹے

س: جیون ساتھی کے حوالے سے تصور؟
ج: میں شروع ہی سے خوابوں کی دنیا میں رہنے والی لڑکی تھی۔ چاند رات انجوائے کرنا، مطالعہ کرنا، قدرتی مناظر کو دیکھنے کی خاطر ادھر ادھر گھومنا، میں کچھ تنہائی پسند تھی ”اب بھی ہوں، زیادہ سوشل نہیں ہوں اپنے کام سے کام رکھتی ہوں تو شوہر ایسا نہ تھا۔

س: متکئی کتنا عرصہ رہی؟
ج: ہمارا نکاح ہوا تھا، دو سال رہا جب بھی ڈیٹ شادی کی فکس ہوتی، کوئی نہ کوئی قریبی عزیز فوت ہو جاتا تھا، میرے ابو بھی کافی عرصہ بیمار رہے میری رخصتی کے وقت وہ اٹھ کے بیٹھ بھی نہیں سکتے تھے اور میری شادی کے پندرہ دن بعد وہ فوت ہو گئے تھے۔

س: شادی کے لیے کوئی قربانی؟
ج: ہاں۔۔ اپنی ایسی۔۔ اور خوشیاں۔
س: رسموں کے لین دین یہ کوئی جھگڑا؟
ج: نہیں، کوئی خاص نہیں ہوا تھا۔

س: شادی کے بعد شوہر نے دیکھ کے کیا کہا؟
ج: میں یہ بتاتی چلوں کہ میرے میاں کی یہ دھواں دھار لو میری سہمی مگر پھر بھی مجھے دیکھ کے کچھ نہیں کہا۔ پلیٹ میں ٹھنڈے چاول رکھے تھے، بولے، کھاؤ گی۔“

میں نے کہا ”نہیں“
میں اپنی فیملی کو یاد کر کے بہت رورہی تھی۔

س: شادی کے بعد شوہر کا رویہ کیسا تھا؟
ج: میرے میاں گھر کے بڑے بیٹے ہیں (صرف نام کے) وہ ہیں تو نرم مزاج مگر ڈل ہیں۔ کمزور فطرت اور کم ہمت ہیں۔۔ کسی بھی حالات میں وہ میرے سپورٹ نہیں بنے۔۔ میں ایکلی روٹی، چپ ہو جاتی مجھے نہیں یاد بھی انہوں نے پاس بیٹھ کے کوئی سلی وی ہو، حوصلہ دیا ہو، بس اٹھ کے باہر چلے جاتے۔
س: کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟

خواتین اور وہ شے اوں کہنے اپنی مرض کا پتلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

دسمبر 2017ء
کے شمارے کی ایک جھلک



- ❖ ”حسن المآب“ سائرہ رضا کا مکمل ناول ❖ سماعت اور گویائی سے محروم بچوں کے ڈاکٹر ”عمر فاروق“
مکمل کے مراحل میں، سے ملاقات،
- ❖ ”تھم گیا شور جنوں“ فرزانہ کھرل کا مکمل ناول، ❖ تمہاری مریم کی ”سارہ“ ”حبیبہ عزیز“ سے ملاقات،
- ❖ ”دھب جنوں“ آمنہ ریاض کا ناول، ❖ ”کرن کرن روشنی“ احادیث نبوی ﷺ کا سلسلہ،
- ❖ راشدہ رفعت اور آصفین نعیم کے ناول، ❖ نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور عدنان کے مشورے
- ❖ ایمل رضا، صدف آصف، عنبرین اعجاز، ہاجرہ ریحان، اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں
- شازیہ الطاف ہاشمی اور تمینہ چودھری کے افسانے،

خواتین ڈائجسٹ کا دسمبر 2017 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

زیوریتی کئی جب گلو بند بچا تو وہ میرے سر سے لے لیا کہ اگلی فصل یہ دے دوں گا مگر وہ دن اور آج کا دن انہوں نے نام نہیں لیا، دو تین بار مانگا تو کہنے لگے ہم نے شادی پہ جو خرچا کیا اسی میں کٹ گیا دکھ تو ہوا مگر چپ کر گئی۔

س: میرے اور سسرال کے کھانوں میں فرق؟
بس تھوڑا بہت فرق ہے۔

س: سسرال میں کن باتوں پر تعریف، تنقید ہوئی؟

ج: میرے سسرال والے میری صفائی والی اور سستی نہ کرنے والی عادت پہ تعریف کرتے ہیں، اب بھی۔۔۔ میں شروع ہی سے سحر خیز ہوں۔۔۔ میں چونکہ ان کے خاندان کی نہیں ہوں تو بچوں سے کافی فرق رکھتے ہیں، ویسے تو پیار کرتے ہیں مگر خالی خولی پیار، دینے دلانے کا نہیں تو تنقید ہوتی ہے کہ بنا کے نہیں رکھتی جبکہ ان کا کھلا ڈھولا ماحول مجھے کبھی پسند نہیں رہا۔ مردوں کو آزادی ہے بنا اجازت سر پر سوار ہو جاتے ہیں میری امی کے گھر کا ماحول ایسا نہیں تھا تو اس وجہ سے بھی میں سسرال میں ایک فاصلے پہ رہی۔ اپنے دیورں، سسر اور ان کے خاندان کے مردوں سے فاصلہ رکھا۔

س: جوائنٹ فیملی سسٹم پسند ہے یا علیحدہ؟

ج: پہلے سسرال کا ماحول دیکھیں کہ وہاں آپ کے سسر، ساس آپ کو کیسی اہمیت دیتے ہیں تاکہ ہم بھی اپنے گھر والا خواب پورا کریں، سچائیں، بنائیں مگر جہاں شادی کے بعد بھی بیٹیاں مالک ہوں وہاں آنے والی کیا گھر بنائے گی۔ میری ساس کا کہنا ہے

میں بہوؤں، بیٹوں کو چھوڑ سکتی ہوں بیٹیوں کو نہیں، یہ نہیں سوچتیں کہ اب بیٹی کی شادی ہو گئی ہے ان کو اپنا گھر بنا کے دو۔ میری دو نندیں اور دو دیور ہیں میری نندیں شادی کے بعد بھی میکے کے مزے لے رہی ہیں۔ تو اگر ایسا غیر فطری ماحول ہو تو الگ ہی رہیں تو اچھا۔

س: پہلے بچے کی پیدائش۔۔۔؟

ج: میرے چاروں بچے میری امی کے گھر ہوئے۔ میرے دو بیٹے، دو بیٹیاں ہیں تو سسرال والے جب اپنا کام وقت پہ نہیں کرتے تو میرا اور بچے کا کیا کرتے نہ ہی وہ زیادہ پر جوش ہوتے ہیں۔

س: سسرال میں مقام؟

ج: جب پورا گھر سنسلا، ساس، نند کو چار پائی پہ بٹھا دیا تھا تو سب خوش تھے۔ مقام بھی تھا پھر بچے کے ساتھ، ظاہر ہے کاموں کا ٹائم ٹیبل بھی بدل جاتا ہے مگر سب کے خیال میں، میں ایک مشین ہوں، تو کام کرنی، مقام ہوتا، نہ ہو پاتا تو مقام ختم سارے ہی رشتے مطلب کے ہیں نہ ہوتے تو اچھا تھا۔

س: شوہر سے تعلقات؟

ج: شروع میں اتنی سمجھ دار نہیں تھی نہ یہ جانتی تھی کہ ان کی نیچر کیسی ہے۔ دقت کے ساتھ ساتھ پتا چلا کہ میں تو ریت کی دیوار کے سائے میں ہوں اکیلی ہوں، کوئی ایک لفظ میری ذات کے لیے بولنے والا نہیں ہے نہ تھانا ہوگا، میں اپنی ذات میں تنہا ہوں، تو شوہر سے تعلقات درستانہ نہ عاشقانہ رہے، دل ہی مر گیا اس میں تمام امنگیں، جذبے بھی ختم، پھر آخر میں زندگی بھی ختم ہو جائے گی۔

میری تمام بہنوں اور والدین سے گزارش ہے کہ بیٹی کی شادی کرتے وقت سسرال کا ماحول دیکھیں کہ وہاں بیٹی اور بہو کا کیا مقام ہوگا۔ شادی کے بعد بیٹی کا اصل گھر شوہر کا ہوتا ہے مگر اس کو اپنا گھر بنانے، سجانے میں کوئی تعاون نہیں کرتا، شوہر بھی نہیں۔ جو عورتیں ساس کے عہدے پہ فائز ہیں ان سے درخواست ہے کہ بہو کو اہمیت دیں، گھر کا مان دیں اور بیٹیوں کو شادی کے بعد اپنا گھر بنانے کی نصیحت دیں ورنہ نہ بیٹی کا گھر آباد ہوگا نہ بہو، بیٹے کا اور مجھ جیسی حساس اور جذباتی لڑکیاں تو کڑھ کڑھ کے اپنا آپ ختم کر لیتی ہیں۔

یہ بھی دیکھیں کہ شوہر مضبوط شخصیت کا مالک ہو۔ اور مالی طور پہ بھی اپنے پیروں پہ کھڑا ہو۔

عشقِ سحر طاہر

Pakistanipoint
ایسٹونل قنصل

Wagor
Azeem

آسان راستہ ہو یا دشوار ، مسترد
اسے عشق ہی جیتنے لے گا ، مسترد

لوگوں کی عام تادمی تخلیق ،، واہ واہ
میرے تراشے سارے ہی شاہکار مسترد

میں تیرے ہاتھ لگ گئی مال
پھر تیرے ہاتھ سے ہوئی ہر بات
جلنے دو جسم دھوپ میں اب ضد کی
وہ گھر تو کیا۔۔۔

زندہ ہیں لوگ اس دورِ سرور میں
اے زیست تیرے جینے کے میں
نمیر کی کال نے شاپنگ کرتی سومیر کو حیرت میں مبتلا کیا تھا۔ اس نے شاپنگ سیکرڈ ڈسٹرے ہاتھ میں رکھ کر
کرتے ہوئے موبائل شانے اور کان کے بیچ پھنسا دیا اور کاؤنٹر پر پے منٹ کرنے لگی۔
"کیسی ہو۔۔؟"

"ہوں۔۔ ٹھیک تم سناؤ" کافی وقت کے بعد ہونے والی بات چیت نے دونوں کے مابین ایک تکلف کی فضا
قائم کر دی تھی۔ وہ پرس شو لڈر بیگ میں رکھ کر ہاتھ میں موبائل سنبھال کر شاپ سے باہر نکل آئی۔
"کہاں ہو اس وقت۔۔۔ مل سکتی ہو؟"

"ہوشل سے باہر ہوں"
"کہاں ہو۔ اپنی لوکیشن بتاؤ میں پک کر لیتا ہوں تمہیں"۔ وہ بولا۔ شاپنگ سینٹر سے باہر نکل کر رکشے کی
تلاش میں نظر دوڑانی سومیر نے گہری سانس بھری۔
"کیا ضروری ہے ملنا؟ کال پر بات نہیں ہو سکتی؟"



"نہیں ہو سکتی۔" وہ فی الفور بول کر لحظہ بھر کو چپ ہو گیا۔ پھر اضافہ کیا۔
 "لیکن اگر تم نہیں ملنا چاہتیں تو تمہاری مرضی ہے۔" سومیہ نے اسے اپنی لوکیشن بتا کر کال کاٹ دی۔ اور
 شاپنگ مال کے احاطے میں موجود گھاس کے چھوٹے سے قطعے میں نصب دو بیٹنوں میں سے ایک پر آ
 بیٹھی۔ ذہن اسی پزل کو حل کرنے میں مصروف تھا کہ میر کو اس سے کیا کام ہو سکتا ہے۔ وہ اگلے پانچ منٹوں کے
 بعد وہاں پہنچ چکا تھا۔ گاڑی سے اتر کر سومیہ کی طرف آتے۔۔۔۔۔ سومیہ نے دیکھا وہ کتنا شاندار نظر آ رہا تھا۔ وہ
 اس سے نظر پھیر گئی۔ (اؤںہوں۔۔۔ کسی کی چیز)

"کچھ کھانا ہے تو اندر ریٹورنٹ بھی ہے۔؟" وہ پوچھ رہا تھا۔ سومیہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
 "نہیں۔" لچک کر کے نکلی تھی میں۔ "میر نے اس کے ہاتھ سے شاپنگ بیگز لے لیے۔ وہ اس کے ساتھ
 گاڑی کی طرف بڑھی۔ وہ اسے آکس کریم پارلر لے گیا۔ معروف آکس کریم کے دو کپ سامنے رکھے وہ آٹنے
 سامنے بیٹھے تھے۔ وہ اسے مہرماہ کی بے وقوفی کی تمام کہانی سنا چکا تھا۔

"تو اس صورت حال میں اب میں کیا کر سکتی ہوں۔ تم نے اس کے سامنے حالات ہی ایسے بنا دیے ہیں کہ
 وہ کسی بھی طرح تم سے چھٹکارا چاہتی ہے۔ کبھی تو کیسے بھی کر کے اس بلیک میل کو پیسے تک دے آئی۔"
 "تم اس سے ملو سومیہ اور ذرا عقل سکھاؤ اسے۔"

"ہا۔۔۔ میں تو خود ساری بازیاں ہاری ہوئی ہوں۔" وہ آکس کریم کے کپ میں یونہی چیچ بھاری تھی۔ میر
 نے بے اختیار اسے دیکھا۔ تو وہ اپنی بے اختیاری پر خفیف سی ہو کر جلدی سے بات بدل کر بولی۔
 "تم نے اس بے چاری کو دشمنی کی اس جنگ میں استعمال کر کے محض اس کی زندگی برباد کی ہے اور کچھ
 نہیں۔ اس کے آغا جان کو رتی برابر بھی فرق نہیں پڑا اس نکاح سے۔ الٹا اس معصوم لڑکی کے خواب اجاڑ دیے
 ہیں تم نے۔"

"مانتا ہوں اپنی غلطی کو۔" وہ اعتراف کرتے ہوئے بولا۔
 "مجھے نہیں پتا تھا کہ آفندی ہاؤس کے لوگ اس قدر ذہنی پسماندگی کا شکار ہیں۔ انہیں تو نکاح پر نکاح کرنا
 بھی گناہ نہیں لگا۔ میں نے تو سوچا تھا کہ سب میرے اور مہرماہ کے نکاح کی خبر اور طلال سے شادی ٹوٹنے پر رت پ
 انھیں گے اور میرا بھی بدلہ پورا ہوگا۔ مگر آغا جان کی سفارح تو صحیح معنوں میں اب مٹ چکی ہے مجھ پر۔"
 "ابھی تو شکر کرو پچھو نے تمہاری حمایت میں یہ قدم اٹھالیا۔ ورنہ اور کون تھا اس وقت۔" سوحد آفندی کے
 سوا جو مہرماہ کو اپنا

اپنے نکاح میں رکھتا۔ بردہ بھی رہ گیا تمہارا۔" سومیہ نے جتایا تو وہ مسکرا دیا۔
 "یو ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔"

"اور مہر۔۔۔ جانیداد حاصل کرنے کے بعد اس کا مستقبل کیا ہوگا۔؟"
 "تم بتاؤ۔۔۔ کیا کرنا چاہیے مجھے۔۔۔ وہ بھی اس صورت میں کہ میں اس کی زندگی کی ہر خوشی کو ختم کر چکا

ہوں۔"
 "تمہیں چاہیے کہ اب تم اس کو اپنی زندگی کی طرف لاؤ۔" دل پر پتھر رکھ کر سومیہ نے اسے پابند کرنا چاہا۔
 "اس کے مطالبے کے باوجود اسے طلاق نہ دو میر۔ وہ بہت معصوم اور بے قصور لڑکی ہے۔" وہ خاموشی سے
 آنسو کریم ختم کرتے ہوئے۔ پھر ٹشو سے ہونٹ صاف کرتا اس کی طرف متوجہ ہوا۔
 "اور وہ جو نفرت اس کے دل میں بھری ہے میرے لیے۔۔۔؟"

"تم اس سے محبت کرنے کا سوچو نمبر۔۔۔ جلد یاد رہے سب کو محبت کے آگے گھٹنے ٹیکنا پڑتے ہیں۔"

"م۔۔۔ ح۔۔۔ ب۔۔۔ ت۔۔۔؟" وہ ہنسنے لگا۔ "وہ کچھ بولا پھر بھنوں کو استفہامیہ انداز میں اچکا کر اسے دیکھنے لگا۔

"نفرت سے نکاح کر سکتے ہو تو کیا محبت کر کے اسے نبھانہیں سکتے؟" سومیہ کی بات نے اسے لا جواب کیا تھا۔

"محبت کا تو پتا نہیں سومیہ! لیکن اتنا تو طے ہو چکا کہ میں اسے طلاق نہیں دوں گا۔" وہ قطعیت سے بولا تو اس کی بات سن کر سومیہ نے بے ساختہ کہا۔ "ابھی مت مانو۔ مگر اکیلے میں اپنا تجزیہ ضرور کرنا۔ تم اس سے محبت کرنا شروع کر چکے ہو۔" وہ متیقن سے بولی۔ مگر نیران سنی کرتے ہوئے بولا۔

"تم نے کہا تھا کہ وہ اور موحد ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں۔"

"جو اسے اپنا ہمدرد نظر آئے گا وہ اس کے قریب ہوگی نمبر!"

"لیکن اسے سوچنا چاہیے کہ وہ میرے نکاح میں ہے۔"

"ہا۔۔۔ ایک ایسا رشتہ جس میں ماسوائے مفاد کے اور کوئی جذبہ نہیں اس کے بارے میں وہ زندگی بھر کچھ اچھا نہیں سوچ سکے گی نمبر۔"

"میں اپنے کیے کا اپنی غلطی کا دوا کروں گا سومیہ۔ مجھے آفندی ہاؤس والوں کے رویے سے اندازہ ہو چکا ہے کہ میں نے ایک غلط مہرہ جن لیا تھا"

"اب بتاؤ میں کیا کر سکتی ہوں تمہارے لیے؟"

"تم صرف یہ کرو کہ مہرہ آفندی کی برین واشنگ کر دو نمبر کے لیے۔" وہ کرسی سے ٹیک لگائے سنجیدہ تھا۔ سومیہ بے ساختہ بولی۔

"لیکن اگر اس نے موحد کو چنا تو؟" چند لمحوں کے لیے بالکل خاموشی چھا گئی۔

"پھر۔۔۔ میں اس کی زندگی سے نکل جاؤں گا سومیہ!" توقف کے بعد وہ اٹل لہجے میں بولا تو سومیہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

نمبر سے بات ہوئے تین روز گزر چکے تھے۔۔۔

اور اب۔۔۔ گزرے تین دنوں سے اب تک وہ مسلسل اسی ادھیڑ بن میں تھی۔۔۔ اسے اپنے دل پر پیر رکھنا چاہیے یا نمبر آفندی کے؟

☆☆☆

مہرہ متحیر تھی۔ موحد کا زرنگار سے اتنا التفات؟ اسے دھیان آیا۔ شاید موحد نے یہ نرم دلی اپنی ماں سے ورثے میں پائی تھی۔ شمرہ بھی تو زرنگار اور وقار کی حمایت کرتی رہتی تھیں۔ لیکن زرنگار کے چہرے پر پہچان کے کوئی تاثرات نہ تھے۔ وہ تو بس چپ چاپ سی کھڑی موحد کو دیکھ رہی تھیں۔۔۔۔۔ مہرہ نے نگاہ کا زاویہ بدلا۔

(سارے تاثرات تو موحد آفندی کے چہرے پر تھے)

"تم۔۔۔؟" زرنگار نے اپنے ہاتھ پیچھے کھینچے تو موحد کو پہلی بار جیسے مہرہ کی موجودگی کا احساس ہوا۔ لیکن زرنگار کے اس ایک لفظ میں مکمل سوال چھپا تھا۔ وہ پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہوا۔

"میں۔۔۔ بھی آپ کا بیٹا ہوں ماں جی۔۔۔" ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر موحد نے شدت جذبات سے کہا۔ مہرہ کا منہ حیرت سے کھلا۔ لوجی میری ساس ان کی ماں ہوئیں۔

"ہاں۔۔۔ شاید۔۔۔ کوئی آتا تو تھا ملنے مجھے۔۔۔ یاد نہیں۔۔۔ یہ کون ہے؟" زرنگار نے اٹھتے لہجے میں

کہہ کر پھر مہر کی طرف اشارہ کیا۔ تو اس نے گہری سانس بھر کر مہر کو دیکھا۔ جس کے اعصاب اپنے ممکنہ تعارف کو سوچ کرتے گئے تھے۔ (نمیر کی بیوی۔ آپ کی بہو یہی کہتا وہ)

"یہ۔۔۔۔۔" وہ تنکھی نگاہ مہر ماہ پر ڈال کر لمحہ بھر کو رکھا پھر کاٹ دار لہجے میں بولا۔

"یہ آپ کے دشمنوں کی بیٹی ہے۔ مہر ماہ بھک سے اڑی۔ کیا تعارف کروایا تھا موصوف نے۔

"میرے دشمن۔۔۔؟ مگر میرا تو کوئی بھی دشمن نہیں ہے بیٹا۔" وہ ان کا ہاتھ تھام کر بستر کی طرف بڑھا۔

"آپ اب یہیں رہیں گی تو میں آپ کو آہستہ آہستہ آپ کے سب دشمنوں کے بارے میں بتاتا رہوں گا۔" انہیں بستر پر بٹھایا۔

"فضول بائیں مت ڈالوان کے ذہن میں موحد۔" وہ ناگواری سے بچنے لہجے میں بولی۔ موحد پلٹ کر تنکھی نظروں سے مہر ماہ کو دیکھنے لگا۔

"تو کیا غلط ہے اس میں۔ لیکن اگر تم دوسرا تعارف ہی کروانا چاہتی ہو تو میں وہی کروا دیتا ہوں۔" اس نے چپا چپا کر کہا تھا۔ مہر ماہ چپ رہ گئی اب وہ کون سا اتنا معتبر تعارف تھا کہ مہر ماہ اس کے حوالے سے پیچھے جانے کی یقینی ہوتی۔

"اس گھر میں ان کی حیثیت کا تعین کرنا ہے موحد۔۔۔۔۔ یقین کر دو وہ مجھے طلاق دینے پر آمادہ ہے۔" کچھ سوچ کر وہ جوش سے بولی تو موحد بیزار نظر اس پر ڈال کر گہری سانس بھرتا زرنکار کو دیکھنے لگا۔ ان سے انسیت کی پھونتی شعاعوں کو وہ محسوس کر سکتا تھا۔ آغا جان کو بتانا ناگزیر تھا سہیل آفندی نے اس بار پہل کی۔ ان کو تو سب کچھ ہاتھوں سے جاتا محسوس ہو رہا تھا۔ آغا جان پہلے تو بے یقینی کے عالم میں بیٹھے رہ گئے پھر اتنی اونچی آواز میں دھاڑے کہ آفندی ہاؤس کے درود یوار لرز گئے۔

"اور تم۔۔۔ تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوا موحد۔۔۔ شمرہ؟" جانے وہ غصے میں زیادہ تھے یا یقینی میں۔ موحد سینے پر بازو لپیٹے خاموش کھڑا رہا۔ اس سوال کا جواب شمرہ نے دیا تھا۔

"مجھے آج سے پندرہ سال پہلے بھی کوئی اعتراض نہیں تھا آغا جان! ان کے تحمل سے دیے گئے جواب نے آغا جان کے ضبط و برداشت کی دھجیاں اڑا دیں۔

"مگر مجھے یہ اعتراض۔۔۔ آج سے پندرہ سال پہلے بھی تھا اور آج بھی ہے اسی شد و مد ہے۔"

پھر انہیں مہر کی خبر لینے کا دھیان آیا۔ وہی لڑکی اس سارے فساد کی جڑ ثابت ہو رہی تھی۔

"مہر وہاں ہے میں اس سے پوچھوں۔ کہاں سے یہ فتنہ اٹھا کر گھر لے آئی ہے وہ؟"

"نا مساعد حالات سے گزر کر وہ دوبارہ آپ کے در پر آئی گئی ہے آغا جان تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ چاہتا ہے ہم لوگ پندرہ سال پہلے ہوئی غلطی کا مداوا کر لیں۔ اور اللہ جب غلطی کا مداوا کرنے کا موقع دیا کرتا ہے تو وہ بڑے نصیب کی بات ہوا کرتی ہے۔"

"غلطی۔۔۔۔۔؟" انہوں نے پھلتی سانسوں کے ساتھ گرج کر یوں دہرایا جیسے اس لفظ کا نام پہلی بار سنا ہو۔ پھر تنفر سے بولے۔

"آغا ذوالفقار نے آج تک کوئی غلط فیصلہ نہیں کیا ہے۔"

"ایسے آغا جان (بہت ہو گیا)۔۔۔۔۔ اتنی دیر سے چپ کھڑا پوتا بیزاری سے بولا بھی تو کیا۔

"مہر ماہ آج بھی نمیر آفندی کے نکاح میں ہے اور یہ بات ہم سب جانتے ہیں۔ اس نے مجھ سے شادی پر ہامی بھر کر صرف آپ کے غلط فیصلے سے بچنے کی کوشش کی ہے۔ اب اگر وہ اس طرح نمیر سے چھٹکارا پانا چاہتی

ہے تو کیا مضائقہ ہے؟"

"تو یہ سب ڈراما کیا تھا تم لوگوں نے؟" ان کے اعصاب کو جھٹکا لگا۔

"آپ اسے جو بھی سمجھیں۔ لیکن الحمد للہ ہم لوگ نکاح پر نکاح کو حرام ہی سمجھتے ہیں آغا جان! اگر اس وقت آپ مہر ماہ کا" کہیں بھی "رشتہ کر دینے پر تلے ہوئے نہ ہوتے تو میں بھی موحد کا نام اس دوسرے نکاح کے لیے پیش نہ کرتی۔"

آغا جان چند لمحوں کے لیے تو کچھ کہنے سے ہی معذور ہو گئے گویا۔

"بہت خوب۔۔۔" چند لمحے لگے تھے انہیں سنھلنے میں۔

"تو اب آغا کو اس طرح ایک سائڈ پر لگایا جائے گا۔"

"صرف اس لیے یہ قدم اٹھایا کہ جس طرح ہم مہر ماہ کے پہلے نکاح کی حرمت کا احساس کرتے ہیں اور کوئی

نہ کرتا آغا جان۔" شمرہ کا حوصلہ قابل دید تھا۔ اتنی بات اور کوئی بہو آغا جان کے سامنے نہ کر پاتی تھی۔

"بکواس بند کرو اپنی۔۔۔ تم۔۔۔ تم لوگ آغا کو بے وقوف بناتے رہے ہو۔۔۔ اور آج اس گناہوں کی پوٹلی کے غلط قدم پھر سے میرے گھر میں آ گئے۔ گولی مار دوں گا میں مہر کو بھی۔ قصہ ہی تمام ہو اس نکاح کا۔ مگر اپنی برسوں کی بنائی عزت پر داغ نہیں لگنے دوں گا۔"

"عزت اللہ بنایا کرتا ہے آغا جان۔ نمیر کی قسمت میں اس گھر کا داماد بننا لکھا تھا۔ اس کی قسمت میں تھا کہ آپ کی پوتی اس کی بیوی بنے۔ اب اگر اس کی قسمت میں یہ زمین و جاہیں ادا بھی ہے تو ہم تو کیا کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا" موحد کالب دلچہ پر پیش تھا۔ آغا جان کا تو پورا وجود ہی بھڑبھڑ جلنے لگا۔

"ابھی میں زندہ ہوں موحد! اور میرے جیتے جی وہ املاک میں حصہ داری کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔"

"بہر حال۔۔۔ میں نمیر آفندی کا قصہ ختم کرنا چاہتا ہوں۔" موحد کا انداز قطعی تھا۔

"اس کی ماں اس گھر میں آ گئی ہے۔ تو وہ بھی اس کے پیچھے آئے گا آغا جان! تب یہ سب حساب اسی سے چکنا کر لیجئے گا۔ اس کی منکوحہ ہے یہاں۔"

"تو یہ بات تمہیں مہر سے نکاح کرواتے وقت معلوم نہیں تھی کیا۔؟ پھر کیوں تم اس معاملے میں آئے۔ میں کہیں بھی اس کی شادی کروا دیتا۔"

"اسی مزید خطا سے بچایا ہے آپ کو آغا جان۔" موحد نڈر ہو کر بولا۔

"موحد۔۔۔۔۔" آغا جان بولے نہیں دھاڑے اور ساتھ ہی ان کا ہاتھ اٹھا مگر موحد اپنی جگہ سے ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹا شمرہ نے ہی بے اختیار اس کا بازو تھام کر اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔

"اب تم لوگ مجھے بتاؤ گے کہ غلط کیا ہے اور سچ کیا ہے۔"

"اب وہ بمبیں رہیں گی۔ جب تک یہ معاملہ ختم نہیں ہو جاتا۔" موحد نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "ورنہ ان کے ساتھ پندرہ سال پہلے کی طرح ہم بھی دوبارہ اس گھر سے نکلیں گے آغا جان! لیکن اس بار بھی واپس نہ آنے کے لیے۔"

وہ دونوں ماں بیٹا جا چکے تھے۔ آغا ذوالفقار اپنی کرسی پر ڈھسے سے گئے۔ ان کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ تو کیا ان کے مات کھانے کے دن آ گئے تھے۔ انہوں نے اپنے داہنے ہاتھ کو اٹھا کر دیکھا۔

"تو کیا یہ ہاتھ اب کمزور ہو گئے ہیں۔ جنہوں نے پوتے پر اٹھنا گوارا نہیں کیا۔ ایسی کمزوری تو میں نے وقار آفندی کی بار بھی محسوس نہیں کی تھی" ان کا ذہن سنسنار ہا تھا۔

"کہہ تو ٹھیک ہی رہا ہے موحدوہ سامنے آئے گا تب ہی تو یہ تماشا ختم ہوگا۔ ورنہ تو یونہی آنکھ چھوٹی چلتی رہے گی ساری عمر۔ اور سزا۔۔۔ میں خود سخت سزا دوں گا اسے۔ دنیا تماشا دیکھے گی اس کا۔" انہوں نے پتے ذہن کو مثبت کرنا چاہا تو بلند فشار خون کو واپس اپنی جگہ پر آنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔

"آغا جان! آپ کل کے اس بچے سے مات کھا گئے۔ اس کی بکواس پر غور مت کریں۔ یاد نہیں شمرہ اور فاران بھی ایسے ہی وقار کی حمایت کیا کرتے تھے۔ انہیں تو شروع ہی سے اس گنبدی کا احساس نہیں تھا جو وقار نے اپنے دامن پر سجالی تھی۔" سہیل آفندی کے منہ میں سارہ چچی کی زبان بول رہی تھی ورنہ آغا جان کے سامنے بات کرنے کی ان کی مجال نہیں ہوتی تھی۔

"میں کمزور نہیں ہوا سہیل! مسئلہ صرف یہ ہے کہ مجھے فاران کے بیٹے سے محبت بہت ہے۔ شاید اس لیے کہ اصل سے سو زیادہ پیارا ہوتا ہے۔ اللہ نے ایک ہی پوتا دیا ہے اسی لیے اس کی نادانیاں نظر انداز کر دیتا ہوں" انہوں نے پتا نہیں کس رو میں اعتراف کر لیا تھا۔ مگر پھر ایک دم چپ سے ہو گئے۔

"کیا اب نمبر کا حوصلہ نہ بڑھے گا کس دیدہ دلیری سے اس نے اس گھر میں اینٹری دی ہے۔ مہرماہ سے نکاح کر کے شب خون مارا اور اب اپنی ماں کو بھیج دیا۔ اور میں تو مہرماہ کو بھی قصور وار کہوں گا آغا جان! اب کیا ہم اتنے کمزور ہو گئے ہیں کہ اس بے نام و نشان شخص کے ہاتھوں بلیک میل ہوں گے۔"

"تھوڑا ہی وقت ہے سہیل! غصہ تو مجھے بھی بہت آیا تھا مگر پھر سوچا کہ ایک بار اس شخص کو سامنے آ لینے دو پھر سارے حساب کتاب پچھتا ہو جائیں گے۔" آغا جان نے د بنگ لہجے میں کہا۔

"تو پھر موحدوہ اور شمرہ بھابی کو مہرہ کے نکاح کا ڈراما کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" وہ جھلبلا کر بولے۔ آغا جان نے ہنکارا بھرا۔

"جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب تو اس وقت کا انتظار ہے جب یہ سارا ڈراما ختم ہوگا۔"

آغا جان کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ اب اس معاملے پر مطمئن تھے۔ سہیل آفندی دل مسوس کر رہ گئے۔ مگر کمرے میں آتے ہی سارہ چچی شروع ہو گئیں۔

"بس آپ اسی طرح سر جھکا کر باتیں سن کر آ جایا کریں سب کی۔ ایک موحدوہ آفندی کم تھا جواب نمبر کی اماں کو لے آئی مہرہ۔ مجھے تو۔۔۔ لگتا ہے کہ مہرہ بھی اس سارے کھیل کا حصہ ہے۔"

"خدا کو مانو۔ وہ بے وقوف تھی جو اپنی اچھی بھلی زندگی برباد کر لیتی۔"

"ساری عمر لگا دی آپ نے اس کا رو بار پر۔ ایک پوتے کو تو پہلے ہی آغا جان نے سر آنکھوں پر بٹھا لیا۔ دوسرے کو بھی کہیں سینے سے لگالیا تو آپ تو بس ہاتھ ہی ملتے رہ جاتیں گے۔" چچی جان نے منٹوں میں سارا تجزیہ کر کے رکھ دیا تھا۔

"اری نیک بخت! ذرا دم تو لو۔ ایک تو تم عورتوں کی فکریں بھی نا، وہ جھجھلا گئے۔ اپنی ہمت تو اتنی تھی ہی نہیں۔ بیوی کے ہمت بندھانے پر ہمت کر بھی لیتے تو دلائل میں اتنا دم نہیں ہوتا تھا کہ آغا جان کو اپنی سوچ پر ڈھال لیتے۔"

"زرنگار کو جس طرح شمرہ نے سینے سے لگایا ہے میں تو حیران رہ گئی۔ ویسے صدیقہ بھابی کا غرور اللہ نے اچھی طرح توڑا ہے۔ جس کو بے نام و نشان ہونے کے طعنے دیتی رہیں وہی ان کا داماد بن گیا۔"

"اللہ کی پناہ مانگو سارہ! بہت کڑا امتحان پڑا ہے ان پر۔"

"ہونہہ۔۔۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔۔۔ اب تو موحدوہ بھی میں ہے ان کی۔ داماد ہے جب اور جتنا جی چاہے

نکلوائیں اس سے۔ "وہ ٹھنڈی آہ بھر کر بولیں۔
 "اب ایسی بھی لوٹ نہیں چکی ہوئی۔ وہ کل کا بچہ سی مگر اس نے بزنس کو رشتہ داری سے بالکل الگ رکھا ہوا ہے۔" انہوں نے باور کرایا تو وہ بڑبڑاتے ہوئے بیڈیٹ بھٹکے لگیں۔

☆☆☆

"یہ لو۔۔۔۔۔" موحد نے کاغذات کی ایک فائل دراز سے نکال کر ٹیبل کی سطح پر پھینکی۔ اس کے مقابل بیٹھے شخص کی آنکھوں میں حیرت ابھری۔ اس نے بے اختیار آگے جھک کر وہ فائل اٹھا کر کھولی اور پھر اختیاراً موحد کو دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیلی۔

"میں اپنے وعدوں کا بہت پکا ہوں الحمد للہ۔"

"میں جانتا ہوں۔"

"تم نے بہت ساتھ دیا ہے میرا۔ تمہارے بنا کچھ بھی ممکن نہیں تھا۔" موحد نے کھلے دل سے اعتراف کیا۔
 "تم اب بھی کسی موقع پر مجھے پیچھے نہیں پاؤ گے۔" وہ اٹل انداز میں بولا۔ تو موحد کچھ سوچ کر ذرا آگے کو جھکا۔

"اور۔۔۔۔۔ اور کچھ؟ کسی اور معاملے میں میری فیور؟"

وہ چونک کر موحد کو دیکھنے لگا۔ (وہ کیا پوچھنے کی کوشش کر رہا تھا) اس نے سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے ہلکا سا نفی میں سر ہلایا اور فائل اٹھا کر مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔
 "ایک بار پھر بہت شکریہ۔" موحد نے مسکراتے ہوئے ریوالونگ چیئر سے ٹیک لگائی اور ہلکے ہلکے جھولتے ہوئے محظوظانہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"میری آفر لانگ ٹرم (لمبے عرصے کے لیے) ہے۔ تم جب چاہو اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہو۔" باہر نکلتے ہوئے اس نے اپنے پیچھے موحد کی مسکرائی ہوئی آواز سنی تھی۔ اس کے قدم ایک بار پھر ٹھٹھکے مگر وہ روکا نہیں تھا۔

☆☆☆

آغا جان نے زرنگار کو اس کے بیڈروم تک محدود رہنے کا حکم دیا تھا (جہاں اب مہر وان کے ساتھ شفٹ ہو گئی تھی)

سومیرہ دروازہ کھٹکھٹا کر اندر آئی تو زرنگار کے بالوں کو برش سے سلجھاتی مہر ماہ چونکی۔

"اسلام و علیکم۔۔۔۔۔ کیسی ہو؟" مہر ماہ اٹھ کر خوش دلی سے ملی۔ مگر وہ یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی جب سومیرہ زرنگار سے مکمل کر بڑی بے تکلفی سے ان کا حال پوچھنے لگی۔ جیسے پہلے بھی ان سے ملتی رہی ہو۔
 "تم۔۔۔۔۔ انہیں جانتی ہو؟" مہر ماہ سے رہا نہیں گیا تو حیرت اور بے یقینی سے پوچھ ہی لیا سومیرہ جھٹکی۔ دفعۃً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ یہاں نمیر کی دوست نہیں بلکہ موحد آفندی کی کزن کی حیثیت سے آئی تھی۔ اس کا زرنگار سے التفات مہر ماہ کو تو اٹھانا ہی تھا۔

"بھئی یہ آئی تمہارے کمرے میں ہیں تو تمہاری کچھ لگتی ہی ہوں گی نا۔" وہ سنبھل کر مسکرائی۔

"یہ بھی میری چچی ہیں۔"

سومیرہ نے ہونٹ سکیڑے۔

"نمیر کی والدہ۔"

مہر ماہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"گڈ ڈسین (اچھا فیصلہ)"۔

مہرماہ نے ان کے بال چٹیا میں لپیٹے اور انہیں لینے کا کہہ کر سومیہ کے ساتھ شہرہ کے کمرے میں آگئی۔
"موحہ کیسا ہے؟" اس کے پوچھنے پر مہرماہ کو یاد آیا شاید وہ موحہ کو پسند کرتی تھی مگر درمیان میں مہرماہ آگئی تو وہ سلسلہ وہیں منقطع ہو گیا تھا۔

"ٹھیک ہی ہوگا! مہرماہ نے شانے اچکائے۔" "میرا اس سے کیا واسطہ"۔
"ظاہر ہے جیسے حالات جارہے ہیں اس سے واسطہ ہو بھی نہیں سکتا"۔ سومیہ نے سمجھ کر سر ہلایا۔

"لیکن زندگی ایسے بھی تو نہیں گزر سکتی نا"۔ اس نے مہرماہ کو گہری نظر سے دیکھا۔
"بس اب تھوڑا ہی وقت رہ گیا ہے۔ ایک بار آغا جان میر کو اپنا خون تسلیم کر لیں تو پھر میں آزاد ہو جاؤں گی"۔ وہ پر امید تھی۔
"تمہارا کیا خیال ہے تمہارے آغا جان اس کی حیثیت تسلیم کر لیں گے؟" مہرماہ نے اس کی بات پر سوچ کر نفی میں سر ہلایا۔

"لیکن تم یہ کام بہت آسانی سے کروا سکتی ہو مہر! سومیہ نے آہستہ سے کہا مہرماہ بری طرح چونکی۔
"میں۔۔۔ مجھے تو پہلے ہی آغا جان نے اس پورشن تک محدود کر دیا ہے"۔
"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ اس طرح تمہیں اپنی من مانی کا موقع مل سکتا ہے"۔
"جتنی من مانی کر چکی ہوں نا۔ شکر ہے اسی پر آغا جان نے گولی نہیں ماری"۔ وہ اداسی سے بولی۔
"میرے خیال میں تو بس تم ہی ہو جو میر کو اس گھر میں اس کی حیثیت دلا سکتی ہو"۔
"میں۔۔۔؟"۔ میں تو بس اس انتظار میں ہوں کہ کب اس بندے سے میری جان چھوٹے۔ ایک بار بس وہ اپنے بل سے باہر نکل آئے۔ آغا جان سے اس کا سامنا ہو جائے۔" مہرماہ نے دعا کی۔
"ہو سکتا ہے وہ اتنا برا نہ ہو مہر! وقت اور حالات اکثر لوگوں کا منہ چہرہ دکھاتے ہیں۔ مگر درحقیقت وہ خود زمانے کے ستارے ہوئے ہوتے ہیں"۔

"میں تو صرف یہ جانتی ہوں کہ اس نے میری زندگی کی خوشیاں چھین لیں مجھ سے۔ امتحان بنا دیا ہے میری زندگی کو۔ بنا قصور کے سزا دی ہے اس نے مجھ"۔

"اللہ ہم میں سے کسی ایک کو چن لیا کرتا ہے آزمائش کے لیے مہر! اور وہ اللہ کا بہت پیارا بندہ ہوتا ہے"۔
"کاٹ تو رہی ہوں آزمائش۔ بنا کسی قصور کے"۔ وہ خفگی سے بولی۔
"میرا تو مخلصانہ مشورہ ہے مہر! اس کی زنجی انا کو تسکین کسی کے ہمدردانہ رویے سے ہی مل سکتی ہے۔ اور تم مانویانہ ناؤم تم سے زیادہ قریبی رشتہ اور کسی کا نہیں اس کے ساتھ فی الحال"۔
"کیسی ناممکن باتیں کر رہی ہو سومیہ۔۔۔ نفرت ہے اس شخص سے مجھے۔" وہ خفت سے لال ہوتا چہرہ لیے خفگی سے بولی۔

"بعض لوگوں سے مل کر ہی یہ حقیقت کھلتی ہے کہ درحقیقت وہ" کس قابل "ہیں مہر! سومیہ آخری بات کر کے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ مہرماہ ابھی ہوئی ہی اس کے ساتھ دروازے تک آئی۔
"کسی بھی بھٹکے ہوئے انسان کی واپسی کا راستہ بند نہیں ہوا کرتا مہرماہ! بعض اوقات بھٹکے ہوئے لوگ کسی اپنے کی آواز کے منتظر بھی ہوتے ہیں۔ مگر مخلص شرط ہے۔"
سومیہ چلی گئی تھی مگر اس کی آخری بات مہرماہ کے ذہن پر ابھی تک دستک دے رہی تھی۔



موحد آفس جانے سے پہلے زرنگار کو الوداعی طور پر ملنے اور حال پوچھنے آیا تھا۔ انہوں نے حسب عادت بتا بیچانے بے ریا سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ دروازے کی طرف مڑا تو مہرماہ کی طنزیہ آواز نے قدم روک لیے۔

"میری ساس کے ساتھ تمہارے اس قدر التفات کی وجہ پوچھ سکتی ہوں؟" اپنی طرف سے اس نے بہت کڑا طنز کیا تھا۔ موحد ایڑیوں پر گھوم کر اس کی طرف مڑا۔ ابو کو استفہامیہ اچکا یا۔ پھر چبا کر بولا۔

"میرے خیال میں ان سے میرا بھی ایک الگ سے رشتہ ہے مہرماہ آفندی!" پھر جیسے وہ ٹھنڈا بڑا کچھ سوچ کر۔
 "ویسے اچھا لگا یہ جان کر کہ تم اپنے اور ان کے "اصل" رشتے کا تعین کر چکی ہو "مہرماہ پر تو جیسے کسی نے ایک لخت ٹھنڈا پانی انڈیل دیا ہو۔ موحد کے ہونٹوں پر آئی محظوظ — مسکراہٹ نے اس کا خون کھولا دیا۔

"شٹ اپ۔۔"

"شکریہ"۔ وہ تعظیماً ہلکا سا جھکا اور یونہی مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔ مہرماہ کا جی چاہا سر دیوار پر دے مارے۔ اپنی زبان کو بھی کو سا ضرورت ہی کیا تھی اس کھڑوس کے سامنے بولنے کی۔

اس نے انتقامنا سومیہ کی کبھی باتوں کو پھر سے سوچنا شروع کر دیا۔ جورات ہی سے بار بار اس کے ذہن کے کواڑ کھٹکتا رہی تھیں۔

"زندگی تمہاری برباد ہوئی تھی مہر! لیکن اس کے بعد نہ تمہارے والدین نے تمہیں اس طرح سپورٹ کیا جیسے کرنا چاہیے تھا اور آغا جان نے بھی تمہارے زخموں پر پھاپا رکھنے کے بجائے نمیر سے اپنی دشمنی نبھانا زیادہ ضروری سمجھا۔"

سومیہ کا لب و لہجہ ہمدردی لیے ہوئے تھا۔

"نمیر سے بات کرو۔۔۔ تم چاہے اسے ساری عمر معاف مت کرنا۔ مگر بددلی کے ان چودہ سالوں کے زخم تو دیکھ لو اس کے وجود پر۔ پھر شاید وہ بری بھی ہو جائے تمہاری عدالت سے۔"

اس نے گہری سانس بھر کر یاسیت سے ایک ہی جگہ بت بنی بیٹھی زرنگار کو دیکھا۔ یہ عورت اسے بہت قابل ہمدردی لگی تھی۔

طوائف۔۔۔ ناچنے گانے والی۔۔۔۔۔ یہ سب تو محض زمانے کے دیے ہوئے نام ہی ہوا کرتے ہیں۔ کبھی کوئی ان کی آنکھوں میں سے ان کی روح میں جھانکنے کی سعی کرے تو کیا کیا روح پرور کہانیاں ملیں۔ مہرماہ کا ذہن الگ ہی اڑان بھر رہا تھا اگرچہ دل اس پر مطمئن نہیں تھا۔ مگر اس کے دماغ میں گونجتی آوازیں۔۔۔

"اگر تمہیں اس معاملے پر منصف بننا ہی دیا گیا ہے مہر! تو دوسری طرف کا دکھ بھی سن لینا فیصلہ کرنے سے پہلے۔ ہو سکتا ہے اس کے زخم تم سے زیادہ گہرے ہوں۔"

مہرماہ نے جھک کر آنکھیں موند لیں۔



موحد کا برتھ ڈے شرہ چچی بہت اچھی طرح سیلبریٹ کرنا چاہتی تھیں۔ تو گھر میں ایک بہت خوش گواری ہلچل پھیل گئی۔ اب تو ترس ترس کر اس گھر میں خوشیاں آئی تھیں۔

"کوئی بھی موحد کو مت بتائے۔ اسے بھی سچی یاد نہیں رہتا" انہوں نے مسکراتے ہوئے سب کو تنبیہ کی

تھی۔ اور اب تجھے تحائف خریدنے اور چن کا مینو ترتیب دینے کا کام شروع ہو چکا تھا۔
 "آپنی! تم کیا دے رہی ہو موصد بھائی کو؟" ملاحہ نے مسکرا کر پوچھا۔ مہرماہ نے نگاہ غلط انداز اس پر ڈالی۔
 "ہر چیز پر تو آتے ہی قابض ہو گیا ہے تمہارا موصد" بھائی "اب اس کی شایان شان کوئی اور چیز ہو سکتی ہے کیا؟"

"آپنی۔۔۔۔" ملاحہ نے احتجاجا کہا۔
 "جب اللہ بن مانگے خوشی کے چھوٹے چھوٹے مواقع دے رہا ہو تو اپنی قنوطیت کو چھوڑ کر خوش ہو لینے میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔"

"اچھا بھئی۔۔۔۔ لے لیں گے تاج محل کا مجسمہ تمہارے موصد بھائی کے لیے۔ اب خوش؟" مہرماہ جس طرح اکتا کر بولی اس پر ملاحہ خوش تو کیا ہوتی، جل بھن کر وہاں سے اٹھ ہی آئی۔
 (بھلا مجھے ان خوشیوں سے کیا مطلب) وہ یاسیت زدہ ہو رہی تھی۔
 کوریڈور سے گزرتی ملاحہ کے قدم کبیر کو آغا جان کی اسٹڈی سے نکلنے دیکھ کر سست پڑے تو وہ کھل کر مسکرا دیا۔
 "کیسی ہیں؟"

"بہت پیاری۔۔۔" ملاحہ نے ذرا سی ناک چڑھائی اور زور دے کر بولی۔ "تم سناؤ تم کیسے ہو کبیر خان! اور اتنے کم کم کیوں نظر آتے ہو آج کل؟" اس کی ادا پر کبیر بے ساختہ ہنسا۔ پھر محظوظ ہو کر بولا۔
 "آپ کے اول دعوے سے تو قطعاً اختلاف نہیں کروں گا۔"
 "اور وہ کم کم نظر آنے والی بات؟" وہ گردن اٹھا کر بات کرتی تھی۔ آنکھوں کو مخصوص انداز شاہانہ سے جنبش دے کر۔ کبیر کے جی میں آئی کہ دل تھام لے۔

"زیادہ زیادہ دیکھنے کے کیسے کچھ جملہ حقوق ہوتے ہیں ملاحہ آفندی! بس وہ کبیر خان کے نام کرنے ہوں گے۔ پھر آپ کی یہ شکایت دور ہو جائے گی۔" بے اختیار بولا تو ملاحہ کی تمام طراری اس کے لفظوں کی گہرائی سمجھ کر پہلے تو تجالت میں بدلی پھر چہرے سے نکلتی پیش اور کبیر خان کی شوخ نگاہ پر فی الفور اڑ پھو ہو گئی۔ وہ اس کی چپ بھانپ کر کوریڈور کا دروازہ کھولتا باہر نکل گیا تو زیر لب ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔
 "اف۔۔۔" ملاحہ نے قدرے حیران ہو کر تپتے کالوں پر دونوں ہتھیلیاں جمائیں۔

"تو اب میں کبیر خان سے شرمایا کروں گی۔۔۔ اللہ اللہ۔۔۔" پھر دھیرے سے ہنس دی۔ تائی جان جو دور سے اپنے کمرے کے ادھ کھلے دروازے کی جھری سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔ انہیں کبیر اور ملاحہ کی ایک بھی بات کی سمجھ نہ آئی تھی مگر ان کا بے تکلفانہ انداز اور بے وجہ سر راہ گفتگو۔۔۔۔۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بستر پر گر سی گئیں۔ رنگت منٹوں میں سفید پڑ گئی تھیں۔

(میرے اللہ۔۔۔ ایک بیٹی بے خبری میں برباد ہو گئی اور دوسری جان بو جھ کر کچھڑ میں منہ مارنے والی ہے؟؟)
 ان کی سوچ میں وہی پندرہ برس پہلے والی گراوٹ ہی تھی۔ انسانوں کو انسان نہ سمجھنا۔ مگر یہ اللہ ہی ہے جو بندے کو سارے رنگ دکھایا کرتا ہے۔

وہ ملاحہ کی اچھی طرح ٹھنپائی کا سوچ رہی تھیں۔
 "شاید ان کے درمیان ایسا کچھ نہ ہو مگر جیسے میرا دل ڈر گیا ان کو بے تکلفی سے بات کرتے دیکھ کر ایسے کسی اور کو بھی تو غلط نہیں ہو سکتی ہے۔ میں اس ملاحہ کی تو خبر لوں گی ہی۔ مگر کبیر کا انداز آنا جانا بھی بند کروانا پڑے گا۔" وہ مضطرب دل کو تاویلیں دے رہی تھیں۔

آپ کو پتا ہے آپ کا ایک بیٹا بھی ہے؟" مہرماہ چاہتے ہوئے بھی زرنگار سے نفرت نہ کر پائی تھی۔ شرہ اسے وقار آفندی اور زرنگار کی ساری کہانی سنا چکی تھیں۔ اب ایسے میں بھی وہ زرنگار سے نفرت کا رشتہ قائم کر لیتی تو یہ واقعی ظلم ہوتا۔

"ہاں۔۔۔ وہ کہتا تو تھا۔ جو مجھ سے ملنے آتا تھا۔" وہ بے نیازی سے بولیں۔ مہرماہ کا دل زور سے دھڑکا۔
"آپ اسے پیچھا پتی ہیں؟"

"ہاں۔۔۔ جس سے ملیں اس کی پہچان تو ہو ہی جاتی ہے۔" وہی لاپرواہ سا انداز۔
"کیا نام تھا اس کا بھلا۔۔۔؟" مہرماہ کے سوال پر ان کی سیاہ آنکھیں سوچ میں ڈوب گئیں۔
"وہ بتاتا تو ہے ہر بار آکر۔ مگر مجھے یاد نہیں" قدرے سوچ کر وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولیں۔ مہرماہ مایوس ہوئی۔ مگر پھر بھی اس نے آخری کوشش کی۔

"نمیر۔۔۔ نمیر آفندی۔ یہی نام بتاتا تھا نا وہ؟"
مہرماہ کو کمرے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی مگر وہ پلٹے بنا زرنگار کو منتظر نگاہوں سے دیکھتی رہی۔
"پتا نہیں۔۔۔ یاد نہیں مجھے" وہ بولیں پھر دروازے کی طرف نگاہ کی تو بھینسا خستہ مسکرا دیں۔
"لو۔۔۔ آگیا وہ۔ تم اسی کا پوچھ رہی تھیں نا۔"

مہرماہ کا دل پوری قوت سے جھٹک کر پھیلا۔ اس نے لمحے کے برابر دس جھپٹوں میں چہرہ موڑ کر نا صرف مضطربانہ انداز میں۔ دروازے میں موجود شخص کو دیکھا بلکہ اسپرنگ کی طرح اچھل کر کھڑی ہو گئی۔

ملاحظہ چائے لے کر آئی تو بہت خوش گوار موڑ میں تھی۔ گرم سویٹر پر خوش رنگ شال اوڑھے وہ جلدی میں تھی۔
"تم کہاں جا رہی ہو؟" تانی جان نے سنجیدگی سے بیٹی کا چہرہ ٹٹولا۔ وہاں وہی معصومیت بھی ہمیشہ والی۔
"میں اور فرزین مارکیٹ تک جا رہے ہیں سو حد بھائی کا برتھ ڈے گفٹ لینا ہے"
"کس کے ساتھ۔۔۔؟" انہوں نے بیٹی کا چہرہ نگاہوں میں رکھا۔

"کبیر کے ساتھ امی! اور کون ہے بھلا؟" وہ مسکرائی تو اس کی مسکراہٹ اور آنکھوں میں اتنا نرم سا تاثر تانی جان کی جہانمیدہ نظروں سے چھپا نہ رہ سکا تھا۔ نوجوانی کی سرخی اس کے کشمیری سیب کے سے گالوں پر چھلک رہی تھی۔ اور کچھ شاید محبت کا اعجاز ہو۔

"کوئی ضرورت نہیں جوان جہان لڑکیوں کو تنہا جانے کی" انہوں نے سختی سے کہا۔ تو ملاحظہ حیران ہوئی۔
"امی! کبیر ساتھ ہے ہمارے۔"

"تو وہ بھی تو ڈرا بیورو رہی ہے نا۔" انہوں نے جانے کیا جتنا یا شاید اسے باور کرانا چاہا۔ ملاحظہ کا دل مٹھی میں جکڑا گیا۔

"کل میں خود چلوں گی تمہارے ساتھ۔ مگر ایسے اکیلے نہیں جانا تم دونوں نے۔"
"کیا ہو گیا ہے امی۔۔۔ کبیر کے ساتھ میں اور فرزین ہیں۔ تین بندے اور پھر بھی اکیلے؟ یہ اچھی سائنس ہے۔" ملاحظہ تو کبیر کے لیے ان کے منہ سے ڈرا بیورو کا لقب سن کر ہی جزبہ زور ہی تھی۔ احتجاج کرنے لگی۔
"ملاحظہ۔۔۔" انہوں نے سنجیدگی سے اسے ٹوک دیا۔ "اب کیا یہی بات آغا جان کہیں گے تب مانو گی؟"

ملاحظہ دنگ سی انہیں دیکھنے لگی۔ جب سے کبیر خان اس گھر میں آیا تھا، ایک فیملی ممبر بن کر رہ رہا تھا۔ گھر کے

اندر اس کا آنا جانا گھر کے افراد کی طرح ہی تھا۔ کوئی پردہ نہیں کوئی پابندی نہیں تو آج کیا نیا ہو گیا تھا۔؟ ملاحہ کا ذہن کھٹک سا گیا۔

"میں آپ کے ساتھ چلی جاؤں گی امی۔۔۔ مگر یہ مت کہیے گا کہ کبیر خان قابل اعتبار نہیں ہے۔" ملاحہ بے اختیار ہو کر بولی تھی۔ انہوں نے بچتی نگاہ بچی پر ڈالی۔ جو کل تک انہیں بچی لگا کرتی تھی۔ مگر اس کی ایک پل کی بے اختیاری نے اس کا سارا اندر کھول کر ماں کے سامنے رکھ دیا تھا۔

"وہ بس اتنا ہی قابل اعتبار ہے کہ ایک بار مہر دہی اسی کے ساتھ گئی تھی اور وہ اپنی اتنی سی ذمہ داری بھی نہ نبھاسکا تھا۔ میری بیٹی کی زندگی برباد ہو کر رہ گئی۔"

"تو یہ بات آپ کو آج یاد آتی ہے امی! ملاحہ نے مارے صدمے کے چھتا ہوا سوال کیا۔
 "تمہیں کس بات پر اعتراض ہے ملاحہ! کبیر کے ساتھ جانے سے منع کرنے پر یا اسے ناقابل اعتماد سمجھنے پر؟" وہ بہت ضبط کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ملاحہ کھل کر ان کے سامنے آجائے۔
 "مجھے ہر بات پر اعتراض ہے امی! کبیر کو اس گھر۔۔۔ میں کبھی ڈرائیور نہیں سمجھا گیا۔ وہ آغا جان کے دوست کا پوتا ہے۔"

"مگر ہمارا ایک ادنیٰ ملازم ہے ملاحہ۔" تائی جان نے یاد دلایا تو وہ سختی سے لبوں کو بھینچتی بنا کچھ کہے باہر نکل گئی درحقیقت اسے رونا آرہا تھا۔ تو یہ حقیقت تھی گھر والوں کی نظر میں کبیر خان کی۔ اور وہ سنے تو۔۔۔۔۔

موحد کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ کر لمحہ بھر کے لیے تو مہر ماہ قوت گویائی سے محروم رہ گئی۔ پھر پلٹ کر زرنکار کو دیکھا۔ اور بے یقینی سے بامشکل پوچھ پائی۔

"یہ۔۔۔ یہ آپ کا بیٹا ہے؟"

زرنکار گویا پریشان سی ہو کر الٹا اس سے پوچھنے لگی۔

"نہیں ہے کیا؟"

مہر ماہ نے گہری سانس بھری۔

"تم کیا گفتیش کر کے پریشان کر رہی ہو ان کو" موحد اسے سرزنش کرتا ہوا آگے آیا۔

"تم۔۔۔ تمہیں اپنا بیٹا کہہ رہی ہیں یہ۔" مہر ماہ الجھی۔

"ہاں تو۔۔۔؟"

"تو یہ کہ۔۔۔۔۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ میری شکل تم سے ملتی جلتی ہوگی۔ آخر کو زرنکار زہتم دونوں! وہ قدرے جوش سے بولی۔ موحد زرنکار کے پاس بیٹھ گیا تھا۔ رسان سے پوچھنے لگا۔

"یعنی تم اس کی اسمارٹنیس کا اندازہ لگانا چاہ رہی ہو؟"

"ہیں۔۔۔۔۔؟" مہر ماہ ہوتی سی اس کا منہ دیکھنے لگی۔ پھر مطلب سمجھ کر خجل سی ہو کر اسی پر الٹ پڑی۔

"شٹ اپ۔۔۔۔۔ مجھے کیا لینا دینا اس خبیث شخص کی اسمارٹنیس سے۔"

"اچھا۔۔۔۔۔ میں سمجھا کہ۔۔۔۔۔ مہر ماہ نے اسے ٹوک دیا۔ "تم کچھ مت کہو اس معاملے میں سمجھے۔"

"یہ کیوں لڑائی کر رہی ہے تم سے؟" زرنکار پریشان سی ہو کر موحد سے پوچھنے لگیں تو مہر ماہ کو غصہ کنٹرول کرنا پڑا۔

"بیوی ہے ماں جی! اسے لڑنے کے لیے کسی وجہ کی کیا ضرورت! موحد نے اس قدر آرام سے توجیہ پیش کی کہ مہر ماہ تو اچھل ہی پڑی سن کر۔

"کس قدر بکواسی ہو تم موحّد!"

"دیکھا۔۔۔ زبان دراز بھی ہے۔ مگر میں صبر و شکر سے گزارا کر رہا ہوں۔" وہ معصومیت سے بولا۔ تو کچھ کہنے کو بے تاب زبان کو مہرماہ نے دانتوں تلے دبایا کہ موحّد کی زبان درازی کا مقابلہ کرنا اس کے بس میں واقعی نہیں تھا۔

"وہ ان سے ملتا رہا ہے موحّد! اگر وہ ان کے سامنے آئے تو شاید یہ اس کو پہچان لیں" مہرماہ سنجیدہ ہوئی۔
"تو۔۔۔؟" اگر وہ سامنے ہی آگیا تو ان کی گواہی کی ضرورت ہی کیا رہے گی؟ "موحّد نے شانے اچکا کر اس کی بات کو کھڈے لائن لگا دیا۔ وہ چپ سی ہو گئی۔

"اصل بات تو یہ ہے کہ اب میں خود بھی اس سے ملنا چاہتی ہوں موحّد!" وہ اتنی مدہم آواز میں بولی کہ موحّد کو لگنے میں غلطی ہوئی ہو۔

"طلاق لینے سے پہلے ایک بار میں اس کو سننا چاہتی ہوں۔"

وہ ساکت سا مہرماہ کو دیکھ رہا تھا جس کے تاثرات میں کوئی الجھاؤ اور الفاظ میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ اور موحّد آفندی یوں چپ ہوا جیسے اس کے پاس پوچھنے کو کچھ نہ بچا ہو۔

☆☆☆

"میرا خیال ہے کہ ملاح کے لیے آئے رشتوں کو اب اور نہ لٹکایا جائے" تائی جان کے تو اندر دو پہر سے کھد بد جاری تھی۔ میاں کے آتے ہی ان کو بتانا مناسب نہ لگا تو بات کرنے کے لیے رات سونے سے پہلے کا وقت چننا۔ اتنی دیر میں یہ بھی احساس ہو گیا کہ بیٹیوں کی اس طرح کی لغزشوں کو من و عن ان کے باپ کے سامنے پیش نہیں کیا جاسکتا تو پھر بہت لپیٹ کر بات کی۔ انہوں نے کتاب کھول کر عینک ناک پر لٹکتے ہوئے استعجاب سے بیوی کو دیکھا۔

"مگر تمہیں ہی تو اعتراض تھا کہ جب تک ملاح پڑھ کر فارغ نہیں ہو جاتی تب تک اس بات کو نہیں چھیڑنا۔"
"ہاں۔۔۔ کہا تھا۔ مگر مہر و کو دیکھ کر دل بہت ڈر گیا ہے میں صاحب! اللہ رحم کرے ہماری بیٹیوں پر۔ زمانہ بہت خراب ہے۔" وہ لرز کر بولیں۔

"تو پھر دیکھ لو میں کیا کہوں اب۔ مگر خاندان ضرور دھیان میں رکھنا لڑکے کا۔ ہر ایرے غیرے کے سامنے بیٹی کو پیش کرنے کی ضرورت بھی نہیں" انہوں نے گویا تائی جان کو فری ہینڈ دیا تو انہوں نے طمانیت محسوس کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلادیا۔

"یہ کبیر کب تک یہاں رہے گا؟ میرا مطلب ہے کہ اس کی بہنیں ہیں، کچھ اس کی شادی کا بھی سوچا ہو گا انہوں نے۔" جیسے انہیں دھیان آیا۔

"افوہ۔۔۔ تم نے کیا رات کے اس وقت میرج بیور کھول لیا ہے بیگم" وہ بد مزہ سے ہو کر صفحے الٹنے لگے تو وہ سر جھٹک کر رہ گئیں۔

☆☆☆

وہ موحّد کے لیے کوئی برتھ ڈے گفٹ نہیں لائی تھی۔ شام کو بال کمرے میں بڑا سا کیک اور دعوت کا اچھا خاصا ماحول دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ اسے ملاح کی بات مان لینی چاہیے تھی۔ اچھی خاصی آفری تھی کل اس نے تائی جان کے ساتھ مارکیٹ جاتے ہوئے۔ اور اب ملاح فرزین اور ثمرہ چچی نے اسے گفتگو دیئے تو وہ ہنس دیا۔
"واؤ۔۔۔ سر پرانزا!"

"ہیش کی طرح۔۔۔" شرہ کی مسکراہٹ پر اداسی کا رنگ غالب تھا۔

"میرا تو سب کچھ تمہارا ہی ہے۔۔۔ مگر پھر بھی۔ جو چاہیے وہ بتا دو ابھی کے ابھی مل جائے گا۔" آغا جان نے اس کے شانوں پر دونوں ہاتھ جماتے ہوئے اسے بالمقابل کیا تو وہ چند لمحے ان کو دیکھ گیا۔ آغا جان کا دل اس کی محبت سے معمور ہونے لگا۔ یہ شان دار سا پوتا ان کو اپنے تمام زخموں پر مرہم کی طرح لگتا تھا۔ وہ عجیب سے انداز میں مسکرا دیا۔

"آپ سے سب کچھ تولے چکا ہوں۔۔۔ مگر یہ تھخہ ادھار رہا آپ پر آغا جان۔ وقت آنے پر باتوں کا۔"

"وعدہ رہا۔ انکار کا لفظ نہیں سنا گئے آغا کی زبان سے۔" وہ داہنا ہاتھ اٹھا کر بولے شرہ نے مسکراتی نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔ یقیناً وہ بہت ذہن تھا۔ وقت کو اسے قابو میں کرنے کا کڑ جانتا تھا۔
موحد نے کیک کی طرف رخ کرتے ہوئے اچھتی نگاہ مہرماہ پر ڈالی جو بڑی لا پرواہی کا تاثر دیتی ملاحظہ سے باتوں میں مصروف تھی۔

"خواتین و حضرات! اب اگر کوئی اور تھخہ دینے والا رہ نہیں گیا تو میں کیک کاٹ لوں۔۔۔؟" وہ معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔ مہرماہ کے چہرے سے پیش کی پیشین گوئیں۔ یقیناً اسی کو سنایا جا رہا تھا۔ پھر وہ مسکراتے ہوئے کیک کاٹنے لگا۔ اسی مذاق باتیں۔۔۔ بہت دنوں کے بعد ایک اچھی سی شام آفندی ہاؤس میں اتری تھی۔
"بہت کجوس ہو۔ کہاں تو جا کر ایک لاکھ لٹا آئیں اور ادھر جہاں چند ہزار کا گفت دینا تھا وہاں ڈنڈی مار گئیں" وہ چائے کا گک لیے لان میں چلی آئی اور ذرا دیر بعد وہ پتا نہیں کسی کام کے لیے جاتے جاتے رک کر اس کی طرف آگیا۔ جاتے تو مہر کی سردی شام میں وہ بہت پیاری سی مسکراہٹ لیے کہتا مہرماہ کو زہر لگا۔ ضروری تو نہیں کہ انسان کی غلطی کو بار بار اس کے منہ پر مارا جائے وہ بھی اس صورت میں کہ آپ کو اس غلطی کا اچھا خاصا احساس بھی ہو چکا ہو۔

"یہ جس جائیداد پر تم قبضہ کیے بیٹھے ہو نا اس میں میرا حصہ بھی ہے۔ تم میری طرف سے کوئی گفت خرید سکتے ہو۔" مہرماہ نے اپنی طرف سے بہت منہ توڑ جواب دیا۔
"ہا۔۔۔" وہ مسکرایا۔

"آغا جان پوتیوں کو جائیداد میں سے حصہ دینے پر بلیو نہیں کرتے۔ تمہیں تو پتا ہی ہے۔"
"پوتوں کو دینے پر تو بلیو کرتے ہیں نا۔۔۔" وہ چپا کر بولی۔ درحقیقت موحد کی بات اس کے دل میں کھب سی گئی۔ آغا جان نے واقعی پوتے کی چاہ میں پوتیوں کو بھی کچھ نہیں سمجھا تھا۔
"تو پھر یہ مت بھولو کہ تم اکیلے پوتے نہیں ہو آغا جان کے اور تنہا عیاشی نہیں کر سکتے اس پر اپنی پر۔ نمیر آفندی بھی برابر کا حصہ دار ہے" وہ نڈر ہو کر بولی۔ تو موحد کی آنکھوں میں حیرت اتری۔
"واٹ۔۔۔؟" اس کے تاثرات نے مہرماہ کو مزہ دیا۔

"تو کیا غلط کہا ہے میں نے؟ اور تم بھی تو اس حق میں ہو۔ شرہ چچی بھی۔"

"ہاں۔۔۔ مگر تم یہ بات کرو گی یہ میں نے نہیں سوچا تھا۔" وہ صاف گوئی سے بولا۔

"کیوں۔۔۔ ایک تم ہی نرم دل ہو اس گھر میں۔" وہ چڑ کر کہتی بیچ پر بیٹھ گئی۔

"جو کچھ اس نے کیا ہے اس کے پیش نظر کہہ رہا ہوں۔"

"جو کچھ اس نے کیا ہے اس کا بدلہ تو میں اس سے بہت اچھے سے لوں گی۔ لیکن تم یہ یاد رکھو بس کہ جب بھی وہ سامنے آیا اس کا حق اسے دینا پڑے گا۔" وہ گویا حکم صادر کر رہی تھی۔ موحد بے ساختہ مسکرا دیا۔

"شیور۔۔۔۔۔ آتے تو دوسرا منے جناب کو۔ جن کو اتنی بڑی بڑی فیور زمل رہی ہیں۔"

"شٹ اپ۔۔۔۔۔ اس کی بات سمجھ کر وہ جھلا کر بولی تو وہ ہنستا ہوا چلا گیا۔ سر جھٹک کر مہر ماہ جائے بیٹے لگی۔ درحقیقت سومیہ کی باتیں اس کے دل میں گڑ گئی تھیں۔ زندگی برباد تو ہو ہی چلی اب وہ سومیہ کے کنبے پر قتل کر کے دیکھنا چاہتی تھی۔۔۔۔۔ ماضی کو کریدنا آسان نہیں ہوا کرتا۔۔۔۔۔ بجھی راگھ میں چھپی چنگاریاں کبھی بکھار دامن کو لپیٹ میں لے لیا کرتی ہیں۔"

☆☆☆

"کبیر۔۔۔۔۔ وہ تیز قدموں سے انیس کی طرف جا رہا تھا جب ملاح کی غلت بھری آواز آئی تو وہ پورے کا پورا ہی اس کی طرف گھوم گیا۔ جانے کیسے رات کے اس پل وہ شمال اوڑھے لان میں نکلی تھی۔

"خیریت۔۔۔۔۔؟" وہ تشویش بھرے انداز میں پوچھتا اس کی طرف آیا۔

"تم کب تک یہاں نوکری کرتے رہو گے؟" وہ پوچھ رہی تھی۔ کبیر کو جھکا لگا۔ پھر ذرا سا غور کرنے پر اسے احساس ہوا کہ ملاح کی آواز روٹی روٹی سی تھی۔

"کیا ہوا۔۔۔۔۔ کسی نے کچھ کہا ہے آپ سے؟"

"تم کہیں جاب کیوں نہیں کر لیتے یا اپنا بزنس" وہ اسی بات پر انکی ہوئی تھی۔ کبیر کو ہنسی آئی۔

"میں کہاں کا لینڈ لاڑ ہوں جو بزنس شروع کر لوں اور سیمپل بی اے کو جاب کہاں ملے گی بھلا؟"

"تو کیا تم ہمیشہ یہاں ڈرائیور ہی رہو گے؟" وہ دیکھی ہو کر پوچھ رہی تھی۔

"میں تو پہلے بھی ڈرائیور ہی تھا ملاح بی بی۔۔۔۔۔ آپ کو آج پتا چلا ہے اس بات کا یا احساس پہلی بار ہوا ہے؟" بہت سنجیدہ ہو کر کبیر نے چھٹا ہوا سوال کیا تو وہ سن رہی رہ گئی۔

☆☆☆

نمیر کی کال آتے ہی مہر ماہ نے یوں جلدی سے مطالبہ پیش کیا جیسے لائن کٹ جانے کا اندیشہ ہو۔

"میں تمہاری مظلومیت کی داستان سننا چاہتی ہوں نمیر! بقول تمہارے کہ تم بہت مظلوم ہو"

"ہوں۔۔۔۔۔ یعنی کہ اس داستان میں میرا مظلوم ہونا ضروری ہے" وہ ہنسا۔

"انتہائی ضروری۔۔۔۔۔ ورنہ تمہیں گولی مارنا میری سب سے بڑی خواہش ہوگی" مہر ماہ نے دانت کچکا پائے۔

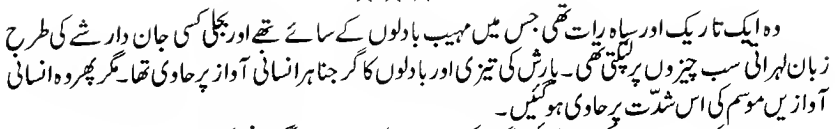
"چلو پھر آج ملے کر لو مہر ماہ نمیر آفندی! اگر میں حق پر نکلا تو میری سزا میری خواہش کے مطابق ہوگی!"

"ہاں۔۔۔۔۔ اور وہ سزا میں خود تمہیں دینا پسند کروں گی" مہر ماہ اس کی بات کی گہرائی میں گئے بغیر تنفر سے بولی۔ تو اس نے گہری سانس بھری۔

"تو بتاؤ مہر۔۔۔۔۔ کہاں سے شروع کروں ظلم و بربریت کی وہ داستان۔۔۔۔۔ وقار آفندی کے ترس سے جو انہوں نے میری ماں پر کھایا اور اسے محبت سے عزت و دار زندگی کی طرف لانے کی سعی کی یا آفندی ہاؤس والوں کی سنگ دلی سے جن کے پاس میری ماں کو دینے کے لیے عزت کم پڑ گئی اور انہوں نے لالچوں کی جالیں ادا کے حصہ دار کمرنے کے لیے تہا چھوڑ دیا؟"

مہر ماہ کی قوت گو یابی جیسے کسی نے چھین لی ہو۔

"جب تم اس گھر سے نکلے اس رات سے نمیر۔۔۔۔۔ جب تم لوگوں کے بعد فاران چھا بھی چلے گئے تھے" وہ با مشغل بولی تو دوسری طرف نمیر آفندی نے خود کو انتہائی غیر آرام دہ محسوس کرتے ہوئے ذہن میں بکھری یادوں کو اکٹھا کرنے کی کوشش کی تھی۔



"یہ آپ کا پوتا ہے۔۔۔ وقار آفندی کا خون۔ اللہ کی قسم" وہ آغا جان کے سامنے گڑ گڑائی تھیں۔
میر اسے بتا رہا تھا اور مہر ماہ نے خود کو میر آفندی کے ساتھ اس سرد اور تاریک رات میں ان ظالم لوگوں کے

اللہ جانے کون نیک فرشتہ تھا جو سرک پر چیتنے چلاتے نمیر کو دیکھ کر کا اور ازراہ مہربانی ان ماں بیٹے کو سرکاری ہسپتال پہنچا دیا۔ جہاں زرنگار کو فوری طبی امداد کے بعد وارڈ میں شفقت کر دیا گیا۔ سردی اور خوف سے کپکپاتے نمیر کے لیے وہ ایک رات ہزار راتوں پر بھری تھی جب اس کو یہی بتائیں تھا کہ اس کی بے ہوش بڑی ماں کو ہوش آئے گا بھی یا نہیں۔۔۔ ٹیسٹوں پر ٹیسٹ لیے جا رہے تھے۔۔۔ نمیر کو گناڈاکٹر دماغ میں کسی ٹیومر کی بات کر رہے ہوں۔۔۔ مگر اسے سمجھ نہ تھی کہ یہ کیا بیماری تھی۔ اسے بس یہی سن کر لرزہ طاری ہو گیا کہ اس کی ماں کے دماغ کا فوری آپریشن ضروری تھا اور وہ پیسوی کے بغیر ممکن نہ تھا۔ وہ دنیا میں اکیلا رہ جانے والا تھا۔۔۔۔۔

مہرماہ نے سنتے ہوئے آنکھیں بھیج لیں۔

آفندی ہاؤس والوں کی بربریت جیسے نگاہوں کے سامنے آگئی ہو۔ "تمہیں اس سے بہت ہمدردی ہے تو جاؤ نکل جاؤ یہاں سے اس کے پیچھے۔۔۔ ایک کو تو اندھا کیا ہی تھا اس بد ذات نے دوسرا اپنی مرضی سے ہو رہا ہے۔" آغا جان نے فاران آفندی کو نخوت سے آرڈر کیا۔ تو انہوں نے ایک پلی بھی کچھ سوچے بنایوی اور بخار میں پھلتے بچے کو ساتھ لیا اور آفندی ہاؤس کی دہلیز پار کر گئے۔ "بہت لمبی داستان ہے مہر ماہ آفندی۔۔۔ حوصلے کے ساتھ سننے اور حوصلے کے ساتھ سنانے والی۔" وہ آرزو رہا تھا۔ اور مہر ماہ۔۔۔ چپ تھی۔۔۔ بہت چپ۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس داستان میں نمیر آفندی مظلوم نکلنے والا تھا۔

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ



رضیہ جہدی

ٹیکنیکل آدمی

عادی انجینئر ہے اور ایک مشہور کمپنی میں سول انجینئر کی جاب کر رہا ہے۔ چھوٹے میاں میڈیکل کے فائل میں ہیں۔ بڑا قدرے سنجیدہ مزاج رکھتا ہے اور چھوٹا ہنس کر چیو پر عمل کرتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ نہ صرف یہ دونوں پڑھنے لکھنے میں اچھے ہیں بلکہ ماں باپ کے تابعدار بھی ہیں۔ اپنے بابا کی ڈانٹ اور اٹھا ہوا جوٹا بھی انہیں کچھ جواب نہیں دیتے رہتا۔

لوگ میری تعریف کرتے ہیں اور میرا وزن کچھ اور بڑھ جاتا ہے، بچے باپ کے سامنے منہ بے شک نہ

”مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ“ کتنی اچھی اور سچی بات کہی ہے۔ کس نے کہی ہے۔ ارے آپ کو یہ بھی نہیں معلوم؟ خیر جیسا نام ہے بڑے مشہور آدمی ہیں اور پھر نام میں کیا رکھا ہے بات اور اچھی بات چاہے جس نے بھی کہی ہو خوشبو کی طرح ہوتی ہے جو چار سو چپکے سے پھیلیتی چلی جاتی ہے۔ تب پھول کو کون یاد رکھتا ہے اور پھر جو کسی شاعر نے کہا ہے کہ۔

مسئلہ پھول کا ہے پھول کدھر جائے گا
چلیں چھوڑیں جہاں مسئلے مسائل کی بات آجائے
میں کو سوں دور بھاتی ہوں۔ ارے بھئی اپنے مسائل
کچھ کم ہیں جو پھول کے مسئلے کو درد سہتا میں۔

بات ہو رہی تھی بچاؤ کی اور وہ بھی دوستوں سے۔
ذرا کان میں سنئیے، مجھے اپنے کتنی کے دو چار دوستوں
سے کیا پچنا پچانا، یہ تو میاں صاحب یہاں تھہریے! یہ
میں اپنے خدا مجازی کا تذکرہ کر رہی ہوں۔ سیاست
سے میرا دور کا بھی واسطہ نہیں اور حکومت اور حاکم
جتنے ہیرے کینے جمع کریں مینوں کی۔ یہ تو میرے گھر
کی بات ہے تو میرے میاں جی (اب ٹھیک ہے نا)
زندگی بھر تابیاب دوستوں میں گھرے رہے جو سب سے
بڑی خصوصیت یہ رکھتے تھے کہ وہ ٹیکنیکل آدمی تھے۔
جب تک میں اکیلی تھی اور بچے چھوٹے تھے
معاملات چلتے رہے۔ میرے میاں جی ہمیشہ اپنی
تابعداری چاہتے رہے۔ ہر ترے وہ گھر کے سربراہ اور
حاکم ہیں مگر وہ اپنے گرد تمام ٹیکنیکل آدمیوں کے آگے
بھی ہم سے تابعداری کے متقاضی رہے۔

اب بچے بڑے ہو گئے ہیں۔ میرے معصوم اور
بھولے بھالے بچے، آپ نہیں گی۔ خیر اتنے بھی
معصوم نہیں، چلیں سان لینی ہوں کہ اتنے بھی معصوم
نہیں۔ بس چوبیس سال کا عادل جیسے ہم عادی بیکارتے
ہیں اور بائیس سال کا عادل جس کا نام بگاڑنے کی اس
کے بابا نے بالکل اجازت نہیں دی وہ عادل سے بہت
پیار کرتے ہیں۔

”یہ بالکل مجھ پر پڑا ہے۔ میں نے یہ نام بھی اس
لیے رکھا ہے کہ کوئی توں کی کم عقلی پر نہ جائے۔“

تو بولے۔
”ارے تمہیں کوئی برتن معلوم ہے جو کمرے میں ہو۔“

پھر خود ہی اندازہ ہوا کہ مجھے کیا معلوم ہو گا۔ اتنی دیر میں مجھے یاد آ گیا کہ چیز کی بڑی پٹی سانسے پڑی ہے اور امی نے سب ہی کچھ تو دیا ہے جلدی جلدی نکالا اور جگہ جگہ رکھنے لگی۔ میاں جی اس اثناء میں نیچے چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد کئے بٹستے ہوئے۔

”بھئی گرم چائے کے بغیر مجھے بارش مزہ نہیں دیتی اور یہ تم کیا منہ بسورے ہو۔ سب اوپر آرہے ہیں۔ سب سمجھیں گے تم شادی سے خوش نہیں ہو ایسا ہی ہے کیا؟ ویسے دن نکل آیا ہے اور میں نے صدیق سے کہہ دیا ہے۔ ارے یس چپچپے گلے میں تو رہتا ہے۔ یار ہے اپنا۔ ٹیکنیکل آدمی ہے دو ایک دن میں آکر چھت کی مرمت کر دے گا۔“

جلدی جلدی بتاتے گئے اور میں پہلے جملے ہی میں پھنسی رہی۔ یہ عورت کم بخت حساس مہنتی ہوتی ہے۔ ہے ناں۔

یہ میری زندگی کا پہلا ٹیکنیکل آدمی تھا۔ بعد میں بتا چلا کہ صدیق کوئی مستری وغیرہ نہیں ہے۔ وہ صاحب کے ساتھ نہیں بھی کبھی بھی شکار ارے مچھلی کا شکار کرنے چلا جاتا ہے اور تمام لوازمات مثلاً ”مینڈک وغیرہ پکڑنا وہی کرتا ہے۔ ویسے گھر میں پڑا رہتا ہے اور سات بچوں کا باپ ہے۔

میرے میاں جی کا کہنا ہے کہ وہ بلا وجہ کی ڈگریوں سے، دولت سے مرعوب ہونے والے نہیں۔ وہ

انسان کے اندر کی قابلیت کو اہمیت دیتے ہیں اور عورت کے ناقص العقل ہونے پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس سے مشورہ کیا لینا بلکہ مرد اس کا پابند نہیں کہ ہر بات عورت سے پوچھ کر بلکہ ہٹا کر کرے۔

پچیس سالہ ازدواجی زندگی میں ہزاروں ٹیکنیکل آدمیوں سے سابقہ بڑا ہے۔

ابھی کچھ دنوں پہلے ایک صاحب ہم سب کی زندگی

کھولیں مگر مجھ سے بہت شکوہ کرتے ہیں اور تو اور مجھ پر دبے لفظوں میں یہ بھی الزام عائد ہوتا ہے کہ اگر میں نے تھوڑا بہت بھی اختلاف کیا ہو تا تو آج نوبت انتہا پر نہ پہنچی ہوتی۔

یعنی میرے بچوں کا پڑھنا لکھنا اور یکدم سے بڑے ہو جانا ہی اپنے بابا کے دوستوں سے زیادہ اور بابا کے ساتھ نظر آتی اختلافات کا سبب بن رہا ہے۔ او فو! آپ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ میں تعلیم کے خلاف ہوں۔ نہیں نہیں، یہ بات نہیں ہے دراصل میں نے اپنا تعارف تو کرایا نہیں۔ میں ایک سرکاری ادارے میں گریڈ انیس کی افسر ہوں۔ ڈبل ایم اے اور ایم بی اے بھی کرنے کے بعد آپ مجھے پڑھے لکھے لوگوں میں شمار کر سکتی ہیں، تعلیم کی مخالف بالکل نہیں۔ البتہ گھر کی پرسکون فضا کی حافی ضرور ہوں۔ آپ لوگ میرے لیے دعا کریں کیونکہ بچوں کی ہر خطا، ہر غلطی دراصل ماں کی تربیت کی خامی ہوتی ہے اور اگر معاملہ برہہ جائے تو نغصیاں کی خرابی تک جاتا ہے۔

چلیے آپ لوگوں کو اپنے مسئلے کی طرف لاتی ہوں۔ کہاں سے شروع کروں دل تو ملکہ ترنم نور جہاں مرحومہ تک جا پہنچا ہے۔

کہاں تک سنو گے کہاں تک سناؤں
ہزاروں ہی شکوے ہیں کیا کیا بتاؤں

میری شادی کی اگلی صبح میری آنکھ پانی کی بوندوں سے کھلی جو کوئی تو اتر سے مجھ پر ڈال رہا تھا۔ آنکھ کھلی تو اندازہ ہوا۔ اوہو یہ مذاق نہیں ہے یہ رمت خداوندی ہے جو برس کر مجھے خوش آمدید کہہ رہی ہے۔ ہر پردا کر اٹھی میاں کو جگایا۔

”کیا ہوا؟“ آنکھ کھولتے ہی ان کی سمجھ میں آ گیا۔ میری پریشان صورت کے خلاف ان کے چہرے پہ خوشی کے وہ آثار تھے۔ جو میرا گھونگھٹ اٹھا کر بھی نہ دیکھے میں نے۔

”دیکھا رم جھم شروع ہو گئی۔ میری کوئی بھی خوشی رم جھم کے بغیر نہیں ہوتی۔“ پھر بستر بھیتا محسوس کیا

خیر اندازے سے کچھ زیادہ ہی میں کام ہو گیا مگر پلاسٹر کے بعد چھت پر بڑا سا گاف رہ گیا۔

ہمارے میاں صاحب کا گھنا ہے کہ ایسی خراب جگہ زمین لی ہے۔ زمین ہی خراب ہے وہاں کی۔ اکثر جگہ ایسا ہی ہو رہا ہے۔ کم از کم نواب نے جہاں جہاں کام کیا ہے وہاں تو ایسا ہی ہو رہا ہے۔

شامت اعمال میرے بیٹے نے جو خود بھی سول انجینئر ہے اور ایک بڑے ملٹی پیٹنٹل ادارے میں اسی عہدے پر کام بھی کر رہا ہے۔ کہہ دیا۔

”بابا! جب وہ خود ہی کہہ رہے ہیں کہ جہاں بھی انہوں نے کام کیا وہاں بھی یہی حال ہو رہا ہے تو کچھ تو ہے ان کے کام میں۔“ بابا کو غصہ آنے لگا۔

بیٹا بھی جیسے سمجھانے پر آج کل گیا تھا۔ ”میں کل چاچو کا مکان دیکھنے جاؤں گا۔“

”مطلب آپ بہت بڑے انجینئر ہیں۔ ایک تار تک کو صحیح جوڑ نہیں پاتے اور بات کر رہے ہیں اس کا کام دیکھنے جائیں گے۔“

میرا چھوٹا بیٹا گردن جھکا کر مسکرانے لگا۔

”بابا یہ سول نہیں الیکٹرک ورک ہے۔ میں احتیاط کرتا ہوں۔“

”تو بیٹا جی! وہ سب کام جانتا ہے۔ الیکٹرک ورک ہو پلمبری کا کام ہو سب کام کر سکتا ہے تم کر سکتے ہو۔“

میرا بیٹا بکا بکا رہ گیا۔

کم از کم میں اپنے میاں کی قائل ہو گئی۔ عادی تو کیا کوئی بھی نواب جتنا اچھا کام نہیں کرتا۔ اس کی گواہ

ہماری ساری الٹی مٹی ہوئی فلاش فنکھال اور انے سونچ دے رہے ہیں اور پھر ہمارے میاں جی کو اس کا قائل

ہی نہیں کرنا تعریف بھی کروانا کہ آج کل یہی رواج ہو گیا ہے۔

میرا چھوٹا بیٹا بھائی کی درگت پر پہلے سر جھکائے ہنسی

ضبط کرتا رہا پھر اٹھ کر بھاگ گیا۔ بہر حال وہ عاقل ہے،

باپ کے سامنے نہ سر اٹھا کر جیو نہ سر اٹھا کر بنسو۔ وہ

سمجھ چکا تھا۔

میں آئے اور چھانکے وہ پہلے ایک ایف بی پلمبر کے ساتھ کام کرنے چھوٹنے کی حیثیت سے ہمارے گھر آئے۔

چھوٹے نہیں جانتیں آپ! ہر فیلڈ میں چھوٹے ہوتے

ہیں یہ اٹھا کر دوڑو رہا کھوئے پلمبر صاحب حکم دیتے اور وہ

عمل کرتے بلکہ ایسا آدی جس پر کسی کی نظر نہیں پڑتی

پھر جانے کب اور کیسے وہ ہمارے صاحب کی نظر میں آ

گئے اگرچہ ہمارے صاحب خود بے نظیر ہیں۔ نہیں

نہیں سیاست نہ میرا بیک گراؤ نہ ہے نامیاں جی کا مگر

ان کی نظر ہمیشہ جوہری کی طرح صرف اور صرف

ٹیکنیکل آدی پر ہی ٹھہرتی ہے۔ پھر کیا تھا اب وہ

ہمارے گھر کے لیے مسٹری، ٹیکنک، الیکٹریشن اور پلمبر

سب ہی کچھ تھے۔ کوئی بھی کام ہوتا وہ نواب کو فون

کرتے وہ آجاتے۔ میرا چھوٹا بیٹا اٹھتا تھا بابا کا ہر ٹکینہ بھی

شاید گھر میں ہی ہوتا ہے ہر وقت۔

میرے دیور یعنی میرے میاں جی کے برادر خود

ابوظہبی میں ہوتے ہیں۔ انہوں نے بھیا کو فون کیا کہ

ان کے مکان کی چھت ڈلوانی ہے اور اس کو فنشن بھی

کروانا ہے۔ وہ میپے ان کے اکاؤنٹ میں بھیج دیں گے،

ان کا جو ٹھیکہ دار تھا وہ بھاگ گیا ہے اور وہ بہت پریشان

ہیں۔

بھیا نے مدد کا وعدہ کر لیا اور ہم سب حیران بلکہ کسی

حد تک پریشان ہو گئے کہ نیا ٹھیکہ دار نواب تھا۔

نواب ہر فن مولا ہے اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

کم میں ٹھیکہ لے رہا ہے اور خود ہی مسٹری، خود ہی

الیکٹریشن اور پلمبرنگ ورک سب کچھ کرے گا۔ حتیٰ کہ

اس نے ذمہ داری لی ہے کہ وہ چھت پڑنے کے بعد پانی

سے ترائی بھی خود کرے گا۔

”بس چھ لاکھ میں کام بن جائے گا۔“

”چھ لاکھ ٹکڑہ تو چار لاکھ بھیج رہے ہیں۔“

”اور بھیج دے گا۔ بھائی ہے میرا۔ آپ اپنے

چھوٹے سے دماغ کو زحمت نہ دیں۔ میں جانوں میرا

بھائی جانے میں نے سمجھ بوجھ کر ٹیکنیکل آدی کو چنا

ہے۔ وہ غصہ کا ٹیکنیکل آدی ہے۔“

کی کوئی اسکیم آئی ہے اور میں نیا اے سی لے رہا ہوں وہ لگائیں گے۔“

”لے لو میاں! بس پرانی چیزیں اچھی ہوتی ہیں تم نے سنا نہیں اولڈ از گولڈ۔“

عادی سر جھکائے سنتے رہے اور اے سی کی خریداری بھی ایک اور ٹیکنیکل آڈی کے مشورے سے انجام پائی۔ مارکیٹ سے دس ہزار اوپر کہ یہ پائیدار اور اچھا ہے۔

ماضی کی کمائی رہنے دیں! آج کل جس ٹیکنیکل آڈی کا چرچا ہے ان کا نام نامی یوسف ہے۔ نام سے کیا ہوتا ہے ماں اور باپ کو تو اپنا بیٹا یوسف لگتا ہی ہے۔ وہ یوسف ثانی بن گئے۔ ہاں وہ اپنے آپ کو اسی میٹرھی پر رکھتے ہیں نیچے اترنے پر تو وقت بھی انہیں مجبور نہ کر سکا۔ عراب پچاس سے آگے کی منازل طے کر رہی ہے۔ شادی وادی کے چکر میں پڑے نہیں۔ عورت کا چکر ہی برا ہے۔ یہ ان کا قول ہے جس پر ہمارے میاں سردھتے ہیں۔

وہ ایک پان کی دکان کرتے ہیں اور ہو میو پیتھک ڈاکٹر ہیں۔ ویسے ان کے ہاتھ میں شفا ہے۔ اس کی تو میں بھی قائل ہوں۔ دودھ کا کاروبار کرتے ہیں اور یہی نہیں دودھ اپنی بانیک پر گھر پہنچا بھی جاتے ہیں۔ نیچے اس سے اچھی کیا بات ہے۔ انہوں نے سختی سے منغ فرمایا ہے کہ باؤڈر اور ڈبے میں بند دودھ مضر صحت ہیں۔ نیچے ان کو نصیحت خان انگل کہتے ہیں کہ وہ وقت بے وقت، جگہ جگہ نصیحت کرنا نہیں بھولتے۔ وہ دنیا کی بھلائی کے لیے ہی ایسا کرتے ہیں مگر دنیا بھلا فلاح کی راہ کو پسند کرتی ہے۔ اور تو اور وہ ہمارے صاحب جی کو بھی نصیحتیں کرنے سے باز نہیں آتے اور لاکھ دوستی بہت سنی وہ کبھی کبھی تو جمنجھلا ہی جاتے ہیں۔

اسی لیے آپ سب سے درخواست ہے کہ ایسا کوئی ٹیکنیکل آڈی نظر میں ہو تو فوراً ”اطلاع دیں“ کیونکہ ہمارے یہاں وہ کمسنی جلد ہی خالی ہونے والی ہی ہے۔

پھر میاں جی کی ملاقات بشیر سے ہو گئی جو بہت بڑا ٹیکنیکل آڈی ہے۔ ایک چھوٹی سی دکان پر کام کرتا ہے اور سلائی مشینیں ٹھیک کرتا ہے۔ ویسے وہ بھی ہونسی میرے میاں کی نظروں میں نہیں چڑھا۔ وہ ہر قسم کی مشینیں ٹھیک کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا بلکہ مشین پر ہاتھ رکھ کر ہی خرابی اور علان بتا دیتا ہے۔

ان ہی دنوں میرے میاں بھی اپنے ادارے کی اسی پالیسی کا شکار ہو گئے تھے ڈاؤن سائزنگ کہاں جاتا ہے۔ اس میں یہ کم دیکھا جاتا ہے کون کیا ہے؟ کارکردگی کیا رہی ہے؟ پس حکم حاکم مرگ مفاجات کا معاملہ ہوتا ہے خیر جو تھوڑے بہت پیسے وہ ان ہی بشیر کے کہنے پر مرغی کے کاروبار میں لگائے پہلی کھپ میں ڈوب گئے جو بچے اس کے لیے بتایا گیا کہ آپ نے جلدی کی۔ رانی کھیت کی بیماری آگئی تھی خیر آپ لوہے کے کاروبار میں پیسہ لگائیے تو بڑے بڑے پنجرے بنوائے گئے لوہے کے اور رنگ برنگ طوطے، چڑیوں کا کاروبار شروع ہوا۔ سرپرست اعلا میرے میاں اور معتمد خاص میاں بشیر کا کاروبار چلا نہیں وہ پنجرے اونے ہونے لگے۔ تمام پیسے ٹھکانے لگے مگر بشیر صاف بچ گئے۔ وہ اپنی خصوصیت کی وجہ سے کہ وہ ٹیکنیکل آڈی ہیں اور کاروبار میں تو منافع بھی ہوتا ہے اور رقم بھی ڈوبتی ہے۔ یہ قسمت کا کھیل تھا اور کچھ نہیں۔ وہ ہر دل عزیز بھی رہے۔ میرے میاں کا اکیلے ہی دل ان کے لیے بہت بڑا تھا پھر انہوں نے ہمارے گھر کی واشنگ مشین پانی کی موثر غرض کہ چھوٹی بڑی سب ہی مشینوں کو بہ وقت ضرورت دیکھا۔ اب اگر اس کی ارے مشین کی اور کس کی عمر ہی ہو گئی تھی تو وہ مجبور ہو کر بتا دیتے تھے کہ بھائی یہ آج کل کی چیزیں بس دو چار دن کی بہار ہوتی ہیں۔

اور تو اور ان کے بھائی اے سی بھی دیکھ لیتے تھے اور دو مہینے میں جب تیس ہزار روپے لگ چکے تو میرے عادی نے بابا کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

”بابا! یہ اے سی جواب دے چکا ہے میرے آفس

ایمل رضا

شگنوں والی شال

چاندی کی بازیب، دودھیا چوڑے، کشمیری
کڑھائی والی قمیص کا دامن اور گٹا..... سب خون
میں اس طرح سے رنگا ہوا تھا کہ ان کے اصل رنگ
کہیں کھو سے گئے تھے۔ ان کے نصیب کی طرح
..... نسایت کے مقسوم کی طرح..... لاش لڑکی.....
بدی، بدکاری،..... گف، گناہ..... غیر محرم اور
غیرت..... سب آپس میں اس طرح جھلے ہوئے
تھے جیسے چاٹی میں لسی بلوئی جاتی ہے۔

سارا وقوع ایک لمحے کی دہن تھا۔ جیسے کوئی

چاند کے چوہارے پر ایک اور چاند نمودار ہوا
تھا۔ روشنی دو چندھی اور ہوا کھیلی.....
سرخ شگنوں والی شال جس کے تار تار پر
شیشہ جڑا تھا۔ ٹھنڈی چاندنی میں چمک رہی
تھی۔ گرد سے انی اس شال پر ہزاروں چاند چمک
رہے تھے۔ سفید اور..... سرخ چاند.....



انہونی..... نہ کوئی قوت لگائی گئی تھی اور نہ ہی احتجاج کیا گیا تھا۔ جیسے گناہ کرنے والوں کو بھی پتہ تھا کہ یہ ہی ان کا مقدر ہے۔ ان کے ساتھ اب اکیلے میں ایسا نہ ہوا تو کل سب کے سامنے ہوگا۔ اس سب کے باوجود ایک صدا بلند ہوئی تھی۔ شاید اپنی صفائی میں بولے جانے کے لئے آخری بھیک مانگی گئی تھی۔ جسے بڑی بے رحمی سے رد کر دیا گیا تھا۔ اور وہ صدا باہر سے گزرتے..... چھت پر سوتے کسی ایک دو نے سن لی تھی۔

”کیا ہوا.....؟“ ”دور سے کسی نے شبیر سے پوچھا تھا۔“

شبیر نے آواز کی سمت دیکھا تھا اور اسے اپنی بندوق اٹھا کر دکھائی تھی۔

”کیا ہوا.....؟“

”فح“..... ہوئی تھی۔ وضاحت کے مقابلے میں غیرت کو، ترس کے مقابلے میں روایت کو، انصاف کے مقابلے میں وحشت کو.....

☆☆☆

چاند کے چوہارے پر ایک اور چاند نمودار ہوا

تھا۔ روشنی دو چند تھی اور ہوا کیٹیلی.....

سرخ شکلوں والی شال جس کی تار تار پر شیشہ جڑا تھا۔ ٹھنڈی چاندنی میں چمک رہی تھی۔ اور اس سرخ شال پر ہزاروں چاند چمک رہے تھے۔ سفید اور صرف سفید..... رانی کی بھر جانی نے شال کو اپنے گرد اچھی طرح سے لپیٹ رکھا تھا۔ اس کی ذرا سی جنبش سے شال میں جڑے ان گنت چاند ہلکھلانے لگتے تھے۔ اسے شاید سردی لگ رہی تھی۔ جبکہ رانی نے صرف دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ اس پر خنکی کا احساس غالب نہیں تھا۔ آج وہ ہر طرح کے احساس سے ماور ہو چکی تھی۔ چھت پر آجانے کے احساس نے سارے احساسات کو مات دے دی تھی۔

نیچے برآمدے میں لائین کی دھیمی لوارات

سب دب دبا گیا تھا..... مر مر ا گیا تھا۔ کتنی دیر تک وہ ایسے کھڑی رہی جیسے کاٹھ کی سرمہ دانی ہی تو ہو..... اور اب ٹوٹ کر اپنے نصیب پر گر جانا چاہتی ہو..... یہاں تک کے بھر جانی کو اسے ہلانا پڑا.....

”کیا دیکھتی ہے رانی.....؟“ بھر جانی کے سوال میں اس بات کا جواب تھا کہ مجھے پتا ہے تو کیا دیکھتی ہے۔ کھلی فضا میں سانس لینے کی حسرتیں رانی کے وجود سے کن بھجورے کی طرح برسوں سے چٹٹی ہوئی تھیں۔ یہ صحرائی علاقوں کی وہ مٹی نہیں تھی جسے جسم سے مانجھا نہ جھکراتا رہا جاتا ہے۔ یہ وہ خواب تھے جو قبر میں بھی ساتھ جاتے ہیں۔

”زمین پر بچھے تارے دیکھتی ہوں بھر جانی..... کیا روز ایسا ہی ہوتا ہے؟“ اس نے اداسی بھرے رنگ سے پوچھا۔

”ہاں.....“ بھر جانی دور خلاؤں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

”مجھے کیسے پتا.....؟“

”گر میوں میں“ میں اپنے گھر میں چھت پر سویا کرتی تھی۔“

”چھت پر.....؟؟؟“ رانی ایسے حیران ہوئی جیسے بھر جانی نے اس کے سامنے اپنے کافر ہونے کا اعتراف کر لیا ہو۔

”چھت پر کیسے بھر جانی..... تیرا ابا تو میرے ابا سے بھی کپتا ہے۔ وہ تیری جان نہیں نکال دیتا تھا کیا؟“

انتظار کو ختم نہیں کرنا چاہتی تھی جو اس آس میں ہوتے تھے کہ اپنی بہن، بیوی۔ حتیٰ کہ ماں کی بھی کسی عیب کشائی یا محض شک کی بنا پر ہی وہ ان سے جان چھڑوا لیں۔

وہ جیسے اکثر پرانے قبیلوں میں ہوتا تھا ناں کہ مرد کو جو ان تب ہی مانا جاتا تھا جب وہ کوئی قابل قدر کام کرے۔ تو یہاں اس مرد کو جو ان تب مانا جاتا تھا جو کسی جوان کو اس کی جوانی نصیب نہ ہونے دے۔ علاوہ کے ”جوان“ اس کام کے انتظار میں رہا کرتے تھے کہ کب ان کو جو ان مانا جائے گا۔

یہاں عورتیں حمل سے ہوتی تھیں تو باقاعدہ وہ ٹوٹے کرتی تھیں جن سے لڑکے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن سب ٹوٹے شاید پرانے ہو گئے تھے یا خدا کو ہی کچھ اور منظور ہوتا تھا کہ وہ جتنے جن کرتی تھیں اتنی ہی ان کے گھر لڑکیاں پیدا ہوتی جاتی تھیں۔

پتا نہیں ایسے علاقوں کے تو جھنگر بھی کیوں چپ سادھ لیتے ہیں۔ کوئی باغی، کوئی دیوانہ بھی کوک نہیں دیتا کہ جن کے دل وحشت زدہ ہو جاتے ہیں انہیں کچھ ڈھارس ہی ملے۔ یہاں کوئی رانجھا کیوں نہیں نکل آتا بانسری بجانے..... ساری ہیروں کو اپنے پیچھے لگانے..... ہیریں بڑبڑ رہی ہیں۔ سوختی کی طرح ڈوب کے مر بھی جانا چاہتی ہیں لیکن بند بند میں دم گھونٹنا نہیں چاہتیں.....

شاید رانجھوں نے بھی بانسریوں کی جگہ خنجر تھام لیے تھے۔ اور انہیں سُرور سے زیادہ اس آواز سے لگاؤ ہو گیا تھا جو گردن پر پھرنے سے اور مرتے ہوئے کی آخری پلکی کی صورت نکلتی ہے۔ یہاں کے رانجھوں نے بھی وہ وحشت سیکھ لی ہے کہ جلاد بھی کانپ کر رہ جاتا ہے۔

بھینڑ کاٹ کھانے والی جھر جھری لے کر رانی نے گہری سانس لی..... بھر جانی کبھی اس پر کپکپی طاری ہے۔

”ٹھنڈ لگ رہی ہے؟“

”سب گھر والے سوتے تھے۔ سارے مرد باہر ہوتے تھے۔ میں ماں کے ساتھ اندر شہ نشین میں..... وہاں کی ایک چھوٹی سی کھڑکی بڑی سڑک پر کھلا کرتی تھی۔ وہاں سے نظر آتا تھا یہ سب..... یہ زمینی تارے اور عارضی جگنو..... مجھے نہیں یاد پڑتا کہ میں بھی سوئی بھی ہوں.....“ پہلو تھکی والے درد زہ کی طرح بھر جانی کو اپنے ہی غم یاد آ گئے تھے۔

اس وقت بھی وہ دونوں گھر کی چھت پر سڑک کی طرف بیٹھی تھیں۔ ذرا دور پچی پچی سڑک دکھائی دیتی تھی۔ اکا دکا گزرنے والی موٹر سائیکلیں ریت اور ٹیلوں کے اس علاقے میں ان کی نظروں کے لیے ایک چھوٹی سی تفریح تھی۔ جب گھر میں کوئی میرد نہیں ہوتا تھا وہ اس طرف آن کر بیٹھ جاتی تھیں۔ اور یہ گھر میں مرد نہ ہونے کا واقعہ دس سالوں میں کوئی ایک بار ہی ہوتا تھا۔ عورتوں کو گھر میں تنہا چھوڑ دینے کا خیال ایسا ہی تھا جیسے باجرے کو اوپر چھت پر ڈال دینا اور رکھوالی کے لیے چڑیوں کو بلا لینا..... علاقے کے مردوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ عورت جب بھی اکیلی ہو کچھ اور نہیں کرتی..... سوائے گناہ کے، بے وفائی کے، بدکاری کے..... اور بدکار کو کاری کرنا وہ خوب جانتے تھے۔ چوپالوں میں ہوئے فیصلوں اور چوپالوں میں ہوئے عمل درآمد کو مرد آپس میں اس طرح سے سنا اور سنایا کرتے تھے۔ جیسے انہوں نے جنگل میں شیر کا شکار کیا ہو۔ وہ بھی اس کی کچھار کے اندر جا کر.....

یہاں عورت کے عیب پر مرد شرمندہ نہیں ہوتے تھے۔ شرمندہ وہ مرد ہوتا تھا جس کی بہن یا بیوی کسی کے ساتھ پکڑی گئی ہو اور وہ اسے جان سے مار نہ سکا ہو..... یہاں عورتیں اسی موت سے ڈرنے کے لیے اپنی ہم عصر، ہم عمر عورتوں سے بھی بات نہیں کیا کرتی تھیں۔ بھائیوں، باپ کے سامنے ہنسا نہیں کرتی تھیں۔ وہ مردوں کے اس

دیکھو، شبیر بھائی گھر پر نہیں، اباجی نیچے سو رہے ہیں تو ہم چھپ کر چھت پر آئے ہیں۔ ایسے جیسے کوئی گناہ ہو۔

بھر جانی نے ٹھنڈی سانس لی۔ ایسے وقت میں اس کی شکل تالا لگے جندرے کی سی ہو جاتی تھی۔ اور رانی کے پاس اس تالے کو کھولنے کی چابی نہیں ہوتی تھی۔

گھر میں ایک ابا تھا ایک بھائی..... بس یہ دو افراد تھے۔ دوسرے..... اور جو تین عورتیں تھیں، وہ ان دوسروں کے سایوں سے بھی کم حیثیت تھیں۔ اماں کی حیثیت سے بڑھ کر تو گھر کا مرتبان تھا جس نے اپنے ایک بارٹوٹے پر شور کیا تھا۔ اماں ساری زندگی اس شور کا ہزارواں حصہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اسے تو ہوا میں اڑتی چڑیا بھی تعجب سے دیکھا کرتی تھی کہ یہ کون سی مخلوق ہے جو ان سے بھی زیادہ ڈری سبھی رہتی ہے۔ پھر ان ہی چڑیوں کا جیسے اس سے دوستانہ ہو گیا۔ وہ انہیں دانہ ڈالتی اور پہروں بیٹھ کر دیکھا کرتی..... عرصے بعد اچانک سے ایک دن غضب ہی تو ہو گیا۔ جب رانی نے دیکھا کہ اماں نے ان چڑیوں سے باتیں کرنا بھی شروع کر دی۔ یہ سب ابا کی تیسری شادی کے بعد سے ہوا تھا۔ دوسری بیوی مرنے کے بعد ابا نے تیسری کرنے میں دیر نہیں کی تھی۔ ابا کی تیسری بیوی اتنی چھوٹی عمر کی تھی کہ وہ رانی کو بھی باجی کہہ کر بلاتی تھی۔ لیکن ابا کی قسمت میں بار بار رنڈا ہونا لکھا تھا شاید..... وہ لڑکی بھی زیادہ دن جی نہ سکی بیچاری۔ پتا نہیں کیوں ڈری ڈری رہتی تھی۔ رات کو سوتے وقت تو اکثر ہی اس کی حالت غیر ہو جاتی تھی۔ پھر اس پر جن آنے لگے اور کوئی جن اسے اپنے ساتھ

کھدکاف لے گیا۔ شاید اس کی دوستی جن سے ہو گئی تب ہی وہ اس کے ساتھ جاتے جاتے مسکرا رہی تھی۔ شکر ہے کہ وہ جن کسی کو نظر نہیں آتا تھا۔ ورنہ اس بیچاری پر بھی بدکار ہونے کا ٹھپہ لگ جاتا

”کھلے آسمان کی ٹھنڈ تہہ خانے کی گرمائش سے اچھی لگتی ہے بھر جانی.....“ وہ سکر کر بیٹھ گئی۔ اس کا تو دل کر رہا تھا آسمان کو اپنے ہاتھوں میں بھر کر نیچے لے جا کر صندوق میں بند کر دے۔ پھر اپنے جیمز کے کپڑوں کی طرح بار بار نکال کر دیکھے۔

ابا اماں نیچے سو چکے تھے، وہ دونوں نند بھر جانی اوپر چھت پر آ گئیں۔ اس علاقے میں بجلی تو تھی لیکن اس کے جا کر آنے کی مدت اتنی لمبی تھی کہ وہ لوگ یہ بھول جاتے تھے کہ ان کے گھروں میں بجلی موجود ہے۔ ٹھنڈ سے ان کے جسم تو کپکپا رہے تھے لیکن وہ ابھی نیچے جانے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ کھلا آسمان اور موٹر سائیکلوں کی گھول گھول انہیں بہت اچھی لگ رہی تھی۔ رانی کو ایسا لگا اس نے جنم ہی آج لیا ہے۔ ماں نے اسے پیدا تو نہ جانے کب سے کر لیا تھا لیکن کوکھ سے آج آزاد کیا ہے۔

”کیا تمہارے ادھر کی سڑک پر بھی اتنی ہی موٹر سائیکلیں گھول گھول کر رہی ہیں؟“

”پتا نہیں..... ایک گز رہی تھی کہ ہزاروں..... لیکن کانوں میں ساری رات کھوکھو ہو رہی رہتی تھی۔“

بھر جانی نے ہنس کر کہا۔ ایسی ہنسی کے رانی کا رونے کو دل کیا۔

”یہ گھول گھول بھی کتنی اچھی لگتی ہے نا بھر جانی..... مجھے تو بعض اوقات لگتا ہے یہ ہمیں

اکسار ہی ہیں یا جلا رہی ہیں کہ دیکھو تم سے زیادہ تو ہماری آواز ہے۔“ بھر جانی خاموش رہی..... ”کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے میں موٹر سائیکل کا پہرہ ہونی میں روندی جاتی لیکن دیس دیس کھوم لیتی۔“

اس نے اداسی سے کہا۔

”اپنی اس خواہش کا کسی اور سے ذکر نہ کر دینا رانی۔“ بھر جانی نے سہم کر کہا۔ ”تیری خواہش یہاں کے ریت روایتوں سے میل نہیں کھاتی۔“

”میل تو یہ زندگی نہیں کھاتی..... اب یہی

تھا۔ جیسے بڑی بہن زہرہ پر لگ گیا تھا۔
 ”تمہیں کائنات یاد ہے بھر جانی..... چھوٹی
 ماں..... ابا کی تیسری بیوی۔“
 ”یاد ہے۔ خدا جنت نصیب کرے اسے۔“
 ”مجھے لگتا ہے وہ مری نہیں تھی۔ ماری گئی
 تھی۔“

”کس کے ہاتھوں.....؟“
 ”خود اپنے ہی ہاتھوں..... میں نے خود دیکھا
 تھا اسے زہریلی گھمبیاں اکٹھے کرتے..... اس نے
 وہ کھالی تھیں۔“

”میں نے بھی دیکھا تھا۔“ بھر جانی نے
 اعتراف کیا۔

”کیا.....؟“ رانی حیران ہوئی..... ”تو نے
 پھر اسے روکا کیوں نہیں..... مجھے تو بت پتا ہی نہ تھا
 کہ یہ اتنی زہریلی بھی ہوتی ہیں کہ جان لے لیں۔“
 ”ان گھمبیوں پر بڑی جانوں کی نظر تھی۔ تیری
 ماں کی بھی..... ساتھ والی کلثوم کی، خدیجہ
 کی..... میں کس کس کو روکتی.....“ بھر جانی نے
 توقف کیا۔ رانی فق چہرے سے بھر جانی کو دیکھنے
 لگی۔

”اچھا کیا..... روز روز مرنے سے بہتر تھا کہ
 وہ ایک دن میں ہی مر گئی.....“

”اور بڑی بہن..... کاش وہ بھی زہریلی گھمبیاں
 ہی کھا لیتی..... کیوں جانتے بوجھتے اس نے
 سانپوں کی کھولی میں ہاتھ ڈالا..... سچ بتاؤں تو مجھے
 چھوٹی ماں کی موت کا دکھ تو ہے لیکن بڑی بہن کا
 نہیں..... عورت کو سب کچھ ہونا چاہئے لیکن بدکار
 نہیں.....“

زہرہ رانی کی بڑی بہن تھی۔ ابا کی پہلی بیوی
 سے..... جسے ابا نے اپنے دوست کی تنہائی
 مٹانے کے لئے اس کے ساتھ کر دیا تھا۔ جیسے پرانی
 فائل میں نئے کاغذوں کو کیا جاتا ہے۔ زہرہ کی
 ماں اور سب کی بڑی ماں نے ابا سے ڈرتے ڈرتے

بس اتنا کہا تھا کہ جوڑ کا رشتہ ڈھونڈ لیتے ہیں۔ تیس
 سال کا فرق ہے دونوں میں..... اور ابا نے وہ مار
 ماری بھی بڑی ماں کو کہ وقت بھی کیا مارتا ہوگا انسان
 کو..... بڑی بہن کی شادی ہو گئی۔ پھر سالوں گزر
 گئے..... اور رانی اس کی شکل دیکھنے کو بھی ترس
 گئی۔ پھر ایک دن اس کی موت کی اطلاع پہنچی گھر
 میں..... اور اس بات کا فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ
 اطلاع پہلے گھر میں پہنچی ہے یا بڑی ماں کی سانس
 پہلے رکی ہے۔

بات صرف اتنی ہی پتا چل سکی کہ ایک دن
 زہرہ خالی کمرے میں کسی سے باتیں کر رہی تھی کہ
 بڑھے نے یہ سمجھ کر ماریا کہ کسی عاشق سے باتیں کر
 رہی ہے۔

بڑی ماں مر گئی اور چھوٹی ماں کا چڑیوں سے
 دوستانہ اور بھی بڑھ گیا۔ وہ بھول گئی کہ اس کے گھر
 میں ایک مینا بھی ہے۔ جسے اس گھر کے دستور نہ
 سکھائے تو وہ بھی اس کی طرح چڑیوں سے دوستی کر
 لے گی۔

”کیا بڑی بہن کا واقعی کسی کے ساتھ چکر ہو
 گا۔ تمہیں کیا لگتا ہے بھر جانی..... کیا اس وقت واقعی
 اس کے کمرے میں کوئی اور ہوگا؟“

”ہاں۔ اس کے کمرے میں تھا کوئی اور۔“
 ”اگر کوئی اور تھا تو پھر ملا کیوں نہیں..... کہاں
 چلا گیا وہ ایک دم سے..... بڑھے نے اسے کیسے
 چھوڑ دیا۔“

”کوئی اور تھوڑی تھا۔ وہ تو اپنے شوہر سے ہی
 باتیں کر رہی تھی۔“

”کیا بات کر رہی ہو بھر جانی..... شوہر تو باہر
 سے آیا تھا۔“ رانی بھنجھٹائی۔

”ہاں..... لیکن وہ والا شوہر نہیں..... وہ والا
 جو اس کے ذہن و دماغ میں تھا۔ وہ والا جو اس کی
 خواہش کے پہاڑ تلے رہا تھا۔“
 ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ رانی کچھ نہ سمجھی۔

”یہ ہی حقیقت ہے رانی..... وہ اپنے شوہر کے ساتھ ہی باتیں کر رہی تھی۔ اسے ہی پتہ نہ تھا کہ ہماری آنکھ سے دیکھو گے تو وہ نظر نہیں آئے گا نہ ہی ملے گا۔ لیکن اس کی آنکھ سے دیکھو تو وہ ہی اس کی ساری زندگی تھا۔“

رانی کچھ بھی کچھ اس نے فرض کر لیا۔

”چلو مان لیتی ہوں..... لیکن جب کمرے میں کوئی تھا ہی نہیں تو وہ بڑھے کو کیسے نظر آ گیا۔ بڑھے نے زہرہ باجی کو کیوں مار دیا پھر.....؟“

”شک..... شک بھی پر چھائی بن جاتی ہے رانی..... جسے دل میں کینہ اور بغض ہو تو مسکراہٹ بھی طعنہ لگنے لگ جاتی ہے۔ ویسے ہی ذہن میں شک ہو تو رتی بھی سانپ لگتی ہے۔ سانپ بھی عام نہیں..... اراتا سانپ.....“

بھر جاتی کے منہ پر پھرتا لاگ گیا۔

☆☆☆

کوئی اراتا سانپ پھنکارتا ہوا گزرا تھا اور ہر طرف فوٹکی سی پھیل گئی تھی۔

خون کی دھار بہتی بہتی دور جا نکلتی تھی۔ باریک سے اب گاڑھی ہو رہی تھی۔ سانسوں کی آروہی امروہی معدوم ہو رہی تھی۔ چاند بھی ڈرا سہا کہیں پناہ مانگ رہا تھا۔ لیکن صحراؤں میں نہ کوئی درخت تھا اور نہ کوئی کوکھ..... جہاں وہ چھپ سکتا..... صحرا میں تو شاید کہن بھی نہیں لگا کرتے..... کہن بھی ڈرتے ہیں ایسے خشک علاقوں میں آنے سے جہاں ہر لڑکی ذات کو جنم سے ہی کہن لگ چکا ہوتا ہے۔

جان نکلنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی تھی۔ موت کا فریشہ بھی جیسے انتظار میں تھا۔ وقت نے تواجل کے ہاتھوں ویسے بھی بہت سے زخم اٹھائے ہیں۔ چلو ایک یہ بھی سہی

☆☆☆

”تو کیا بہن صرف شک کی وجہ سے ماری گئی.....“ رانی نے ڈکھ سے کہا۔ جیسے اپنے آپ سے.....

”شک نہیں روایت کی وجہ سے..... اور اچھا ہو ماری گئی..... وہ لاکھ یقین دلاتی بھی کہ وہ ا سے باتیں کر رہی تھی تو اس بڑھے نے تب بھی نہیں یقین کرتا تھا اور پھر اگلے دن مردوں کی پچایت میں ایک عورت کے خلاف فیصلہ دے دیا جانا تھا۔“

”بھی میرے والے کو مجھ پر ایسا شک ہو گیا تو.....؟“

”ایسی بات نہ کر رانی..... ایک تو ہی تو ہے جس سے باتیں کر کے مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں بھی سانس لینے والی مخلوق ہوں۔“ بھر جاتی نے کہا اور گھٹ کے رانی کو پیٹھی ڈال لی۔ شال کے تارے جھلک کر نکلے۔

”ایک بات بتاؤ بھر جاتی، جب تم میری طرح کنواری ہوگی تو تمہارا بھی بڑا دل کرتا ہوگا نا ایسی شکنتوں والی شال لینے کو.....؟“

”ہاں..... بہت کرتا تھا..... خالوں ہی خالوں میں یہ شال اوڑھ کر رکھتی تھی۔ اماں کے جینز کی شال نکال نکال کر اوڑھتی رہتی تھی۔ مجھے لگتا تھا میری زندگی بس یہی شال ہی ہے۔“

”اور اب.....؟“

”اب بھی لگتا ہے کہ یہ شال ہی میری زندگی ہے۔ یہ ہی غم گسار ہے۔ اسی میں میرے آنسو جذب ہوں گے اور اسی گھر میں میری آخری سانسیں.....“

”بھائی بڑا سخت مزاج ہے نا.....؟“

”بھی مرد ہوتے ہیں۔ میرے ابا بھی ہیں میرے تینوں بھائی بھی ہیں۔ میرے بھائی نے مجھے گنگنا تے سن لیا تھا تو مجھے اتنا مارا تھا کہ چلنے لائق نہیں رہی تھی۔ جھٹ پٹ میری شادی کر دی۔ قسم کھا کھا کر کہتا تھا کہ میرا ضرور کسی کے ساتھ چکر ہے۔ میں چھپ چھپ کر ملکتی ہوں اس سے.....“

”شیر بھائی جی مجھے بڑا گھور گھور کے دیکھتا ہے۔ اپنے دھیان میں تھی دودھ ابل گیا، ابا کی جھاگ نے ایسی تصویریں بنائیں کہ میری ہنسی نکل گئی۔ کہنے لگا، کس عاشق کو یاد کر کے ہنس

رہی ہو۔“

ہیں۔ مجھ سے سیکھ لے۔۔۔۔۔“
 ”اب سکھار ہی ہو۔۔۔۔۔ جب زندگی کی سلیٹ پر آزادی لکھی جا چکی ہے۔ حق کی آزادی۔۔۔۔۔“
 ”تیری شادی ہونے والی ہے رانی۔۔۔۔۔ اور تو حق کی بات کرتی ہے۔ اب تو صرف مقدر رہ گیا ہے۔ جسے بدلائیں جا سکتا۔“

”لیکن مقدر کو توڑا جا سکتا ہے بھر جانی۔۔۔۔۔ میں نے اندازہ لگایا ہے۔ مقدر کے ساتھ جنگ لڑی جا سکتی ہے۔ مقدر کو مات دی جا سکتی ہے۔“
 ”کیسے۔۔۔۔۔؟؟“

”مقدر کے ساتھ کھیل کر۔۔۔۔۔“ رانی کی آنکھوں میں ناگ منی جیسی جوت جاگنے لگی تھی۔ بھر جانی کو ایک لمحے کے لئے رانی سے خوف سا آیا۔۔۔۔۔ ”لکھے ہوئے مقدر کو ہرایا جا سکتا ہے بھر جانی۔۔۔۔۔ خود کو ختم کر کے۔۔۔۔۔“

”ایسا کیوں سوچتی ہے رانی۔۔۔۔۔ شادی پر تو لڑکیاں بہت خوش ہوتی ہیں۔ تو موت کی باتیں کرتی ہے۔ آزادی کی بات کرتی ہے۔“
 رانی کوئی جواب نہ دے سکی۔

”اچھا بتا۔۔۔۔۔ ایک طرف شادی ہو رانی اور دوسری طرف حق کی آزادی تو تو کیا لیتا پسند کرے گی۔“

”پتا نہیں۔۔۔۔۔“ رانی نے بات ٹالی۔۔۔۔۔ لیکن اندر ہی اندر کوئی فیصلہ کر چکی تھی اور یہ فیصلہ تو اس کے اندر نجانے کب سے ہو چکا تھا۔
 ”دل کا بڑا اچھا ہے تمہارا بھائی۔ خود گیا ہے شہر جیمز خریدنے۔۔۔۔۔“

”پتا نہیں بھر جانی۔۔۔۔۔ پر مجھے لگتا ہے کہ ایک ایسے وقتوں میں مرد بڑا خوش ہوتے ہیں۔ وہ جیسے قیدی ہیں جو ایک سے دوسری جیل ڈالے جاتے اور جیل میں بڑا خوش ہوتا ہے کہ چلو میری جان تو چھوٹی۔ ایسے ہی دیکھ لو بھائی شبیر کو کیسے چوکیداری کرنی پڑی ہے تمہاری، کیسے دے پاؤں آتا ہے گھر، کیسے کان لگا کر میری تمہاری باتیں سنتا

ایک پرانی موٹر سائیکل بڑا شور کرتی ہوئی گزری۔ دونوں نے اس شور کو اپنے دل کے زخموں پر دوا کی طرح سنا۔ دونوں خاموش بیٹھی اندھیرے میں گھورتی رہیں۔

”بھر جانی۔۔۔۔۔ کیا ایسی زندگی میں اور موت میں کوئی فرق ہے۔۔۔۔۔؟“

”موت کے بعد کیا ہوگا کون جانے۔۔۔۔۔“
 ”زندگی میں کیا ہوگا میں جانتی ہوں۔۔۔۔۔ اسی لئے تو موت کو سوچتی ہوں۔ سچ بتاؤں تو میرا بڑا دل کرتا ہے مر جانے کو۔۔۔۔۔ سنا ہے عالم برزخ میں بڑے مزے ہیں۔“

”تیری شادی ہونے والی ہے رانی۔ ایسی باتیں نہ سوچ۔۔۔۔۔“

”کیسے نہ سوچوں۔۔۔۔۔ وہ کون سا اباسے یا شبیر سے الگ ہوگا۔ بادشاہ کی طرح رونی مانگا کرے گا۔ پھر مزدور کی طرح مارے گا۔“

”وہ دیکھ اتنی رات کو سفید پرندوں کا غول۔۔۔۔۔“ بھر جانی نے دھیان بٹانے کو دُور آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ بھر جانی۔۔۔۔۔“ رانی نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔۔۔۔۔

”کیا ہوا۔۔۔۔۔؟“ بھر جانی حیران ہوئی۔
 ”میں پرندوں کو نہیں دیکھتی بھر جانی۔۔۔۔۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔“

”پرندوں سے۔۔۔۔۔؟؟؟“
 ”ہاں۔۔۔۔۔ مجھے لگتا ہے جو میں نے ان کو دیکھ لیا تو میری اور ان کی دوستی ہو جائے گی۔ ویسی دوستی جو اماں کی ان سے ہے۔“

”کیوں اتنا سوچتی ہے۔“ رندھی ہوئی آواز سے بھر جانی بولی سبکھی بتایا ہی نہیں کہ میں لڑکی

”اماں نے سبکھی بتایا ہی نہیں کہ میں لڑکی ہوں۔ سوچنا میرا حق نہیں۔“

”لڑکیوں کے حق نہیں صرف فرائض ہوتے

ہے..... بے چارا ہر وقت بوسوگنٹا رہتا ہے تمہارے عاشقوں کی۔

دوئوں قہقہہ لگا کر بننے لگیں۔ ”اچھا ہے، مصیبت میں پڑا رہے۔ مجھے کیا۔“
 ”تمہاری جان بھی کہاں کیسی ہے۔ مارتا ہے، تو رات بھر رونی ہو۔“

”میں تو ماں کے پیٹ سے رو پیٹ رہی ہوں۔
کون سی نئی بات ہے۔ ویسے کہہ کر گیا ہے کہ میرے
لیے بہت ساری چیزیں لائے گا شہر سے.....“
”اور جو تم کہہ دیتیں کہ سرخی لے آتا تو.....“
”توبہ توبہ..... خود سے کہہ دیتی تو پہلے مارتا، پھر
گالی دیتا، پھر پوچھتا، ”کس یار کو دکھائی ہے؟“
”پھر کہتی ہو، دل کا بڑا اچھا ہے.....“ اس نے
چھیڑا۔

اس نے بڑی اداس سانس بھری۔ ”سب مرد اچھے ہوتے ہیں رانی، بری تو بس عورت ہوتی ہے۔“ دونوں کئی ہی دیر تک خاموش رہیں۔ رانی نے ٹھنڈ سے کچی لی تو بھر جائی نے اسے اپنی شال میں بھر لیا۔ رانی نے بھی سر اس کے شانے پر رکھ دیا۔ اور شال کے شیشوں میں اپنا عکس دیکھنے لگی۔

”مجھے بھی یہ شال لینے کا بہت شوق ہے بھر جائی..... شال اوڑھ کر کسی کے ساتھ لپٹ جانے کی چاہ ہے۔ کیا وہ بھی مجھے اسی طرح اپنے ساتھ لگا لیا کرے گا؟“

”لگاتو لے گا۔ بس دعا کرنا کہ پھر پرے نہ
 ہکلیے.....“

”جیسے ابا نے اماں کو پرے دھکیل دیا ہے۔ دو بچوں اور دو بیویوں کے بعد..... اور تب ہی اماں نے پرندوں سے دوستی کر لی ہے۔..... سنا ہے میرے والا بھی بہت کڑوا ہے۔“

”بیٹھا کرنے کی کوشش بھی نہ کرنا اسے۔۔ مرد کو اس کی غلطی بتاؤ تو وہ اور زیادہ اگڑتا ہے۔“ بھابھاج نے سرگوشی کرتے ہوئے راز کی بات بتائی۔

پیارے بچوں کے لئے

قصص الانبياء



تمام انبیاء علیہ السلام کے بارے میں مشتمل

ایک ایسی خوبصورت کتاب جسے آپ

اپنے بچوں کو پڑھانا چاہیں گے۔

کتاب کے ساتھ حضرت محمد ﷺ

شاخہ و مفت حاصل کریں۔

قیمت - 300/- روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے پر ڈاک خرچ - 50/- روپے

بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 اردو بازار، کراچی۔ فون: **32216361**

رات اتنی تاریک تھی اور ان کی سرگوشیاں اتنی مدھرتھیں کہ لگتا تھا جیسے دو پریمی بانسری بجا رہے ہوں۔ ساری دنیا سے چھپ کر راز و نیاز کر رہے ہوں۔

عورت کے دل کے راز ہی کتنے ہوتے ہیں..... وہ محبت کرے تو بھی، محبت نہ کرے تو بھی۔ اس کے پاس ہوتا ہی کیا ہے جو چھپائی پھرے یا اترا تپا پھرے۔ تھرکی ریت، اور دھوپ کی تمازت میں اتنی حدت ہی کہاں ہوتی ہے کہ آگ بھڑکا سکے۔ عورت عورت کی غم گسار بنی ہوئی تھی۔ وہ جو بھائی کے سامنے ہنس کر بات بھی نہیں کرتی تھی، اس وقت چھپ کر رو رہی تھی اپنے اپنے نصیب پر..... مقسوم پر.....

اور چھت کی سڑک کی طرف کی منڈیر کے پاس بیٹھے ایک ہی شمال میں ایک دوسرے سے اپنے دل کے راز کہتے، انہوں نے ایک سائے کو اپنے پیچھے آتے دیکھا ہی نہیں.....

ان کے پیچھے دے پاؤں آتے شبیر نے ان دونوں کو راز و نیاز کرتے دیکھا تو اسے سمجھنے میں وقت نہ لگا کہ اس کی بدکردار بیوی، چھت پر رات کے اس پہر کیا کر رہی ہے۔

☆☆☆

سرخ گھنوں والی شمال میں دونوں لاشیں ایک ساتھ اکٹھی پڑی تھیں۔

”کون تھا؟“ کسی نے شبیر سے پوچھا تھا۔
”یار تھا گنجری کا..... میں شہر کیا گیا تو اسے گھر پر ہی بلا لیا.....“ شبیر نے دو فائر داغنے کے بعد دونوں لاشوں پر تھوک پھینکا۔

چاند کی روشنی سمٹ گئی۔ لالٹینیں بجھ گئیں اور سورج نے بھی نہ طلوع ہونے کا تہیہ کر لیا۔
چڑیوں کی سہیلی اماں دو فائر کی گونجتی آواز کا اور ایک آہ کا شور سن کر اوپر آئی تھی۔ خود اسے بھی چھت پر آئے ایک عرصہ ہوا تھا۔ اور ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ آسمان کے تاروں کو دیکھے یا لاش پر پڑی

شمال کے چمکتے شیشوں تلے چھپی اپنی بہو کو.....
”کس گاؤں کا ہے..... بلاوا بھیجواتے ہیں کہ اپنے نامرد کی لاش لے جاؤ۔“

”بھئیوڑے گاؤں کا لگتا ہے۔ ڈیل ڈول زانا نہ ہے۔ وہاں کے مرد ہی کھسے لگتے ہیں۔“
اور ہوں ہی شبیر نے یہ دیکھنے کے لیے کہ اس کی بیوی کا عاشق کون ہے دوسری لاش سے شمال کھسکا تو اماں کی ایک چیخ اس قدر بلند آواز سے نکلی کہ بعد میں اس گاؤں میں پیدا ہونے والا ہر بچہ بہرہ پیدا ہوا.....

شبیر کا غصے سے تپا ہوا چہرہ ساکت ہو گیا۔ دھب سے وہ زمین پر بیٹھا..... بھر جائی اور رانی کی لاش اوپر تلے ایک دو بے پرگری ہوئی تھیں۔ لاش، لڑکی..... بدی، بدکاری..... گف گناہ..... غیر محرم اور غیرت..... سب آپس میں اس طرح گھلے ہوئے تھے جیسے چائی میں لسی بلوئی جالی ہے۔

اماں دونوں لاشوں پر بیٹھی حلق پھاڑ کر چلا رہی تھی۔
”بلاوا بھیجواتا ہوں ابھی.....“ کوئی پتھر بنے شبیر سے کہہ رہا تھا۔

بھر جائی نے ٹھیک کہا تھا کہ بڑی بہن روایت اور شک کی وجہ سے ماری گئی۔ دل میں شک ہو تو رسی بھی سانپ لگنے لگتی ہے۔

سوچا تو رانی نے بھی ٹھیک تھا۔ اور بھر جائی کا یہ سوال کہ اسے شادی کرنی ہے یا آزادی..... اس کے جواب میں ”آزادی“ کہہ دیا تھا۔

رانی یہ راز اپنے ساتھ ہی لے گئی کہ جس وقت اس کا بھائی ہندو ق لیے ان دونوں کا نشانہ باندھ رہا تھا، اس نے شمال کے شیشوں میں بھائی کو دیکھ لیا تھا۔ اور پیدائشی حق والی آزادی حاصل کر لی تھی۔

مٹی سے لپی ہوئی چھت، ان کا خون جذب کرنے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ پچی پچی سڑک پر سے اب کوئی موٹر سائیکل گزرنے والی نہیں تھی۔

☆

فہرست

ہوں۔۔۔!

(ورلڈ بیسٹ فادر) ہوں۔۔۔!

! اتی رائے کے مطابق)

”میں یاروں کا یا ر اور اور۔۔۔۔۔!!“

نہیں شاید مجھے پہلے اپنا تعارف کروانا چاہیے تھا۔

میرا نام ذیشان ملک ہے! اور میں ایک بینک

”مجھے صرف یہ کہنا چاہیے تھا کہ میں ایک

روایتی ”مرد“ ہوں۔۔۔!

آپ حیران ہو کر سوچ رہے ہوں گے کہ میں اتنے آرام سے کیسے خود کو روایتی مرد کہہ رہا ہوں۔ کیا میری انا مجھے نہیں روکتی!! ایسے اعتراف کرنے سے۔۔۔!!

سچ بتاؤں؟

قسم سے روکتی ہے، بہت روکتی ہے، زنج کرتی، تنگ کرتی، طعنے دیتی ہے! عمر میں کیا کروں کہ ضمیر نام کی چھین دل کو چیر نگیں ہے!

میں اتنا احساس تو کبھی بھی نہیں رہا ہوں۔۔!



مگر جب سے دل کی زمین پر درد کا نیلا پھول کھلا ہے - فہرست سن کر یاد کر چکا تھا۔
میرادل ایسے ہو گیا ہے جیسے لبالب بھرا ہوا پیمانہ۔!
جو ہر وقت پھلنے کو بے تاب۔۔۔۔۔ بس موقع کی تلاش میں رہتا ہے!

ہاں تو میں بتا رہا تھا کہ میں ایک روایتی مرد ہوں۔۔۔!
نہیں میں بتا نہیں رہا۔۔۔! میں اعتراف کر رہا ہوں کہ میں ایک روایتی مرد ہوں۔۔۔!
(کیا صرف یہ اعتراف کرنے کے بعد، سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے؟)

کیا آگے کی داستان سنانا ضروری ہے! وہہہہہ
دراصل اناروک رہی ہے کہ۔۔۔۔۔!!
اچھا میں بتاتا ہوں۔۔۔! چھپا کر بھی تو اذیت ہی جھیل رہا ہوں۔

ہاں تو یہ بات ہے، آج سے آٹھ سال پہلے کی!
جب سرخ لباس میں لمبوس، نازک اور ڈری نہمی سی ماہتاب میری زندگی میں بہار کے اولین جھونکے کی طرح داخل ہوئی تھی۔

☆☆☆

”تم نے اچھی طرح سمجھا دیا تھا نا! پہلے دن سے ہی بیوی کو اچھی طرح سے یہ باور کروا دینا ضروری ہوتا ہے کہ شوہر کے نزدیک اس کے والدین اور بہن بھائیوں کی کیا اہمیت ہے! اللہ بخشے! تمہاری دادی جان کہا کرتی تھیں کہ۔

”بیٹے کا اچھا یا برا گرم سرد رویہ پہلے دن ہی بہو کو سمجھا دیتا ہے کہ اسے اپنے سسرال والوں سے کس حد تک بنا کر رکھنی ہے! اس لیے سمجھ دار مرد پہلے دن ہی بیوی کے دل میں اپنے گھر والوں کی دھاک بٹھا دیتے ہیں، اس لیے تو پھر ساری زندگی بیوی کی جرات نہیں ہوتی کہ اپنے سسرال والوں کے آگے سر اٹھا کر بات بھی کر جائے!“

ذیشان نے ہاتھ میں پکڑے موبائل پر نظر جمائے ہوئے، سر ہلایا تھا۔ جس دن سے اس کی شادی کی تاریخ طے ہوئی تھی، وہ ایسے فرمودات کی ایک طویل

فہرست سن کر یاد کر چکا تھا۔
”یہ فرمان، فرمودات کی فہرست میں شاید ایک سو ایک نمبر پر تھا۔“

ذیشان نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر سر جھٹک کر گیم کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اسے صرف اتنا یاد تھا کہ اس سے پہلے کے سو فرمان، مکتبی سے لے کر شادی تک کے دنوں میں سسرال کو نیچا دکھانے اور ان پر اپنا رعب جمانے کے لیے تھے۔

”امی! آپ فکر مت کریں! ماہتاب سے آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی،“
ذیشان کا گیم ختم ہونے کے قریب تھا۔ اس لیے اس نے بغیر سوچے سمجھے، ماں کو تسلی دی تھی مگر جب اسے خود پر گڑی ان کی سخت نظروں کا احساس ہوا، تو گڑ بڑا کر رہ گیا۔

”واہ بیٹاجی! ابھی ایک دن ہی ہوا ہے اور تم اپنی بیوی کی گارنٹی بھی دینے لگ گئے ہو! بہت تیز لگی ہے یہ بھولے بھالے چہرے والی ماہتاب۔۔۔!“
سعیدہ بیگم نے بیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا تو ذیشان نے گیم ادھورا چھوڑا اور فوراً ماں کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔۔

”ارے نہیں امی جان! میں تو اس لیے کہہ رہا تھا کہ میں نے آپ کے حکم کے مطابق اسے اچھی طرح ذہن نشین کروا دیا ہے کہ میرے لیے میرے والدین اور بہن بھائیوں سے آگے کچھ بھی نہیں ہے۔“
ذیشان اپنی جگہ سے اٹھ کر ماں کے پاس تخت پر بیٹھ کر ان کے پاؤں دبانے لگا۔

”چل ہٹ! سب جھگڑتی ہوں میں۔۔۔!“
سعیدہ بیگم نے مصنوعی حقکی سے کہا۔ اسی وقت چادر میں لپی گھرائی ہوئی سی ماہتاب اور اس کے ساتھ ذیشان کی چھوٹی بہن حرا چلی آئی۔

”امی! بھابھی کو پارلے کر جانا ہے۔ ٹائم ہو گیا ہے۔ چلیں بھائی! ہمیں چھوڑ آئیں۔“
حرا نے مصروف سے انداز میں کہا تو ذیشان نے پلٹ کر ان دونوں کی طرف دیکھا۔

”میں ابھی فارغ نہیں ہوں! تم ایسا کرو کہ عثمان کے ساتھ چلی جاؤ!“
حرا نے حیرت سے ذیشان اور پھر ماں کی طرف دیکھا۔

”مگر بھائی!“ ماں نے گھورا۔ تو حراسر جسٹک عثمان کو بلانے کے لیے اندر کی طرف چلی گئی۔
ماہتاب خاموشی سے کونے میں کھڑی رہی۔ وہ دونوں ماں بیٹا، اسے کوئی بھی اہمیت دیے بغیر باتوں میں مصروف تھے۔ ماہتاب خاموشی سے سر جھکائے اپنے مہندی سے سجے پاؤں دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد حرا اور عثمان چلے آئے۔ پھر وہ تینوں خدا حافظ کہہ کر چلے گئے۔

”چلو تم بھی تیاری کرو۔ شام کو ولیمہ ہے!“
سعیدہ بیگم نے مطمئن ہو کر بیٹے کو اٹھنے کی اجازت دی۔
ذیشان نے پرسکون ہو کر گہری سانس لی۔
”شکر ہے کہ امی کا موڈ بہتر ہو گیا۔“

☆☆☆

”ذیشان! میری بات سنیں! میں ماما کو کیا کہوں گی کہ۔۔۔!!“

ولیمہ کے لباس میں بنی سنوری، ماہتاب پریشان چہرہ لیے کھڑی تھی۔ ذیشان نے ٹائی لگاتے ہوئے، سے خشنے میں سے گھورا تھا۔

”ماہتاب! تمہاری ماما کیا کہتی ہیں یا کیا نہیں۔۔۔ مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا۔ میرے لیے یہ ضروری ہے کہ میری امی کی خوشی کس میں ہے۔ وہ اگر یہ بات پسند نہیں کرتیں تو تمہیں کیا مسئلہ ہے!“

ذیشان نے مڑ کر اسے گھورا تو ماہتاب کچھ کہتے بچے رک گئی مگر اس کی آنکھوں میں ابھرتی نمی، ذیشان کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہی تھی۔ وہ سر جھٹک کر لڑے سے باہر نکل گیا۔ سب لوگ شادی ہال میں ہانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔

”مہارانی صاحبہ کی تیاری ختم نہیں ہوئی کیا؟“
میدہ بیگم نے طنز یہ لہجہ میں کہا۔ اسی وقت سر بھگائے ماہتاب بھی کمرے سے نکل آئی تھی۔

ویسے کی تقریب ختم ہوئی تو ماہتاب کی خوبصورت اور اسماٹھی سی ممانے ان دونوں کو رسم کے مطابق ساتھ چلنے کو کہا تو ماہتاب نے ہنچکاتے ہوئے منع کر دیا۔
”مگر کیوں ماہتاب۔۔! خاندان والے کیا کہیں گے؟“ ماہتاب کی مماناں بیگم نے حیرت سے بیٹی کے چہرے کی طرف دیکھا۔

”مرضی ہے آپ کی بیٹی کی! ہمارے یہاں ایسی کوئی رسم نہیں ہے۔ اس لیے ذیشان ہمارے ساتھ گھر جا رہا ہے!“ سعیدہ بیگم نے سخت لہجہ میں کہا۔
”بس وہ ماما! ویسے ہم کل آپ سے ملنے آئیں گے۔“ ماہتاب نے جلدی سے کہا۔ ارم نے پاس بیٹھی منہ بنائی سعیدہ بیگم اور باادب بیٹھے ذیشان کی طرف دیکھا۔ جو ایسے لاپرواہان کے بیٹھا ہوا تھا، جیسے اس کا اس بات سے کوئی لینا دینا ہی نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتیں۔ خاور جلدی سے آگے بڑھے اور معاملے کو خوش اسلوبی سے ختم کرتے ہوئے، اپنے مخصوص زندہ دل انداز میں بولے۔

”چھوڑو بس بیگم صاحبہ! ان فضول کی رسموں کو! دل جس سے خوش اور مطمئن ہوں، بس وہ ہی رسمیں ٹھیک لگتی ہیں۔ سعیدہ بہن! کل رات کے کھانے پر آپ سب مدعو ہیں! ایک شاندار سی دعوت، میرے شاندار سے بیٹے ذیشان کے لیے۔“

خاور نے ایسے کہا کہ ذیشان مسکرا کر اثبات میں سر ہلانے لگا۔ ارم نے ایک ڈکائی نظر شوہر پر ڈالی تو وہ انھیں آنکھوں ہی آنکھوں میں چپ رہنے کا اشارہ کرنے لگے۔

ماہتاب والدین سے مل کر بوجھل قدموں کے ساتھ، ذیشان کے پیچھے چل پڑی۔

”ماما! آپ نے ہمارے ساتھ نہیں جانا تھا؟“

پری میڈیکل کی طالبہ ردا نے حیرت سے سوال کیا تھا۔
”تو او رکیا! ہم نے تو اتنے سارے پلان بنائے ہوئے تھے۔“ میٹرک کی طالبہ کرن نے بھی حیرت سے سوال کیا۔

”بیٹا! آئی کل آئیں گی آپ سے ملنے، چلو

سے انھیں گھورا تھا۔

”ایک تو میری اولاد، ہمیشہ میرے الٹ ہی جائے گی۔ لوگوں کے بچے اپنے والدین کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں اور ایک میرے بچے ہیں۔ ہر بات میں نیا نکتہ، ہر بات میں نگرار لے کر بیٹھ جائیں گے۔“

”امی! آپ غصہ مت کریں۔ حرا ابھی بچی ہے اسے کہاں سمجھ ان باتوں کی!“ ذیشان نے فوراً گے بڑھ کر کہا۔ تو سعیدہ بیگم منہ میں بڑبڑانے لگیں۔

”جاؤ حرا تم اچھی سے چائے بنا کر لاؤ!“ ذیشان نے حرا کو اشارہ کیا تو وہ سمجھ کر اٹھ گئی۔

”میں تو چائے نہیں پیوں گا۔ بہت نیند آ رہی ہے۔“

عثمان نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ اس وقت ہی افتخار علی ملک کمرے میں داخل ہوئے۔

ذیشان نے باپ کو کمرے میں آتے دیکھا تو احترام سے اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔

”بیٹے رہو بیٹا! شکر ہے سب کام خوش اسلوبی سے ہو گئے ہیں۔“ افتخار علی عثمان کی نماز ادا کر کے آئے تھے۔ اس لیے ایک ہاتھ میں تسبیح تھی۔

دوسرے ہاتھ سے ذیشان کا کندھے پر ہلکی دی اور اس کے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گئے۔

”سعیدہ بیگم! مجھے آپ کا رویہ کچھ پسند نہیں آیا۔ آپ کم از کم یہ تو خیال کر میں کہ نئی نئی رشتہ داری بنی ہے۔“ افتخار علی کے کہنے پر سعیدہ بیگم تپ کیں۔

”میں نے ایسا کیا کر دیا ہے؟ آپ کے تو شکوے نہیں ختم نہیں ہوتے۔ ہر وقت مجھ پر تنقید کرتا۔ آپ کا پسندیدہ کام ہے۔“

حرا چائے کی ٹرے اٹھا کر کمرے میں داخل ہوئی۔ ماں کا موڈ آف دیکھ کر، اس نے کچھ بھی کہنے سے گریز کیا اور چائے کے کپ سب کو پکڑا کر کمرے سے باہر جانے لگی۔ جب افتخار علی نے اسے پکارا۔

”حرا بیٹی! مہتاب سے پوچھ لیتا، اسے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔“

”جی ابو! میں بھابھی کے پاس سے ہو کر آ رہی

سب گاڑی میں بیٹھو، میں آ رہا ہوں۔“

خاور نے نرمی سے اپنی لاڈلی بیٹیوں کو سمجھایا اور پھر ارم کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر انھیں دلاسا دیا تھا۔

”حوصلہ رکھیں آپ! ہماری بچی کے آگے ابھی بہت لمبا سفر بڑا ہوا ہے۔ اگر ابھی سے ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو لے کر بیٹھ جائیں گے، تو اس کے لیے زندگی مشکل ہو جائے گی!“

خاور کے سمجھانے پر ارم سر ہلا کر رہ گئیں مگر ان کا دل اندر سے بہت بے چین تھا۔ اللہ نے انھیں کوئی بیٹا نہیں دیا تھا۔ یہ تینوں بیٹیاں انھیں جان سے بڑھ کر پیاری اور عزیز تھیں۔ مہتاب نے ایم۔ ایس سی فزکس کیا تھا۔ جب اس کے لیے آیا پہلا رشتہ ہی قبول کر لیا گیا اور اسے بہت دھوم دھام سے، بہت اربانوں کے ساتھ رخصت کیا گیا۔ اب اس کے سرسرا کے سرد رویتے انھیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہے تھے۔

☆☆☆

”مہتاب کی ماں کے تئیر اور انداز دیکھے تھے؟ ایک تو اپنی عمر کا خیال نہیں اسے۔! اوپر سے عجیب عجیب فیمن کرنی ہیں محترمہ۔ اس عمر میں سویر ہونے کے بجائے لڑکی بننے کی کوشش میں لگی ہوئی ہیں۔ ویسے بہت تیز اور چالاک ہے وہ۔۔!“

ویسے سے واپسی پر مہتاب کے علاوہ باقی سب سعیدہ بیگم کے کمرے میں جمع تھے۔ ویسے کے فنکشن پر تفصیل سے تبصرے کیے جا رہے تھے۔

سعیدہ بیگم نے منہ بنا کر ارم کا ذکر کیا تو ذیشان کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ اسے دوپہر والی معمولی سی بات کا نتیجہ اچھی طرح یاد تھا۔ اس لیے اسے فی الحال خاموشی ہی بہتر لگی تھی۔

”امی! ایسا تو مت کہیں! ارم انٹی بہت اسارٹ اور سو برعورت ہیں۔ اپنے آپ کو بہت فٹ رکھا ہوا ہے۔ لگتا ہی نہیں ہے کہ وہ جوان بیٹیوں کی ماں ہیں۔“ حرا نے متاثر کن لہجے میں کہا تو عثمان نے بھی سر ہلا کر تائید کی تھی۔ جس پر سعیدہ بیگم نے غصے

”ماہتاب آئی! آج آپ رک جائیں نا۔ ہم بہت ساری باتیں کریں گے اور۔۔۔۔۔“
کرن نے پرجوش انداز میں کہا تو ماہتاب و میرے سے مسکرا دی۔
”آج نہیں گڑیا! کسی دن ویک اینڈ پر آؤں گی۔ شادی کی مووی اور البم آجائے۔ مل کر ویڈیو بنائیں گے۔“
ذیشان نے سر کھٹا کر اس کی طرف دیکھا۔
ماہتاب نے اس بار سمجھ داری سے معاملے کو ہینڈل کر لیا تھا۔ ذیشان کو یہ بات اچھی لگی کہ ماہتاب عام لڑکیوں کی طرح نہیں ہے بلکہ بہت سلجھی ہوئی اور سمجھ دار لڑکی ہے۔ جس نے کچھ دنوں میں ہی سسرال کے ماحول کو سمجھ کر قدم اٹھانا سیکھ لیا تھا اور یہ سب اچھی تربیت کا نتیجہ تھا۔ ذیشان کے دل میں جہاں ماہتاب کے لیے نرم جذبہ پیدا ہوا تھا، وہاں ہی اس کے والدین کے لیے بھی عزت بڑھی تھی۔

☆☆☆

آنے والے وقت نے ثابت کیا کہ ماہتاب اس کے لیے بہترین انتخاب تھی۔ اس نے جس طرح تیزی اور سمجھ داری سے اپنی جگہ بنائی تھی، وہ حیران کن تھا۔ سعیدہ بیگم کا مزاج جتنا بھی کڑوا تھا، ماہتاب کے بغیر ان کا کوئی کام بھی نہیں ہوتا تھا۔ ماہتاب ان کا رائٹ ہینڈ تھی۔ ہر بات میں، ہر چیز میں مشورہ لینا اور اس پر عمل کرنا ماہتاب کی ذمہ داری تھی۔ ماہتاب کو اللہ نے جڑواں بچوں سے نوازا۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ گھر میں رونق اور چہل پہل ہو گئی۔ ان دونوں خرا کے لیے بھی بہت اچھا رشتہ آیا تو جھٹ منگنی، پٹ پٹاہ والا معاملہ بن گیا۔ اتفاق سے روا کا رشتہ بھی خالہ کے خوبرو نانا کو ڈاکٹر بیٹے سے طے پا گیا۔ جو شادی کے فوراً بعد روا کو اپنے ساتھ امریکا لے کر جا رہا تھا۔ اس لیے پہلے نکاح ہوا اور جب اس کے پیپر ز بن گئے تو شادی کی تاریخ طے پا گئی۔

ذیشان کو لگتا تھا کہ ماہتاب اس موقع پر انصاف نہیں کر پائے گی۔ ایک طرف بہن کی شادی تھی اور دوسری طرف نند کی۔۔۔۔۔! سعیدہ بیگم بار بار

ہوں۔ انھیں جائے کے ساتھ سرور کو ٹیلیٹ دی ہے۔ اب آرام کر رہی ہیں۔“
”ماہتاب بیٹی کی طبیعت خراب ہے۔ ذیشان تم یہاں بیٹھے ہوئے ہو! جا کر دیکھو۔ اگر زیادہ خراب ہے تو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔“
افتخار علی نے کہا تو ذیشان فوراً اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور ”جی ابو“ کہہ کر، حرا کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔
”اونہ! سب ڈرامے ہیں یہ، ملکہ عالیہ کے سر

میں درد ہو رہا ہے۔“

سعیدہ بیگم کا پارہ چڑھا ہوا تھا۔ افتخار علی کچھ کہتے کہتے ترک ملنے۔ وہ رات کے اس پہر بیوی سے بحث نہیں کرنا چاہتے تھے۔ سعیدہ بیگم کا ٹیکھا مزاج ہری میرچ کی طرح تھا۔ وہ کسی سے بہت کم ہی خوش ہوتی تھیں۔ اس لیے تو ان کی بہت کم لوگوں سے بنتی تھی۔

☆☆☆

”ماہتاب! تم خوش تو ہونا؟ کیسے لوگ ہیں یہ؟ تمہارے ساتھ ان کا رویہ اور ذیشان۔۔۔! وہ کیسے مزاج کا ہے؟ بظاہر تو بہت کمیز دار اور باادب لگتا ہے مگر۔۔۔۔۔!“

ذیشان جو موبائل کان سے لگائے، باتیں کرتا ہوا، لاؤنج میں چلا آیا تھا۔ فون بند کر کے وہ واپس ڈرائنگ روم کی طرف مڑا، جب بچن سے آتی بلکی سی آوازوں پر چونکا۔

”جی ماما! سب ٹھیک ہے۔ آپ پریشان مت ہوں۔“

ماہتاب کی مدھم سی آواز ابھری۔ وہ گہری سانس لے کر آگے بڑھ گیا کیونکہ وہ یہاں زیادہ دیر کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ارم اور ماہتاب آگے پیچھے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔ حرا کے ساتھ باتیں کرتی روا اور کرن نے مسکرا کر ماہتاب کو اپنے پاس بیٹھنے کو اشارہ کیا۔

ذیشان کے سامنے اپنی اس سوچ کا اظہار کرتیں تو ذیشان بھی ماہتاب کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگا۔ اسے بھی لگتا تھا کہ ماہتاب انصاف نہیں کر سکے گی۔۔۔!

مگر یہاں بھی ذیشان حیران رہ گیا، جب اس نے ماہتاب کو حرا کی شادی کی تیاریوں سے لے کر شادی کے ہر فنکشن تک آگے آگے دیکھا۔

ردا کی شادی کے فنکشن بھی شروع ہو گئے تھے۔ جب سعیدہ بیگم مکلاوے کے لیے حرا کو اپنے گھر لے کر آئیں تو ماہتاب سے زیادہ ذیشان حیران ہوا

تھا۔ اسے آج بھی یاد تھا کہ امی نے ماہتاب کے گھر والوں کو سختی سے منع کر دیا گیا تھا۔ ذیشان کو سب سے زیادہ شرمندگی کا احساس اپنی بیوی کے سامنے ہو رہا

تھا۔ جو سب کچھ بھلائے اچھی بہو ہونے کا فرض ادا کر رہی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ماہتاب کے دل میں کیا ہے؟ کیوں کہ اس نے ذیشان کے سامنے بھی کسی بات کا شکوہ نہیں کیا تھا۔ بھی بھی ذیشان کو لگتا تھا

کہ جیسے وہ رو بوٹ ہے۔ جو اپنے فرائض تو بخوبی سر انجام دے رہی ہے۔ مگر وہ اپنی خواہشات اور خیالات کا اظہار کرنا ضروری نہیں سمجھتی تھی۔

ردا کی شادی سے دو دن پہلے افتخار علی نے ماہتاب کو عثمان کے ساتھ میکے بھیج دیا۔ وہ سعیدہ بیگم کے ساتھ ساتھ ذیشان پر بھی بہت غصہ ہوئے تھے کہ جو کسی کی خاموشی اور سعادت مندی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے تھے۔

ذیشان کو اپنے غلط رویے کا احساس اکثر شدت سے ہونے لگا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ جیسے اس کے اور ماہتاب کے درمیان جھجک کی ایک لکیر ہے، جس کے بار دونوں کب سے کھڑے ہیں نہ ماہتاب کبھی اس لکیر سے آگے بڑھی تھی اور نہ ذیشان۔۔۔!

یہ وقتی سوچیں ہوتیں جو کبھی کبھی اسے بے چین کرتیں اور وہ سر جھٹک کر پھر سے اپنے روزانہ کے معمولات میں مصروف ہو جاتا مگر جب گھر میں عثمان کی شادی کے ہنگامے جاگے تو ذیشان ایک عجیب

سی خلش کا شکار رہنے لگا تھا۔ عثمان منہ پھٹ اور بہت بولتا تھا۔ اتفاق سے کنول بھی ایسا ہی مزاج رکھتی تھی۔ کنول عثمان کی کلاس فیلو تھی۔ یہ لومیرج بہت مشکل سے ارچ میرج میں ڈھلی تھی۔ سعیدہ بیگم اتنی

آزاد خیال لڑکی کو بہو نہیں بنانا چاہتی تھیں مگر یہاں بات ان کی چاہت کی نہیں تھی بلکہ عثمان کی چاہت کی تھی۔ جس نے گھر بھر میں ایک ہنگامہ برپا کر رکھا

تھا۔ مجبوراً سعیدہ بیگم کو ماننا پڑا۔ عثمان کی شادی روایتی دھوم دھام سے سرانجام پائی۔ کنول اور عثمان کی ذہنی ہم آہنگی اور ایک دوسرے کے لیے فکر اور

محبت دیکھ دیکھ کر ذیشان اکثر سوچ میں گم ہو جاتا تھا۔ وہ ماہتاب کو دیکھتا۔۔۔! کیا فرق تھا ماہتاب اور کنول میں۔۔۔!

دونوں آج کے دور کی لڑکیاں تھیں۔۔۔۔! دونوں پڑھی لکھی اور خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ ویل آف فیلٹی سے تعلق رکھتی تھیں۔

مگر دونوں کے مزاج اور عادتوں میں اتنا ہی فرق تھا، جتنا ان دونوں کی قسمت میں۔۔۔۔!! ہاں یہ قسمت ہی تو تھی، جو ماہتاب جیسی ہیرا لڑکی کو، قدر کرنے والا شوہر نہیں دے سکتی تھی!

”کیا میں غلط ہوں؟“ ذیشان اکثر سوچتا۔ جواب میں ایک لمبی ”ہاں“ اس کی منتظر ہوتی تھی۔ اور ذیشان اپنے ہی سوال پر شرمندہ ہو کر رہ جاتا تھا۔

☆☆☆

سعیدہ بیگم کو اچانک دل کا شدید دورہ پڑا اور وہ ایک ہفتہ ہسپتال میں داخل رہیں۔ ان دنوں ذیشان کو لگتا تھا جیسے کائنات میں کچھ اور نہیں ہے۔ وہ ہر وقت ماں کی پٹی سے لگ کر بیٹھا رہتا۔ ساری ساری رات ان کے سر ہانے جاگ کر گزار دیتا۔ وہ اپنی ماں کو چھوڑ کر گھر نہیں جاتا تھا کہ جیسے وہ گھر جائے گا تو اس کی ماں کو ابل کا فرشتہ اپنے ساتھ لے جائے گا۔! وہ ایک خوف زدہ بچے کی طرح ماں کا چہرہ دیکھتا رہتا۔ ڈاکٹر زان کی حالت سے پُر امید نہیں

ذیشان کا خدشہ سچ ثابت ہوا تھا۔ اس کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی موت کے فرشتے نے تیزی دھکائی تھی۔ ان دنوں ذیشان کو ایسا لگتا تھا جیسے وقت روٹی کے گالوں کی طرح اڑ رہا ہے اور وہ اس وقت کے درمیان کہیں بھی نہیں تھا۔

نجانے کتنا عرصہ لگا اسے سنبھلنے میں۔۔۔!!

☆☆☆

وقت تیزی کے ساتھ آگے بڑھتا تھا۔ عثمان اور کنول لندن میں سیٹ ہو گئے۔ حرا اپنے دونٹ کھٹ بچوں کے ساتھ، ایک خوش گوار زندگی گزار رہی تھی۔

افتخار علی بڑھاپے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے، اپنی فراغت کے لمحات میں سے کچھ وقت کتب بینی میں گزارتے تھے۔ باقی دن میں اپنے دوستوں کے ساتھ واک اور گپ شپ کرتے اور دن کا سب سے خاص حصہ اپنے دونوں شرارتی پوتوں اور معصوم سی پوتی کے ساتھ کہانیاں سنانے اور مختلف کھیل کھیلنے میں گزار دیتے تھے۔ وہ اپنی زندگی سے بہت مطمئن تھے۔

ذیشان کے چہرے کی سنجیدگی میں اضافے کے ساتھ ساتھ، ایک سنہری رنگ کے فریم کا بھی اضافہ ہوا تھا۔ ماہتاب نے سارے گھر کی ذمہ داری خوش اسلوبی سے اٹھا رکھی تھی۔ حرا کے ساتھ فون پر گپ شپ رہنے کے ساتھ ساتھ فیشن سے لے کر کھانے پکانے کی نئی نئی ترکیب کا تبادلہ روزانہ کی بنیاد پر ہوتا تھا۔ حرا کے لیے ماہتاب اس کی بھابھی سے زیادہ بڑی بہن اور دوست تھی۔

زندگی میں سب کچھ بہت اچھا اور خوبصورت تھا۔ ذیشان خوش تھا مگر مطمئن نہیں۔۔۔! نجانے کیوں؟

اس کیوں کا جواب اسے اس دن ملا، جب بی۔ پی شوٹ کر جانے کی وجہ سے ارم بیگم کو ہسپتال لے ہونا پڑا اور ماہتاب دیوانہ وار اپنی ماں کی جبرگیری کرنے میں لگ ہوئی تھی۔ وہ دن بھی ایسا ہی تھا جب۔۔۔!!

☆☆☆

”آج علی کا رزلٹ آتا تھا؟ اور حذرہ کی ٹیچر نے

تھے۔ سعیدہ بیگم نم آنکھوں کے ساتھ اپنی اولاد کو دیکھتی رہتی تھیں۔ اکثر ان کی نظریں ماہتاب پر جم جاتیں۔ جو بہت خاموش اور محبت سے ان کے ساتھ ساتھ ماتی گھر والوں کا بھی خیال رکھ رہی تھی۔ کبھی افتخار علی کی دوائی اور کھانے کی اسے فکر لگی رہتی۔ کبھی ذیشان کی مٹھکن اور بھوک کا خیال اسے بے چین کر دیتا۔۔۔ کبھی روٹی ہوئی حرا کو دلا سادیٹی یا آنسو چھاپتے عثمان کو تسلی دیتی۔ ساتھ ساتھ اپنے نینوں بچوں کی بھی دیکھ بھال کرتی۔ سعیدہ بیگم کی بیماری کے دوران کا وقت ایسا تھا کہ جس میں درد اور رکھ سے ہوتا ہوا، ہمدردی کا ایک سنہرا شہنشاہ دونوں کے درمیان جڑ گیا تھا۔ ذیشان کو شدت سے احساس ہوتا تھا کہ ماہتاب کی سب خوبیوں میں اعلیٰ اس کی محبت اور ہمدردی کی وہ سنہری ڈور ہے، جس نے سب کو ایک دوسرے سے باندھ کر رکھا ہوا ہے اور اس کی حیرت کی انتہا نہیں رہی جب اس بات کا اعتراف سعیدہ بیگم نے بھی کیا۔۔!

اس دن ذیشان ماں کو اپنے ہاتھوں سے سوپ پلا رہا تھا، جبکہ پاس کھڑی ماہتاب ہاتھ میں پکڑے رو مال سے ان کا منہ بار بار صاف کر رہی تھی۔ سعیدہ بیگم کی آنکھوں میں آنسو اُٹھ گئے۔ انھوں نے کمزور ہاتھوں سے ماہتاب کا ہاتھ تھاما اور ہونٹوں سے لگایا۔

”تم میرا بہترین انتخاب ہو ماہتاب! مجھے خوش ہے کہ میرے گھر کو سنبھالنے اور سب کو جوڑ کر رکھنے کے لیے تم موجود ہو۔ مجھے معاف کر دینا!“

”ارے امی! ماں بھی کبھی اپنے بچوں سے معافی مانگتی ہیں! آپ پلیز رو میں مت! جلدی سے ٹھیک ہو کر کھڑ آ جائیں۔ ہم سب بہت اداس ہیں آپ کے بغیر۔۔۔!!“

ذیشان نے اسے آنسو چھپانے کے لیے رخ پھیر لیا تھا مگر ماہتاب دیکھ چکی تھی۔ سعیدہ بیگم ماہتاب کی طرف دیکھ کر دھیرے سے مسکراتے لگی تھیں۔ اگلی صبح عثمان کو ماں کے پاس چھوڑ کر ذیشان کپڑے بدلنے گھر گیا تھا۔ جب کچھ دیر کے بعد عثمان نے روتے ہوئے کال کی کہ سعیدہ بیگم کا انتقال ہو گیا ہے۔

میں تنگ کے لیے بلایا تھا اور نو رکی کلاس۔۔۔۔۔!!“
 ذیشان کو ریڈ ورن میں کھڑا تیزی سے بچوں کے
 بارے میں بات کر رہا تھا۔ جب سامنے بیچ پڑی تھی
 ہاری ماہتاب آہستگی سے کہا۔
 ”آپ پلےز یہ سب دیکھ لیجئے گا! امی کی وجہ سے
 میرا دل بہت پریشان ہے!“
 ”ہوں! ٹھیک ہے۔ میں سب دیکھ لوں گا۔ تم
 اپنے گھر کے مسئلے سنو۔۔۔!“

ذیشان نے تلخ لہجے میں کہا تو ماہتاب نے
 چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں
 پھیلا مال کارنگ، ذیشان کی نظروں سے پوشیدہ نہیں
 رہا تھا۔ وہ تیزی سے پلٹا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں
 سے چلا گیا۔ آفس آکر بھی اس کا دل نہیں لگا۔ وہ
 بہت بے چین اور پریشان رہا۔ بار بار نظروں کے
 سامنے ماہتاب کا تھکا ہوا، اداس چہرہ گھوم رہا تھا۔ پتا
 نہیں کیوں وہ ہمیشہ اس کے ساتھ ایسے ہی زیادتی کر
 جاتا تھا۔ جہاں بھی ماہتاب کو اس کے سہارے یا
 ہمدردی کی ضرورت پڑتی، وہ ایسے ہی انجان بن کر
 پاس سے گزر جاتا تھا۔

وہ آفس سے نکلا اور سیدھا قبرستان چلا گیا۔
 ماں کی قبر پر سرخ، پھولوں کی پیتاں ڈال کر دعا کے
 لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔ جب اس کی بند آنکھوں کے
 سامنے بیمار ماں اور ان کی بے لوث خدمت کرنی
 ماہتاب کا چہرہ ابھرا تھا۔ اس نے ایک دم آنکھیں
 کھولیں۔ ہاتھ چہرے پر پھیرے اور تیزی سے
 واپسی کے لیے مڑ گیا۔

☆☆☆

ارم بیگم کو ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔ ذیشان تازہ
 پھولوں کے کپے اور پھولوں کے بھرے شاپرے لے کر ان
 کے گھر پہنچا تو دروازہ کھلتی ماہتاب حیران رہ گئی۔
 ذیشان مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوا۔ جہاں اس کا
 استقبال ہمیشہ کی طرح گرم جوشی اور محبت سے کیا گیا۔
 کافی دیر ارم اور خاور کے پاس بیٹھ کر وہ باتیں کرتا رہا۔
 ارم کو خاص خیال رکھنے کا کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔

تو ارم نے اسے دل سے دعائیں دی تھیں۔
 ”میرا کوئی بیٹا نہیں ہے مگر جب بھی تمہیں
 دیکھتی ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ تم میرے بیٹے ہو!“
 ارم نے نقاب زہد لہجے میں کہا۔
 ”میں آپ کا بیٹا ہی ہوں ماما! آپ آرام کریں۔
 میں کل پھر آؤں گا۔“

ذیشان نے کہا اور خدا حافظ کہہ کر کمرے سے
 باہر نکل گیا۔ پوری تک پہنچا۔ جب بھاگتی ہوئی
 ماہتاب آئی اور پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہنے لگی۔
 ”میں تھوڑی دیر میں گھر آ رہی تھی۔ دراصل ماما
 کہہ رہی تھیں کہ میں کچھ دیر ان کے پاس رک جاؤں۔
 اس لیے دیر ہوگئی! آپ رکیں۔ میں ابھی آتی ہوں۔“
 ماہتاب نے جلدی سے کہا تو ذیشان مسکرا دیا۔
 ”اس کی ضرورت نہیں ہے! تم کچھ دن آٹنی
 کے پاس رہو! ان کا خیال رکھو۔“

ذیشان نے نرمی سے کہا تو ماہتاب حیرت سے
 آنکھیں پھاڑے اسے دیکھنے لگی۔
 ”نہیں! ابو گھر میں اکیلے ہوتے ہیں۔ آپ
 نے روز آفس جانا ہوتا ہے۔ میں کیسے گھر چھوڑ کر بیٹھ
 جاؤں یہاں!“

ایک محبت کرنے والی بیوی کی طرح اسے بھی
 اپنے گھر کی فکر زبا نہ تھی۔
 ”تم سب فکریں چھوڑو! حرا کچھ دنوں کے لیے
 رہنے آئی ہوئی ہے۔ وہ سب دیکھ لے گی۔ تم بس اپنی
 ماں کو بہت خیال رکھو ماہتاب! یہ مائیں بہت قیمتی اور
 پیاری ہوتی ہیں! ان کے ساتھ جتنا بھی وقت گزارا
 جائے، وہ بہت کم ہوتا ہے!“ ذیشان کے چہرے پر
 اداسی اور آنکھوں میں نمی پھیل گئی تھی۔ ماہتاب کا دل
 تڑپ اٹھا۔

”آپ ٹھیک ہیں نا؟“ اس نے جھج کر پوچھا۔
 تو ذیشان اسے دیکھ کر رہ گیا۔
 ”ہاں شاید۔۔۔! اب ٹھیک ہو جاؤں!“ ذیشان
 نے مدھم لہجے میں کہا۔
 ”اچھا میں چلتا ہوں!“ ذیشان نے گہری

مجھے ہمیشہ کانٹے کی طرح چبھتی رہی ہے جس کا اعتراف میں آج کر رہا ہوں!“

ذیشان کے کہنے پر ماہتاب کچھ دیر سر جھکا کر کھڑی سوچتی رہی۔ پھر مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔
”ہوں سنہری ڈور! ایسا لگ رہا ہے جیسے بچوں کی کہانی کی کوئی پری ہو۔۔۔!“

ذیشان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ ایک انگلی سے سر کھجاتے ہوئے کچھ سوچ کر بولا۔

”ہاں کل رات ابو بچوں کو ایسی ہی کسی پری کی کہانی سن رہے تھے! جس کے پاس سنہری ڈور ہوتی ہے! اب روٹھی بیوی کو منانے کے لیے کچھ تو کہنا ہی تھا نا۔۔۔!“

ذیشان نے بھی شرارت سے کہا تو ماہتاب نے اسے گھورا۔

”ارے مذاق کر رہا ہوں! تم سچ سمجھ بیٹھیں!“
ذیشان نے جلدی سے کہا تو ماہتاب کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”ویسے آپ نے سچ ہی کہا ہے ذیشان کہ کچھ وقت ضرور لگتا ہے! مگر ہم رشتوں کو محبت اور ہمدردی کی سنہری ڈور سے باندھ ہی لیتے ہیں!“
ماہتاب کے لہجے میں شرارت مگر آنکھوں میں سچی خوشی تھی۔ ذیشان اطمینان سے مسکرا کر سر ہلانے لگا۔

واپسی کے سفر پر گنگناتے ہوئے اس نے گاڑی کا بیک مرر ٹھیک کرتے ہوئے خود کو دیکھا تو بے ساختہ مسکرا دیا۔

”ہاں تو بات شروع کی تھی کہ میں ایک روایتی مرد ہوں۔۔۔!“

نہیں۔۔۔! یہ تو پہلے کی بات تھی! جس لمحے میں نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا! اس کے بعد تو میں روایتی مرد نہیں کہلاؤں گا نا۔۔۔!!

چلیں چھوڑیں! اس قصے کو! آپ بھی ذرا اپنے آس پاس غور سے دیکھیں!

ہمدردی کی سنہری ڈور سے بے خبر تو نہیں ہیں۔۔۔!“

☆

سانس لی اور گاڑی کالاک کھول کر پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا اور سرخ گلابوں کا بکے باہر نکالا اور حیران نظروں سے دیکھتی ماہتاب کی طرف بڑھایا۔

”میں جانتا ہوں کہ میں تمہاری طرح بہت اچھا تو نہیں ہوں مگر میں اتنا اچھا ضرور ہوں کہ تمہاری اچھائی اور محبت کا اعتراف کر سکوں!“

ماہتاب کے چہرے پر حیا کے رنگ پھیل گئے۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں خوشی کے بے تحاشا جھپکے ہوئے جگنو تھے۔
”آج یہ انقلاب کیسے؟“

ماہتاب نے سرخ پھولوں کی پتیوں کو چھوتے ہوئے سوال کیا۔ گاڑی سے فیک لگائے ذیشان نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ جہاں جھپکنے والے ستارے آج بھی لاتعداد تھے مگر اس نے نظریں گھما کر ماہتاب کی طرف دیکھا۔

”زمین پر جھپکنے والا میرے نصیب کا یہ ستارہ سب سے زیادہ روشن اور چمک دار ہے!“

”بات دراصل بہت معمولی سی ہے ماہتاب! کل میں اپنی تکلیف اور دکھ کے وقت جس جگہ پر کھڑا ہوا تھا، وہاں آج تمہیں کھڑے دیکھا تو مجھے ایک بات کا احساس بہت شدت سے ہوا۔۔۔!“ ذیشان نے توقف کیا۔

”کس بات کا؟“ ماہتاب نے پُر تجسس انداز میں پوچھا۔

”میرے دکھ اور پریشانی میں تم نے بہت محبت اور نرمی سے ہمدردی کی سنہری ڈور ہم سب کے گرد باندھی تھی مگر جب تم پر یہ وقت آیا تو میں اس ہنر سے ناواقف رہا۔!“

تم آج بھی اسے دکھا اور پریشانی میں مبتلا ہو کر، اپنے شوہر اور اس کے گھر والوں کے خریے اٹھا رہی تھیں اور میں جو تمہارا ہمسفر، زندگی بھر کا ساتھی ہوں، تم سے یکسر انجان اپنی دنیا میں مست جی رہا ہوں! شاید اس لیے بھی کہ تم نے مجھ سے کوئی شکوہ نہیں کیا؟ مجھے بھی احساس نہیں دلایا کہ میں تمہارے معاملے میں بہت خود غرض رہا ہوں اور یہ بات ہی

آسیہ زلّٰتی

تھیویری اگلی ہے



آتے ہیں۔ کوئی بلاتا تھوڑی ہے۔ آخر قرب تعلق کا اظہار بھی کیسے ہو؟ مروت و یگانگت بھی کوئی چیز ہے۔ اور خاطر داریاں۔ مہمان نوازیاں۔ ابا جان اور امی جان پر لازم۔

امی تو کسی کے گھر تو اتر سے جاتی نہ تھیں۔ نہ ہی ابا جان کسی نسبتاً ”قرب یا دور کے عزیز کے گھر جاتے دیکھے گئے۔ ان کی تو محلے والوں سے ہی قربت تھی۔ جاتے بھی تھے اور لوگوں کو مسائل حل کرنے کے مشوروں سے بھی نوازتے۔ رات گئے تک مطالعے میں مشغول رہتے۔

دن میں مہمانوں کی مداخلت کے باعث مطالعے کا وقت ہی کم ملتا تھا۔ اس کے علاوہ انہیں ٹی وی کا بھی شوق تھا۔ لیکن صرف پسند کا پروگرام۔ یعنی فٹ بال میچ بے حد شوق سے دیکھتے۔ جن دنوں کرکٹ کا سیزن ہوتا۔ باندی سے دیکھتے۔ مہمانوں کی موجودگی میں بھی۔ ہائی میچ اور ٹینس بھی، ذوق و شوق سے دیکھا کرتے اور جب یہ

اکلوتی اولاد، اف، اکلوتی اولاد ہونا بھی سزا ہے۔ سزا؟ نہیں شامت۔ آفت مصیبت۔ اکلوتی اور پھر لاڈلی۔ بھئی واہ۔ اوپر سے خوب صورت بھی۔ لوجی طرے پر طرہ لگ گیا۔ تو تاج پہنا دو۔ مگر بس لفافے خوشامد۔

اور یہ لفافے ان مہمانوں کی تھی جو۔۔۔ بن بلائے آتے رہتے۔ آتے ہی رہتے۔ یکسانیت نے ذہن کند کر دیا۔ سوائے دعاؤں کے اور کچھ سمجھ میں نہ آتا۔ اے اللہ کچھ تبدیلی تو آئے زندگی میں۔ یہاں تو زندگی ایک ہی دائرے میں کھوم رہی تھی۔ اس کو زندگی گزارنا کتنے ہیں؟ یا زندگی ہمیں گزار رہی ہے۔

مہمان، مہمان در مہمان، صبح دیکھیں، نہ شام چلے آ رہے ہیں۔ یہ فلاں چچا ہیں۔ یہ خالو ہیں۔ ڈھنگے ماموں کی تشریف بھی آ رہی ہے۔ انکے پھپھا بھی چلے آتے ہیں کہ بھی رشتے دار ہیں۔ کوئی قریبی کوئی دور کا۔ کوئی نسبتاً ”مزید دور کے۔ اے بھی اپنی محبت میں

مکمل ناول



لگائی ہوئی پنیری بھی سمیٹ لیتا ہے میں سوچ رہا ہوں۔
اسے نکال باہر کروں۔“
”آپ کی بیٹی بھی کچھ نہیں سیکھتی۔ اسے کہاں
دھکادیں گے؟“

”کیا مطلب؟ مالی اور ہماری بیٹی“ ایک جیسی سزا کی
مستحق ہو سکتی ہے؟“ حیرانی سی حیرانی تھی۔
”میرا مطلب ہے کہ پہلے بیٹی کی اصلاح کریں۔
اسے کچھ اخلاقیات بھی سکھائیں۔ اس کے بعد
بچے چارے مالی کی خبر لیں۔ جاہل مالی کی۔ بڑھی لکھی بیٹی کو
مہمانوں سے تباہ سے ملنا ہی سکھادیں۔“

”وہ آپ کی ذمہ داری ہے۔ آپ ہی اصلاح کر
لیں۔“ انہوں نے کتاب کھول لی پڑھنے کے لیے۔ امی
بزار ہو کر اٹھ گئیں۔ بیٹی پر برتنے کے ارادے سے
کمرے سے فطیل خراب موڈ کے ساتھ تو چند ہنستے
مسکراتے مہمان داخل ہوئے فوراً ”موڈورست کیا۔
مسکراتا لازمی تھا۔ اندر بٹھلیا۔ ٹھین آئی۔ اسے
مہمانوں سے ملایا۔

”یہ تمہارے چچا ہیں یہ چچی۔ اور یہ ان کی بیٹیاں۔
آؤ ان سے ملو۔ کئی عرصے بعد آئے ہیں۔ اچھا ہاں
شبلاش“ چائے بھی بناؤ۔ اور ہاں وہ۔ اچھا تھو میں آ
کر بنائی ہوں۔ تمہی الخال ان سے ملو۔“
چائے کی فرمائش پس پشت چلی گئی۔ وہ مصنوعی
مسکراہٹ کے ساتھ چچا چچی سے ملنے لگی۔ یوں تو وہ
اتنی شوقین نہ تھی ملنے ملانے کی۔ لیکن چائے بنانے
سے تو آسان تھا یہ کام۔ (ملنا ملانا) وہ ان کی بیٹیوں کے
پاس بیٹھ گئی۔ اور دل جمعی سے سوالات کرنے لگی۔
(جس میں وہاں بھی۔ بقول امی)۔

”ہاں، ہم تو پشاور سے آئے ہیں۔ ابو کی جاب ختم ہو
گئی تو آگئے کہ یہاں گھر تو ہے۔ وہ ابو سعودیہ جا رہے
ہیں نا جاب کی تلاش کے لیے تو۔“ وہ بھی جواب
دینے کی شائق۔

”ہم تو اپنے دادا کے بنائے ہوئے گھر میں رہنے
آئے تھے۔“ دوسری نے لقمہ دیا۔
”مگر۔ وہاں پھپھو نے قبضہ کیا ہوا ہے۔ آدھا گھر

سین بھی گزر جاتے۔ تولان میں مالی کے سر پر سوار ہو
جاتے۔ (بقول امی جان)

اسے بدلتیں دیا کرتے۔ طریقے سکھاتے۔ خود بھی
پودوں کی دیکھ بھال کرتے۔ لان کے لیے بہت سنجیدگی
سے مالی کی شامت بلا تے۔ ٹھین کو بھی بلا کر اسے
مختلف پودوں کے نام ان کی افزائش اور دیکھ بھال کے
طریقے بتاتے۔ پھولوں کے زمانے میں بہت جذباتی
ہو کر نہ صرف مالی بلکہ مہمانوں کو بھی اپنے ساتھ کام
میں لگانے کی کوشش کرتے۔ گوڑی ہو رہی ہے۔
سو کھ پتے تلاش کر کے توڑے جا رہے ہیں۔ دوائیں
چھڑکی جا رہی ہیں۔

ٹھین فارغ وقت میں ان کا ہاتھ پٹائی۔ امی جان کو
باپ بیٹی کی یہ والی مصونیت ناگوار گزرتی۔ وہ چپکے چپکے
ابا جان کی کلاس لیتیں۔

”یہ کیا لڑکی کو لے کر لان میں بیٹھ جاتے ہیں آپ،
پودوں پھولوں کی معلومات سے اسے کیا ملے گا۔ یہ عمر
اس کی گھر کے کام سیکھنے کی ہے۔ نہ کہ کیماری میں گھریا
چلانے کی حد ہے۔“

”یہ والی نصیحت۔ گھر کے کام سیکھنے کی۔ آپ بیٹی کو
کریں۔ ادھر ادھر خلی پھرتی رہتی ہے تو میں کام میں لگا
لیتا ہوں۔ وہ بھی شوق سے کرتی ہے۔ میں نے نہیں سنا
کہ کبھی آپ نے گھر کے کام کرنے کے متعلق اس پر
اپنا ارادہ ظاہر کیا ہو اور وہ اسے بہت پڑھنا ہے۔ کیا
وہ پڑھ لکھ کر پچن سنبھالے گی؟“

”اچھا تو پڑھ لکھ کر ۴ بجینریا ڈاکٹر بن کر گھاس
کھودے گی؟ جو آپ سکھا رہے ہیں۔ آپ کی ان
تفریحات سے اسے فرصت ہو تو میں کچھ سکھاؤں۔“
امی کو قائل کرنا مشکل امر تھا۔

”اچھا خیر“ آپ سکھائیں جو سکھانا چاہتی ہیں۔
جھاڑو پوچھا، میں بھی اب تھک گیا ہوں مالی سے مغز
ماری کر کے۔ نہ صاحبزادی نے کچھ سیکھا نہ مالی نے۔
کعبت گوڑی کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ ہاں جھاڑو لان
میں دے لیتا ہے اور منحوس لان کے ساتھ میری نئی

”لڑکیوں کو بلارہے ہیں۔“ اس نے آکر کہا۔ وہاں تینوں کسی لطیفے پر ہنس رہی تھیں۔ کون سنتا۔ پھر وہ چیخی۔

”نعمی بی بی۔“ کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ آخر ڈرننگ ٹیبل پر مکا مارا۔ نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا۔ صدا بہ صحرا ہوئی وہ آواز بھی۔ تب اس نے مٹین کے بالوں کا برش زمین پر پٹخا عین نعمی کے سامنے۔ دو ٹکڑے، کمرے میں سکوت۔ نعمی پر سکتے۔

”مہمان جا رہے ہیں جی۔ آپ دونوں کو بلایا ہے۔“

”کہہ کر نعمی کے سکتے ٹوٹنے سے پہلے باہر لپکی۔ مہمانوں کے ساتھ ہی باہر آگئی۔ گھر جانے کے لیے۔ کل کے نانغے کا ہانہ بھی سوچ لیا۔ پرسوں تک نعمی بی بی نیا برش منگوا چکی ہوں گی۔“

نعمی بی بی جوش میں بھری (غصہ) ای اباجان کے پاس پہنچیں۔ اندریوں بھی کچھ دوسرے معاملات زیر بحث تھے۔ وہ جو شکو کی شکایت لے کر آئی تھی۔ دم بخود اباجان کی باتوں پر غور کرنے لگی۔ پھر جب اس کو اصل معاملے کا علم ہوا۔ توجہ اٹھی۔ اباجان مطمئن۔

”ہاں بیٹا! ساجد تمہارے چچا ہیں۔ میں اپنے بھائی کو پریشان نہیں دیکھ سکتا اور پھر ہمارا گھر بہت بڑا ہے۔ دل چاہی بڑا کرو۔ ہمیں تو دو کمرے ہی کافی ہیں بلکہ گیسٹ روم بھی ہمارے پاس رہے گا۔“

”تو۔۔۔ اباجان انہیں کیا فرق پڑے گا۔ وہاں بھی تو ان کے پاس دو کمرے ہیں۔“

”وہاں کمرے بے حد چھوٹے ہیں اور ایک ہاتھ روم ہے۔ ایک کمرہ تو ان کے سامان سے بھر گیا ہے۔ اس کے علاوہ۔۔۔ یہاں بڑے کمرے ہیں۔ اسٹور ہے۔ کچن بھی چھوٹا سی۔ مگر الگ ہے۔ برآمدے میں بھی منجائش ہے۔ اندر صحن کا باہر لان۔ وہ تو بہت خوش ہو گئیں۔ پھر آپا کا مزاج۔ ان کے کچن میں جا کر کام کرنا اتنا آسان نہیں۔ بیٹا! کسی کی پریشانی میں ہمارے ذرا

کرائے پردے دیا۔ آدھے میں خود رہتی ہیں۔“

”اور ہمیں اوپر کے دو کمرے دے دیے۔ نہ وہاں کچن نہ کمرے میں اے سی۔ تندور کی طرح۔“

وہ نعمی کے تابوتوں سوالات کا جواب اسی تیزی سے دے رہی تھیں۔ پھر اباجان آگئے۔ دونوں بھائی بے حد گرم جوشی سے ملے۔ پھر قہقہے ایلنے لگے۔

شکو چائے لے آئی۔ اب چائے کا دور چلا۔ شکو ان کی ملازمہ تھی۔ اسی کی منہ چڑھی۔ ”خیر خواہ۔ اور تیز دست۔“ یہ امی کی رائے تھی اس کے بارے میں۔ جس سے نعمی متفق نہ تھی۔

”چالا کو ماسی بُد تمیز۔“ یہ اس کی حتمی رائے تھی۔ ”دو کمرے؟ اور سب۔“ وہ حیرت کا اظہار کرنے سے باز نہ آئی۔

”رہنے کے لیے تو ایک ہی کمرہ ملا۔ ایک میں تو ہمارا سامان ہی اٹھایا ہے۔ پچھو ناراض کہ ہم پشاور سے آئیں گئے۔ وہیں جاب تلاش کرتے۔“ لہجے میں مجبوری اور اداسی۔

وہ شکو کا ہاتھ پکڑ کر باہر آگئی۔ کمبخت کو سن گئی لینے کی علت تھی۔ چچا کی بیٹی نے بھی اس کے پیچھے آنے میں دیر نہ لگائی۔ دوسری نے بھی پیچھا کیا۔ نعمی اپنے کمرے میں آگئی۔ ارادہ تو شکو کو ڈانٹنے کا تھا مگر شکو ایک کتابیں ہاتھ چھڑا کر باہر بھاگی۔ کام کے ہانے۔ کمرہ کباڑ خانے کا نمونہ بنا ہوا تھا۔ حسب معلوم، ہر سمت کپڑے، میلے اجلے، موزے، جوتے، سوٹر، کوٹ کھلونے، ڈیکوریشن کے پس وہ بیٹھنے کی جگہ تلاش کر رہی رہی تھی کہ کزن بے تکلفی کے ریکارڈ برابر کرنی ہوئی کپڑے ایک طرف سمیٹ کر بیٹھ گئی۔

دوسری بہن نے آؤ دیکھانہ تاؤ۔ وہ صوفے پر بچہ کوٹ، سوٹر اور شالوں کے ڈھیر پر ہی ڈھیر ہو گئی۔ پچھلے سفتے امی نے اسے گرم کپڑے سوٹ کیس میں رکھنے کے لیے لاکر دیے تھے۔ اسے فرصت نہ ملی۔ اب تینوں کا زبان دانی کا مقابلہ شروع ہوا۔ تینوں نے اپنی گفتار اور رفتار کا بھرپور مظاہرہ کیا۔

شکو مہمانوں کی واپسی کی خبر لائی۔

برآمدے میں کھانے کی میز کرسی جم گئی۔ کچن آباد ہو گیا۔

ابا کے ہاتھ چومتے۔ شکر یہ شکر یہ کرتے چچا سعودیہ روانہ ہو گئے۔ نشین نے کمرہ بند کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ اسے بڑھنا تھا۔ ابا جان کی خواہش کہ وہ بہت سا بڑھ کر عالم فاضل ہو جائے۔ چند دن سری اور اسری نے اس کا انتظار کیا۔ پھر وہ بھی کاموں میں مصروف ہو گئیں۔

امی اور ابا جان گھر کی رونق سے بہت خوش تھے۔ رات کا کھانا مل کر ایک جگہ کھایا جاتا۔ بلکی پٹلی گپ شب ہوتی۔ نشین نے سوالات کا سلسلہ موقوف کیا۔ وہ واقعی بڑھائی میں منہمک ہو گئی تھی۔ لیکن سری۔ اسری اس موقع پر بھی نشین سے چپک کر اپنی معلومات سے آگاہ کیا کرتی تھیں۔ وہ کچھ متاثر ہو ہی گئی۔

ان دونوں کی معلومات وسیع تھیں۔ فیشن لباس جیولری کس مارکیٹ میں کون سا اسٹور۔ بہت شان دار ہے۔ کہاں فیشن کے ملبوسات اچھے داموں مل جاتے ہیں۔ آج کل کون سی فلم مقبولیت کے ریکارڈ توڑ رہی ہے۔ نشین کی خاموشی کی ایک وجہ اس کی لاعلمی بھی تھی۔ لیکن تابہ کے۔ کب تک ان سے الگ رہتی۔ آخر دوستی ہو گئی۔

سری خرے والی تھی۔ اسری ساہ مزاج اور ملنسار تھی۔ اسری سے بچی دوستی ہو گئی۔ مگر اس کے پاس وقت کی کمی تھی۔ ابا جان نے بھی مجبور کیا۔

”دیکھو تمہارے طرز عمل سے محسوس نہ ہو کہ تم ان سے بیزار ہو۔ ہم نے خود انہیں بلایا ہے۔ وہ بن بلائے مہمان نہیں ہیں۔ اور تمہیں تو اپنے اکیلے بن کا شکوہ رہتا تھا۔ اب دو مہینے آ گئیں۔ ان کی خوشی کا خیال رکھنا چاہیے۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔“

مہمانوں کی آمد رفت جاری و ساری تھی۔ گھر میں مہمانوں کی آمد سے گوکہ اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ شکوہ تھی نا۔ وہ کسی جن کے قبیلے سے تعلق رکھتی تھی۔ سارے کام بخوبی اور بہ خوشی انجام دینے کے لیے۔ وہ

سے عمل سے اگر کمی ہوتی ہے تو دل کو سکون ملتا ہے۔ پھر یہ تو ہمارے اپنے ہیں۔“ آف ابا جان کی ہمدردی۔ ”امی اور ان کی لڑکیاں آف۔“ اب امی سے داد چاہی۔ ”توبہ کتنا بولتی ہیں۔ زن زنان ٹرین چل پڑی۔ رکتی ہی نہیں آف خدایا۔ میں تو تھک گئی۔ سن سن کر۔“

امی نے خفگی سے اسے گھورا۔ ابا جان اپنی کتاب میں گم ہو گئے۔

”دوستی کر لینا۔“ ایک وقفے کے بعد ابا جان نے مشورہ دیا۔ وہ بے چینی سے اوپر ادرھٹلنے لگی۔ ”ہمارے ایک گھر میں دو گھر۔ وہ بھی اتنا بولنے والے۔ کان تھک گئے میرے۔“ بڑی مابٹ اتنی بلند ضرور تھی کہ امی سن سکیں۔

”مجھے تو بولنا آتا بھی نہیں اور ان کے پاس کتنے قصے ہیں یا اللہ۔ ایک گھنٹے میں چار قصے سنا دیے۔“

امی کے پاس جواب موجود تھا۔ ”میں سن رہی تھی۔ جب وہ قصے سنارہی تھیں اور تم ان سے بڑھ کر قصہ سنارہی تھیں۔ وہ کہتی تھیں پچھونے یہ کہا۔ یہ کیا تم جواب دیتیں۔ شکوے یہ کہا۔ یہ کیا۔ غضب خدا کا۔ نشین! تم ان سے کم نہیں ہو۔“

”تو۔ میرے پاس اور تھا بھی کیا شکوے کے سوا اور آج اس نے میرا پتھر برش بھی توڑ ڈالا۔“

”اچھا ہوا۔ تم کم استعمال کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ جب وہ قصہ سنارہی تھیں۔ تمہیں خاموشی اختیار کرنی چاہیے تھی۔ پھر وہ بھی خاموش ہو جاتیں۔ کم از کم پچھو گئے قصے تو نہ ہوتے۔ بری بات۔ یاد رکھو غیبت کرنے والا گناہ مہار ہے تو سننے والا گناہ سے بری نہیں ہو جاتا۔“

”امی وہ تو بس اپنی تکلیفوں کا حال سنارہی تھی۔“ وہ منمنائی اور توبہ توبہ کرتی ہوئی اپنے کمرے میں آکر آئے وقت کے لیے (کڑا وقت) تیار کرنے لگی۔ آف۔

ایک ہفتہ ہوا تھا کہ چچا جم سامان اور فیملی کے آ گئے۔ چچا نے خاسمال کی مدد سے اپنا سامان سیٹ کیا۔ اسٹور سوٹ کیسوں سے بھر گیا۔ کمرے ج گئے۔

گھر کے کونے کونے سے واقف تھی۔ امی نے ڈرائی
فروٹ کس غار میں پوشیدہ رکھے ہیں۔ حلوہ جات، نمکو
وغیرہ کا خزانہ کس کونے کھدرے میں قیام پذیر ہے۔
امی کے آنکھ کے اشارے پر دوڑ کر جاتی۔ چھ دیر بعد
ٹرالی سجا کر مہمانوں کے سامنے لے آتی۔

نشین سے امی کونہ جانے کون سے خطرات لاحق
تھے کہ ہر چہ اس سے چھپا کر رکھی جاتی۔ وہ دانت پیس
پیس کرا سے کھورتی۔ جو غریب نظروں سے اسے دیکھتی
گویا جتا رہی ہو کہ یہ میں ہوں گھر کی مختار کل۔ ماکن
کے اعتبار کی حق دار۔ ہاں تو اس استور میں جہاں سارا
خزانہ پوشیدہ تھا۔ نشین کی جان نکلتی تھی۔ جھینگڑ
چپوٹے۔ کبھی کا کدو بھی۔ کساریاں اڑتی پھرتی
تھیں۔ کیا پتا کوئی کیڑا اس پر حملہ کرے۔

استور میں بڑی ترتیب سے مختلف ڈبے قطار میں
کھڑے تھے۔ مستعد، کھولو اور پالو۔ من پسند چیز۔
لیکن اسے واقفیت نہ تھی۔ ہر ڈبا کھولنا۔ دشوار کام۔
شکوہ مرہر راز سے واقف تھی۔ کبکجی کو کچھ تلاش نہ
کرنا پڑتا۔ جن کی نسل سے تھی۔ آنکھیں بند کر کے
بھی مطلوبہ اشیاء برآمد کر لیتی۔ یقیناً "نڈر تھی۔ چنل
سے کا کدو کو مار دینا دل پسند کارنامہ تھا۔ اکثر ڈبوں پر
کچرا ڈال کر اسپرے کرتی۔ پھر جھاڑو سے کیڑوں کی
لاشیں بھی اٹھاتی۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ بغیر کام کے
استور میں کھسی اور منہ چلاتی ہوئی برآمد ہوئی۔ نشین
فورا "ابا جان سے فریاد کرتی۔

"دیکھیں، دیکھیں شکو استور سے آئی ہے۔ پلو سے
منہ پوچھتی ہوئی۔ اس سے پوچھیں۔ پوچھیں کیا کھاتی
آ رہی ہے۔ یقیناً "کاجو بادام۔ اس کا پیٹ کیا اسٹیل کا
ہے۔ ہر وقت کھانا مانگتا ہے۔"

"تو؟ گھر کے کام بھی تو وہی کرتی ہے سارا دن۔ آخر
اسے بھی توانائی کی ضرورت ہے۔" یہ امی جان کی
طرف سے جواب ملا۔

"جی درست۔ مجھے تو توانائی کی ضرورت ہی نہیں۔
امی آپ کبھی انصاف بھی کر لیا کریں۔"
"تو بیٹا جی! آپ بھی استور میں جا کر کچھ کھالیا کرو۔"

مشہور مزاح نگار اور شاعر

انشاء جی کی خوبصورت تحریریں،

کارٹونوں سے مزین

آفسٹ طباعت، مضبوط جلد، خوبصورت گرد پوش

—————

کتاب نام وقت

450/-	سفرنامہ	آوارہ گرد کی ڈائری
450/-	سفرنامہ	دنیا گول ہے
450/-	سفرنامہ	ابن بطوطہ کے تعاقب میں
275/-	سفرنامہ	چلے ہو تو چین کو چلے
225/-	سفرنامہ	مکرمی گری پھر مسافر
225/-	طرز و مزاج	خدا کندم
225/-	طرز و مزاج	اُردو کی آخری کتاب
300/-	مجموعہ کلام	اس ہستی کے کوپے میں
225/-	مجموعہ کلام	چاند نگر
225/-	مجموعہ کلام	دل و دشتی
200/-	ایڈیٹورین پوائنٹ انشاء	اندھا کنواں
120/-	ادبیری پوائنٹ انشاء	لاکھوں کا شہر
400/-	طرز و مزاج	باتیں انشاء جی کی
400/-	طرز و مزاج	آپ سے کیا پردہ

—————

مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی

مجھے خوشی ہوگی کہ میری بیٹی کو ہل کر کچھ کام کرنے کا خیال تو آیا۔ خواہ کھانے کا ہی سہی۔“

امی کے استدلال۔۔۔ اور اس کی جھلّاہٹ۔۔۔ اسے یقین تھا کہ امی کو بیٹی سے زیادہ شکوہ عزیز ہے۔ کمبخت کہیں کی۔ چالا کو ماسی۔ میرا حق غصب کرنے والی۔

”بیٹا! آپ نے شاید سنا ہو۔“ ابا جان نے بھی دخل دے ہی دیا۔ ”آدمی کا کام پیارا ہوتا ہے۔ چام نہیں۔“

اب یہ چام کمبخت کہاں سے آگیا۔ اسے لگا۔ چمٹ کی قسم ہوگی یا چمٹاری کی اولاد کے مترادف۔ اب میں ایسی ہو سکتی ہوں بھلا۔ اپنے پیارے ابا جان امی جان کی نظر میں۔ لیکن ابا جان اسے چام کا مطلب سمجھانے لگے۔ چام یعنی چڑی۔ یعنی شکل صورت۔ دکھا چمار کی نسبت نکل آئی۔

”اپنے اپنے نصیب۔“ امی جان اسے منہ بناتے دیکھ کر مسکرائیں۔ ”صبر بھی کرو۔ نکمی، ناکارہ۔“

”یعنی اکلونی لاڈلی کی کوئی اہمیت نہیں؟ آخر مجھے شکوہ جیسا نصیب کیوں نہ ملا۔ میں نکمی۔ ناکارہ۔ بے صبر، کم ظرف ہوں۔ بد حرام ہوں۔ مگر ہوں تو آپ کی بیٹی۔ مجھے ترجیح کیوں نہیں دے جاتی آخر؟“

”بیٹا جی۔“ ابا جان نے لاڈ سے بازو میں لے کر اسے چکارا۔ ”آپ نہ کم ظرف ہو نہ بد حرام۔ ہم دونوں آپ سے محبت کرتے ہیں۔ مگر ہمارا فرض ہے۔ آپ کی بہتری کے لیے نصیحت کریں۔ آپ اس پر غور کرنے کی عادت ڈالیں۔ برداشت بھی ہونی چاہیے۔ زندگی میں کام آتی ہے۔“

لو جی ایک اور نیا خطاب بلکہ القاب۔ علاوہ بے صبر نکمی، ناکارہ کے۔ پورا دن اداسی طاری رہی۔ سوچ کے بے شمار دروا ہو گئے۔ ان سارے الزامات، خطابات، القابات وغیرہ سے بری ہونے کی صورت نظر نہیں آئی۔ صرف ایک نتیجہ سامنے آیا۔

”میں بہت بری ہوں۔ ابا جان اور امی جان کے معیار کے مطابق نہیں اسی لیے شکوہ نرسری اور اسری ان کے زیادہ قریب ہیں۔ یعنی کہ۔ زیادہ کام کرنے والی زیادہ مصروف نظر آنے والی شکوہ (شکیلہ عرف شکوہ

عرف چالا کو ماسی) اور زیادہ بولنے والی۔ بک بک کی شوقین۔ نرسری اور اسری۔ میں ان کی نظموں میں غیر اہم ہوں۔ اچھا میں غیر اہم بن کر ہی جی لوں گی۔ میرے نصیب۔ رونا آگیا۔ ابا جان کو بھیجیاں دستیاب ہیں۔ امی کو تیز دست بچن کی اولاد۔ شکوہ دونوں اپنی پسندیدہ ہستیوں سے دل لگائیں۔ ہم بھی پڑھ لیتے ہیں۔ دروازہ لاک کر کے پڑھتی رہی۔ کسی نے پوچھا تک نہیں۔ دل نہ لکھنے کے باوجود وہ کتابوں میں غرق رہی۔ شام کو شکوہ نے دستک دی۔ چائے کی نوید سنائی۔ وہ کان بند کیے بیٹھی رہی۔ چائے کے بغیر ہم مروت نہ جائیں گے۔ ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جو چائے نہیں پیتے جیسا کہ۔۔۔ اس کے پیچھا۔ ڈھمکے پچھا۔ انہیں شرمٹ مرغوب تھا۔ ہائے مگر شرمٹ بھی تو دستیاب نہیں۔ اس کا غلم بھی شکوہ کو بے کس کو نے یا کس خانے میں پائے جاتے ہیں۔ اسکو ایش، شرمٹ فلاں فلاں۔ صبر ٹی اور برداشت کی عادت ڈالنی ہے۔ پڑھ پڑھ کر داغ شل آتے ہیں۔ سربھاری۔

رات ہوئی۔ دروازہ بھا۔ ”کھانا کھالیں۔“ بھوک تو تھی۔ مگر صبر و برداشت آزمانے کے لیے کہہ دیا۔

”بھوک نہیں ہے۔ بعد میں کھا لوں گی۔“ شکوہ کی لنگھانے کی آواز معدوم ہوئی۔ از سر نو اپنی ناقدری پر رونا آیا مگر۔ ایک بار پھر دستک۔

”صاحب نے بولا ہے۔ کمرے میں کھانا ہے تو لے جاؤ۔ لے آئی ہوں۔“ ہائے رے اطاعت۔

”نہیں کھانا نہ کمرے میں نہ باہر۔ تم ٹھونسو۔“ ابا جان کو خیال ہے میرا۔ امی نے تو پوچھا تک نہیں۔ نہ جانے متاکمل جاسوئی ہے۔ وضو کر کے نماز شروع کر دی۔ اٹیو سے فریاد۔ دروازہ کھلنے کی آواز۔ اوہ لاک تھا۔ مگر جتنی تو لگائی نہ تھی۔ ابا جان کے پاس دوسری چابی ہوتی تھی۔ ہونی تو امی کی رسائی میں بھی۔ مگر انہیں میری پروا نہیں۔

ابا جان اس کی نماز ختم کرنے کے انتظار میں تھے۔ وہی ہوا۔ ان کے ایک پیار بھرے لمس نے ایک محبت

جنرل کی ضرورت ہے۔ بچے ہوئے تو اسے کار چاہیے۔ ناظم بیٹی کی خاطر کسی طرح اس کے مطالبات پورے کرتا رہا۔ اس کی حیثیت بھی کچھ نہیں تھی۔ قسطوں پر کار لے کر دی۔ اب وہ کہتا ہے کہ کار دے دی تو کیا کمال کیا میں تو ذرا یورن گیا ہوں آپ کی بیٹی اور نواسوں کا۔ گھر میں جو شرعی حق بنتا ہے آپ کی بیٹی کا۔ وہ دے دیں رقم کی صورت یا آدھا گھر۔ بے چارہ پریشان تھا۔ دو بیٹیاں ایک بیٹا اور ہیں۔ آدھا گھر کیسے دے۔ پھر اس نے بیوی بچوں کو ناظم کے پاس بھیج دیا۔ بچاری ناظم کی بیٹی بھی پریشان تھی۔

میں نے اس سے کہا کہ تم اپنی ساس کے پاس جاؤ۔ ان سے کہو کہ آپ مجھے بیاہ کر لائی تھیں۔ آپ کے بیٹے نے مجھے گھر سے نکال دیا ہے۔ اب میرے اور بچوں کے اخراجات آپ کی ذمہ داری ہے۔ اور آپ مجھے اپنی جائیداد سے وہ شرعی حق دینے کی پابند ہیں۔ جو میرے بچوں کا حق بنتا ہے۔ مجھے جائیداد میں سے حصہ چاہیے۔ وہ یقیناً سوال کریں گی تو بتا دینا۔ آپ کا بیٹا میرے باپ سے میرے شرعی حق کا دعویٰ دار ہے۔ تو میں آپ سے اپنے بچوں کا حق مانگتی ہوں۔ کیونکہ بچے آپ کی نسل ہیں۔ تو یہ دو مہینے پہلے کی بات ہے۔ اب وہ اپنے شوہر کے گھر میں آرام سے رہتی ہے۔ آج ناظم نے اس مسئلے کے ذرا سپین کا قصہ سننے کے لیے بلایا تھا۔ ناظم کی بیوی تو بہت ڈر گئی تھی کہ میرے مشورے پر بگڑ نہ جائے معاملہ اور داماد مزید کوئی مسئلہ نہ کھڑا کر دے۔ کہ بھی اپنی بیٹی کو رکھو اپنے پاس۔ پھر مشکل ہوگی کہ اتنے اخراجات۔۔۔ بیٹی اور نواسوں کے کیسے پورے کریں گے۔

مگر اس نے ان کی بیٹی کے ساس سسر نے بیٹے کو بہت ڈانٹا۔ اس کی خوب کلاس لی کہ اگر تمہارے بیٹوں بہنوئی گھر میں سے حصہ مانگ لیں گے۔ تو کیسے پورا کریں گے ہم خیر شرمندہ ہوں۔ اور بیوی بچوں کو لے گیا۔ معافی مانگنی ناظم سے یہ ہوتی ہے مردم شناسی۔ میں نے اس کے والدین کے ظرف کو بچان کر ہی اس شادی کے لیے اصرار کیا تھا۔ اب دوسری بیٹی کا رشتہ

بھرے جملے ساری خفگی بھلا دی۔
”میرے بچے کو بھوک کیوں نہیں ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ وہ ان سے مل گئی بیٹھی تھی۔
”میں آپ دونوں سے ناراض تھی۔ چائے بھی نہیں پی۔ ہڑتال یعنی بھوک ہڑتال۔“ ناز بھرا لہجہ۔
”ارے ارے بھئی۔ میرا بچہ اتنا سمجھ دار کب سے ہو گیا۔ ناراضی میں بھوک ہڑتال کر دی۔ بتا دیا ہوتا۔ تمہاری امی سمجھ رہی تھیں تم سوری ہو۔ ہا میں ہوا کیا؟“
ابا جان سرسراہٹ ہو گئے۔ اب سارے شکوے شکایتوں کے پلندے کھل گئے۔

”میں صبح سے خفا ہوں۔ آپ نے خبر لی؟ کھانا کھایا نہ چائے پی۔ کسی نے آکر پوچھا؟ اب تو جو کچھ ہیں نرسی، اسری ہیں آپ کی۔ امی کے لیے شکو کافی ہے۔ میں کون ہوں؟ غیر امہ؟ فالٹو برزہ میرے پاس صبر برداشت کے سوا اور ہے کبھی کیا؟ یہی چاہتے ہیں آپ؟“

”آہ۔ میرا بچہ سمجھ دار ہو گیا۔ سنو میں تو دوپہر کو کھانا کھا کر ناظم کی طرف چلا گیا تھا۔ ابھی آیا ہوں۔ وہاں کچھ مسئلہ تھا پچھلے دنوں۔ خیر دوپہر میں تم کب کھانا کھائی ہو۔ چائے پر نہیں آئیں تو تمہاری امی سمجھیں کہ سوئی ہو پڑھتے پڑھتے اب شکو نے بتایا کہ تمہیں بھوک نہیں ہے۔ تو میں آگیا۔“

”ناظم چچا کا کیا مسئلہ تھا۔“ وہ شرمندہ تھی بات ٹالنے کو سوال کر بیٹھی۔

”ارے بیٹا۔ اولاد کے مسائل بہت نازک ہوتے ہیں۔“

”ابا۔ آپ کو ان کی اولاد سے کیا لیتا ہے۔ ناظم چچا خود ہی مسئلہ حل کریں۔“

”دوستی کا معاملہ ہے۔ وہ پریشان ہوتا ہے تو مجھے بلا لیتا ہے۔ دراصل اس کی بڑی بیٹی کا جب رشتہ آیا تو میں بھی داماد کو دیکھنے گیا تھا۔ اس کے والدین بہت معقول لگے۔ لڑکا بھی مناسب ہی تھا۔ شادی کے کچھ عرصے بعد وہ والدین سے الگ ہو گیا اور گھر کی ضروریات کے لیے ناظم سے مطالبہ کرنے لگا۔ اسے سی لکوا دیں۔

”خاناں کو اور بہت کام ہوتے ہیں۔ ابھی چائے بنا کر لایا تھا۔ مہمان آگئے تھے۔ اب اسے بھی کچھ سہولت ہو جائے گی۔ بے چارہ سارا دن لگا رہتا ہے۔“

”بے چارہ سارا دن لگا رہتا ہے۔ شکوہ بھاری سارا دن پھر کی بنی پھرتی ہے۔ ایک میں فاتو ہوں کہ یہ فضول کام۔“ مگر فریاں برداری کے ریکارڈ بنانے کے لیے وہ بالک کے بچے چنتی۔ حالانکہ اسے نہ بالک پسند تھا۔ نہ میتھی کی خوشبو۔ وہ یہ گھاس پھوس کھاتی تھی نہ تھی کیونکہ اس کے خیال میں یہ بکری کا چارہ تھا۔ ابا جان اسے بکری نہیں شیرینی بنانا چاہتے تھے۔ شیر بھلا بالک میتھی کھاتا ہے؟

”کسی کام میں پتہ نہ مارنا۔ یہ بالک اکٹھے کرو۔ ڈنھل میں خود کاٹ دوں گی۔ کیا نوچ کھوٹ کر رہی ہو۔“

امی کو خوش کرنا۔ ناممکنات میں سے تھا۔ وہ بیزار ہو کر اٹھ گئی۔ اور آلو بالک پکا دیکھ کر خست افسوس۔

”آلو بالک میں خاناں ماں ذرا سا گوشت ڈال دیتا تو۔“ مگر امی کی خوشنودی کے لیے وہ کھانے پر آمادہ ہو گئی۔ آلو میتھی۔ اف۔ میتھی کے بیج میں سے نکلو چٹنا۔ پتے چٹنے سے بھی دشوار کام۔ خیر دل بڑا کرنا امی کی خواہش پر۔ ہر چیز اللہ کی دی ہوئی نعمت ہے۔ ہر سبزی میں بے حد فائدے ہیں۔ سب کچھ کھانا چاہیے۔ اور وہ آلو کے ساتھ میتھی کے اکاڑ پتے بھی چبا جاتی۔

سلیقہ شعار تو بن نہیں سکتی تھی۔ اچھی بچی بننے کے لیے بکری بن کر گھاس پھوس کھانا شروع کر دیا اور مہمانوں سے تباہ سے پیش آنا بھی سیکھ لیا۔ لیکن اف امی کی وسیع تر خواہشات۔

”مہادربنے کی کوشش کر رہی ہے ہماری بیٹی۔“ ابا جان اسے کھانے میں غرے نہ کرنے پر کہتے۔

”کچھ سلیقہ بھی سیکھ لیتی۔“ امی منہ بنا تیں۔ ”کمرہ بے ڈھنگے پن کا اعلا نمونہ۔ الماری پھوٹ پڑی کا اعلا شاہکار۔ بستر میرے خدا۔ اس کی سرال میں دس نوکر ہوں گے تب شاید۔ سن رہے ہیں آپ۔“

”بیٹی آپ کی ہے۔ سکھا دیں سلیقہ، مجھے کچھ

آیا ہے۔ مجھے ہی لے کر گیا۔ وہ بھی میں نے اوکے کر دیا۔ اس لیے مجھے خاصا وقت لگ گیا۔ اچھا اب آپ پھر سے اپنی شکایات کا ورق کھولیں۔ کیوں ہمیں سزا دی جا رہی ہے بھوک ہڑتال کی صورت۔“

وہ بوکھلا گئی۔ ”ارے نہیں۔ بس چلیں، کھانا کھانے چلیں۔ اتنی سخت بھوک ہے۔ میں مذاق کر رہی تھی۔“

وہ انہیں دھکیلتی ہوئی کھانے کے کمرے میں لے آئی۔ جہاں چچی، نسری، اسری موجود مع امی کے۔ ابا جان نے سرگوشی کی۔

”ارے کہیں یہ تمہیں چبانہ جائیں۔“ ان کا اشارہ نسری، اسری کی طرف تھا۔

”میں لوہے کا چٹا ہوں ابا جان! دانت ٹوٹ جائیں گے ان کے۔“ وہ بھی منمنائی۔

”اوہو! کھانا شروع کرو بھئی۔ رزق کو انتظار نہیں کروانا چاہیے۔“ ابا جان نے شور مچایا۔ بعد میں اس کو نصیحت بھی کی۔ ”ماں باپ سے زیادہ کوئی محبت نہیں کر سکتا۔ ہاں دوسروں کے لیے دل میں گنجائش ضرور نکالنی چاہیے۔ ہر رشتہ اہم ہوتا ہے۔ نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔“

اس نے رات کو امی کے پاس جا کر معافی مانگی۔ وہ حیرانی سے پوچھنے لگیں۔ ”کیسی معافی؟“

”امی! میں آپ سے ناراض تھی۔“ امی نے لا علمی ظاہر کی کہ انہیں تو اندازہ نہیں ہوا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ امی اداکاری کر رہی ہیں۔ سمجھ توئی تھیں۔ امی بھی مگر۔

اب مٹھن نے رویہ بدلا۔ گنجائش نکالنے کی کوشش کی۔ ابھی کوئی دل کی بات یا اپنے محسوسات امی کو بتانے چاہے تو وہ ٹال جاتیں۔

”چلو ہنو فضول، مجھے بہت کام ہیں۔ تمہاری کہانی سننے کا وقت نہیں ہے میرے پاس۔ ذرا کام کرو یہ بالک اور میتھی کے پتے چنو۔ مدد کرو میری۔“

”خاناں لڑ لے گا۔ آپ میری بھی سنیں۔“ وہ حیران ہوتی۔ خاناں آخر کس مرض کی دوا ہے۔

اعتراض نہیں مگر ابھی اسے پڑھنے دیں۔“
امی کو اس کے پڑھنے پر بھی اعتراض تھا۔



سے مشورہ ہی کر لیتا ہے۔ میرا بیٹا موجود ہے۔ میری
بھتیجی کسی اور سے۔۔۔ لوئی بات مجھے تو تم نے غیر سمجھ
لیا۔“

”آبا! آپ کی دو بھتیجیاں اسی گھر میں موجود ہیں۔“
امی نے سمجھایا۔

”لو۔ اتنی زبان دراز۔ چالاک مکار۔ توبہ میں تو کبھی
نہ کروں اب کیا باتوں؟“

”خیر! زبان دراز تو نہیں کہہ سکتے۔“ ابا جان فوراً
وکیل صفائی کا کاروار ادا کرنے لگے۔ ”آپ نے انہیں
تنگ بھی بہت کیا تھا۔ شاید کچھ بول پڑی ہوں۔ مگر
بہت نیک، شریف بچیاں ہیں۔“

”پہنیں کیا پتا۔ میرے گھر میں دو مہینے گزرے۔
ایسے کہ کیا باتوں، آف تنگ کر رہا تھا۔“

”میرے گھر میں تو چھ ماہ سے زیادہ ہو گئے ہیں۔ مجھے
کیوں نہ تنگ کیا اور یوں بھی آپ نے ان کے گھر پر
ناجائز قبضہ کیا ہوا ہے۔ کرایہ بھی وصول کر رہی ہیں اور
حق دار کو اوپر کا ایک کمرہ۔ آپنا غور کریں۔ آپ زیادتی کر
رہی ہیں۔ میں دستبردار ہوا ہوں اس گھر سے۔ ساجد کا
تو حق ہے۔“

”لو، اب تم بھی دعا کرو گے۔ کیا بہن کا حصہ نہیں
بنتا۔“

”اصولاً تو بہن کے حصے میں اوپر کے دو کمرے ہی
ہیں۔ قبضہ آپ نے۔۔۔ خیر چھوڑیں۔“

پھپھو منہ پھٹائے چچی کی طرف چلی گئیں۔ امی
گھبراہٹیں۔ ”لو اب ان سے نہ لڑنے لگیں۔ خواہ مخواہ“

”نہیں لڑیں گی۔ وہ بہر حال غاصب ہیں۔ اور
سمجھتی بھی ہیں خوب۔“

کچھ دیر بعد پھپھو، چچی کے پاس سے آئیں۔ خوش
گوار موڈ کے ساتھ چچی نے غبی خوش دلی سے خدا

حافظ کہا۔ ابا جان مسکرا دیے۔ دنیا کتنی عجیب ہے۔
لوگ کیسے بدل جاتے ہیں۔ کچنیل بدلنا شاید اسے ہی
کہتے ہیں۔



ایک دن خالہ آگئیں۔ پشاور میں رہتی تھیں۔ مگر
ان کا بیٹا امریکہ یا انگلینڈ میں تعلیم کے لیے چکر لگاتا۔ دو
بیٹیاں بھی دوسرے ملکوں میں۔ خالہ کا ایک پیر۔ بیٹے
کے پاس دوسرا بیٹی کی طرف۔

چچی کی ان سے پشاور سے جان پہچان تھی۔ رات
میں بیٹوں خواتین کی امی سمیت محفل جمی۔ اسے تو نہ
چچی اچھی لگتی تھیں نہ خالہ ہی پسند آئیں۔

خالہ نے بتایا۔ ”ان کا بیٹا اب امریکہ میں ہے۔
سسرال کی کسی شادی میں شرکت کی غرض سے آئی
تھیں۔ جاتے ہوئے اپنے بیٹے کے لیے ہمیں کارشتہ
دے گئیں۔“

”جواب لینے آؤں گی وہاں سے فارغ ہو کر۔“
یونیورسٹی کا نام گھر کا بتاتا گئیں۔ ابا جان نے اپنے
دوستوں سے رابطہ کیا امریکہ، انہیں تحقیق کا فریضہ
سونا۔ ادھر سے ”سب بہترین“ کا رزلٹ معلوم ہوا۔
امی فکر مند۔ امریکہ اتنی دور۔ ابا جان بھی سوچ میں
پڑ گئے۔ ایسا ہوا تو؟ یہ نہ ہوا تو۔۔۔ پھر دل کو سمجھالیا۔ مگر
لڑکے کی تعریف، تعلیم، مزاج بہترین۔

خالہ آئیں۔ بہت خوشامد۔ کار نئی دینے کو تیار۔
آجائے گا میں۔ اچھی جاب مل گئی تو وہاں کیوں
جانے لگا؟ اور اسے تو جاب چنگی بجاتے مل گئی۔ وہ کالج
سے آئی تو سب کچھ طے ہو چکا تھا۔ انہوں نے پرس
سے انگوٹھی نکال کر پہنا دی۔

”ہمارے ہاں مفتی کا رواج نہیں ہے۔ مگر میں
صرف نشانی دے رہی ہوں کہ اب میں میری لمانت
ہے۔ میرے سہیل کی۔۔۔“ بہت لجاہت سے کہہ کر
اسے گلے لگایا اور چلی گئیں۔

مٹھائی لے آئی تھیں۔ وہ بانٹنی پڑی۔ پھپھو فوراً
آگئیں۔ بہت ناراض۔

”ارے میں کہیں مروت نہیں گئی تھی۔ بندہ بیٹوں

تھیں۔ اسری پاس تھی۔ وہ کیفیت بتانے لگی۔ وہ امی سے لپٹ گئی۔ امی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
 ”دعا کرو بیٹا! دعا۔“ اسری اور گل آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگیں۔

ہسپتال کا مخصوص ماحول، نرسیں، ٹرائیاں، دواؤں کے لپکے۔ اف کو نئی دوا اباجان کو دیں گے کہ وہ فوراً صحت مند ہو جائیں۔ وہ مسلسل دعا کر رہی تھی۔ پھر ایک ڈاکٹر وہاں آکر کھڑے ہو گئے۔ نہ جانے کیا بول رہے تھے۔ اپنی کاوش، کوشش۔ اللہ کی مرضی کچھ اور بھی افسوس۔

امی دم بخود۔ ان کا رنگ یک لخت اڑ گیا۔ ٹین کے منہ سے نکلا۔
 ”انکل سرفراز؟“

وہ مڑے۔ ”ارے بابرلی ڈل؟“
 انکل سرفراز انگلینڈ میں پڑوسی تھے۔ بہت دن ساتھ رہا۔ بے تکلفی چہرہ۔۔۔ سعودی عرب چلے گئے۔ آج عرصہ بعد دیکھ کر دونوں پہچان گئے۔ مگر ان کا متغیر چہرہ اور الفاظ۔۔۔

”میں پہچان گیا تھا نام اور چہرہ۔ اجنبی نہ تھا میرے لیے۔ لیکن۔۔۔ افسوس میں اپنے دوست کو نہ پہچان سکا۔ اللہ اللہ نے بس اتنی سائیس۔“

نہ جانے اور کیا کچھ کہتے رہے۔ وہ امی سے لپٹ گئی زور سے۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہیں انکل۔ بھلا کوئی انکل ایسا ہوتا ہے؟ یہ۔۔۔ یقین سے دوسرے مگر۔“

”میں اس ہسپتال میں دو دن ڈیوٹی دیتا ہوں۔ آج بھی میرا دن تھا۔ کاش میں کچھ کر سکتا۔“ وہ بمشکل جذبات پر قابو پاسکے تھے۔

انہوں نے ایسولینس کا انتظام کیا تھا اور پھر۔۔۔ قافلے کی شکل میں سب واپس آئے۔ لٹے پٹے قافلے کی مانند۔ اب سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ گھر سنانا، ہوا تو وجود میں سنائے بولنے لگے۔ بھلا ایسا بھی ہوتا ہے؟ اصل تنہائی تو اب شروع ہوئی۔ نہ امی کے پاس اعتراض کا موقع تھا نہ قہمی کے پاس الفاظ۔ بس ایک خاموش معاہدہ تھا۔ ایک شکوہ تھی جو بولا کرتی۔ اس کی

انسان اپنے مفاد کے لیے بے حس ہو جاتا ہے۔ اسے رشتوں سے تعلق رکھنا بھول جاتا ہے۔ وہ خود غرضی کے بھنور میں چھپ جاتا ہے۔ نتیجہ کچھ بھی ہو۔ دل کی تنہائی ہو یا ذہنی اکیلا پن۔ کس قدر اذیت ناک ہوتا ہے لیکن۔۔۔ ان کے لیے جو احساس رکھیں۔ آج کی دنیا تنہائی کی دلدہا تھی۔ اف کاش میں اتنی تنہا نہ ہوتی۔ کوئی میری بہن ہوتی۔ میری اصلی والی بہن۔ ٹین کی سوچ بہت محدود تھی۔ مگر اب اسے صرف اپنے مستقبل کی فکر تھی۔ اعلا تعلیم اباجان کا ارمان اور شاندار مستقبل خوشحال زندگی۔ اباجان بیٹی کو بیٹا کہتے ہی نہ تھے۔ سمجھتے بھی تھے۔ اور وہ بھی بیٹا بننے پر فخر کرتی۔ (سوچنے میں کیا حرج ہے) آخری پیر دے کر خوش خوش واپس آ رہی تھی۔ تمام پیر بے حد عمدہ ہوئے۔ اپنی قابلیت پر خود کو داد دینے کا دل چاہا۔ خیر ابا جان سے بڑھ کر اور کون داد دے گا۔ زلزلے آنے پر تو جشن منانا لازمی۔ امی بھی کیا یاد کریں گی۔

وہ گل سے باتیں کرتی آ رہی تھی۔ گل اس کی دوست اور ہم جماعت تھی چند گھر آگے اس کا گھر تھا۔ اسنے گیٹ پر اس نے گل کو خدا حافظ کہا اور بُرجوش انداز میں اندر آئی۔ اباجان کی متوقع پر شوق نظروں کے بجائے سناٹا وہ دوڑی چچی کی طرف نسرئی ملی۔
 ”وہ تو ہسپتال، پچا جان کی طبیعت خراب۔۔۔ اسری چچی کے ساتھ۔“

نہ جانے وہ کیا کہہ رہی تھی۔ ٹین بے قرار ہو کر باہر بھاگی۔ آخری بات نے اس کے ہوش گم کر دیے تھے۔

”اسری کا فون آیا تھا پچا جان کو ہارٹ انیک۔۔۔“
 گل ابھی اسنے گیٹ پر بھی جب ٹین نے اسے جا لیا۔ گل نے بھائی کو ساتھ لیا۔ اپنی امی کو بتا کر حواس باختہ ٹین کو لے کر نرسری کے بتائے ہسپتال کے لیے روانہ ہوئی۔ اباجان کو ہارٹ انیک۔۔۔ کیسے کیوں؟ کبھی تو کچھ ہوا نہ تھا۔ بہت محتاط زندگی گزارتے تھے۔ اچھی صحت تھی۔ اچھی صحت؟ پھر گل کے بھائی نے امی کو تلاش کر لیا۔ برآمدے میں ایک بچہ پر فکر مند بیٹھی

15

بچوں میں
زندگی بہت ہے موقع

کیا آپ کو اپنے گھر کی آمدنی میں اضافہ کرنے کی ضرورت ہے؟
کیا آپ کو کسی کام میں تربیت اور روزگار میں معاونت کی ضرورت ہے؟

کھانا پکانے اور امور خانہ داری کا تربیتی کورس



اس کورس کے ذریعے آپ کھانا پکانے اور امور خانہ داری کی تربیت حاصل کر کے گھریلو مدد کی ابھرتی ہوئی صنعت میں ایک باعزت روزگار حاصل کر سکتی ہیں۔

ملازمت کا
یقینی موقع



تیمارداری کا تربیتی کورس

یٹیف وی ٹی آئی آغاخان یونیورسٹی اور ہولی فیل ہسپتال کے تعاون سے پاکستان میں اپنی نوعیت کا پہلا پروگرام پیش کر رہا ہے جس کے ذریعے آپ کو بزرگوں اور معمر افراد کی تیمارداری کی تربیت کے ساتھ ساتھ ملازمت کے مواقع فراہم کئے جاتے ہیں۔

یٹیف وی ٹی آئی
یونیورسٹی آف ایڈوانسڈ
سٹڈیز اور میڈیسنل
سائنسز

کسٹمر سروس اینڈ ریٹیل سیلز کورس



اس کورس میں نہ صرف کسٹمر سروس اینڈ ریٹیل سیلز کورس کی پیشہ ورانہ تربیت فراہم کی جاتی ہے بلکہ ریٹیلورنس، فوڈ پیئرز، ریٹیل آؤٹ لٹس، سوپر اسٹورز جیسے اداروں میں ملازمت کا موقع بھی فراہم کیا جاتا ہے۔

18 سے 28 سال

پیر تا جمعہ 9 بجے سے 4 بجے تک

پروگرام کی سہولیات:

مفت پک اپ اینڈ ڈراپ ملازمت کی فراہمی یٹیف وی ٹی آئی کا سرٹیفکیٹ ماہانہ وظیفہ دوپہر کا کھانا

اگر آپ تندرست اور صحت مند ہیں اور داخلہ شرائط پر پورا اترتی ہیں تو داخلے کے لیے
پیر تا جمعہ صبح 9 سے شام 6 بجے کے درمیان اس نمبر پر رابطہ کریں: 0300-2523129
ایس۔ی۔: info@taffoundation.org ویب سائٹ: www.taffoundation.org



نے آکر بتایا۔ نعی کی اعلا تر محنت کا صلہ اعلا ترین تھا۔ گل اس سے لپٹی ہوئی تھی۔ نعی کے دل کو چوٹ سی لگی۔ اباجان کو۔۔۔ کتنا انتظار تھا۔ اس کے رزلٹ کا۔ ایسے ہی رزلٹ کا۔ وہ رو رہی تھی۔
 ”اباجان ہوتے تو کتنا خوش ہوتے۔ اب کیا فائدہ؟“

”پاگل ہو۔ وہ جہاں ہیں بہت خوش ہو رہے ہوں گے۔“ گل نے ایک لڈو اس کے منہ میں ٹھونس۔ ”یہ مٹھائی امی نے تمہارے اور میرے شاندار رزلٹ پر محلے بھر میں بانٹی ہے۔ اباجان کی خاطر۔ ان کی روح کی خوشی کے لیے کھلو۔ آئی آپ بھی۔“ اس نے ڈبا امی کی طرف بڑھایا۔

امی نے آبدیدہ آنکھوں کو پلو سے خشک کیا۔ اور ڈبا لے لیا۔ شکو بھلا کیوں پیچھے رہتی۔

”بی بی! لاؤ مجھے دو ڈبا۔ اصل میں تو اس کی حق دار میں ہوں۔ میں نے منٹ منٹ چائے بنا کر۔ بھی شربت گھول گھول کر پلایا۔ ساری محنت تو میری ہوئی۔ نعی بی بی کو تو مٹھائی پسند بھی نہیں۔“

اس نے ہاتھ بڑھایا۔ نعی نے تیزی سے ڈبا امی کے ہاتھ سے چھینا۔ شکو سے کچھ بعید نہ تھا۔ پورا ڈبا کھا جاتی۔

”ہر چیز قبضہ۔ اس کا بس چلے تو مجھے بھی کھا جائے کچا چبا گے۔“

”ہنو۔ کڑوا گوشت کون کھائے؟ ہم برنی کھاتے ہیں۔“ اس کا منہ برنی سے بھرا ہوا تھا۔ جو امی نے اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دی تھی۔

”ہاں تم کھاؤ۔۔۔ رزلٹ تمہارا آیا ہے۔ بڑھ بڑھ کر میں آدھی رہ گئی۔ رزلٹ ان کا ہو گیا۔“ وہ مٹھائی لے کر چچی کی طرف چلی گئی۔

گل نے شکو سے کہا۔ ”تم واقعی بہت تنگ کرتی ہو بھین کو۔“

”آپ بھی آزما کر دیکھ لیں۔ وہ اسی طرح ٹھیک رہتی ہیں ورنہ ابھی بیٹھی رو رہی ہوتیں۔“
 ”مجھے یہ ہنر نہیں آتا۔“ گل قدرے مایوسی سے

آواز غنیمت تھی ورنہ تعزیت کے لیے چند دن لوگ آئے محلے والے ہمدردی کے لیے آتے رہے۔
 چچا کا فون آیا۔ وہ اب امریکہ بیٹے کیس چلے گئے تھے۔ ان کو وہاں جا بل گئی تھی۔ بیٹا اسکا لرشپ پر پڑھ رہا تھا۔ وہ بہت سالوں سے وہاں تھا۔ اب امریکی شہری۔

پڑوسیوں نے مشورہ دیا۔ ”دیورانی سے کہو۔ کرایہ دیا کریں۔ ان کے حالات اچھے ہیں۔ میاں اور بیٹا بھی کمایا ہے۔ تمہارا اب کمانے والا رہا نہیں۔“

مگر امی موت میں کچھ نہ کہہ پائیں۔ اپنی مالی حیثیت کا اندازہ کر کے خانہ سال کو جواب دے دیا۔ شکو نے جانے سے انکار کر دیا۔

”بے شک آدھی ٹخنہ دے دینا۔ کھانا بھی پکاؤں گی۔ پر جانے کا مت کہنا۔ بی بی جی گھر میں کوئی مرد نہیں رہا۔ چور ڈاکو موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ رات کو بھی رہوں گی۔ فکر نہ کرو۔ چوکیدار کی کام بھی کر لوں گی۔“

”تو تم کیا مرد ہو۔“ نعی سے رہانہ گیا۔ شنی خوری بڑی آئی مادور۔

”پر گاؤں والی جانی تو ہوں۔ دو کو آسانی سے ٹھکانے لگا سکتی ہوں۔“ سینہ تان کر بولی۔
 ”اچھا لان میں سانپ نکلا تو کیا ہوا تھا۔ گھگھی بندھ گئی تھی۔ جانی کی۔“

”تو سانپ تو پھر سانپ ٹھہرا۔ کاٹ لے تو بندہ ٹپس ہو جائے۔“ آف رے حاضر جوابی۔

”امی! شکو سے کہہ دیں۔ رہنا ہے تو تمیز سے رہے۔ میرے منہ نہ لگے۔“

”بی بی! نعی بی بی کو بتا دو۔ مجھے تنگ نہ کریں زیادہ یہ شرط ہے میری بس۔“ دونوں بحث میں مبتلا تھیں۔ امی سر پر ہاتھ رکھے بے بسی کا نمونہ بنی ہوئی تھیں۔



بی اے کا رزلٹ آ گیا تھا۔ خوشی سے بے حال گل

بولی۔
 ”پھر آپ کا رزلٹ بھی میرا ہوا۔“ واہ کیا انداز تھا۔ امی ہنس دیں۔
 ”چلو یہ بھی سہی۔ میرا رزلٹ تمہارا ہوا۔“ وہ بھی شکوہ کی حاضر جوابی کی معترف ہو گئی۔

چچی کے کھر سے آکر وہ ڈبا ڈھانک کر رکھ رہی تھی۔ ”یہ آپ کے لیے بچا لائی ہوں۔ کہیں شکوہ کھالے۔“
 ”ہاں۔ آدمی نہ کھائے۔ چوئیاں بے شک کھالیں۔“ وہ چڑ گئیں۔ ”اب گل کی امی کا شکریہ ادا کرو جا کر۔“

”آپ مٹھائی نہیں بانٹیں گی؟“
 ”کھائی تم نے اور مٹھنے والوں نے بس کافی ہے۔“
 اف امی اتنی بے مروت۔ مٹھنے والیاں لیکن اب بھی مبارک باد دینے میں پیش پیش۔ مٹھائی جن تک نہیں پہنچی وہ بھی۔ اس دن پڑا ٹھنڈا ٹھنڈا موسم تھا۔ خوشی جیسے دستک دے رہی تھی۔ کیا ہونے والا ہے۔ کاش پہلے سے علم ہو جایا کرتا تو کتنا مزا آتا۔ لیکن امی مزا کر کر کرنے میں ماہر تھیں۔

”سنو۔ اماں آرہی ہیں۔ ان کے سامنے اچھی بچی بن کر رہنا۔ انہیں بحث مباحثہ پسند نہیں۔“
 ”جی اچھا۔“ فرماں برداری سے گردن ہلائی۔ ”مگر یہ اماں ہیں کون؟ میں تو جانتی نہیں۔“
 ”میری اماں ہیں۔ کینڈا سے آرہی ہیں۔ کیا تم نے اپنی نانی کا نام کبھی نہیں سنا؟“

”نام آپ نے بتایا ہی نہیں۔“
 ”اب میں کیا ان کا نام بتائی۔ بے وقوف۔“ وہ دانت پیس رہی تھیں۔
 ”ہیں؟ بے وقوف؟ یہ کیسا نام ہے؟“ وہ ششدر رہ گئی۔ اور سے امی چپل لے کر جھپٹیں۔ بھاگنے میں تو تیز تھی۔ نکلی تو سیدھا گل کا راستہ لیا۔
 ”پتا ہے۔ امی کی اماں آرہی ہیں کینڈا سے“ تو بہ ہے۔ کینڈا کے لوگوں کے نام کیسے ہوتے ہیں؟ ان کا نام بے وقوف ہے۔“

”ہیں؟ بے وقوف؟ یہ کیسا نام ہے؟“ وہ ششدر رہ گئی۔ اور سے امی چپل لے کر جھپٹیں۔ بھاگنے میں تو تیز تھی۔ نکلی تو سیدھا گل کا راستہ لیا۔
 ”پتا ہے۔ امی کی اماں آرہی ہیں کینڈا سے“ تو بہ ہے۔ کینڈا کے لوگوں کے نام کیسے ہوتے ہیں؟ ان کا نام بے وقوف ہے۔“

”ہیں؟ بے وقوف؟ یہ کیسا نام ہے؟“ وہ ششدر رہ گئی۔ اور سے امی چپل لے کر جھپٹیں۔ بھاگنے میں تو تیز تھی۔ نکلی تو سیدھا گل کا راستہ لیا۔
 ”پتا ہے۔ امی کی اماں آرہی ہیں کینڈا سے“ تو بہ ہے۔ کینڈا کے لوگوں کے نام کیسے ہوتے ہیں؟ ان کا نام بے وقوف ہے۔“

نانی کے پیر دبانے لگی۔ انہیں آرام تو آیا۔ نیند نہیں۔
 ”کچھ دین کے بارے میں بھی جانتی ہو؟“ نانی کا
 نواسی سے سوال۔

”جی۔ نماز روزے کی پابندی کرتی ہوں۔“ نواسی
 مطمئن کرنا جانتی تھی۔

”اچھا۔ شاباش۔“ کچھ مسئلے مسائل کے بارے میں
 بھی پڑھا ہے؟ یا ماں سے کچھ لیا؟“

”ہائیں۔ مسئلے مسائل کیسے لیے جاتے ہیں؟“
 حیرت۔ بجا۔ سوال بھی۔

”اے ننھی۔ میں نے کہا تیری بیٹی تو بہت غبی لگتی
 ہے مجھے۔“ نانی مطمئن ہو جائیں۔ ایسا ممکن نہ تھا۔

”نہیں ماں! بہت سمجھ دار ہے۔ بس ذرا دیر سے
 سمجھتی ہے۔“ ننھی نے صفائی دی۔

”تو غبی اور کسے کہتے ہیں؟“ نانی شاید کچھ اور بھی
 کہنے والی تھیں۔ نواسی نے روک دیا۔

”نانی! آپ لمبے سفر سے آئی ہیں۔ آرام کریں سو
 جائیں۔ ٹھکن اتر جائے گی اور اگر نیند نہ آئے تو گولی

کھالیں۔ بہت آرام کی نیند آئے گی۔ میں گولی لا دوں؟“

نانی کو جیسے کر نٹ لگا۔ اٹھ بیٹھیں۔ ”ہائیں یہ نیند
 کی گولی کس لیے کھانا چاہتی ہے۔ جب نیند آئے گی سو

جاؤں گی۔ ڈاکٹر سی دو اکھا کر مجھے مرنا نہیں ہے۔ میں
 بیماری میں حکیمی دو اکھا ہاتی ہوں۔ سن لیا۔“

”تو آپ کی سیلی پونلی میں یا پیلی میں بلڈ پریشر کی جو
 دو اے ڈاکٹر نہیں ہے؟“

نانی منہ دبا کر ہیں۔ ”ارے یہ تو دو سال سے
 میرے پاس یوں ہی پڑی ہیں۔ منیر کے اطمینان کے

لیے رکھے رہتی ہوں۔ بلڈ پریشر، میرے دشمنوں کو۔“

”ہائیں نانی! یہ اتنی پرانی۔“ آنکھیں زیادہ ہی کھل
 گئیں سن کر۔

”سنو لڑکی! یہ کیا نانی تانی جیسے پڑوس کی بڈھیوں کو
 نانی داوی کہہ دیا۔“

”تو رشتہ جو ایسا ہے۔ نانی کا۔“

سے کالی صندوقچی نکالو۔ ٹھیک۔ اس میں میری سرے
 دانی ہوگی۔ سرمہ لگا لوں۔ اچھا اب یہ سرے دانی
 صندوقچی میں رکھ کر پونلی میں رکھ دو۔ جہاں سے نکالی
 تھی پونلی۔ وہیں رکھ دینا۔“

ان کا سوٹ کیس عمر عیار کی زنبیل سے کم نہ تھا۔
 چار دن تک چچی بھی اس زنبیل کے رُاسرار رازوں

سے واقف ہوئی تھیں کیونکہ انہیں بھی اس قسم کی
 خدمات سے بہرہ ور کیا جاتا۔

صندوقچی میں سرے کے علاوہ سوئی دھاگا۔ چھوٹی
 قینچی۔ چھوٹا چاقو۔ نشوونچہ۔ بلڈ پریشر کی گولیاں۔ پبلی

پونلی میں ایک خوب صورت ڈبہ تھا۔ ڈھکن اٹھاؤ
 میوزک سے لطف لو۔ اس ڈبے میں موزے کئی

جوڑے۔ تصویروں کا البم، جو شاندارے کے پیکٹ۔
 دوسلین۔ ریزنگاری رکھنے والا چھوٹا پرس۔ برقی رقم

والا برقرار۔ امی نے تو کہہ بھی دیا۔
 ”اماں! وہاں سے جو چیزیں لے آئی ہیں۔ وہ سب

یہاں ملتی ہیں۔ آپ نے خواہ مخواہ وزن بڑھایا۔“
 اماں کو ان کا تجربہ اعتراض پسند نہیں آیا۔ پولیس

نہیں۔ تیسری خالی پونلی جو کپڑوں کے درمیانی حصے میں
 تھی۔ اس میں بیڈ ٹلفافے، ٹلم، ناخن کترنے والی ستر

سال پرانی ناخن گیری۔ آج کل کوئی اسے پہچانتا بھی
 نہیں۔ گھروالے بھی (ننھی کے سوا) ماموں کی پیدائش

پر جو پہلی فراک انہیں پہنائی گئی تھی۔ معد ماموں کے
 بچپن کی تصویروں کے۔ کروشے کی بنی چند اشیاء، ٹی

کوزی کور، کلمے، آستین، شمیم، الم علم۔
 شکو کو بڑی ہنسی آئی۔

چاندی کا کٹورہ پانی بننے کے لیے۔ نانی اسی کٹورے
 میں پانی پیتی تھیں۔ دراصل اس کٹورے کے لیے ہی

یہ پونلی کھلی تھی۔ کٹورہ باہر نکال لیا گیا۔ میز پر سجا دیا
 گیا۔ کالی تحائف بھی سوٹ کیس میں سے نکالے

گئے۔ سب کا خیال تھا۔ لمبے سفر سے آنے کے بعد نانی
 آرام کریں گی۔ نیند پوری کریں گی مگر واہ ری نانی۔

بیٹھی باتیں کرتی رہیں۔ لیٹ کر باتیں۔ کر دٹ لے کر
 باتیں۔ غرض باتیں باتیں۔ رات ہوئی امی کے حکم پر وہ

”اچھا تو رشتے داروں کو رشتوں سے پکارا جاتا ہے؟ جیسے اے بچا زاد بسن آنا زرا۔ خالہ زاد بھائی بیٹھو چائے پو۔ پھوپھی زاد بسن آئے تشریف لائیے۔“

نانی تخت ناراض، ایک تنگ مگر زوردار۔ ”نانی خاصی ٹیڑھی کھیر ہیں۔“ اس نے طے کیا۔

”جو تمہاری ماں کہتی ہے وہی کہا کرو۔“

لو اتنی سی بات سمجھانے کے لیے لیکچر کی افادیت کا سہارا لیا۔ ان کی فطرت سمجھنے کے لیے بہت زیادہ دانش کی ضرورت تھی۔ اور وہ دانش در بالکل نہ تھی اور نانی اسے دانش در بنانے کے جتن کر رہی تھیں۔ ہر گز تادن اس کی جفاقت ان پر عیاں کرنا رہا۔ وہ باپوس ہو گئیں۔ چچی کو نانی سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ اور نانی ان کو شرمندہ کرنے میں زور نہا۔ جھجک گئیں۔ وہ کسی کا لحاظ کرنا نہیں جانتی تھیں۔ سب کو اندازہ ہو گیا تھا۔

”اے ننھی! تم نے یہ عقل مندی کی کہ آدھا گھر کرائے پر اٹھا دیا۔ اکبر کے بعد تو تمہاری آمدنی رہی نہیں۔ چلو اچھا ہے۔ دال روٹی کا سہارا ہوا۔“

چچی کی طرف اشارہ کر کے نانی نے اپنی ننھی کو شاباشی دی۔ وہ شرمندہ ہو گئیں مگر نانی شرمندگی کی ش سے واقف نہ تھیں۔

”میں کہتی ہوں یہ گیسٹ روم بھی کرائے پر اٹھا دو۔ کسی نرس یا ڈاکٹر کو جو دوسرے شہر سے نوکری کے لیے آتی ہیں بچاریاں۔ شریف لوگوں کے گھر تلاش کرتی ہیں۔ ان کے خرے بھی نہیں ہوتے۔“

”اف نانی کی معلومات مشاہدات تجربات۔ مقالہ

جات۔

”اماں! یہ۔۔۔ بھابھی ہیں۔ میری دیورانی۔“ امی نے جھینپ کر تعارف کرایا کہ چچی کو برا نہ لگا ہو۔ ان کا تو واقعی رنگ اڑ گیا تھا۔ نانی مطمئن انداز میں گویا ہوئیں۔

”ہاں ہاں جانتی ہوں۔ تمہارا دیور امریکہ میں ہے۔ خوب کہا رہا ہے۔ بیٹے نے بھی نوکری کر لی ہے۔ وہاں فلیٹ بھی خرید لیا ہے۔ انہیں بھی احساس ہے کہ تم دونوں بے سہارا ہو گئی ہو۔ منیر امریکہ میں اس سے ملا

تھا۔ اپنے ساجد سے۔ ساجد نے منیر کو بتایا تھا کہ اب بھابھی اور بیٹیجی کی ذمہ داری اٹھا رہا ہے۔ بیوی سے کہہ دیا ہے کہ کرایہ دیا کرو اور جو بھی ضروریات ہوں پوری کرو۔ بچی کی تعلیم میں رخنہ نہ ہو۔ آخر میں بیوی بیٹیوں کو لاکھوں کی رقم بھیجتا ہوں۔ بیٹیجی کا بھی پورا حق ہے۔“ چچی کا منہ اتر گیا مزید۔

”اے سنو۔ اس نے بتایا کہ میری بیٹیوں کو پڑھنے پڑھانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ آج کل کے زمانے میں۔۔۔ کون لڑکی پڑھنا نہیں چاہتی۔ جد ہے۔ میں تو ساجد سے ملی ہوئی تو ڈانٹتی۔ کہ تمہارا قصور ہے۔ علم حاصل کرنا آج کی ضرورت ہے۔“

اف۔ نانی کی معلومات اور یادداشت۔ لفظ بہ لفظ سنا دیا۔ اور ماموں نے بھی ساری کہانی اپنی اماں کے گوش گزار کر دی۔ جنہوں نے فرالے اور زنائے سے یہاں سنا دی۔

”اے بھئی بچے بد شوق ہوتے ہیں۔ تب بھی انہیں ماں باپ ماریٹھ کر اسکول بھیجتے ہیں۔ بچوں کی مرضی پر تھوڑی چھوڑتے ہیں۔“

نانی کی داستان بلکہ نصیحت افروز داستان ختم ہونے کے آثار نہ تھے۔ وہ وہاں سے بھاگ آئی۔ چچی کی مجرمانہ خاموشی اور مزید اتری ہوئی صورت دیکھنے کی تاب نہ رہی۔

انگلنڈ چچی کچھ رقم لے آئیں۔

”آپ کے دیور کہہ رہے تھے ہم دوسرا گھر لیتے تب بھی تو کرایہ دینا پڑتا۔“ امی کے انکار پر انہوں نے کہا۔

مگر امی نے ہر گز نہ لیا۔ شرمندہ ہو رہی تھیں۔

”مجھے ضرورت ہو گئی تو آپ سے مانگ لوں گی۔“

امی نے کہہ کر واپس کر دی۔

نعمی کو غصہ آ رہا تھا۔ نانی کو جا کر شکایت لگادی۔

”آپ کی ننھی نے چچی کا دیا ہوا کرایہ واپس کر دیا۔“

نانی کو اللہ موقع دے۔ خوب تھا ہوئیں۔ ”کچھ آگے کا بھی سوچ لینا چاہیے۔ لڑکی کی شادی بھی کرنی ہے۔ اتنی منگانی ہے۔ جینز کہاں سے جمع کرے گی

”ہاں نا۔ قیامت کے دن جب سارے مردے زندہ کیے جائیں گے۔ اللہ کی عدالت میں ان کو پیش کیا جائے گا۔ تو اصلی صورت یعنی بالوں ناخنوں کے ساتھ صحیح شکل میں پیش کیا جائے گا۔ ہمارے بال ناخن ان کو لگا کر۔“ ثانی نقشہ کشی کی ماہر تھیں۔

ثمنی نے جھر جھری لی اور ثانی کے پاس آ بیٹھی۔

”اماں! پھر تو جگہ کم بڑ جائے گی۔ جب سارے

مردے اپنے میلوں تک پھیلے بالوں۔ گزروں ناخنوں

کے ساتھ چلیں گے۔ انہیں تو جگہ بھی زیادہ چاہیے ہو

گی۔ پھر اللہ میاں کو دوسری زمین الاٹ کرنی پڑے گی

قیامت کے لیے۔ ایک جگہ میں اتنی گنجائش کہاں ہو

گی۔ جب سب کے بال ایک دوسرے میں الجھ رہے

ہوں گے۔ ناخن دوسروں کے ناخنوں میں پھنس رہے

ہوں گے۔ او خدا تو بہ توبہ۔ کتنا خوفناک منظر ہو گا۔

سب مردے ایک دوسرے میں سٹھم گٹھا۔ یعنی بچا ہی

نہیں چلے گا۔ کہ کس کے بال کہاں تک ہیں۔ اور کس

کے ناخن کہاں الجھ رہے ہیں۔ یعنی کہ ہر مردہ شتم شتم

گر تار بڑا۔ دنگل میں مصروف بال ناخن جھڑوانے کے

لیے۔ اف یعنی کہ۔۔۔“

تصور ہی اتنا ہولناک تھا۔ تاڑ کر کے ثانی کی چپل

اس کی پیٹھ پر۔ وہ بد گئی۔ ہوش میں آگئی۔ اب سمجھ

میں آیا۔ اس تقریر دل پذیر کی ادائیگی کے لیے موقعہ

کیوں مل گیا۔ ثانی اس دوران اپنی چپل نیچے سے

اٹھانے کی تگ و دو میں تھیں۔ وہ سمجھی امی کی طرح

ہنسی چھپانے کے لیے منہ نیچے کیا ہے حالانکہ ہنسی کا

نہیں عبرت کا مقام تھا۔ قیامت کا منظر کچھ اتنا ہی

دہشت ناک تھا تب ہی تو مولوی لوگ قیامت کے دن

سے ڈرتے ہیں۔

”یعنی کہ۔۔۔ کعبخت۔۔۔ جانگوس۔۔۔ بے دین۔

ارے کچھ نہ بڑھا اس نے کچھ نہ سیکھا۔“ ثانی کا لیچر

شروع ہو گیا تھا۔ ”نہنی! بشتی زیور منگا کر پڑھائی

ہوتی۔ تو اتنی بے خبر نہ ہوتی۔“

کمر کی جلن۔ اف۔ سہلا سہلا کر ادھ موٹی ہو رہی

تھی۔ چلا پڑی۔ ”پڑھا ہے۔ سب پڑھا ہے۔ یہ بھی

نہنی۔“

”اماں! آپا کو میرے حالات کا علم ہے۔ وہ رعایت

کریں گی۔ بہن ہیں آخر۔ اپنے لوگ تو۔۔۔“

”اس خیال میں نہ رہنا۔ آج کل شادی بھی سودا

ہوتا ہے۔ اپنے لوگ سب سے پہلے آنکھیں ماتھے پر

رکھ لیتے ہیں۔ رعایت نہ مروت اور عارف کا میاں

ایک نمبر کا لاپچی ہے۔ جہاں فائدہ دیکھا۔ ادھر ہی لڑھکا۔

ثانی کیا سمجھنا تھا چاہ رہی تھیں۔ امی کو مگر بہن کا اعتبار

تھا۔

ثمنی بالوں میں برش کر رہی تھی۔ چپکے سے ایک

چور نظر اٹھو تھی پر ڈالی۔ یہاں کیا فائدہ نظر آیا؟ بے

خیالی میں برش بالوں میں الجھ گیا۔ زور لگایا تو بالوں کا کچھا

باٹھوں میں آ گیا۔ بال پیٹ کر برش میں پھنسا دیے۔

”امی! شکوے کیے گا۔ بال نکال کر کچرے میں ڈال

دے۔ میں کہوں گی تو باتیں بنائے گی۔ اچھی طرح برش

صاف کر دے۔“ ثانی چونک گئیں۔

”ارے کچرے میں کیوں؟ بال ادھر ادھر نہیں

پھینکنے چاہئیں۔ تمہارے ہاں تو لان ہے۔ اس میں

گڑھا کھدو۔ الو۔ اسی میں سب کے بال اور ناخن کاٹ کر

ڈالا کرو۔ میں نے تو کینیڈا میں بھی ایک تھیلا بنا رکھا

ہے۔ اس میں سب کے بال اور ناخن جمع کرتی ہوں۔

یہاں پاکستان میں بھی میں نے۔“

”کیوں ثانی؟ مطلب اماں کیا کھا دینا ہی ہے۔ بالوں

ناخنوں کی کھاد۔ توبہ۔“ پھر برسی آگئی۔

”چل ہٹ، بھی قیامت کے دن بے چارے

فرشتوں کو ایک جگہ سارے بال اور ناخن مل جائیں

گے۔ ان کو بجا بلاش نہیں کرنے پڑیں گے۔“ ثانی

کی منطق سمجھ میں نہ آئی۔

”فرشتے بالوں کا کیا کریں گے؟ کیا وہ سمجھ ہوں

گے۔ اپنی لوگ بنا کر لگا میں گے؟“

ثانی شدید ناراض ہوئیں۔ ”ہائے ماں نے کچھ نہ

بتایا۔“ اب انہوں نے جو نقشہ کھینچا۔ تو اسے فرشتوں

پر رحم آنے لگا۔ اف اتنی محنت۔ جگہ جگہ سے بال

اٹکھا کرتا۔

قیامت کہاں برپا ہوگی۔ میدان عرفات میں۔“ ثانی اسے دین کا علم سکھائے بغیر چپ ہو جائیں۔ ممکن نہیں۔

”اماں! پتا ہے مجھے۔ مگر۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک کتنے لوگ وہاں ہوں گے۔ کھرب ہاؤس کھرب ہا۔ بلکہ سو کھرب ہا۔ ڈھانچے تو خیر آجائیں گے ان کے بل ناخن نہیں آسکتے۔“

ثانی شدید ناراض۔ ”دفع جاہل‘ بے دین ہوش کر لے جاہل۔“

اس کی فریاد کچھ اتنی دردناک تھی کہ چچی معہ بیٹیوں کے حال معلوم کرنے آ گئیں۔ نعمی کی زبانی ساری کہانی سن کر تو جو قہقہوں کا طوفان برپا ہوا کہ قیامت آتی ہوئی بھر جاتی۔

”سارے ہی بے خبرے ہیں نادان۔ قیامت کو مذاق سمجھ لیا ہے۔“ ثانی لیٹ گئیں۔ خفا لیکن وہ مایوس نہ ہوئیں۔ اگلے دن سے پھر دین کی تعلیم شروع۔

صحابہ کرام۔ اولیاء کرام۔ درویشوں کے واقعات یوں سنائیں جیسے ان کے سامنے گزر رہے ہوں۔

”کتبوں میں پڑھا ہے۔ کہہ کر سب کو قائل کرتیں۔ ورنہ نعمی کو تو شبہ تھا کہ ممکن ہے وہ کہیں کہ میرے سامنے کے واقعات ہیں۔ کیونکہ یادداشت ان کی غضب کی تھی۔ بچپن کے تمام واقعات تمام جزئیات کے ساتھ۔ اپنے دادا دادی، نانا ثانی والدین کے تمام قصے۔ ان کے آپس کے تعلقات، سارے ان کو اذیر تھے۔ جس سے وہ نواسی کو بھی فیض یاب کرنا چاہتی تھیں۔“

اگر وہ نصیحتوں کے پٹارے ذرا دور کر دیں۔ تو پرانے سب واقعات بہت ہی دلچسپ تھے۔ دادا کا غصہ جلال دادی کی طنزیرہ جگت بازی۔ نانا ثانی کی ہکا پھینکتی۔ اپنے والدین کے ٹھنڈے مزاج پر سکون جنگ کے مزاجیہ واقعات۔ واہ!! ویسے ثانی کی ذات بابرکت بے حد مجلسی تھی۔ اب تو محلے بھر کی خواتین باری باری آتیں اور ثانی کی دلچسپ باتوں اور مسائل کے حل سے فیض یاب ہوتیں۔ محل کی امی تو باقاعدہ

ان کی مرید ہو گئی تھیں۔ اب ابا جان کی زندگی میں آنے والے مہمان نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔ البتہ محلے والیوں کے جھگڑے لگتے جیسے درس ہو رہا ہو۔ گھر کی بے رونق مفقود ہو چکی تھی۔ ثانی نے غم غلط کرنے کا ڈپلوما لیا ہوا تھا۔ اب تو ثانی کے فرمودات پر غور کرتے ہوئے ہی وقت گزر جاتا۔ ابا جان کی کمی کسی حد تک انہوں نے پوری کر دی۔ اس کا یونیورسٹی میں داخلہ بھی ثانی کا مہمون منت تھا۔ بہت سے رخصتوں کا مددگار بن گئیں۔ امی بھی خاصی مصروف اور مطمئن نظر آتیں۔ لیکن ایک جملہ جو اول دن سے بیٹی کو تاکیدا

سنائی تھیں۔ اب بھی وہی ان کے لبوں پر ہوتا۔

”اماں سے بحث نہ کیا کر نعمی۔ اماں خفا ہو جائیں گی۔ انہیں بحث پسند نہیں۔“ مگر نعمی بھلا جاتی۔

”اچھا تو ثانی! پھر قیامت کے بارے میں آپ نے ماموں کے بچوں کو بھی اپنے خیالات سے اسی طرح آگاہ کیا۔ جیسے مجھے۔“

”ہاں تو اور کیا۔“

”اور انہوں نے مان لیا؟“

”کیسے نہ مانتے۔ تمہارے جیسے منکر دین نہیں ہیں وہ۔ مسجد میں نماز پڑھتے ہیں۔“ ینینڈین مسلمان بہت ہی معصوم اور پرامن ہیں۔ جب انہوں نے یقین دلایا کہ ماموں مزید بھی ان کی دینی معلومات پر ایمان لے آئے۔ تمہارے جیسا کہ حجتی نہیں ہے میرا بیٹا۔“

ویسے اس میں شک نہیں۔ ثانی سے بحث میں مزا بہت آتا۔ بسا اوقات بحث بہت بھاری پڑ جاتی۔ امی کے دھمو کے بعد۔ شکو کی مذاق اڑاتی ہنسی اور بھی جی جلاتی۔



ایک دن تو دھماکا ہو گیا۔ ماموں جان مزید بغیر اطلاع کے آگئے۔ اپنی بہن بھانجی کے سر پر شفقت کا ہاتھ رکھا۔ یوں لگا جیسے حفاظتی سا بنان تن گیا۔ ثانی کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آئے تھے۔ ثانی کی تو عید ہو گئی۔ وہ ابھی سفر کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ اکیلی تو بالکل

ماموں کھل کر رہے۔ ”اچھا، مجھے تو کبھی نہیں بتایا۔ اصل میں وہ سوچتی بہت ہیں۔ کمائیاں بناتی ہیں۔ اور اپنی سوچ پر انہیں یقین ہوتا ہے۔ یہ ان کی عمر کا تقاضا ہے۔ مشاہدات و تجربات سے مزید رہنمائی ملتی ہے۔ ان کی مثبت سوچ کا یہ نتیجہ ہے کہ اپنی ہواور پوتوں کے ساتھ مثالی سلوک اور تعلق ہے۔ گھر امن امان کا گہوارہ ہے۔ اماں کے یہاں آجانے سے یقین کرو بہت دیر الٹی ہے ہمارے گھر میں بے رونق سی ہے۔“ اسے یقین تھا۔ ایسے ہی ہوگا۔ ساری رونق تو یہاں تھی۔



یونیورسٹی میں پہلا باقاعدہ آغاز تعارف و تعارف اچھا لگ رہا تھا۔ مگر گھر آکر اندرونِ خانہ خبر ملی۔ ثانی صبح دیر تک نہیں اٹھیں تو ماموں سمجھے رات کو کچھ بے چینی رہی ہوگی۔ لیکن وہ خاموش ہو چکی تھیں۔ ہمیشہ کے لیے ڈاکٹر نے آکر تصدیق کی۔ ان کا سانس دو گھنٹے پہلے ہی رک گیا تھا۔ دل خاموش۔ وہ ثانی جو گھر میں قبل کی طرح چلتی تھیں۔ اب وہ بلبل خاموش تھی۔ اسی نے بتایا رات کو کہہ رہی تھیں۔

”مجھے کینڈا میں ڈبے میں بند ہو کر دفن نہیں ہونا اور ڈبے بھی کھڑا کر دیتے ہیں۔ یہ بھی خیال نہیں کرتے کہ مرہ لینا چاہے تو۔ بھی کھڑے کھڑے تو زندہ بھی تھک جاتا ہے۔“

ماموں انتہائی ریجیدہ سر جھکائے بیٹھے تھے۔ اسی مشکل ضبط کر رہی تھیں۔ سعی کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ اچھی بھی سوئی تھیں۔ کیسے یک دم انسان دائمی سفر کے لیے روانہ ہو جاتا ہے۔ اباجان بری طرح یاد آئے۔ ثانی نے کس طرح سب کو ہلائے رکھا تھا۔ غم گساری یوں بھی ہوتی ہے۔ آتے ہی مقبولیت کے ریکارڈ قائم کر دیے۔ گھر آنا ”فانا“ لوگوں سے بھر گیا۔ محلے والے۔ بڑوسی۔ دور نزیک کے رشتے دار۔ ماموں بے حد مصروف ہو گئے۔ وہ جو بیٹی اور نواسی کا غم سمیٹنے آئی تھیں۔ اپنا کام کر کے منزل کی طرف روانہ

نہیں بلکہ وہ اب کنڈا جانا چاہتی ہی نہ تھیں۔ یہاں دل لگ گیا تھا۔ نواسی کے ساتھ (واہ رے) اور اتنے محبت کرنے والے موجود تھے۔ (محلے والیاں) اپنا وطن اپنی زبان۔ وہاں کیا دھڑا ہے۔ کمبخت ماریاں انگلش میں گٹ پٹ کرتی تھیں۔ آتے ہوئے جاتے ہوئے بھی انگریزی میں سلام۔ منحوس ماریاں۔ اردو تو جیسے گناہ تھی۔ رنگ و اپا کستانی یا انگریز سمجھتی ہیں خود کو۔

ماموں نے چند دن ملنے ملانے میں لگا دیے پھر سب کو لے کر مریٰ تھیا کلی ایبٹ آباد کی سیر کو روانہ ہو گئے۔ ایبٹ آباد میں ان کی سالی صاحبہ رہتی تھیں۔ وہاں خوب سیریں ہوئیں۔ پہاڑوں پر اوپر سے نیچے باقاعدہ آبادی تھی۔ رات کو لائٹیں روشن ہوئیں تو لگتا چراغوں ہو رہا ہے۔ نالی بہت خوش تھیں۔ خوشگوار ٹھنڈی ہوائیں۔ پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو میں لپٹی قدرتی صنایع کے بے مثل مناظر۔ کسی کا دل واپسی کے لیے تیار نہ تھا۔ محروم واپس آتا تو تھا۔

واپس آکر ماموں نے واپسی کی کٹلی۔ ثانی واپسی کے لیے تیار نہ تھیں۔ روز بھانہ بتا دیں۔

”رات سر میں اتنی کھلی ہوئی۔ دو بجے مچھی کو جگایا۔ اس نے گنگھی کی۔ تیل لگایا۔ پھر صبح سوئی میں بتاؤ وہاں جہاز میں کھلی ہوئی تو۔ مسافر تو چھوڑو۔ ایر ہو سٹس کیا کہے گی کہ بڑی بی کی عمر دیکھو اور جوؤں کی پیلغار۔ لو بھلا۔ بدنامی سی بدنامی۔“

کبھی آنکھوں کا توازن بگڑ جاتا۔ ”ایک کے دودو نظر آ رہے ہیں۔ یہ مبینہ ہے ہی منحوس۔ ایر ہو سٹس آئے گی۔ مجھے دو نظر آئیں گی۔ تو کون سی سے چائے کا کہوں گی۔ پاگل سمجھ گئی تھیں۔“

ماموں بھی جانتے تھے۔ ٹالتے رہے۔

شمنین نے پوچھ لیا۔ ”ماموں! آپ نالی کی ہر بات پر یقین کر لیتے ہیں۔“

ماموں مسکرائے۔ ”بے شک ماں کو جھٹلانے کا گناہ کر کے جہنم تو نہیں خریدوں گا۔“

”خواہ۔۔۔ کچھ بھی یعنی قیامت کے جو مناظر دکھائے انہوں نے۔“ اس نے پورا نقشہ کھینچا۔

ہو گئیں۔

جنازہ اٹھا تو غم سے امی کی ہچکیاں لگ گئیں۔ غم مانے والی۔ اپنا غم دے گئیں۔ اباجان کے بعد ایک اور چاہنے والی ہستی جدا ہو گئی۔ خالہ کا فون آسٹریلیا سے آیا۔ چچا کا تعزیت کا۔ لوگ آتے جاتے رہے۔ کئی دن بہت سے لوگ آئے مگر رونق مفقود۔ امی صدے سے جو ناموں افسردگی کی تصویر۔

”کیا قدرت اسی لیے مجھے لائی تھی۔“ بار بار یہی کہتے۔ پھر چونک گئے۔ ”شکر ہے میں آگیا تھا۔ تم کس طرح سارے کام کرتیں اور میں کیچھتاوے میں زندگی گزارتا۔“

امی کو بھی احساس تھا۔ وہ اکہلی یہ فریضہ کیسے ادا کرتیں۔ کیا مکمل والوں سے مدد نہیں۔ مجبوراً۔ آج بھائی کی موجودگی غنیمت لگ رہی تھی۔ اللہ نے مدد کی بھائی کو بھیج دیا اور اماں کا ارمان۔ وطن کی مٹی نصیب ہوئی۔ جا کر قبر میں لیٹ گئیں۔

امی کو کیچھتاوا۔ ”میری وجہ سے آئی تھیں۔ میرے گھر سے جنازہ اٹھا۔“ جہاں ماں کی محبت شفقت سے محرومی کا دکھ تھا۔ وہیں اپنے گھر سے جدائی کا قلق۔ ”گھر میں کیسی بھاری تھی ان کے دم سے۔ رونق اور برکتیں ساتھ لے گئیں۔“ محلے بھری خواتین کو بھی بے حد افسوس اور قلق تھا۔

”کس طرح سب سے کھل مل جاتی تھیں۔ مسائل کا حل بتاتیں۔ کسی کو کفایت کے گڑ سکھاتیں۔ کسی کو بھوسے بنا کر رکھنے کی تدبیر، کسی کو سانس مندوں کو خوش کرنے کی کار آمد تدبیر۔ خواتین جب آتیں ان کی صلاحیتوں کے سن گاتیں۔

”میں نے ان سے کہا اماں! میرے میاں بہت غصے والے ہیں۔ میری لڑائی ہوتی ہے روز۔“ تو کہنے لگیں۔ برداشت کی عادت ڈالو۔ زبان قابو میں ہو تو معاملہ سلجھ جاتا ہے۔ زبان ہی فتنہ ہے۔ میں نے ان کی نصیحت پر عمل کیا تو یقین کرو، میاں کا مزاج بھی اعتدال پر آگیا۔“

سب کی زبانیں اماں کی تعریف تو صیف اور قابلیت کو سراہ رہی ہوتیں۔ تینوں کو بھی قلق تھا کہ اس نے خود ان سے کچھ نہ حاصل کیا۔ خود کو عقل کل سمجھ کر بحث کرتی رہی۔ واقعی آدمی کے گزر جانے کے بعد اس کی قدر ہوتی ہے۔

ماموں بھی چند دن بعد چلے گئے۔ بچی کچھی بہار رخصت ہوئی۔ البتہ ٹھی کا اکاؤنٹ کھلوا کر کالی رقم جمع کروادی۔

”اماں نے کہا تھا، ٹھی کی تعلیم کا پار اٹھاؤ۔ ان کی خواہش پوری کرنا۔ میرا آخری فرض ٹھہرا۔ میں بوقت ضرورت اور رقم اکاؤنٹ میں بھیجا کروں گا۔ جب تمہیں ضرورت ہو۔ تو بلا تکلف فون کر دینا۔“

خالہ بھلا کیوں نہیں آئیں۔ ایسے وقت پر بھائی بہن کو بڑے بہن بھائی کی موجودگی سے تقویت ہوتی ہے۔ غیروں کی طرح فون پر افسوس۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔

اور وہ صاحب زادے سہیل نہ جانے کس دنیا کے باسی تھے۔ خالہ سے بات کرتے نہ مغیترے، پتا نہیں خالہ نے ان کی کس طرح پرورش کی ہے۔ یوں تو ابا جان نے کئی بار موصوف سے بات کی تھی اور مطمئن ہو گئے تھے۔ مگر اسے یہ بے نیازی کھٹک رہی تھی۔ امی کو بھی کوئی پروا نہ تھی۔ انہیں اپنی آپا پر بہت بھروسہ تھا۔ ہونا بھی چاہیے۔



پھر گھر میں ایک تغیر آیا۔ خوشگوار ہوا کا جھونکا۔ چچی کے ایک چچا کی معرفت نسری کا رشتہ آیا تھا۔ چچی نے آ کر بتایا کہ چچا کے ہاں جا کر ہی بات ہوگی۔ دونوں بیٹیوں کو لے کر فوراً چلی گئیں۔

شکوے بھنوں تن کر خیال آرائی کی۔

”بی بی! مجھے تو دال میں کالا کالا دکھتا ہے۔ بھلا دوسروں کے گھر بیٹیوں کے رشتے طے کیے جاتے ہیں؟“

امی کو تو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کالا نہ سفید۔ یہ

محترمہ خواہ مخواہ فکر میں مبتلا ہو گئیں۔ ہر معاملے میں دخل اندازی۔ اب گھر میں کوئی مرد نہیں تو چچی کو اپنے چچا کا سہارا لینا پڑا۔ یہ استدلال بھی شکوے نہ درگزیاد۔
”لڑکی کے باپ کو خود دیکھ بھال کرنی چاہیے۔
بوڑھے چچا کو تو نہ دھکائی دیتا ہو گا۔ نہ سناٹی دیتا ہو گا۔
بچارے کیا طے کریں گے۔“

وہ تو باپ کی ذمہ داری پر لیکچر دینے کو تیار تھی مگر نشین نے امی سے شادی میں پہننے کے کپڑوں کا تقاضا کر دیا۔ مہندی، شادی، ولیمہ۔

چچی آئیں تو وہ دوڑی۔ نسرئی سے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“
بات طے ہوئی ہے۔“

نسرئی شرمائی۔ ”ہوں!“ مختصر جواب۔

چچی کمرے میں کپڑے پھیلائے از حد مصروف۔
کسی سوال کا جواب خاطر خواہ نہ دیا اپنی الجھنوں کا ذکر کرتی رہیں۔ واقعی چچا آخر کیوں نہیں آجاتے بیٹی کو رخصت کرنے۔ لیکن ابھی امی سے بھی جواب سوال نہ ہوئے تھے کہ کچھ سامان لے کر وہ پھر چلی گئیں۔

اسری تو آتی ہی نہ تھی ورنہ ضرور سب کچھ بتا دیتی۔
نعمی یونیورسٹی میں مصروف تھی۔ امی کو اتنا علم ہو گیا کہ چچی کے چچا کی شادی کا انتظام کریں گے۔ ان ہی کی معرفت رشتہ ہوا ہے۔ امی خاصی پریشان ہو گئیں۔

سوچ میں ڈوب گئیں۔
”بھابھی کی بیٹی کی شادی کا انتظام ان کے چچا کر رہے ہیں۔ میرے تو کوئی چچا بھی نہیں اور میری بیٹی کے چچا تو۔۔۔ اپنی بیٹی کی شادی میں نہیں آ رہے۔ سنا ہے کہ سادگی مد نظر ہے۔ مہندی مایوں سب خرافات رٹھیں ہیں۔ اصراف بے جا اور لغو۔ اسلام میں لغویات کی ممانعت ہے۔“ کون اعتراض کرتا۔

☆ ☆ ☆

شادی ہال میں خوب رونق تھی۔ بے حد آرائش، غیر ضروری چکا چوند۔ پھولوں کے گلہ دستوں کی قطاریں۔ اس سلسلے میں اصراف بے جا کا خیال نہیں آیا۔ اسری تو مہمانوں کی خاطر میں از حد مصروف

تھی۔

مہمان زیادہ تر تو چچی کے عزیز ہی تھے۔ کچھ وہ بھی تھے۔ جو ابا جان کی زندگی میں خوب آیا کرتے تھے۔ امی کی خاطر داریوں کا لطف لینے۔ ظاہر ہے ابا جان کے رشتے دار چچا کے بھی ہوئے۔ سب امی سے مل رہے تھے۔ تعجب تو یہ تھا کہ محلے والوں میں سے کوئی نہ تھا۔ حالانکہ چچی کے سب سے اچھے تعلقات تھے۔ وہاں اسے اپنی ایک کلاس فیلو مل گئی۔ دونوں بچپنی سیٹوں پر بیٹھ کر مہمانوں پر تبصرہ کرتے لگیں۔

”ہائے اللہ قل ہی آجاتی۔ برا مزہ آتا۔“

”لو محلے والوں کو کون بلاتا ہے۔“ مہ رخ نے کہا۔

”رشتے دار ہی اتنے ہو جاتے ہیں۔ پھر اپنی گنجائش بھی دیکھنی پڑتی ہے۔ نہیں ہو سکا ہو گا زیادہ انتظام۔ حالانکہ یہ جو فضول نمائش کی ہے لائٹوں اور پھولوں کی بھرمار۔ لاکھوں میں ہوگی۔“

مہ رخ زیادہ سمجھ دار تھی۔ مگر وہ بتانہ سکی کہ چچا اور ان کا بنانا تو امریکن ڈالروں میں کھیلتے ہیں۔ کمی تو نہیں ہے۔ بلکہ گنجائش سے بہت زیادہ کمارے ہیں۔

وہ چپ رہی۔ پھر بیارات کی آمد کا غلغلہ اٹھا۔ کیمبرے ادھر ادھر بھاگ دوڑ میں مصروف ہو گئے۔ سب سے آگے دو لکھامیاں دوستوں کے جلو میں داخل ہوئے۔ ڈھول ڈھاکوں کے ساتھ۔ پھر ان کا مردانہ جلوس ساتھ والے پورشن میں چلا گیا۔ مردانہ، زنانہ الگ رکھا گیا تھا۔ مردوں کے قافلے گزر گئے۔

اب خواتین کا جلوس نمودار ہوا۔ نعمی نے امی کو چچی اور اسری کے ساتھ پھولوں کے ہار لیے گیٹ کے پاس کھڑا دیکھا۔ وہ بھی اپنی جگہ سے آگے نہ ہوئی۔ پھر اس نے امی کی آواز سنی۔

”ارے آیا! آپ، آپ کب آئیں قطرے؟“

حیرت اور ناسف سے لبریز ان کی آواز۔ اس نے بھی خالہ کو سب سے آگے دیکھ لیا تھا جو کچھ بوکھلائی ہوئی تھیں۔

”ہاں وہ، ارے بابا! بچی کو دیکھ۔“ کہتے ہوئے چچی کے ہاتھوں سے مسکرا کر بارہ ہنستی ہوئی وہ آگے بڑھ

لکس۔ نمی کو بچانے بغیر۔ (شاید) سامنے سے گزر لکس۔ زنانہ اسٹیج کی جانب۔

چی کے جلو میں خالہ اور ماہان کی بیٹی، یہ یہاں کیا کر رہی تھیں۔ پھر چی انہیں سہ ہنوں والے صوفوں کی طرف لے گئیں۔ عزت و احترام کے ساتھ۔ ماہانے تو اسے بچانا بھی نہیں۔ اسری بھی۔ صاف لگا کہ منہ پھار رہی ہے۔ پھر اسٹیج پر خالہ اور ماہا چند خواتین کے ساتھ بیٹھی نظر آئیں۔

خالہ مسلسل محو گفتگو تھیں، پتا نہیں کس کے ساتھ۔ شاید وہ کچھ پریشان تھیں یا مصروف نظر آنے کی فضول کوشش۔ خالہ کا رویہ۔۔۔ اسے عجیب لگا۔ کچھ چھین سی ہوئی۔ یہ ماجرا کیا ہے؟ نانی کی وفات پر تو انہیں سکیں۔ نسر کی بارات میں بیٹی سمیت۔۔۔ یہ ماہا کی سرسری تقریب تو نہیں؟

پھر شور ہوا۔ اب دلہن چند لڑکیوں کے گھیرے میں اندر آ رہی تھی۔ اسری؟ ہاں ساتھ ساتھ سب سے آگے جراتی، کسی نے کہا ہی نہیں کہ چلو نمی دلہن کو لے آئیں۔ اسری نے بھی۔۔۔ اجنبیت کا نقاب چہرے پر صاف نظر آ رہا تھا۔ یہ ماجرا کیا ہے۔ وہ یقیناً "ہولنق" نظر آ رہی ہوگی۔

دلہن کو اسٹیج پر بٹھا دیا گیا تھا۔ قمقمے لگ رہے تھے اور نمی بجاری دم بخود بھول بھلیوں میں بھٹک رہی تھی۔ پھر نایک کھل گئے۔ نکاح کا خطبہ۔ پھر ایجاب و قبول۔۔۔ دولہا کا نام صاف طور پر سماعت سے ٹکرایا۔ نمی بوکھلا گئی۔ مہ رخ کا شانہ دیو بج لیا۔

"امی امی کہاں ہیں؟"

اسے امی کی مدد کی ضرورت تھی۔ امی اس سے بھی پھیل رو میں شروع میں ہی بیٹھی تھیں۔ شاید وہ بھی خالہ سے مل کر آگے جانے کے بجائے قریبی سیٹ پر بیٹھ گئی تھیں۔ شاید نقاہت کے سبب۔ وہ نمی کی طرح کسی بھول بھلیوں کے اسرار میں نہیں کم ہوتیں۔ انہیں شک ہو گیا تھا بلکہ یقین تب ہی وہ جو قریبی سیٹ نظر آئی اس پر جم گئیں۔

نمی نے تیزی سے آکر ان کو تھام لیا۔ ان کا چہرہ

زرد تھا۔ ہلکی ہلکی کپکپاہٹ سے ہونٹ کھل گئے تھے۔ نمی کو نہیں، دراصل امی کو مدد کی ضرورت تھی۔ سہارے کی۔ کسی اپنے کی قربت کی خواہش۔ ان کے اپنے اسٹیج پر مبارکبادیں وصول کر رہے تھے۔ نمی نے امی کو پکڑ لیا۔ اپنی اپنی بیٹی مدد کے لیے آ گئی تھی۔ انہیں سہارا ہی تھی۔ ہمت بڑھ رہی تھی۔ وہ جو خود کمزور تنکا تھی، ماں کے سہارے کی محتاج۔ آج مضبوط سہارا بن گئی۔

مہ رخ بھی آ گئی۔ اس نے ان کی کیفیت دیکھ کر بیرے سے ایک گلاس پانی منگا کر انہیں پلایا۔ پھر امی کا ضبط جواب دے گیا۔ وہ رونے لگیں۔ عجب نقاہت تھی۔ سینکڑوں لوگوں سے بھرے ہال میں تنہائی محسوس ہو رہی تھی۔

"آئی کو کیا ہو رہا ہے مٹھیں؟ میرا خیال ہے انہیں گھر لے جاؤ۔ میں ابو سے کہتی ہوں، وہ پنچا دیں گے۔"

"نہیں مہ رخ! ابھی ٹھیک ہو جائیں گی۔ چچی کو مبارک باد دے کر پھر چلے جائیں گے۔ امی سنبھالیے خود کو۔ کیا ہو گیا ہے۔ چلیں ہمت کریں۔ چچی اور خالہ کو مبارک باد دیں۔"

وہ ڈر گئی تھی۔ ہمت مار کر امی کچھ ایسا نہ کریں کہ سب کے سامنے شرمندگی ہو۔

اف۔ خالہ کی بے نیازی۔ مصنوعی بے رخی۔ انگوٹھی کسی کو۔ نکاح کسی سے۔ پلکوں میں چھین ہونے لگی۔ وہ اپنی کیفیت سے خود بھی لاعلم تھی۔ گلا خشک ہو رہا تھا۔ اس نے سہیل کو تو کبھی بچپن میں دیکھا تھا۔ پھر اب۔۔۔ اندر سناتا کیوں پھیل رہا تھا۔ لیکن اس پر ماں کی ذمہ داری تھی۔ انہیں بھلانا تھا۔ حوصلہ بڑھانا تھا۔ اب نانی تو نہیں آئیں گی ہمیں سنبھالنے۔ ہمیں خود ہی سنبھالنا ہو گا۔ اپنی مدد آپ۔

مہ رخ امی سے ادھر ادھر کی باتیں کر رہی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ کوئی غیر معمولی واقعہ آئی اور نمی کو بے چین کر چکا ہے۔ وہ ان کی توجہ دوسری باتوں کی طرف مبذول کر رہی تھی۔ مہ رخ، چچی کی چچی کی

بہت جی تھی۔ یعنی جن بچا کے گھر رشتہ طے ہوا تھا۔ ان بچا کے تو عزیز زند عمو تھے ہی کہ چچی کے بھی عزیز تھے۔ مگر چچی کی چچی کے میکے والے بھی بلائے گئے تھے۔ تبھی تو اس قدر ہجوم تھا۔ اچھا پھپھو نظر نہیں آئیں۔ کیا انہیں بھی پُرا سرار طور پر ہماری طرح بے خبر کھا گیا تھا۔

کھانے کا اعلان ہو رہا تھا۔ مہ رخ چلی گئی۔ امی نے ٹی می سے کہا بھی کہ جا کر کھالے۔ لیکن وہ دیکھ رہی تھی۔ امی کو نفایت ہو رہی ہے۔ وہ ہمت بحال کرنے کی کوشش میں بے حال ہو رہی تھیں۔ ٹی می کا رویہ دیکھ کر انہیں کچھ تقویت ہوئی۔ مہ رخ ایک بیرے کے ساتھ کھانا لیے آرہی تھی۔ میز پر کھانا رکھ کر بیر اچلا گیا۔ مہ رخ ہسلا پھسلا کر امی کو کھانا کھلانے میں کامیاب ہو گئی۔

ٹی می کے حلق میں لقمہ چبھ رہا تھا۔ کانے کی طرح۔ پتا نہیں کیوں؟ وہ خود اپنی کیفیت سے لاعلم تھی۔ چچی لپکی ہوئی آئیں۔

”بھابھی! ایسی طبیعت ہے؟ مجھے تو اس بچی مہ رخ نے بتایا۔ تو میں نے کھانا بھیج دیا۔ میں ذرا ادھر مہمانوں کو ذرا۔“

امی ان کی بوکھلاہٹ پر خود جیسے قوت بحال کر چکی تھیں۔ کھڑی ہو گئیں۔ چچی کو گلے لگا کر مبارک باد دی۔ ”بس بھابھی پیر سن ہو گئے تھے تو ہمیں بیٹھ گئی۔“ وہ چچی کو مطمئن کرنے میں کامیاب ہوئیں یا نہیں چچی نے ان کی معذرت قبول کی یا نہیں۔ مگر ٹی می سے کہا۔ ”آؤ ٹی می۔ نرسی کے ساتھ کھانا کھاؤ۔ وہ پوچھ بھی رہی تھی کہ۔۔۔ اس کی سہیلیاں اسے کھلا رہی ہیں کھانا۔ وہ بچی کب کچھ کھا رہی ہے۔ نکاح کے وقت اتاروئی کہ لینے کے دینے پڑ گئے۔ اب بھی۔۔۔ رخصتی کے خیال سے روئے جا رہی ہے۔ آنسو نہیں تھمتے اس کے۔ اچھا بھابھی میں چلوں۔ وہ مہمان کھانا ذرا۔“

وہ چلی گئیں۔ خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع کیا۔ جس بچی کے آنسو نہ ٹھمتے تھے۔ وہ اسٹیج پر سہیلیوں کے

جھکٹے میں دور سے ہی دانت چکا رہی تھی۔ امی کے دانت واقعی خاصے لمبے تھے۔ آج بطور خاص دیکھے۔ شاید خوشی میں یوں ہی ہوتا ہو گا۔ دانت لمبے جاتے ہوں گے اور یہ سہیلیاں کہاں سے دستیاب آئیں گی! اچانک۔ کبھی تو کسی کا نام نہ سنا تھا۔ نہ رخ پر نہ کبھی نظر آیا۔ باہ۔

دولہا اپنے دوستوں کے ہمراہ زنانے حصے میں داخل ہو رہا تھا۔ اسرئی، ماہا ساتھ تھیں۔ ان لوگوں کے سامنے سے گزر گیا تو قالہ بھی آگئیں۔ بیٹے کا ہاتھ قہ کر آگے بڑھ رہی تھیں پھر اسٹیج پر دلہن کے ساتھ بطور خود بھی پہلو میں براجمان ہو گئیں۔ تصویریں کھا کھٹلی جا رہی تھیں۔

اسٹیج پر سلامی کی رسم ہو رہی تھی۔ (اصراف بے ہمارے دولہا اتنی قیمتی چیز لے کر جا رہا ہے۔ دلہن۔ کسی کی انمول متاع، ماں باپ کا درنایاب۔ سلامی کیوں؟)

”امی! اٹھیں۔ سلامی ہو رہی ہے۔ آپ جو لفافہ لائی ہیں دے دیں جا کر۔“

چچی بھی آگئیں بطور خاص مدعو کرنے۔ ”بھابھی آئیے سلامی ہو رہی ہے۔“

ٹی می نے معذرتی لہجے میں کہا۔ ”چچی! ہم آئی رہے تھے ادھر۔ امی کو کمزوری محسوس ہو رہی ہے اس لیے آہستہ آہستہ آتے ہیں۔“

چچی نے بغور ٹی می کو دیکھا۔ ٹی می نے فوراً ”خوشی سے معمور لہجے میں کہا۔ ”چچی! نرسی کامیک اپ مکمل سے کروایا ہے۔ بہت پیاری لگ رہی ہے۔“

چچی نمال ہو گئیں۔ وہ روغن قاز لینے پر خود کو دلا دینے لگی۔ مہ رخ نے اسے کہنی ماری۔

”واہ! میک اپ بغضول لگ رہی ہے۔ دانت کھراکتے لمبے ہیں۔ کسی نے کہا نہیں۔ ہنسومت۔“

ٹی می نے مہ رخ کو گھورا۔ ”تمہیں کیا، اس کی ساس کو اس کے لمبے دانت ہی پسند آئے تھے۔“

”جب کانے گی ان ہی دانتوں سے تو چیخیں ماریں گی ساس ماں۔“

نمی کو ہنسی آگئی۔ امی کو لڑکیوں کی مزاحیہ باتوں نے دھل دیا۔ وہ اسٹیج پر چڑھ گئیں۔ وہاں بے ہنگم شور مچا۔ بچی خوشی سے نہال تعارف کروا رہی تھیں۔ جیسے پہل جیتی ہو۔

”یہ نسرئی کی بڑی تائی ہیں۔ تم جاننے تو ہو۔“ واضح طور پر نہیں۔ خوش مزاجی کا مظاہرہ کامیاب رہا۔ دولہا پھانک کر کھڑا ہوا۔

”میں شاید تمہاری خالہ ہوں اگر تم پہچانتے ہو تو“

دولہا بے چینی سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اسے ماں، بہن کی کمک درکار تھی۔ چچی نے نکارا۔

”ارے یہ نمی کدھر ہے۔ آؤ ناٹینہ بیٹی! بہنوئی سے ملو۔ تم وہاں منہ چھپائے کیوں کھڑی ہو۔“ ٹینہ نے اپنی پہلی بار اس کا پورا نام انہوں نے لیا تھا۔

وہ اچک کر اسٹیج پر چڑھی۔ ”منہ کیوں چھپاؤ گی بھئی! سامنے تو کھڑی تھی، آپ کے بلانے کا انتظار کر رہی تھی۔“

امی دولہا کو سلامی کا لفافہ دیتے ہوئے گلوگیر آواز میں کہہ رہی تھیں۔

”نسرئی کے دولہا کے لیے سلامی لائی تھی۔ اگر معلوم ہو تا تو بھانجے کے خیال سے زیادہ لائی۔ پتا نہیں رازداری میں کیا مصلحت تھی۔ آپا اتنی غیرت برتن گی۔ امید نہ تھی۔“

دولہا پر شرمندگی کا بوجھ آگرا۔ سر جھکا لیا۔ چچی بلند آواز میں گننے لگیں۔

”اور بیٹا سہیل! یہ ٹینہ! نسرئی کی دوسری بہن۔ تمہاری سالی نمبر دو۔ سوچا تعارف کرادوں۔“ چچی خوشی میں سرشار تھیں۔

نمی کا چہرہ تپ گیا۔ اس نے انگلی سے انگوٹھی نوج لڑ نکالی۔ چچی کو دکھا کر دولہا کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

”چچی! اس وقت بہنوئی نمبروں کو دینے کے لیے اس ففے کے سوا میرے پاس اور کچھ نہیں۔“

چچی کی ہنسی کو بریک لگ گیا۔ دولہا کی آنکھیں اس

پر ٹک گئیں۔ سر سرائی آواز میں بولا۔

”تم نمی۔؟“

اسے ہنسی آگئی۔ ”ٹھیک پہچانا۔ مزید خالہ سے پوچھ لیں۔ اگر انہیں یاد ہو۔“

وہ فوراً ہی مرکز امی کا بازو تھام کر نیچے اتر آئی۔ چچی نے نکارا۔

”گھر دپ فونو کے لیے آپ کو آنا ہو گا بھابھی۔“ مگر امی میں ضبط کی تاب بھی نہ رہی۔ خالہ کو مبارک یاد دینے کی حسرت ہی رہ گئی۔ امی نے کمزور آواز میں کہا۔

”اب بیٹھا نہیں جائے گا۔ گھر چلو۔“

نہ جانے خالہ کس مسئلہ میں الجھی ہوئی۔ نظر آ رہی تھیں۔ خواتین کے جھگڑنے میں۔ شاید بہن، بھانجی سے منہ چھپانا مقصود تھا۔

مہ رخ نے کہا۔ ”میں ابو کو لے کر آتی ہوں۔ جب تک وہ گاڑی گیٹ پر لائیں گے۔ تم آئی کو باہر لے آؤ۔ آرام سے۔“

تکلفاً بھی وہ مہ رخ کو منع نہ کر سکی۔ امی بہت تکلیف میں تھیں۔ آہستہ آہستہ انہیں باہر لائی۔

مہ رخ گاڑی کے پاس کھڑی تھی۔ مہ رخ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ پھر راستے سے میڈیکل اسٹور سے مہ رخ کے والد نے کوئی دوا خریدی اور نمی کو دے کر تاکید کی۔

”گھر جاتے ہی کھلا دینا۔ مجھے یہ ٹھیک نہیں لگ رہیں۔ دوا سے سکون ملے گا۔“

اف غیروں کو بھی احساس ہے لیکن اپنے لوگ طرح طرح سے اذیتیں دینے کے ماہر۔ یہ کیسے لوگ ہیں۔ کیسی دنیا ہے۔ رات امی دوا کے اثر سے سو گئیں۔ لیکن صبح ان کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ اس نے چھٹی کر لی۔ شکو آئی تو اس سے ہنس ہنس کر باتیں کیں۔ حال چال پوچھا۔ (جو کام کبھی نہیں کیا تھا)

”کیا ہو گیا بی بی! نمی بی بی کا مغز الٹ گیا کیا؟ نسرئی بی بی کی شادی میں کسی نے منتر تو نہیں پھونک دیا۔ یہ ایک رات میں کیا ماجرا ہو گیا کہ جنگل کا جنگل ہرا ہو گیا۔“

شکو پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔ نمی کا

خوشگوار موڈ برداشت نہ ہوا۔ مگر شکوے جملے نے امی کے ضبط کے بندھن توڑ دیے۔ نہ جانے امی کے پاس آنسوؤں کا کتنا ذخیرہ تھا۔ کل سے آج تک جمع ہوتے ہوتے دریا بن گیا۔

نعمی اور شکوے کی ہر طرح دل جوئی میں لگ گئیں۔ نہ جانے کیسا گہرا زخم تھا۔ درد کی شدت، اپنوں کی بے وفائی، وغالبازی بے رخی۔ بے نیازی۔ تغافل۔ بگاڑی۔ غیرت کی حد نہ تھی۔ نہ جانے زخموں سے کبھی فریاد بلند ہو رہی تھی۔ بے بسی۔ بے سہارا پن۔ (فریاد) فکروں کے درد۔ کس سے انصاف مانگیں۔ منصف خود ہی قاتل بن گئے۔ شکوے شادی کا حال سننے کے لیے بے چین تھی۔ سن کر اس کی جھنجھک گئی۔

رات کو مکمل بھی آئی۔ اسے یونیورسٹی میں مہ پرغ نے بتایا تھا۔ امی کی نقاہت کا۔ معاملے سے تو لاعلم تھی وہ۔ گل دنگ رہ گئی۔

”ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ یہ تھی رازداری کی وجہ؟“ چچی کئی دن تک اپنے بچپانے کے گھر سے نہ آئیں۔ محلے والیاں البتہ تو اتر سے آئی رہیں۔ افسوس اور غصہ۔ لگتا تھا نسری کی شادی نہیں جتناڑا تھا ہے۔

نعمی سب سے کہہ کہہ کر تھک گئی۔ ”کوئی بات نہیں خالہ۔ اللہ ہے ہمارے ساتھ۔ آپ لوگ امی کو سمجھائیں۔ ہو سکتا ہے ہمارے لیے بہتری ہو اس میں۔ اللہ کی مصلحتیں وہی سمجھتا ہے۔“ مگر کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ بہتری نظر تو نہیں آ رہی تھی۔ یتیم لڑکی، بے سہارا بیوہ۔ خالہ اور چچا کا فریب۔ بیوہ بیمار ہو گئی۔ یتیم لڑکی بائبل۔ ہنس ہنس کر سب کا استقبال کرتی۔ (جو پہلی بار دیکھا) اطمینان سے نصبہ تھیں کرتی۔ (وہ بھی پہلی بار)

”امی کو سمجھائیں۔ میں تو خوش ہوں۔ میری کزن کی شادی ہوئی ہے۔ مجھے کوئی غم نہیں ہے۔ اصل میں امی کو اس بات سے تکلیف پہنچی کہ چچی نے یہاں سے شادی کیوں نہیں کی۔ اپنے بچپانے کے گھر جا کر کیوں کی؟“ دراصل اسے تو اگلوٹھی سے لگاؤ تھا نہ اگلوٹھی

والے سے۔ لیکن امی کی فکر پریشانی سمجھ سکتی تھی پھر بھی وہ حتی الامکان انہیں اطمینان دلاتی رہتی تھی۔ نئی والی بات اب سچ ہوئی۔ خالو صاحب کو نسری کے ابا کے امریکن ڈالر زیادہ عزیز ہو گئے۔ مگر خالہ کا بری الذمہ ٹھہرائی جائیں۔ یہ مشکل تھا۔



شادی کے کئی دن بعد چچی آئیں تو وہ دوڑی گئی۔ نسری کا حال چال پوچھا۔ ”گھر کب آئے گی۔ امریکہ جاے گی یا؟“ چچی نے سرسری جواب دیا۔ پھر تھکن کا ہانہ کر کے لیٹ گئیں۔ وہ اسری کو برآمدے میں لے آئی۔ ”اتنے دن وہاں کیا کرتی رہیں۔“ کا جواب اسری نے دیا۔

”کیا منہ دکھاتے سب کو۔“ اسری شدید ناراض تھی۔ نعمی گھبرا گئی۔

”اچھا ہاں وہ تم کو جو اگلوٹھی پہنائی تھیں نسری کی ساس اماں نے کہاں ہے اب؟“ اسری ابھی بس۔ ”ارے“ میں نے تمہارے بہنوئی کو سلامی میں دے دی۔“ وہ خوشگوار لہجے میں بولی۔ اسری کا غصہ کم ہوا۔

”اچھا کیا۔“ اسری نے اسے شاباش دی۔ ”حق بہ حق دار رسید۔ تم نہ دیتیں تو میں تم سے لے کر ان کے منہ پر مار آئی۔ خالہ بھی جن بڑی۔“ منہ پھلا لیا۔ نعمی کو ہنسی آئی۔

”ارے۔ کیا ہو گیا بھی۔ کیا کوئی نئی بات ہوئی ہے جو تم خفا ہو۔ دنیا بہت بڑی ہے۔ سب چلتا ہے یہاں۔“

”حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ جس پر احسان کر چکے ہو۔ اس کے شر سے بچو۔ تم لوگوں کے ساتھ۔“

نعمی نے بات پوری نہ کرنے دی۔ ہسلادیا۔ سگلا بڑبڑاتی رہی۔ ”تم کیوں خفا ہو اسری۔ ہمیں کوئی شکایت نہیں۔“

ہر کام اللہ کی مرضی سے ہوتا ہے۔“ نعمی اسے ٹھنڈا کرنے میں لگی رہی۔

”تم نے۔۔۔ چچی نے تو حیران کر دیا۔ مگر وہ جانتا تھے، امی کے چچا اور نانی، امی کو بہت برا بھلا کہتے تھے۔ نانی نے تو آج کہہ دیا۔ ایک غلط کام کے لیے میرا گھر استعمال کیا تم نے۔ اب اپنے گھر جاؤ یا وہ تمہیں نکال دیں تو کوئی اور ٹھکانہ کر لیتا۔ یہاں نہ آنا۔ امی کو ان کے سب خاندان والے شرمندہ کر رہے ہیں۔ روز بڑنی۔ میں زبردستی امی کو لائی ہوں۔ ورنہ وہ تو اب بھی نہ آتیں۔“

”مگر تمہارے چچا یعنی نانا کی معرفت تو رشتہ ہوا تھا۔“ نعمی کو عجیب لگ رہا تھا۔

”لو انہیں تو اب پتا چلا ہے۔ ساری چالاکی تمہاری فلاں کی ہے۔ کہا کہ اس بات کا چرچا نہ کرنا۔“

”اچھا اچھا ختم کرو یہ بتاؤ نسری خوش تو ہے۔ کب آئے گی یہاں۔“ کسی طرح اسے اس موضوع سے ہٹائے۔

”خاک۔“ وہ جھٹلائی۔ وہاں ہر وقت۔۔۔ وہ ماہیگم اٹی اماس سے شکایت کرتی رہتی ہیں کہ کیا دیکھا۔ سانولا رنگ، لمبے وامت۔ مونے ہونٹ اور ان کے بھائی چپ سنتے رہتے ہیں۔“

نعمی نے کانوں کو ہاتھ لگائے اور وہاں سے اٹھ کر آ گئی۔ پتا نہیں کیا معاملہ تھا۔ شاید خالو نے ہی یا خالہ نے۔ نہیں تو پھر کس نے یہ رشتہ طے کیا تھا۔ وہ الجھ گئی۔ پھر سوچا۔ انجان رہنا بہتر ہے۔ نسری سے امدادی ہو رہی تھی۔ اتنی بری بھی نہ تھی بے چاری۔ وہ کمرہ بند کر کے پڑھنے بیٹھ گئی۔ لیکن ذہن میں الٹ پلٹ ہو رہی تھی۔ معمرہ تھا۔ مجھے کانہ سمجھانے کا۔

شام کو چائے کی تلاش میں آئی۔ خانساں تو تھا نہیں۔ شکو کی مرضی پر کھانا پینا تھا۔ شکو، امی سے شکوہ کر رہی تھی۔

”بی بی! آپ خاموش کیوں رہیں۔ وہ آپ سے معافی مانگ رہی تھیں۔ آپ کہتیں مجھ سے نہیں اللہ

سے معافی مانگو۔ راز کی بات تو نہیں تھی۔ اب سب کو خبر ہو گئی کہ نہیں۔ دل میں کھوٹ تھا۔ اور اب معصوم بن کر۔“

امی نے ڈانٹا۔ ”اچھا بس کرو۔ کچن کو دھولو، بہت جکنا ہو رہا ہے۔“ وہ نعمی کو دیکھ کر موضوع سے ہٹ گئیں شاید۔

”اصل میں نا۔ بی بی جی، غم کے مارے مجھ سے کوئی کام نہیں ہو رہا۔ دیکھ لو چائے تک نہیں بنائی۔“ منہ بنا رہی تھی۔

”پائیں شکو! تمہیں کاہے کا غم ہے۔“ حیرت تو لازمی تھی۔ شکو دھیت بڑی اور غم؟

”لو جی، غم تو آدمی کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ اب دیکھ لو۔ یہ کیا کم غم ہے۔ نسری بی بی کا کیاہے چوروں کی طرح۔“ ”شکو چپ رہو۔ فضول بولتی ہو۔ خوشی کا موقع ہے۔ اٹھو چائے بناؤ جا کر۔ انسان کو سوچ کر بات کرنی چاہیے۔“

امی اسے ڈانٹ رہی تھیں تو نعمی کو ہنسی آگئی۔ بولی ”تو امی انسان کو نا۔ یہاں تو ایسا نہیں ہے۔“ شکو منہ پچھلا کر کھڑی ہوئی۔ ”بھلائی کا تو ویلا ہی نہیں ہے۔“

وہ چلی گئی تو امی نے بتایا۔ ”تمہاری چچی آئی تھیں۔ معافی مانگ رہی تھیں۔ کہہ رہی تھیں آپا نے کہا تھا۔ یہ راز ہی رہنا چاہیے۔“



وقت گزر رہا تھا۔ وہ بھی یونیورسٹی میں مصروف تھی۔ امی نے مشین نکال لی تھی۔ نہ جانے کیا کیا سیتی رہتی تھیں۔ دل بسلانے، مصروف رہنے کے لیے۔ چچی پھر نہیں آئیں۔ نسری آئی یا نہیں۔ نہ اس نے پوچھنا نہ کسی نے بتایا۔

”یونیورسٹی میں تقریریں مقابلے۔ پھر اسپورٹس۔ وہ تو گھن چکر بن گئی۔ امی نے کہا بھی۔“

”ہر چیز میں ٹانگ نہ اڑایا کرو۔“ ”مگر وہ مشغلے کی تلاش میں رہتی تھی۔ اور اب امتحان

بھی نزدیک آ رہے تھے۔ کبھی گل آجاتی تو مل کر پڑھتیں۔
گل کا رشتہ طے تھا۔ امتحانات کے بعد شادی تھی۔
ای بے حد فکر مند رہنے لگیں۔

پچھو بہت دن بعد آئیں۔ نسری کی شادی کے زمانے میں یہاں نہ تھیں۔ کراچی گئی ہوئی تھیں۔ نہ جانے کس کی شادی میں۔

کچھ دن بچے سے ناراض رہیں۔ پھر سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ نئے نئے قصے سنا کر امی کو ہولا دیتی تھیں۔

”عمر گزر جائے تو اچھے رشتے نہیں آتے ابھی سے تلاش کرو۔ نہیں تو بیٹھی رہ جائے گی۔ آخر نسری کی وقت پر ہو گئی کہ نہیں۔ کوشش کرو گی تو مرضی کا رشتہ ملے گا۔“

نعی نے سن کر دل سے کہا۔ ”چچی جیسی کوشش۔ امی کے بس کی بات نہیں۔“ پچھو کو اس پر بھی حیرت نہ ہوئی کہ۔۔۔ بیٹی کی شادی میں باپ شریک نہ ہوا۔ بھائی بھی وہیں بجا رہا۔

”اے بھائی ہو گئی شادی ان کے بغیر کہ نہیں“
تو اونچو کا خرچا کرتے۔ بچت کرنی چاہیے۔“

ایک دن کہنے لگیں۔ ”میں ہی لے جاتی سوہنا کر مگر آج کل کی اولاد فتنہ ہے۔“

عقدہ نہ کھلا۔ مطلب کیا تھا۔ فتنہ کہاں تھا۔ شکوہ البتہ خفا۔

”یہ وہی ہیں نا۔ جو صاحب سے لڑی تھیں کہ میرے بیٹے کے ہوتے ہوئے خالہ کے بیٹے سے ممکن کیوں کی؟“

مگر پچھو کی چچی سے خوب گاڑھی چھن رہی تھی۔ شکوہ کو شک تھا کہ بچا اور ان کے بیٹے کی کمائی کے دار پچھو کو بھیج رہے ہیں۔ دیکھ لینا۔ اسری بی بی کو لے جائیں گی بیاہ کر۔ وہیں ڈیرہ جمار کھا ہے۔“

اف اس کی خیال آرائیاں۔۔۔ چلا لو۔ وہ آرام سے لیٹی تھی۔ تھک گئی تھی۔ گل کا انتظار تھا۔ اس کے گھر آئے دن سسرال والے آ جاتے، ان

کی خاطر مدارات، پاس بیٹھ کر اخلاق برتتا۔ کبھی ہولے والی نند کے۔۔۔ جھنگوں کی تعریف کرنی، کبھی سوٹ کی یا میچنگ سینڈل کی۔ اوہو ہو۔ وہ تو کبھی ایسی مصنوعی اخلاق کی قائل نہ تھی۔ مگر ٹھنڈا سانس لے کر گل کہتی۔

”مجھے بھی پسند نہیں۔ زبردستی طاری کرتی ہوں کیفیت۔ آج کل بہت فیشن ہے۔ کرنا پڑتا ہے نعیمی۔ ورنہ لوگ ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ کبھی کبھی رشتے بھی ٹوٹ جاتے ہیں۔“

”اور تمہیں بہت شوق ہے۔ ایسے لوگوں سے شادی کا۔ جو بددلی اخلاق کو فیشن کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ توبہ۔“

”اماں ابائی وجہ سے سب کرنا پڑتا ہے۔ رشتہ جڑ رہا۔ ورنہ ان کو ایس عمر میں کہاں کوئی نیا رشتہ ملے گا۔“ وہ بہت سنجیدہ تھی۔

”ارے، ارے رشتہ تمہارے ابا کا ہو رہا ہے کیا۔ اس عمر میں۔“ اچھل پڑی سن کر۔

”ماروں گی اب۔“ گل ہنس دی۔ جھینپی ہوئی ہنسی۔ ”میرا مطلب ہے اس عمر میں ابا کہاں ڈھونڈیں گے نیا رشتہ۔ میرے لیے، بالکل! میرے لیے۔“

”ہیں؟ تمہارے لیے بالکل؟ یہ؟“ والے کیا پاگلا ہیں؟ بالکل۔۔۔



اس دن جو خفا ہو کر گئی تو آئی نہیں۔ مگر آؤ یونیورسٹی میں تو سابقہ پڑتا تھا۔ بارے من گئی۔ آئے کا کہا تھا۔ شکوے آخر سر گوشی کی۔

”مہمان آئے ہیں۔ بی بی بلارہی ہیں۔“ وہ الجھ گئی۔ ”مہمان آئے ہیں تو میرا کیا کام ہے۔“

”نسری بی بی آئی ہیں۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھیں۔“

وہ سرعت سے کھڑی ہو گئی۔ ”اللہ! شادی کے پہلی بار ہمارے ہاں آئی ہے۔ چلو بھی مل لیتے ہیں۔“ وہ بال برابر کرتی ہوئی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

ہوئی۔ توقع تھی چچی اور اسری کی گھڑیاں تو دھلھامیاں
مٹھنے سے بیٹھے ملے۔ ماما بھی ساتھ تھی۔

اس نے سر اے پر نظر ڈالی۔ شکر ہے ابھی نما کر
کپڑے بدل کر ہی بیٹھی تھی۔ بال البتہ بکھرے ہوئے
تھے۔ کچھ سوکھے کچھ کیلے۔ سلام کر کے (مصنوعی سا
سلام۔ جو سمجھتی تھی وہ بناوٹی اخلاق کی قائل نہیں۔
آج وہی کرنا پڑا۔)

نسرئی سے لپٹ گئی اور اس کے ساتھ ہی بیٹھی
رہی۔ اور اخلاقا "باتیں بھی ضروری تھیں۔ (وہی
بناوٹی اخلاق)

"روز زیاد کرتی تھی 'اسری' سے پوچھتی تھی کہ نسرئی
کب آئے گی۔"

"ہاں وہ بس دعوتیں پھر ہم ہنی مون پر چلے گئے تھے
نہ۔" نسرئی بہت ہنسن کر جواب دے رہی تھی۔
نسرئی اور نین۔ ساتھ ساتھ۔ امی کے دل کو کچھ
ہوا۔ نین اس قدر حسین لگ رہی تھی۔ نسرئی
بجاری۔ مقابلتا "بہت ہی دبی ہوئی سی۔ معمولی
خود خال مزید بگڑے ہوئے لگ رہے تھے۔

"ہاں بھی نین۔" ماما اس سے مخاطب ہوئی۔
"پڑھنے کوڑھنے جاتی ہو؟"

"جی۔" عجیب سوال تھا۔

"اچھا۔ کس کلاس میں ہو؟" اور بھی عجیب، کیا وہ
پوچھ رہی تھی۔ "کس کلاس میں ہو۔"

"ماسٹرز کر رہی ہوں۔ اف، دو مہینے رہ گئے ہیں
متخان میں۔"

ماما نے چہرے پر اذیتی حیرت کو چھپانے کی کوشش
ہی نہیں کی۔ "اچھا؟ کبھی سنا نہیں۔"

"جی تو پوچھ لیا ہو تا نسرئی سے۔" وہ بددلی سے بولی۔
عجب مہمان، عجیب تر رویہ۔

امی ماما کو بتانے لگیں۔

"اس کے ابا جان کی خواہش تھی کہ اعلا تعلیم
مسل کرے اور اس نے ہر بار اعلا پوزیشن بھی لی۔

... آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخلہ ہو چکا ہے مگر
بھیجنے کے لیے تیار نہیں، میں اکیلی ٹیسے رہوں

گی۔ بس جتنا پڑھ لیا کافی ہے۔"

دھلھا اور ماما دونوں جیسے نمکدش میں تھے، نہ جانے
کیوں، پھر میاں سہیل کھڑے ہو گئے۔

"چلو ماما! ابی انتظار کر رہی ہوں گی۔"

ماما بھی کھڑی ہو گئی۔ نسرئی سب سے پہلے کمرے
سے باہر نکلی۔ بعد میں شکو نے بتایا۔

"نسرئی بی بی آج یہیں رہیں گی۔ دھلھا اور ان کی
بہن چلے گئے۔"

کل دیر میں آئی۔ بتا رہی تھی کہ اصل میں دیریوں
ہوئی کہ میں نکلی تو نسرئی کے میاں اور نندل گئے۔ نند
مجھ سے پوچھنے لگی۔

"نین کو جانتی ہو۔" میں نے کہا "ہم کلاس فیلو
ہیں۔" پھر وہ سوالات کرتی رہی۔ میں نے بھی خوب

بڑھ چڑھ کر تمہاری قابلیت کے بیان داغے۔ حیرت
ہے۔ انہیں خبر ہی نہ تھی۔ تمہارے تو کزن بھی ہوتے

ہیں۔"

نمی ٹال گئی۔ سہا کی حیرت بناوٹی نہ تھی۔



نمی نے امتحان کا پھوٹ ایسا سوار کر لیا تھا ذہن پر
کہ آس پاس کی خبر نہ تھی۔ اسری بھی عرصے سے نظر

نہ آئی۔ ادھر گل کی شادی کی تیاریاں۔ گل کی شامت،
اکثر مد مزاج رہتی۔ مہمانوں سے عاجز۔ امی بھی اکثر گل

کے گھر جاتیں۔ اس کے جینز کی ساٹیاں، دوپٹے لے
آئیں۔ کسی میں بیل لگانی ہے تو ساڑھی میں ستارے

ٹانگتے ہیں۔ جال بنانا ہے، نہ جانے اور کیا کیا۔ یہ سلسلہ
ستارے والے بھڑک دار کپڑے گل پہنے گی۔ تو یہ۔

عجیب اول جلول سی، بغلول لگے گی۔ وہ دل کھول کر
ہنستی۔ گل بھی جھینپ جاتی۔ امی گھورتیں۔

"نمی! فضول نہ بولا کرو۔ شادی کے بعد پہننے
پڑتے ہیں۔ ہمیشہ اسٹوڈنٹ تو نہیں رہنا ہوتا۔ اور یہ

کپڑے مطلب کام بنے ہوئے، کئی برس تک کام
آتے ہیں۔"

"کئی برس تک... اوسے میں تو تک آ جاؤں پس پس

تھی۔ آج۔۔۔ وہ سمجھ گئی۔ پچھلی بار ابا جان ہی۔۔۔ آخری پیپر۔۔۔ وہ دوست تھی۔ نسلی دیتی ہوئی اس کے ساتھ آگئی۔ سامنے ای بی ٹی تھیں۔ شکر ہے، کل ان کے پاس بیٹھ گئی۔

”آئی! آخری کانٹا بھی نکل گیا آخر۔ شہزادی آزاد ہو گئی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ٹمی نے فوراً بات کالی۔

”کانٹا نہیں سوئی شہزادی کے جسم کی آخری سوئی نکلی تو وہ آزاد یعنی زندہ ہوئی۔“

گل نے ٹمی کو دیکھا۔ ٹمی نے ای کو۔ گل کا اشارہ ای کی طرف تھا۔ چہ بھجا بیٹوں پر خاموشی۔ پراسرار۔ شکوہ بولنے کی بیماری تھی۔ دونوں کو ای کی طرف متوجہ دیکھ کر بولی۔

”وہ جی اصل میں بی بی جی پریشان ہیں۔“ گل نے کہا۔ ”آئی کیا بات ہے۔“ وہ ان کے پاس بیٹھ گئی۔ ٹمی بھی ای کو نہ حال دیکھ کر فکر مند تھی۔ ”وہ جی اصل میں نسری بی بی کھر آگئی ہیں۔“ شکوہ ہی جواب دے رہی تھی۔ اس کا نچہ بھی پراسرار سا تھا۔

”تو پھر کیا ہوا؟“

”نہیں ہوا تو کچھ نہیں بس ذرا اطلاق لے کر آگئی ہیں۔“ دھماکا کر دیا بکغت نے دونوں چونک گئیں۔

”اصل میں ابھی آپ کی چچی یہاں سے گئی ہیں۔ بول بول کر بی بی جی سے کہہ رہی تھیں۔ آپ کی بددعاؤں سے میری بیٹی کا گھر اجڑ گیا۔ بہت خراب باتیں کر کے گئی ہیں۔ بس جب سے لی کا یہ حال۔۔۔“

شکوہ ہو گئی۔ گل نے ای کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”آئی! آپ کیوں اڑھتی ہیں۔ جو کچھ ہوا۔ ان کا اپنا کیا دھرا ہے۔ کھسائی ملی کھمبا تو جتنی ہے۔ کسی پر تو الزام لگاتا تھا۔ ہم تو بہت دن سے سن رہے تھے۔ نسری کی ساس نند سے نہیں بنتی۔ اب اور کیا ہوا پتا نہیں۔“

وہ چپ ہوئی تو ٹمی ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

”ای بہت اچھے پیپر ہوئے ہیں۔ سارا کچھ بہترین“

کر۔ یعنی کہ بس اپنے جاؤ حد ہے۔“

”نمی جاؤ یہاں سے۔ پٹ جاؤ گی میرے ہاتھ سے۔ روز پینے کو کون کہہ رہا ہے۔ کبھی کبھی کسی بھی موقع پر۔۔۔ ای کی باتیں بھی عجیب ہوتیں۔ وہ مجھے بغیر بول پڑتی تو ڈانٹ پڑتی۔

”بی بی! دال میں کالا کالا ہے۔“ سچی۔ ”شکوہ بھلا باز آتی۔ ادھر ادھر کے قصے سنا کر بوری کرتی تھی۔

”نسری بی بی خوش نہیں ہیں۔ ساس نند کی برائیاں کرتی رہتی ہیں۔“ سچی۔ ”چونکا دیا آخر۔

ای خفا ہونے لگیں۔ ”خوار شکو! آگے کچھ کہنے کی اجازت نہیں ہے۔ کہیں بھی کچھ ہو! اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔ آئندہ نہ سنوں میں ادھر ادھر کی۔“

ای سے ڈر کر ٹمی کے پاس آگئی سرگوشیاں کرنے۔

”آپ کا نام بھی لے رہی تھیں۔ میں نے خود نہ۔ روٹی کا کپڑا دھو کر پھیلائے گئی تھی ڈوری پر تو۔“

ٹمی نے اسے دھکا دیا۔ ”بکو اس کس قدر کرتی ہے۔“

وہ شیرھی آنکھوں سے دیکھتی چلی گئی۔ ”بھلائی کا تو ویلا ہی نہیں ہے۔“

وہ ای کو جوش و خروش سے گل کی شاوی کی تیاریاں کرتے دیکھ کر انہیں لقب دے چکی تھی۔ خدمت خلق کی کوئین۔ گل بہت ہنس۔

”فکر نہ کرو۔ تمہاری باری بھی آئے گی تب آئی کی خوشی دیکھنا۔ جال بنائیں گی۔ گوئے اور۔۔۔“ اس نے منہ بند کر دیا ہاتھ رکھ کر۔

”چپ پڑھنے آئی ہو یا بکشتن گویاں کرنے۔“



پھر امتحانات بخیر و خوبی ختم ہوئے ایک بوجھ تھا۔ اب فراغت یکدم وہ رک گئی۔ گل کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”گل! میرے ساتھ ذرا چلو۔ پھر تھوڑی دیر میں چلی جاتا۔“

گل نے اس کی ڈری ہوئی آواز کبھی نہیں سنی

افوہ۔ اس کو تو سحانی ہونا چاہیے تھا۔ محاذ گرم۔ حملہ
 پہ حملہ، کمبخت کی زبان تھی کہ تلوار کی دھار۔ اور پھر
 ہر گز رن مان محاذ گرم سے گرم تر ہوتا گیا۔ بیٹی کی
 طلاق خالہ اور امی کی بد دعاؤں کا نتیجہ تھی۔ بھول گئیں
 جب رازداری سے شادی کی تھی۔ امی کو خبر تک نہ
 ہوئی۔ اور اب۔۔۔

”ہائے اس دن میری کمبختی کہ میں نے کہا
 سہیل، جا بیٹا خالہ سے مل آ۔ جانتی نہ تھی کہ خالہ کب
 خوش ہوں گی اور اوپر سے تمہاری بیٹی نے اپنے حسن کا
 اداؤں کا ایسا جال ڈالا کیا جادو کیا کہ بس وہ تو اسی دن سے
 بدل گیا۔ ہائے میری نسرئی یہ تعلیم دی ہے بیٹی کو۔
 لوگوں کے ہنستے بستے کھرا جاڑے۔ بہن کے نصیب
 پھوڑے۔“

چچی کی زبان تھی کہ دو دھاری تلوار۔ ادھر ادھر
 گزرتے ہوئے غصہ نکالا کرتیں۔ نمی گھر میں رہنے
 کی وجہ سے سب کچھ سننے پر مجبور۔ امی بچاری کے
 حواس گم ہو جاتے۔ بولنا چاہتیں مگر زبان ساتھ نہ
 دیتی۔

ایک دن پچھو آئیں۔ تو پہلے چچی کی طرف گئیں۔
 افسوس کے لیے پھر بڑبڑاتی ہوئی آئیں۔

”کہہ آئی ہوں، خردوار آئندہ نمی یا اس کی ماں کا نام
 بھی لیا تو زبان گدڑی سے کھینچ لوں گی۔ بیٹی کی زبان
 دیرازی کی کیا خبر نہ تھی اور جب دھوکے سے شادی کی
 تھی۔ تب نہ سوچا کہ کیا انجام ہو گا۔ غضب خدا کا نہ
 باپ آیا نہ بھائی۔ میں کراچی گئی اور سہاں بارات ملائی۔
 ایک گھر میں رہتے ہوئے۔ جھٹلی سے خفیہ معاملات
 طے کیے۔ عارفہ کو اندر اندر بہکایا کہ نمی تو نیم پاگل
 ہے، عقل سے عاری ہے۔ پڑھنا پڑھانا ڈھونگ ہے۔
 ارے مجھے عارفہ نے سب بتایا ہے۔ وہ تو شرم سے منہ
 نہیں دکھا رہی۔ ابھی سب سنا آئی ہوں۔ میرے
 سامنے معصوم بننے کی ضرورت نہیں۔“

پچھو بولے جارہی تھیں۔ امی بے چاری سننے پر
 مجبور۔ پچھو بھی رنگ بدلنے کی ماہر نکلیں۔ مکرور سے
 سی۔ کچھ بچ بھی بول دیا۔

”ن رہی ہیں۔“
 امی یک لخت چونک گئیں۔ جیسے گہری نیند سے
 جاگی ہوں۔ پلکیں جھپک کر بولیں۔ ”اچھا آگئیں تم؟“

”جی۔ آپ کو شاید نیند آ رہی ہے۔ زیادہ فکر نہ کیا
 کریں۔“

وہ کسی اور دنیا میں تھیں۔ حال سے بے خبر۔ ”اچھا
 چلو پھر کھانا کھاؤ۔ شکوہ اگل بھی کھائے گی۔ یہیں لے
 آؤ۔“

گل کھڑی ہو گئی اور اپنی اماں کے انتظار کا بہانہ کر
 کے چلی گئی۔ نمی کو اشاروں میں سمجھا کر کہ امی کا دل
 ہلاؤ۔

نمی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کس طرح امی کو
 ہلائے۔ یہ خبر اگر صرف شکوہ کی دماغ کی اختراع ہوتی تو
 وہ پروانہ کرتی۔ مگر چچی خود آکر۔۔۔ تو کچھ تو سچائی تھی۔
 گل نے پہلے بھی نسرئی کی بد مزاجی اور زبان درازی کے
 بارے میں دلی زبان سے بتایا تھا۔ اسے لعجب ہوا کہ
 گل کو یہ معلومات کہاں سے حاصل ہوئیں۔ جبکہ
 نسرئی کی ماں بہن تو اسی گھر میں ہیں۔ سرال دور ہے
 پھر اسے خبر نہ ہو گل کو خبر ہو جائے۔

گل نے کہا۔ ”میں اسی دنیا میں رہتی ہوں۔ تم کسی
 اور جہاں کی باشندہ ہو۔“

اب وہ سوچ رہی تھی کہ واقعی اسے دنیا کی خبر
 نہیں۔ کہاں کیا ہو رہا ہے اور یہ کوئی عیروں کا معاملہ بھی
 نہیں۔ نہایت افسوس کی خبر ہے۔ مگر چچی کے امی کے
 ساتھ روئے نے بھی سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اب وہاں جا
 کر افسوس گرتا بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔
 ”چلو شکوہ کھانا لے آؤ۔“ امی کو اس کی فکر تھی۔

”آپ نے کھا لیا؟ ابھی ساتھ آٹھ ماہ ہوئے ہوں
 گے۔ اتنی جلد طلاق اور خالہ؟ ذہن ادھر ہی تھا۔

”اجی کہہ۔“ شکوہ میں پکنے کی عادی۔ سوال امی
 سے کیا جواب شکوہ کے پاس تھا۔ ”میں تو کہہ رہی تھی
 بی بی گرم روٹی بنا کر لاتی ہوں۔ کھالیں مگر ادھر تو محاذ گرم
 تھا وہ حملہ۔“

اس دن سے چچی کے گھر سنا تھا۔ زبان پر قفل لگنا اسی کو کہتے ہیں۔ نمنی نے یونیورسٹی میں جاب کے لیے اپلائی کر دیا۔ وہاں سے لائبریری انچارج کے لیے آفر آئی۔ فی الحال یہ بھی غنیمت سمجھا۔ مگر گل کی شادی بھی آگئی۔ امی کو ضروری ہو رہی تھی۔

وہ گل کی امی کے ساتھ شادی ہال چلی گئی۔ گل اپنی کزن کے ہمراہ بیوی پار لڑ گئی ہوئی تھی۔ شادی خوب رونق والی تھی۔ یونیورسٹی کے کافی لوگ آئے ہوئے تھے۔ سب سے مل کر بہت لطف آیا۔

رخصتی کے بعد وہ امی کی طبیعت کا بتا کر ایک پڑوسی فیملی کے ساتھ واپس آئی تو امی کو مزید نڈھال پایا۔ وہ شادی کا حال پوچھنے لگیں۔

اگلے دن دلہے پر نہیں گئی۔ صبح ناشتے کا انتظار۔ ارے شکو غائب وہ تو اثرات کو بھی رہتی تھی۔ امی سے پوچھا۔ انہوں نے مطمئن لہجے میں کہا۔

”شکو نہیں آئے گی۔ بھابھی نے اسے نکال دیا ہے۔“ کس قدر عجیب۔

”مگر کیوں امی، ہمارے نوکر کو گھر سے نکالنے کا انہیں کیا حق ہے۔ بھروسے کی تھی۔“

”حق ہے بیٹا انہیں۔“ امی عجیب لہجے میں کہہ کر چپ ہو میں تو وہ چوکی۔ کوئی بات ہے۔“

”اب یہ گھر ہمارا نہیں رہا۔ ان کا ہو گیا ہے۔“ شاید ہم گھر کا تو اتنا دھماکہ نہ ہوتا۔ تفصیل یہ تھی کہ

چچا نے امریکہ میں رہتے ہوئے یہاں کے وکیلوں سے گٹھ جوڑ کر عدالت سے یہ گھر اپنے نام کروا لیا ہے۔ جواز یہ کہ اولاد نرینہ نہ ہونے کے سبب گھر

قانوناً بھائی کا ہوتا ہے۔ بلکہ جتنی بھی برابری ہو۔ ہماری برابری۔ صرف یہ گھر تھا۔ جواب ہمارا نہیں رہا۔

بیٹی کے شرعی حق میں۔ ایک کہہ رہے۔ جو وہ تازہ زندگی استعمال کر سکتی ہے۔ بجلی گری تھی یا۔۔۔

کتنی دیر تک تو سمجھ میں ہی نہ آیا۔ یہ ہوا کیا۔ کیسے وہ سمجھی نہیں مگر امی سب سمجھ گئی تھیں۔ کیسا ناشتہ۔

کہاں کا کھانا۔ کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ گھر کے کاغذات لاکر میں تھے۔ لاکر دونوں کے نام پر تھا۔ مگر۔۔۔ ان

کاغذات کا۔۔۔ کوئی فائدہ نہ تھا۔ یا چونکہ کوئی ان کا پتہ نہ تھا جو ان کاغذات کی بدولت کارروائی کرتا۔ نہ جانے وہ سارے رشتے دار کہاں تھے جو اپنا جان کی زندگی میں روز آیا کرتے تھے۔ کس سے مدد مانگیں۔ ماموں، ماموں کچھ مشورہ۔۔۔ امی نے مخالفت کر دی۔

”وہ خود وہاں پریشان ہیں۔ ان کا بیٹا بیمار ہے۔ اتنی دور بیٹھوہ کیا مشورہ دے سکتے ہیں۔“

”شاید کوئی وکیل یا جج ماموں کے واقف۔۔۔“

”بیٹا صبر کرو۔ یہ ہمارا مسئلہ ہے۔ ہمیں ہی مقابلہ کرنا ہے۔ ہمت کرو اللہ آسمانیاں دینے والا ہے۔“

بھوک مرچھی تھی۔ چائے بنائی۔ بسکٹ کھائے اور نڈھال ہوتی ماں کو تسلی دینے لگی۔ دوپہر کو کھانا پکانے کے لیے کچن میں گئی۔ تو وہاں مزدور توڑ پھوڑ کر رہے تھے۔ وہ چچی۔

”یہ کیا کر رہے ہو۔“

چچی شاید منتظر ہی تھیں۔ فوراً آگئیں۔ ”تمہاری ماں نے بتایا نہیں؟“

ترجمی نظروں سے تلخ لہجے میں بولیں۔ اف ان کا انداز، زبان بھی بدل گئی۔ تمہاری ماں؟ یہ اس ہستی کے لیے الفاظ تھے جو ابھی کل تک اس چھ کنال کے جنگل کی مالک تھی۔

”اب یہ ہمارا گھر ہے۔ ہم جو چاہے کریں۔ چاہیں تو پورا گھر توڑ کر بنائیں۔ اب اپنی مرضی کا کچن بنائیں گے۔ تم اپنے کھانے پینے کا خود انتظام کر لو۔“

اف، سنگدل کی یہ مثال کب دیکھی تھی۔ امی نے سن کر کہا۔

”ہاں بھابھی صبح بتا گئی تھیں کہ وہ مزدور لگا رہی ہیں۔ میں تمہارے جاگنے سے پہلے آلیٹ بنا لائی تھی رکھا ہے۔ روٹی بھی بنائی تھی۔ آنا تھا فریج میں۔ شکو

کل سالن بنا گئی تھی۔ وہ بھی فریج میں ہو گا۔“

امی کا طمینان۔ وہ دنگ رہ گئی۔

کھانے کا کچھ انتظام امی نے کر لیا تھا۔ شام کو مزدوروں کی چھٹی کے بعد اس نے فریج سے گوشت نکال کر پھرتی سے کوکر میں ڈال کر ابالنے رکھا۔ تیزی

آپ کو بھی رخصتی کی تیاری کر لینی چاہیے۔ ارے بھی بیٹی کی رخصتی پھر آپ کے لیے تو اسٹور بھی کافی ہو گا۔ ہاں تو کب ہو رہی ہے تقریب رخصتی؟“ اسی قسم کی فضول بکواس کر کے امی کو عاجز، ٹھہی کو خوف زدہ کرتا۔ بے چاری ماں بیٹی۔ زبان کھولتے ہوئے ڈرتیں۔

گل سسرال سے ملے آئی تو اپنی امی کے ساتھ آئی۔ گھر اور گھر والوں کی محسوس دیکھ کر تاسف کرتی رہیں۔ موقع غنیمت جان کر گل کو امی کے پاس چھوڑ کر وہ بینک چلی گئی۔ امی کو تنہا چھوڑنے کو دل نہ چاہتا تھا بہت کمزور ہو گئی تھیں۔

ماموں کی مہمانی سے بینک میں خاصی رقم تھی۔ کچھ ابا جان کے زمانے کا اثاثہ بھی تھا۔ اس نے احتیاطاً ”رقم زیادہ نکالی۔ نہ جانے اب موقع کب ملے وقت کا کچھ پتا نہ تھا۔

گھر آئی تو گل کو پریشان پایا۔ وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ شہزادے صاحب آکر نہ جانے کیا فضول بکواس کر کے گئے۔ وہ تاب نہ لاسکیں۔ بے ہوش ہو گئیں۔ گل کی موجودگی غنیمت تھی۔ دونوں نے ٹیکسی کی اور ہاسپٹل لے گئیں۔ دعا کرتی رہی کہ آج ڈاکٹر سرفراز مل جائیں۔ فرشتہ رحمت کی طرح۔ ایمر جنسی میں جو ڈاکٹر تھے۔ وہ معائنہ کر رہے تھے۔ انکل مل گئے۔ شکر ہے۔ اس کی تو غم اور فکر سے آواز بند تھی۔ گل نے انہیں مختصر حال تیزی سے بتایا۔

شام تک امی کو ہوش نہ آیا۔ جب ہوش میں آئیں تو ٹھہکی کو دیکھ کر مسکرا دیں۔ اشارے سے طبیعت ٹھیک ہے۔ کہا۔ آنسو مشکل سے ضبط کیے۔ امی ان حالات میں بھی مسکرا سکتی ہیں۔ گل بھی ان کی ہمت اور حوصلے کی قائل ہو گئی۔

رات کو انکل سرفراز انہیں اپنے ذاتی کلینک میں لے جانے کی تیاری کرنے لگے۔ وہ ”گھبراہٹی“ کلینک کے اخراجات۔“ اس نے دبی زبان سے احتجاج کیا۔ وہ افسردہ ہو گئے۔

سے دوسرے چولھے پر مسلا بنایا۔ بارے سالن تیار ہو گیا۔ غنیمت کہ چولھا ابھی سلامت تھا۔ نہ جانے کل کیا ہو گا۔ کیا کچھ ٹوٹے گا۔ کیا سلامت رہے گا۔ نئے مالک مکان کی جو مرضی، فرخ اگر کمرے میں لا کر رکھ لیں۔ تو کچھ بہتر نہ ہو۔ لیکن ابھی تو کچھ عقل میں نہ آ رہا تھا۔ نہ جانے خالہ کہاں ہیں۔ کب تک شرما میں گی۔

پچھو کو امی نے کل ہی فون کر دیا تھا۔ ان کی ٹانگ کی بڑی فربک چھو ہو گئی تھی۔ آنے جانے سے لاچار۔ شام گھری ہوئی تو چوروں کی طرح اسری آئی۔ بجلی کی کیتلی اور چائے کی پتی، پھین دے گئی۔ بولی کچھ نہیں۔ دوسرے کو پھر چوروں کی مانند کھانا لائی۔ منہ نے بچن سے کچھ برتن لا کر رکھ لیے تھے۔ مزدور آگئے تھے۔ گل کی امی آئیں۔ کمرے میں برتن، کھانا، شکو غائب۔ سر تھام کر رہ گئیں۔ محلے والوں کی ہمدردیاں اور تعاون۔ وہ دونوں شرمندہ بھی ہوئیں اللہ کی شکر گزار بھی۔

جواب کی خواہش ترک کر کے امی کی تمنائی کا مداوا بن گئی۔ ماموں کا فون آیا۔ رقم مزید بھیجی تھی۔ شکر ہے کوئی تو ہے۔ ٹھہی اپنے راتے وقت کو یاد کرتی۔ تبدیلی کی دعا کی تھی۔ ایسی تبدیلی؟ ابا جان کے نہ ہونے سے کیسا انقلاب آیا۔ بھی کوئی تصور نہ کر سکتا تھا۔ اس طرح بھی ہوتا ہے۔ عروج، زوال تو اب اور کتنا زوال ہو گا۔ وہ خوف زدہ رہنے لگی۔



اس کا خوف بچ نکلا۔ ایک دن غلطہ اٹھا۔ شہزادے صاحب کی تشریف آئی ہے۔

مالک مکان چچا حضرت کے ولی عہد حضور امریکہ سے برسا برس کے بعد آگئے تھے۔ طنز و تحقیک کا نیا سلسلہ۔ ان کو یہی باور کرایا گیا تھا کہ عین نے اپنے حسن کا جادو چلا کر سہیل کو اپنے جال میں پھنسا لیا اس لیے نسری کی طلاق ہوئی۔ شرجیل آئے۔ چچی کو سلام کرنے۔ طنز کے تیرہ سارے۔

”ہاں تو پھر سہیل آیا نہیں آپ کی بیٹی کو بنایا ہے۔

ہے۔ ایسے دوست اور پرہیزی بھی غنیمت ہوتے ہیں۔
شکرا ادا کیا۔

امی کو چھوڑ کر کہیں چاہیں سکتی تھی۔ ورنہ گل کی
امی کے ساتھ جاسکتی تھی۔ اور پھر۔۔۔ امی کی حالت
دگرگوں ہوتی گئی۔ انہوں نے نفعی کا ہاتھ پکڑ کر بمشکل
بات کی۔

”دیکھو، ہمت نہ ہارنا، اللہ پر یقین رکھو۔ مجھے کچھ
ہو جائے۔ تم آپا کے پاس چلی جانا۔ وہ کہیں بھی ہوں
اور اپنے گھر کو بھول جاؤ۔“

کتنی دقت سے انہوں نے یہ الفاظ رک رک کر
کہے۔ وہ بے قابو ہو کر رونے لگی۔ ”اف زندگی اور
مشکل فیصلے، جس جرم کی سزا ہے۔ میرے اللہ! انکل
نے سمجھایا۔“ آزمائش سے گھبراؤ نہیں۔ اللہ مہربان
بھی ضرور دے گا۔“

کب تک صبر کرے۔ مگر اب صبر اس کی آزمائش
بن گیا۔



رات میں کسی وقت امی کی سانس کی ڈوری ٹوٹ
گئی۔ امی تو ہمت و حوصلے کا پہاڑ تھیں پھر وہ حالات
سے ہار گئیں۔ ایسا کیسے ممکن ہے مگر سب کچھ ممکن
ہے۔ ایک اور صدمہ۔

ڈاکٹر سرفراز کے گھر سے امی کا جنازہ اٹھا۔ آہ اپنے
گھر غسل کا پانی نہ نصیب ہوا۔ مگر وہ اب اپنا گھر نہ تھا۔
نفعی اب تھک گئی تھی۔ کتنا روٹی اور کب تک صبر
کرے گی۔ انکل نے اس سے رشتے داروں کے فون نمبر
مانگے تھے۔ اور لوگ۔ وہی لوگ جو امی کی ابا جان کی
مہمان نوازی سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ جج ہو گئے۔
پھپھو بھی آئیں۔ محلے والے بے شمار۔ کسی رشتے
دار نے نہیں کہا۔

”جنازہ ہمارے گھر سے جائے گا ڈاکٹر، تم تو غیر ہو۔
کسی عزیز یہاں تک کہ پھپھو کے منہ سے بھی نہ نکلا
کہ ”مین تم میرے ساتھ چلو۔ یہاں غیروں میں کیسے
رہو گی۔“ کسی نے بھی اس کی ذمہ داری لینے کا اشارہ

”بیٹا! اس حال میں دیکھ کر میں کیا سنگ دل سے
سنگ دل آدمی بھی رو پڑتا۔ آج ایمر جنسی میں اس قدر
نقاہت کا عالم دیکھ کر میرے کلیجے پر چھریاں چلنے لگیں۔
تم چاہتی ہو میں بھابھی کو یہاں تکسپری میں چھوڑ کر
ہولمان ہوتا رہوں۔ میں نے وہ زمانہ دیکھا ہے۔ جب
بھابھی دونوں ہاتھوں سے خیرات کیا کرتی تھیں۔ مجھ پر
تف ہے اگر میں آج پرانی دوستی کا لحاظ نہ کروں۔“

نفعی مجبور ہو گئی۔ محل کے ساتھ امی کو کلینک لے
گئی۔ ڈاکٹر فون کر چکے تھے۔ فوراً ہی دیکھ بھال شروع
ہو گئی۔ کلینک کافی بڑا اور جدید مشینز کے علاوہ بہترین
ڈاکٹر کام کرتے تھے۔ احاطے میں نرسوں کے کوارٹر
تھے۔ یہاں اسے ہر قسم کی سہولت دی گئی۔ انکل کی
مہربانی مکمل مطمئن ہو کر چلی گئی۔

انکل بہت متاسف ہو کر کہتے۔ ”حضرت علی رضی
اللہ عنہ کا فرمانا کسی قدر معنی رکھتا ہے۔ اب حقیقت کا
علم ہو رہا ہے۔ ”جس پر احسان کرو۔ اس کے شرے
بچو۔“ یہ وہی شر ہے مگر انسان نہیں سمجھتا اس کا انجام کیا
ہو گا۔“

”انجام کی فکر ہو تو انسان ایسے فعل سے گریز نہ
کرے۔“

تین دن بعد سہ ماہی جانے سے پہلے گل آئی۔ امی
کی طبیعت کچھ بہتر تھی۔ مگر کمزوری برقرار۔ نفعی نے
گل کو اپنے کمرے کی چابی دے کر کہا کہ وہ اس کے دو
چار کپڑے نکال کر بھائی کے ہاتھ بھیج دے۔ وہ خود اکیلی
گھر جانے سے ڈر رہی تھی۔ گل نے سمجھ داری سے
کہا۔

”میں نے کمرہ کھولا۔ تو شرجیل کچھ کر سکتا ہے۔ وہ
کمرے میں چوری یا توڑ پھوڑ بھی کر سکتا ہے۔ اس
لیے یہ خطرہ مول نہ لو۔ برائے مانو تو ایک بات کہوں۔“
وہ بات سن کر وہ چپ ہو گئی۔ واقعی کچھ نہ
ہو جائے کم ہے، محل نے کچھ کپڑے اسے بھجوا دیے
اپنی شادی سے پہلے کے اس کی امی خود بیک لے کر
آئیں۔ وہ ان کے محلے لگ کر رونے لگی۔ بے بسی،
مجبوری، وقت کتنا ظالم ہے۔ کیسے آنکھیں بدل لیتا

میں لطف ملتا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر جو قوت ہے۔ وہ ہے برداشت۔ آپ کے پاس برداشت ہے تو آپ سب سے زیادہ بہادر ہیں۔ وہ بہادر بننے کی مشق کر رہی تھی۔ مگر یادداشت۔ گزرو کر دیتی، کیا کیا بھلائے؟

اباجان کی خون پسینے کی کمائی سے بنایا ہوا وہ خوب صورت گھر۔ جس کا سرسبز لان پھولوں سے مہکتا تھا۔ اور جس کے ایک گوشے میں پھولوں کے درخت تھے۔ اباجان کی اپنے لان کے لیے کاوش اور جذباتیت۔ آم، آلو بخارہ، خوبلی، نیبو، آڑو کے پڑ اپنے اپنے سیزن پر پھولوں سے لد جاتے۔ اباجان خود سب کی دیکھ بھال کرتے اور پہلا پھل اپنے ہاتھ سے توڑ کر چنگیر میں رکھ کر لاتے۔

”لو نیگم سیزن کا پہلا پھل۔“

وہ منہ پھلا لیتی۔ ”اور بیٹی کے لیے اباجان؟“

”اباجان کی جان۔ یہ سب بیٹی کے لیے ہے۔ ظاہر ہے آپ تو وہونے کی مشقت کریں گی نہیں۔“

جب بہت یاد آتی۔ وہ آٹنی کے پاس چلی جاتی۔ اباجان سے ملتی، جلتی شفقت انکل سے وصول کرتی۔

”ہا، نہ جانے کس مقام پر آگئی تھی زندگی، تنہائی اور محرومی۔“



کلینک میں ایک لڑکا جو ادھار تھا۔ بہت نیک، مستعد، چاق چومند بہت سے کام سپرد کیے جاتے جن کو خوش اسلوبی سے کر کے واپاتا۔ سرفراز انکل کو اس پر اعتماد تھا۔ دراصل وہ کیاؤنڈر تھا۔ لیکن ہر کام میں پیش پیش۔ کلینک سے تعلق ہو نہ ہو۔ اسٹاف کے کام کر کے خوش ہوتا۔

شعبہ کو اعتراض تھا۔ جس کام کے لیے رکھا گیا تھا۔ جس کی تنخواہ وہ لیتا تھا۔ اس سے زیادہ، اس کے سوا کیوں کرتا ہے۔ اس کے اعتراض پر جو ادھار نے انکساری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے تو اس میں کوئی حرج نظر نہیں آتا۔ میں سب

نہ کیا۔ اپنے سب غیروں گئے۔ یہ دنیا کتنی بے وفا ہے۔ محلے والیاں البتہ اس کے پاس آکر اس سے پوچھتی رہیں۔ ”کیا سوچا۔ کیا کروں گی۔“ نیگم سرفراز نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

”آج سے یہ ہماری بیٹی ہے۔“ اور سب بے فکر ہو گئے، وہ کڑا وقت جو زخم دے گیا۔ اس کا مرہم کہاں سے لائی۔ دنیا میں تو نہ تھا۔ اس نے انکل سے دودن بعد ہی کہہ دیا۔

”مجھے جاب کرنی ہے۔“

اور وہ مہربان انکل جیسے منتظر ہی تھے۔ کلینک میں آفس جاب موجود تھی۔ اس کے لیے ہی خالی تھی۔ اس نے کوارٹر میں رہنے پر اصرار کیا۔ انہوں نے بخوشی اس کا مطالبہ پورا کر دیا۔

اب وہ کلینک میں انچارج کی حیثیت سے عہدہ سنبھال کر کوارٹر کی مکین تھی۔ ڈاکٹر بھی مطمئن ہو گئے اور وہ خود بھی۔ کسی پر بوجھ بنا گوارا نہ تھا۔ کلینک کے فون سے انکل کی اجازت لے کر ماموں سے بات کر لی۔ ماموں خود بیمار تھے۔ انہوں نے اپنے اطمینان کے لیے ڈاکٹر سے بات کی۔

ماموں نے خالہ کے بارے میں پوچھا۔ اس نے کہہ دیا۔ ”معلوم نہیں۔“

انہوں نے بتایا۔ ”وہ بھی عرصے سے لاعلم ہیں۔“

ایک کمرے کے کوارٹر میں کتنا سکون تھا۔ وہ خود اپنی کیفیت پر حیران تھی۔ کیا کبھی سوچا تھا۔ امی کے بغیر اس تنگ کمرے میں سونے کی۔ مگر اسے شاید صبر آگیا تھا۔ وہ سکون سے سو جاتی۔ انکل آٹنی کی شفقت، دیگر ڈاکٹروں اور اسٹاف کا تعاون اور ہمدردی۔ دونوں وقت کھانا آٹنی بھیج دیتی تھیں۔

چھوٹے سے کوارٹر میں ضرورت کی ہر سہولت تھی۔ خدا کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی۔ زندگی کسی بھی سانحے سے ختم نہیں ہو جاتی۔ گو کہ وقت بدل جاتا ہے۔ لیکن آٹنی سمجھاتی تھیں۔

”نصیب بدلے دیر نہیں لگتی۔ زندگی میں غم ہے اور خوشی بھی امید اور یقین کے ساتھ زندگی گزارنے

بھی لے آتے وہ شرمندہ ہو کر واپس کرتی۔ تو وہ یقین دلاتے کہ خلوص اور محبت کا تحفہ ہے۔ جو آپ کی طرف سے ہمارے مریض کو ملتا ہے۔ واہ میں اپنا وقت گزار رہی ہوں۔ یہ لوگ محبت بانٹ رہے ہیں۔

ایک دن چند نرسوں کے ہمراہ وہ رکیٹ گئی تھی۔ وہ بھی مریضوں کے لیے محبت بھرا تحفہ دینا چاہتی تھی۔ کچھ اپنی ضروریات کی چیزیں بھی تھیں۔ نہ جانے شرجیل کیسے آگیا۔ بے تعلق کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کا بازو تھام کر شکوے کرنے لگا۔ وہ ہر چند ہاتھ چھڑانا چاہ رہی تھی۔ مگر وہ ضد پر آمادہ تھا۔

”جب سے گئی ہو۔ شکل نہیں دکھائی، غائب ہو گئیں۔ منخلے والوں سے چچی کی خبر لی۔ تم اتنی لا تعلق کیسے ہو سکتی ہو؟“

نرسیں اس کی ناگواری دیکھ کر آگئیں اور شرجیل سے ہاتھ چھڑوایا اور دنگ آواز میں کہا۔

”کون ہو جی تم۔ تمہاری ہمت کسے ہوئی؟“ وہ بھی آکر گیا۔ ”تم کون ہو؟ کیا لگتی ہو، میری کزن ہے، میں بات کر رہا ہوں۔“

”اوائے، بہت دیکھے ہیں ایسے غنڈے بد معاش، کزن بن کر تڑی دکھانے والے پولیس کو فون کرو نالہ۔ ہماری پاس کو چھیڑ رہا ہے میڈم! آپ چلیں۔ ہم نبٹ لیں گے کر نل فراز کو فون کرو۔“

”جو! تم میڈم کو لے کر چلو۔ ہم آجائیں گے۔ غنڈوں سے نبھا آتا ہے ہمیں۔“ دوسری نرس بھی کم نہ تھی۔

جو! نے شرجیل کا گریبان پکڑ لیا۔ اب وہ جواب طلبی کرنے لگا۔ ٹیسی کو پریشانی ہو رہی تھی۔ آخر یہ جو! یہاں کیا کر رہا تھا۔ دکان دار بھی آکر کھڑے ہو گئے۔ شرجیل کو بھانگتے بن بڑی۔ وہ بہت ڈر گئی۔

پتا چلا کہ جو! کا تو گھر ہی اس بازار کی ایک گلی میں ہے۔ اس کا یہی راستہ ہے۔ ورنہ وہ سمجھتی کہ وہ واقعی اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ حالانکہ اس وقت اپنے بابا کے لیے حکیمی دوا لینے آیا تھا۔

”لو چراغ تلے اندھیرا۔“ نرس زرجیں نے مذاق

کے کام فرض سمجھ کر کرتا ہوں۔“

”تمہاری عزت نفس مجروح نہیں ہوتی؟ جب۔۔۔ ذاتی کام لیے جائیں۔ وہ تم پر فرض تو نہیں۔“

”مجھے خوشی ہوتی ہے کہ میں کسی کا کام آسان کر رہا ہوں۔ میری عزت کم تو نہیں ہوتی۔ سب میری قدر کرتے ہیں۔ مجھے اپنی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔“

(عجیب آدمی ہے۔ اسے عزت نفس عزیز نہیں۔)

اس دن وہ چھٹی کے بعد گیٹ سے باہر کسی کام سے جا رہی تھی۔ لپکتا ہوا آیا۔ ”کوئی کام تھا تو مجھے بتا دیتیں میں کر دیتا۔“ وہ۔۔۔ کس قدر ڈھیٹ ہے۔

”کیوں بھی؟ میرے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں۔ میں اپنا کام خود کر سکتی ہوں۔“ وہ تنک کر بولی۔

”پھر بھی باہر اکیلی۔ مطلب میں باہر جاتا ہوں تو آپ کا کام بھی کر دیتا۔ مجھے خوشی ہوتی۔“

”ہاں! میں دیکھتی ہوں۔ تم سب کام کر کے کتنا خوش ہوتے ہو۔ سمجھ لو میں تمہیں خوشی نہیں دینا چاہتی۔“

”کیوں جی۔ مجھ سے کوئی غلطی۔ کوئی قصور۔ سب تو ایسا نہیں کرتے۔“

”سب تمہیں ادنیٰ سے ادنیٰ کام دے دیتے ہیں۔ تمہیں اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ میں سمجھ لو میں ان میں سے نہیں ہوں۔“

وہ واپس آئی تو گیٹ پر کھڑا تھا۔ وہ اسے نظر انداز کر کے اندر آگئی۔

”وہ جی مس ٹینن باہر گئی تھیں۔ تو میں کھڑا تھا کہ شاید انہیں میری مدد کی ضرورت ہو۔“ وہ کبھی نرس کے سوال کا جواب دے رہا تھا۔ ٹیسی چڑ گئی۔ افوہ میری نگرانی بھی اپنے فرائض میں شامل کر لی۔

ٹینن پابندی سے آفس کے کاموں کے علاوہ مریضوں کے کمروں میں جا کر ان کی خیریت پوچھنے لگی۔

کوئی کام یا ضرورت ہوتی انہیں تو وہ کر دیتی۔ مریضوں کے لواحقین سے مل کر انہیں تسلی دینا، ڈیوٹی کرنا بھی آ گیا تھا۔ اب تو وہ نصیبِ حق بھی کرنے لگی تھی نالی بن کر سب خوش ہوتے۔ بعض لوگ تو چھوٹا موٹا تحفہ

وہ خوش ہو کر بیوی سے بولے۔ ”دیکھو کتنی نیک
بچی ہے۔ مجھے دعا دے رہی ہے۔“ اماں نے اس کے
سر پر ہاتھ رکھ کر دعا میں دیں۔
”اللہ اپنی اماں میں رکھے۔ ہمیشہ خوشیوں کے
جھولے جھولے۔“

کئی دن بعد جواد سے ابا کی خیریت پوچھی۔ شربا گیا۔
(لوٹی)۔ میں نے ایسی کیا بات کر دی کہ موصوف شربا
(گئے)

”وہ مس۔ ابا بہت خوش تھے آپ سے مل کر۔ اب
بہتر ہیں۔“

”ارے واہ۔ میں کوئی جادو کرنے لگی تھی۔“ ہنسی آ
گئی۔

جواد بھی ہنس دیا۔ بڑی بے ریا ہنسی۔ خوش کرنے
والی۔ ہنسنے ہوئے اس کا چہرہ بھی کھل گیا۔



ایک دن گل کی اماں آگئیں۔ سب محلے والوں اور
گل کا حال بتانے کے بعد رازداری سے بولیں۔

”تمہاری چچی تمہارا پتا پوچھ رہی تھیں۔ آئیں گی
کسی دن۔“ انہیں ان کے بیٹے نے بتایا ہے کہ تم کہیں
افسر لگ گئی ہو۔ جستجو ہو رہی تھی۔ میں نے تو لا علمی
ظاہر کی ہے مگر کہیں سے بھی معلوم کر لیں گی۔ ان کے
چکر میں نہ آنا۔ گھبریں گی بہت۔“

وہ بھلا چچی کے چکر میں کیا آتی۔ کچھ بھولی نہ تھی۔
لیکن عجب العجائب چچی نہیں خالہ آگئیں۔ لپٹا کر
دھواں دھار دھار رونا شروع کر دیا مگر اسے رونا نہ آیا۔ آنسو
خشک ہو گئے تھے۔ نہ ہی خالہ کے آنسو متاثر کر سکے۔
حالانکہ چند دن پہلے گل کی امی سے لپٹ کر بھل بھل
روٹی تھی۔

خالہ افسوس کرنے لگیں۔ یہ کوارٹر۔ اتنی عریض و
وسیع کوٹھی کی رہنے والی۔ ایک کمرے کے مختصر گھر
میں کیسے رہتی ہے۔ چچا کی فریب کاری پر غصہ کرنے
لگیں۔ (اپنا بھول گئیں۔ شاید)
خالہ چچی کی مکاری بتانے لگیں۔ کیسے انہوں نے

اڑایا۔“ خود کلینک میں کام کرتے ہیں۔ ابا کو حکیم کا
علاج۔ واہ جی۔“

جواد نے بتایا۔ ”ابا کو حکیم کی دوا سوٹ کرتی ہے۔“
وہ دوا کی تلاش میں چلا گیا۔

نرس نے ٹھنی کو سمجھایا۔ ”ڈرنے کی بات نہیں
ہے مس۔ بے فکر ہو کر تری دے کرایے غنڈوں سے
بات کرنا چاہیے۔ کمزور بندے کی تو پھر شامت آتی
ہے۔“ مگر وہ واقعی ڈر گئی تھی۔



ایک دن شام کو نرس مارتھا اور زر جنیں کو کہیں
جانے پر تیار دیکھ کر اس نے پوچھ لیا۔

”تم دونوں کہاں جا رہی ہو؟“

یہ دونوں اس کے ساتھ والے کوارٹروں میں رہتی
تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ جواد کے والد بیمار ہیں۔ جواد
چھٹی پر ہے۔ بجارا اکیلا ہے، کمانے والا۔ بڑی
معلومات تھیں انہیں۔

”میں بھی چلوں؟“ ٹھنی نے پوچھا۔

تینوں مل کر جواد کے گھر کی طرف چل پڑیں۔
مارکیٹ سے گزر کر گلی میں داخل ہوئیں۔ زر جنیں
نے یاد دلایا۔ ”یہ وہی جگہ ہے مس۔ جہاں آپ کا
کزن ملا تھا۔“

جواد کا گھر چھوٹا سا تھا۔ تین کمروں کا مختصر صحن والا
ابا کے کمرے میں کرسی نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ تینوں
اماں کے ساتھ دوسرے پانگ پر بیٹھ گئیں۔ ابا سے
خیریت پوچھی۔ نرس مارتھا نے جو پہلے بھی آتی رہی
تھی۔ ٹھنی کا تعارف کرایا۔ ٹھنی نے ابا کو تسلی دی،
نصیحتیں بھی کیں۔ جن کی وہ عادی ہوتی جا رہی
تھی۔

(تالی کی روح خوش ہو جاتی ہوگی) اماں کی دل جوئی
کی۔ جواد کی دو بہنیں تھیں۔ چائے بنا لائیں۔ ٹھنی
نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ چلتے ہوئے اس نے ابا سے کہا۔
”میں پھر آؤں گی۔ آپ کو صحت یاب دیکھنے کے
لیے۔“

انہیں بتادو۔ اب تم اس طرح کے دس گھر خرید سکتی ہو۔ تمہارے پاس وہ چادو ہے جو ان لوگوں کے پاس نہیں ہے۔ وہ ہے علم کا چادو۔ علم کی بے بہا دولت۔ تمہارے ماں باپ کی دعا میں۔ ان کی اعلا تربیت اور تمہاری صلاحیت۔“

چچی کا رنگ پیلا ہو کر سفید پڑ گیا تھا۔
”اچھی مہمان کو رخصت کرو اور ہمارے ساتھ لےج کرو۔ پھر ڈیوٹی۔ رات کو تمہاری آغوش تمہیں لینے آئیں گی۔ لی سی میں ڈنر پر جانے کے لیے تیار رہنا۔“ کہہ کر چچی پر کڑی نظر ڈال کر اپنے ساتھ آئے ڈاکٹروں کے جلو میں واپس چلے گئے۔

ایک تو انکل کی شاندار شخصیت پھر ان کے دائیں بائیں موبد ڈاکٹروں کا اور پیچھے نرسوں کا لشکر۔ چچی نرس ہو رہی تھیں۔

”یہ... ڈاکٹر سرفراز ہیں۔“ وہ چچی کو بتانے لگی۔
”ابا جان کے پرانے دوست“ یہ ہاسپٹل ان ہی کا ہے۔ مجھے یہاں کا انچارج بنایا ہے انہوں نے۔ انہوں نے ہی ابا جان اور امی کا بھی آخری وقت دیکھا۔ پھرامی کے جنازے کو اپنے گھر لے گئے وہیں سے۔“
بات نامکمل چھوڑ کر قابو کرنے لگی خود کو کہ کمزوری ظاہر نہ ہو۔

”آپ کے گھر سے نکل کر پھر ہم دونوں ان کے گھر گئے۔ وہ مردہ میں بھی نیم مردہ۔“

چچی انھیں اور باہر نکل گئیں۔ وہ واش روم میں ٹھس کر منہ دھوتی رہی۔ آنسو نظر نہ آجائیں۔ کئی دن اس بے کیف ملاقات کے حصار میں رہی۔



ایک دن جواد کے گھر چلی گئی۔ وہاں اماں سخت پریشان نظر آئیں۔ بتایا کہ ”گھر کرائے کا ہے۔ دو ماہ سے کرایہ نہیں دے سکے۔ جو ادنیٰ اچھی سی نوکری کے لیے ہاتھ پیرا رہا ہے مگر سفارش نہیں ہے۔ اب یہ نئی مشکل، قرض کے لیے اوہرا دھر چکر لگا رہا ہے۔ دیکھو اب کیا ہو تا ہے۔“

نعمی کو پاگل جابل بتایا۔ اپنی بیٹیوں کے سلیقے اور تعلیم و تربیت کے جابل بچھائے۔ بتا نہیں کون سا منتر مجھ کعبخت پر کیا کہ بہن بھانجی کو بھول کر ان کے چکر میں آگئی۔ آج بہن یاد آئیں۔ ان کی بے وقت موت، بھانجی کی کمپری۔

وہ بے دلتا سے ان کی باتیں سنتی رہی۔ ان کی سرد آہیں بھی اس کے دل کو موم نہ کر سکیں۔ لیکن وہ بعد میں بے چین رہی۔ سب کچھ بھلایا تو نہیں جاتا۔ کچھ اچھے وقت کی یاد آہی جاتی ہے۔ وہ بدل گئی تھی۔ مگر اس قدر بھی نہیں۔

اور جب از سر نو بھلانے کی تک دو دو میں تھی۔ تو چچی تشریف لے آئیں۔ وہ آفس میں مصروف تھی۔ شروع مہینے کی مصروفیات۔ تنخواہوں کا حساب، دواؤں کی دریافت، کیا کچھ موجود ہے کیا نہیں ہے۔ نت نئے آرڈر۔ نرس، ڈاکٹروں کا آنا جانا آرڈر وصول کرنا۔ مریضوں کے لواحقین رشتے دار آکر شکریہ۔ معلومات مطلوبہ اشیاء کی فہرست۔ عزت و احترام، سب کے انداز سے ہو رہا تھا۔ چپ چاپ دیکھتی رہیں۔ لےنا مگر ان کی بات سننے کا موقع ملا۔

”تمہاری خالی سنا ہے تمہارا پتا تو چھتی پھر رہی ہیں۔“ نہ امی کی تعزیت نہ افسوس تحقیق البتہ۔
”دیکھو ان کے بہکائے میں نہ آنا۔ چالاک اور مطلب پرست ہیں۔ میں تو بھگت چلی ہوں۔ ہائے آئی تھیں گریا؟“

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔
”دیکھا۔ میں سمجھ گئی تھی۔ اب وہ تمہیں گھیریں گی۔ ان کے چکر میں نہ آنا۔“

ڈاکٹر سرفراز دستک دے کر اندر آئے۔ ”ارے، تم لےج کے لیے نہیں آئیں۔ وقت ختم ہو گیا تو پھر شام تک مہلت نہیں ملے گی۔ چلو اٹھو۔“

”جی۔ وہ چچی آگئی تھیں تو اس لیے۔“ وہ منمنائی ان کی محبتوں، شفقتوں کی اسیر تھی۔

وہ چونک گئے۔ ”اچھا؟ وہی جنہوں نے بھائی کی روح سے دعا بازی کر کے تمہیں گھر سے در بدر کیا؟

بہن نے آکر بتایا۔ ”اماں بھائی آگئے ہیں۔“

اماں نے اشارے سے پوچھا ”کیا ہوا؟“

بہن نے مایوسی سے گردن ہلائی۔

”اچھا بھائی کو چائے دو۔ میں ابھی آتی ہوں۔“

اماں کے جاتے ہی ثمنی نے پرس سے مطلوبہ رقم نکالی اور ابا کے تکیے کے پاس رکھ دی۔ آبدیدہ ہو گئے بزرگ۔ انکار کرنا چاہتے تھے تو اس نے کہا۔

”ابا! میں اکیلی ذات ہوں۔ مجھے خاصی بڑی تنخواہ ملتی ہے۔ یوں ہی رقم بینک میں پڑی رہے۔ کیا فائدہ یہ بہتر نہیں کہ کسی کا کام آسان ہو جائے۔“

ابا کی مشکور و ممنون آنکھوں کا تاثر بے حد اثر انگیز تھا۔ اماں بولتی ہوئی آئیں۔

”نہ کوئی رشتہ دار نہ اپنا کام آتا ہے نہ دوست۔ بھلا بتاؤ نیچے کو شرمندہ کر دیا۔ ابا نہ کوئی ٹھور نہ ٹھکانہ مالک مکان گھر خالی کرنے کو کہہ رہا ہے۔“

ابا نے تکیے کے نیچے سے رقم نکال کر کہا۔ ”جو او سے کہو۔ دنیا میں فرشتے بھی ہوتے ہیں۔ اللہ انہیں مدد کے لیے دنیا میں بھیجتا ہے، ہم جیسوں کے لیے۔“ اماں کا چہرہ دکھ اٹھا۔ پھر مشکوک نظروں سے ثمنی کو دیکھا۔

”اماں! میں بھی آپ کی بیٹی ہوں۔ آپ اب کچھ نہیں کہیں گی۔ کیا میں ماں باپ کو پریشان دیکھ سکتی ہوں۔“

اماں پھر بھی بحث کے موذ میں تھیں۔ آخر کنارہ دار۔ ”اچھا اسے قرض سمجھیں۔ جو او کی تنخواہ سے کاٹ لیا کروں گی قسط۔ خوش؟“

ابا اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ”لوجی میں تو ٹھیک ہو گیا۔ لاؤ کھانا کھا لوں فکر سے نیند بھوک سب غائب تھی۔“

”ابا! آپ بالکل صحت یاب ہو جائیں۔ ہم پارٹی کریں گے ہوٹل میں۔“ وہ بشارت لہجے میں بولی۔ پھر وہ رکی نہیں۔ جو او کا سامنا ہونے سے پہلے گھر سے نکل آئی۔

اگلے دن جو او آیا۔ تنہائی ملتے ہی بولنے لگا۔ رقم واپس لینے پر اصرار وہ چڑ گئی۔

”افوہ۔ دیکھو جو او! نہ میں نے احسان کیا ہے نہ میں اس ارادے سے وہاں گئی تھی نہ ہی مجھے علم غیب ہوا۔ یہ لہذا وہی سمجھ کر کام میں لاؤ۔ دیکھو میں بے ارادہ تمہارے گھر چلی گئی۔ وہاں پریشانی تھی۔ عام حالات میں بلکہ محتاط طبیعت سمجھ لو۔ کبھی میں پرس میں زیادہ رقم رکھتی ہی نہیں۔ اور مجھے کچھ لینا بھی نہ تھا۔ قدرت نے مجھے وہاں پہنچایا۔ زیادہ رقم قدرت کے اشارے پر ہی میرے پرس میں تھی۔ اب اماں ابا کو پریشان دیکھ کر میں بے نیازی سے آجاتی۔ تو اللہ کو کیا منہ دکھائی اور ہاں۔ دوسرا مکان تلاش کریں، یہ والا مالک مکان تو بہت بے مروت ہے۔ خود غرض لاچکی، حد ہو گئی۔ اسے احساس نہیں کہ گھر خالی کر کے تم لوگ جاؤ گے کہاں؟“

”وہ تو اس کی بھی مجبوری ہے۔ اس نے گھر بنایا ہی آمدنی کے لیے ہے۔ وہ نقصان کیوں اٹھائے گا؟“

”ہاں تو سنا ہے اس کے دو مکان ہیں۔ بھی انتظار کر لے۔ ایک کے کرائے سے کام چلائے۔“

جو او اس کی بات سن کر حیران ہو گیا۔ بھول گیا کہ رقم واپس کرنے آیا تھا۔ سمجھ گیا کہ وہ واپس نہیں لے گی۔

”اور اسے کبھی مجھ سے بھی ملانا۔ میں اس کی اچھی خبر لوں گی اور اخلاق اور انسانیت پر ایسا لکچر دوں گی کہ اس کے ہوش اڑ جائیں گے۔ پھر کبھی تقاضا نہیں کرے گا۔“



آفس میں داخل ہوئی تو حیرت کا جھکا لگا خالہ مع صاحبزادے کے براہمن۔ مسلسل بولتی رہیں۔

ہمدردی۔ افسوس اپنی بے خبری، پیش کش۔

”میں تو کہتی ہوں تم آج ہی ہمارے گھر آ جاؤ۔ اس کو اگر میں تھوڑی دیر میں ہی میرا تو دم گھٹنے لگا۔ تم کیسے رہتی ہو۔ سہیل تو سن کر ہی اتنا پریشان ہوا کہ امی ابھی جا کر لائیں ثمنی کو۔“

اس نے بے رخی اور بد اخلاقی کے تمام تسلیم شدہ

ریکارڈ ڈٹوتے ہوئے اعلان کیا۔

”خالہ! اس آفس میں کام کرنے کی مجھے تنخواہ ملتی

ہے۔ میں اپنی اوقات اور حیثیت پہچان گئی ہوں۔ ان کو اوروں میں بھی انسان ہی رہتے ہیں اور یہاں آفس میں کام کے اوقات میں مہمانوں سے ملنے کی اجازت نہیں ہے۔ آپ شام کو میرے کوائرڈ آکر مل سکتی ہیں اور کسی کو ہنسی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

میں مطمئن اور خوش ہوں۔ یہاں میری عزت اور قدر ہے۔ پلیز مجھے کام کرنا ہے۔ آپ شام کو آسکتی ہیں۔“ مصروفیت ظاہر کرنے کے لیے رجسٹراٹ پلٹ کرنے لگی۔ دونوں خاموشی سے چلے گئے۔ ابھی جو اخلاقی اور انسانیت کا پرچار کر کے جو لوگو مطمئن کر کے آئی تھی۔ خود بے چین ہو گئی۔ خالہ سے ایسا سلوک۔

بری بات، مگر کیا کرے۔ اسے کہاں کوئی پناہ ملی۔ کس نے آسرایا؟ ہمدردی؟ اب دنیا میں اتنی جلد انقلاب بھی آسکتا ہے۔ مگر اس کے اندر بھی انقلاب برپا تھا۔ وہ کیا تھی۔ کیا ہو گئی۔ وہ لابی، بے فکر، بے خبر، خوش مزاج، لاڈلی بیٹی۔ اتنی تلخ۔ برگشتہ۔ بد مزاج۔ کیسے؟ حالات۔ کیا کچھ نہ گزر گیا تھا اس پر۔ وہ بھی تیزی سے بدل رہی تھی۔

انکل نے بتایا۔ ”تمہاری خالہ آئی تھیں۔ بیٹا ساتھ تھا۔ انہیں تم پر گزرنے والی قیامت کا علم دیر سے ہوا۔ وہ چاہتے ہیں کہ تمہارے بچے سے قانوناً تمہارا گھر واپس لے لیا جائے۔ تم اپنے گھر کے کافذات لا کر دے دو۔ میرا خیال ہے وہ صحیح کہہ رہے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے۔ جو نکتہ انہوں نے بیان کیا کہ تمہارے والد اپنے موروثی گھر کے حصے سے بھائی کے حق میں دست بردار ہو گئے تھے۔ وہ گھر تمہارے بچے کا ہوا۔ تمہارا گھر تمہارے نام سے بنایا گیا تھا۔ بلا شرکت غیرے۔ اس پر قانوناً ”یا شرعاً“ کسی اور کا حق نہیں ہے۔ میرا مشورہ ہے۔ تم کافذات انہیں دے دو۔ لڑکا بیڑ بڑ ہے۔ ہوشیار ہے۔ اگر کامیابی ہوئی تو۔“ مجھے ان کافذات کا کرنا بھی کیا ہے۔ اس نے سوچا اور لا کر سے لا کر انکل کو دے دیے کہ کریں کوشش۔

امید کم ہی تھی۔ لیکن۔۔۔ انکل نے بتایا انہیں اس کام کا معاوضہ نہیں لینا۔ محض اپنے پن اور ہمدردی میں یہ کام کریں گے۔

اچھا بھی دیکھ لیتے ہیں ہمدردی۔ ویسے اپنے پن کو تو پرکھا جا چکا۔ اگر چچی نے کچھ غلط بیانی کی بھی تھی تو اسی سے تصدیق کی جاسکتی تھی۔ اگر ان سے نہیں تو محلے والوں سے یا اس کے کالج کے ٹیچر ذویغیرہ سے۔ لیکن نانی کی بات۔ خالو لالچی ہیں۔ جہاں دولت دیکھی ادھر ڈٹ گئے۔ ممکن ہے خالہ نے ان سے مشورہ کیے بغیر اپنی محبت میں انکو بھی پسند دی ہو۔ بعد میں شوہر کی مرضی پر فیصلہ بدل دیا۔ اس نے دل میں خالہ کے لیے نرم گوشہ ابھرا محسوس کیا۔

”کیسے عجیب لوگ ہیں دنیا میں۔ رنگ بدلتے دیر لگے نہ شرم آئے۔ جب آئی نے اسے وہ نئی خبر سنا لی۔ وہ رنگ رہ گئی۔“

”تمہاری چچی مجھ سے ملنے آئی تھیں۔ (تو انہوں نے تلاش کر ہی لیا منہج) اپنے بیٹے سے تمہارا رشتہ لے کر۔ کتنی ہیں یہ موقع بہترین ہے۔ اپنے باپ کے گھروالک بن کر رہنے کا۔“

ادھ۔ کچھ سن گن مل گئی ہوگی۔ قانونی کارروائی کی۔ گویا مسٹر سہیل نے کام شروع کر دیا۔ ”آپ نے کیا کہا ان سے؟“

میں نے کہا۔ ”مبین کے تو بہت رشتے آتے ہیں۔ دولت مند اور اعلیٰ تعلیم یافتہ اوپنٹی پوزیشن والوں کے۔ زمین جائیداد والے۔“

کننے لگیں۔ ”ہم بھی جائیداد والے ہیں۔ پیسہ بھی بہت ہے۔ رشتے دار ہیں۔ اپنا خون ہے اس لیے یہ چاہا۔“

میں نے کہا ”اچھا اسی خونی رشتے کی وجہ سے آپ نے اسے دربر کرنے میں دیر نہ لگائی۔ اپنی ماں کو جس حالت میں ہاسپٹل لائی۔ اس وقت خونی رشتے دار کہاں تھے۔ بس بیٹی۔ میں نے انہیں واپسی کا راستہ بتا دیا۔“ بدلتا ہے رنگ آسمان کیسے کیسے۔



محلے کے لوگوں کو گھر کی صفائی کی ذمہ داری سونپ کر کہ لوگ آ رہے تھے تو نسی نے افان و خیزاں اندر آتی شکو کو دیکھا۔ کچھ بھاری بدن ہو گیا تھا۔ لپٹ گئی۔ روئی رہی شادی ہو گئی تھی بچہ بھی تھا۔ نہ جانے کس طرح خبر ملی کہ فوراً آئی۔

وہ آئی، انکل کے ساتھ ان کے گھر آ گئی۔ گم صم تھی۔ جیسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہو۔ لیکن رات کو واپس کلیننگ آئی۔ کوارٹر کے تنگ ماحول میں۔ پناہ گاہ یہ اس کے لیے آغوشِ یاد سے کم نہ تھا۔ جب وہ مایوس دل گرفتہ بے آسرا تھی۔ اس جگہ نے سارا دیا، اعتماد دیا۔

صبح ہوتے ہی مٹھائی اور فروٹ منگا کر تمام اسٹاف کو کھلایا۔ میزبوں کے لیے فروٹ لے گئی۔ ہر طرف مبارک باد کا شور تھا۔ جوا بہت مسکرا رہا تھا۔ اس کے سوال پر شرمایا۔

”وہ تو مجھے خوش ہو رہی تھی۔ اس لیے۔“

کمال ہے۔ یہ آدمی ہر ایک کے معاملے میں دخیل انداز میں کرتا ہے جیسے اس کا اپنا معاملہ ہو۔ شاید اسی لیے اتنا مقبول بھی تھا۔

شام کو مٹھائی اور فروٹ لے کر جوا کے گھر جا پہنچی۔ انہیں جوا دیتا چکا تھا۔ سب نے مبارک باد کے ساتھ دعائیں دیں۔ ابا کو فروٹ دے تو بولے۔

”میں تو مٹھائی کھاؤں گا۔ خوشخبری کی مٹھائی سے نقصان نہیں ہوتا۔“

ان کی منطق ہی الگ تھی۔ جوا انہیں بہت پرہیز کرواتا تھا۔ اس لیے بڑے میاں کوئی موقع جانے نہ دیتے۔

وہ آ رہی تھی تو لالہ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ سب کچھ اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ اس کا جتنا شکراوا کرو کم ہے۔ ہماری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ نہ جانے تمہارے مالِ باپ کی نیکی تھی یا ان کی دعائیں۔ جو آج بھی تمہارے کام آ رہی ہیں۔ یادوں ہی۔ ان کے لیے بھی دعائے مغفرت کیا کرو۔“

جب بھی کوئی اباجان اور امی کا اچھے الفاظ میں ذکر

سہیل نے کارروائی کی ابتدا کر دی تھی۔ نسی کو بھی کئی بار عدالت جانا پڑا۔ مگر اسے امید نہ تھی۔

چھ ماہ کا عرصہ۔ انکل نے اسے کاغذات دیتے ہوئے خوشی سے معمور لہجے میں کہا۔ ”چلو بیٹا۔ یہ کام بھی پایہ تکمیل کو پہنچا۔ سہیل کی کاوش اور قابلیت نے معرکہ جیت لیا۔ اب تم اپنے گھر کی مالک ہو۔ کل عدالت کے کارندے گھر کا قبضہ لے کر آئے۔ آج سہیل مجھے چالی دینے آیا تھا۔ بہت مبارک باد دے رہا تھا۔ چلو چل کر دیکھتے ہیں۔“

وہ سن ہو گئی۔ اعصاب سو گئے۔ کیسے؟ ناامیدی بے یقینی اور فتح کی خبر۔ گھر۔ پیارا گھر، اباجان کی حلال کمائی کا بنایا ہوا۔ ان کی محبتوں کی نشانی، امی کے سلیقے کا سجایا ہوا۔ اس وقت اجڑے دیار کا نقشہ نظر آ رہا تھا۔ اسے بہت رونا آ رہا تھا۔

محلے والے جمع ہو گئے۔ خواتین مبارکباد کے لیے آگئیں۔ خوش بہ خوش۔ گل کی ای نے گلے لگالیا۔

”کل بڑا عبرت انگیز منظر تھا۔ جب عدالت کے

کارندے اندر سے سامان باہر پھینک رہے تھے۔

تمہاری چچی رو رو کر فریاد کر رہی تھیں۔ ان کا بیٹا دور

کھڑا تھا۔ محلے والے بھی چچی کی لداؤ کیسے کرتے اور

یہ فریچہ جو یہاں بیچ گیا ہے۔ زیدی صاحب کی بیوی بیٹی

کی بدولت۔ وہ نشان دہی کر رہی تھیں کہ یہ سامان

مالکوں کا ہے۔ ملکہ نے برتنوں کو ان کے ہاتھ سے

چھین چھین کر جگہ پر رکھا کہ یہ یہاں کا پرانا سامان

ہے۔ یہ صوفہ، بیڈ، الماریاں کسی کو لے جانے نہیں

دیا۔ کون بھول سکتا ہے تمہارے مالِ باپ کے حسن

سلوک کو دیکھا یہ ہے قدرت کا انتظام۔“

”اور۔۔۔ خالہ وہ نرسی، اسری؟“ سے یاد آیا۔ ہمدرد

اور محبت والی اسری نہ جانے کہاں ہو گئی۔

”بیٹا وہ تو سپاہیوں کے آتے ہی چلی گئیں۔ سنا ہے

تمہارے چچا کے دو گھر اور ہیں۔ کرائے پر تھے، اب

وہیں گئی ہیں ماں بیٹیاں یا پتا نہیں، پھوپھی نے تو پناہ

دینے سے انکار کر دیا تھا۔ حالانکہ غاصب تو وہ بھی

ہیں۔“

کرتا اس کا دل خوشی اور طمانیت سے بھر جاتا اور آنکھیں بھیگ جاتیں۔ آنکھیں پلو سے خشک کرتی وہ گلی سے باہر نکل کر نیکی کا انتظار کرنے لگی۔ کسی کے ہاتھ نے اس کا ہاتھ دوچا۔ اس کی چیخ نکل گئی۔

”جب رہو اور میرے ساتھ چلو ورنہ۔۔۔“ شربیل تھا۔ زخمی شیر۔

وہ پھر چیخی۔ ”چھوڑو۔ چھوڑو میرا ہاتھ۔“ مگر وہ کھینچنے لے جا رہا تھا۔

وہ مدد کے لیے چلا رہی تھی۔ دکاندار سب مصروف خریداروں کا ڈھام۔ وہ زور لگا کر زمین پر بیٹھ گئی۔ اور زور زور سے اللہ کو پکارنے لگی۔

”دیکھو۔ ابھی آرام سے کہہ رہا ہوں۔ میرے ساتھ چلو۔ کسی کو یلایا تو نقصان کی تمیز دے رہی ہوگی۔“

وہ تو اللہ کو پکار رہی تھی۔ زمین پر بسنے والے بندگان خدا تو محض تماشائی تھے۔ لا تعلقی، بے نیاز۔ اب وہ اسے ٹھیسٹ رہا تھا۔ زمین پر۔ سرک پر۔ وہ ہاتھ پیر چلا

رہی تھی، حلق کو بھی کام میں لا رہی تھی۔ مگر بے سود، اچانک گرفت کمزور ہوئی اور ہاتھ آزاد، وہ بہ آسانی کھڑی ہو گئی۔ چھلے ہوئے ٹھنوں کے باوجود۔

تب اس نے جواد کو دیکھا۔ جو شربیل کا ہاتھ پکڑ کر

نعی کو بچانے کی تگ و دو میں تھا۔ پھر چند راہ گیر بھی اس جنگ میں شامل ہو گئے۔ شربیل، جواد کو مار رہا تھا۔

گھونے لگاتیں۔ مگر جواد صرف چیخ رہا تھا۔

”جائیں میڈم! آپ چلی جائیں۔“

وہ کیسے چلی جانی۔ اس معرکے سے الگ ہونا اس کے بس میں نہ تھا۔ پھر یکایک شربیل نے جیب سے

پستول نکالا۔ نعیمی کو نشانہ بنایا۔ جواد چیخا اور شربیل کو دھکا دیا۔

”چھوڑو گا نعیمی۔“ اس نے کہا اور پستول سے گولی نکل۔ مگر نعیمی سکتے کی کیفیت میں تھی، بل نہ

سکی۔ نہ جانے کیسے جواد اس کی ڈھال بن گیا۔

گولی، جواد کو لگی۔ وہ لڑکھڑایا۔ مگر نعیمی کو دیکھا۔ پھر مگر پڑا۔ لوگوں نے شربیل کو قابو میں کر لیا تھا۔ پستول چھین لی تھی۔ ”پولیس“ کوئی چیخا۔ جواد کا خون سرک

ر۔ سرک لال ہو رہی تھی۔ اس نے بے بسی سے دیکھا۔

پولیس وین میں وہ کلینک پہنچے، بے ہوش جواد۔

جواس باختہ نعیمی، ڈاکٹر سرفراز تو خود پریشان ہو گئے۔ فوراً ”آپریشن تھیٹر میں لے گئے۔ سوالات۔۔۔ کس

نے مارا۔ گولی کہاں لگی۔ کسے ہوا۔ وہ تو ایسا آدمی نہ تھا۔ ہاں وہ تو ایسا نہ تھا۔ مگر لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔

زخمی کرنے والے۔ وہ پتھر بیٹھی کاپ رہی تھی۔

”میری وجہ سے۔۔۔ میرے لیے اس اکیلے گھر کے کفیل نے۔“

ڈاکٹر سرفراز پولیس سے بات کر رہے تھے۔ نرسیں اس کو تسلی دینے لگیں۔ ”دعا کرو مس دعا کرو۔“ سب

مل کر دعا کرنے لگیں۔ مارا تھا کھڑے ہو کر انجیل سے کچھ سنا لے گئی۔ دعائیں۔ میں اس کے ماں باپ کو کیا

جواب دوں گی۔ بس یہی سوال بے چین کر رہا تھا۔ دو گھنٹوں گزرے جیسے دو صدیاں۔

”گولی نکال دی گئی ہے۔ اڑتالیس گھنٹے اہم ہیں۔ دعا کریں۔ خون زیادہ بہنے کی وجہ سے کمزوری بہت ہے۔“

”اڑتالیس گھنٹے۔ اس کی اپنی زندگی میں اتنے اہم ہوں گے۔ سوچا بھی نہ تھا۔ سب اپنے کاموں میں لگ

گئے۔ وہ اسی جگہ جمی رہی۔ پھر انکل اگر ڈانٹ ڈپٹ کر اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ آئی اس کی حالت دیکھ کر

گھبرا گئیں۔ وہ جیسے حواسوں میں نہ تھی۔ اڑتالیس گھنٹے۔ یہی الفاظ منہ سے نکل رہے تھے۔ پھر وہ پاگلوں

کی طرح نہ نظر آنے والا نقطہ تلاش کرتی۔ آسمان تکتی کبھی زمین۔ اماں ایا کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ کیا کہوں

گی ان سے۔ اگر جواد کو کچھ ہو گیا۔ میں۔۔۔ میں ان کی کفیل بن جاؤں گی۔ ہاں لیکن ان کا بیٹا۔ اصلی بیٹا تو بن

نہیں سکتی۔ ان کے وہ ارمان تو پورے نہیں کر سکتی۔ بیٹے کا سہرا۔ اس کے بچے۔ ان کی اپنی نسل۔

”پولیس کو میں نے بیان دیا ہے۔ شربیل نے جنون کے عالم میں گولی چلا دی تھی۔ خدا کرے جواد

صحت مند ہو جائے۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

بہر حال تمہارا نام اس میں نہیں آئے گا۔“ انہوں نے تسلی دی۔ بہت معاملہ قم تھے ڈاکٹر۔

رات تھی کہ سیاہ رات۔ جاگتے سوتے ختم ہی نہیں ہو رہی تھی۔ صبح ہوتے ہی وہ بھاگنے کے موڈ میں تھی۔ انکل نے روکا۔

”چھوڑ دوں گا تمہیں۔ میری بات ہوئی ہے ڈاکٹر اویس سے۔ خطرے سے باہر ہے۔ اپنا حلیہ درست کرو۔ اگر وہاں پولیس ہو۔ تمہیں کوئی بیان نہیں دینا۔ سمجھ لو تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ جرم شرجیل نے کیا ہے اور بس۔ بعد میں دیکھیں گے۔ آرام سے چلیں گے۔“

پتا نہیں اب انکل کیا کریں گے۔ میرا نام آئے بغیر مقدمہ کیا بنے گا۔ اندر جا کر اس نے حلیہ درست کیا۔ ناشتہ سب کے ساتھ کر کے انکل کے ساتھ نکلی۔ کلینک میں جواد کے والد تھے۔ وہ ان کے گلے لگ کر دھواں دھار روئی۔ انہوں نے پیار سے سمجھایا۔

”بیٹا تمہارا تصور نہیں ہے۔ ایک حادثہ تھا۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔ کبھی بھی کسی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ تم نہ ہو تیس تو کوئی اور سبب بن جاتا۔ یہ جواد کے نصیب میں تھا سو ہوا۔ شکر ہے مولا کا۔ جان بچ گئی۔“ بہت ہی صابر تھے۔

”وہ اللہ نے ہمیں بہت دعاؤں کے بعد عطا کیا تھا۔ اللہ ہی اس کی حفاظت کرتا ہے۔“

ایسے لوگ بھی دنیا میں ہوتے ہیں۔ قانع صابر شاکر۔ آزمائش کو صبر شکر کے ساتھ گزارنے والے۔ وہ ابھی آئی سی یو میں تھا۔ باہریشے سے جھانک کر دیکھا۔ اف! رنگ زرد، نقاہت چہرے سے ظاہر تھی۔ دیکھنا نہ گیا۔ پیوں میں جکڑا ہوا۔ خاموش، بے ہوش۔ وہ جو ہر کام میں پیش پیش رہتا تھا۔ اسے ساکت لیٹے دیکھنا۔



اسے ہوش آ ہی گیا۔ پھر کئی دن بلکہ کئی ہفتے لگے سنبھلنے میں۔ دُستار ج ہو کر گھر چلا گیا۔

انکل کی کوشش سے جواد کو بہت اچھی جاب مل

گئی۔ اس نے ایم بی اے کیا ہوا تھا۔ جب عرصے تک جاب نہ ملی تو انکل کی پیش کش قبول کر لی۔ ابابھی جب تک سروس کر رہے تھے پھر ریٹائر ہو کر بیٹھ گئے۔

خالہ پھر آ گئیں۔ وہی اپنا گھر ہوتے ہوئے یہاں کیوں پڑی ہو۔ سہیل نے تمہاری خاطر اتنی محنت اور کوشش سے گھر حاصل کیا ہے۔ اس مقدمے کے لیے رکا ہوا تھا۔ امریکہ سے بلاوے آرہے ہیں۔ یہی روٹا تھا ان کا۔

”خالہ! آپ کا شکریہ۔ اپنے بیٹے تک بھی میرا شکریہ پہنچا دیں۔ لیکن مجھے اب گھر کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے تو صبر کر لیا تھا۔ اب اس لیے یہاں ہوں کہ یہاں میری جاب ہے۔ مجھے آسانی ہے۔“

شرجیل جیل میں تھا۔ چچا امریکہ سے آ گئے تھے۔ بیٹے کی رہائی کے لیے اپنی کمائی بے دردی سے لٹا رہے تھے۔ کئی پارٹمی سے ملنے کی کوشش کی۔ سرفراز انکل کی تاکید تھی کہ چچا کلینک میں داخل نہ ہوں اور وہ ہر بار مایوس گئے۔

وہ خاموشی سے اپنا کام کر رہی تھی۔ اب وہ کسی تبدیلی کی خواہاں نہ تھی۔ قناعت پسند ہو گئی تھی۔ جواد اپنی نئی نوکری پر مطمئن تھا۔ کبھی کبھی اس کی کمی محسوس ہوتی۔ یہاں کا ہر فرد اس کا عادی تھا۔ سب ذکر کرتے آئی نے اگر نئی خبر دی۔ ”خالہ اسے بہو بنانا چاہتی ہیں۔“ تمہاری خاطر امریکہ کی جاب چھوڑ کر آیا۔ کامیابی کے بعد اتنا تو ان کا حق ہے۔ سوچ کر جواب دینا۔ مجھے تو کوئی حرج نظر نہیں آتا۔ اپنے آخر اپنے ہوتے ہیں۔“

اور وہ اس آخری جملے سے متفق نہ تھی۔ صاف انکار کر دیا۔

”ان کی محنت کا شکریہ میں ادا کر چکی ہوں۔ آئی! میں ایک بار رد کیے جانے کے بعد مزید ذلت نہیں سہہ سکتی۔ امی کی وہ ذہنی اذیت، ان کا دلی صدمہ۔ یہی صدمہ ان کا دشمن بنا۔ میری شادی نہ ہو سکنے سے زیادہ خالہ کا ازداری سے میری کزن سے رشتہ جوڑنا۔ اپنے کیا اس طرح دغا فریب کرتے ہیں۔ وہ بتا دیتیں۔ امی

برداشت کر لیتیں۔ لیکن۔۔۔ امی سے زیادہ چچی کا اعتبار کیا تھا۔ ان کا دل ٹوٹ گیا آئی۔“
”مجھے اندازہ ہے۔“ آئی ملائم لہجے میں بولیں۔
”میں تمہاری امی کی جذباتی کیفیت سے کبھی آگاہ ہوں۔ لیکن۔۔۔ شاید وہ اس غلطی کا کفارہ دینا چاہتی ہوں۔“
”تلائی کرنا مقصود ہو۔“

”میں اب کسی کا اعتبار نہیں کر سکتی آئی۔ خصوصاً کسی اپنے کا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ خالہ کے گھر رشتہ نہ ہونا میری بہتری میں ہو۔ امی نے یہی باور کرایا تھا تاکہ میں اثر نہ لوں۔ مگر خود امی کی ذلت کیسے گوارا کروں۔ میں زندگی بھر امی کی ذلت کے احساس سے اس رشتے سے نباہ کر سکوں گی؟ میں مرنا قبول کروں گی۔ مگر۔۔۔“

”اچھا چلو۔۔۔ زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ اصل میں وہ آئی تو تمہیں رشتہ لے کر، ہم نے انکار کر دیا۔ تمہارے انکل نے تمہارا رشتہ طے کر دیا اپنی مرضی سے۔“ مسکرا رہی تھیں۔

”اوہو۔۔۔ آئی ڈرامہ باز۔“

”جو ایک اعلا شریف گھرانے کا آڑیا ہوا معقول اور نیک لڑکا ہے۔ اس کی عادات اور اطوار سے متاثر ہو کر تمہارے ڈاکٹر انکل نے اسے تمہارے لیے نامزد کر دیا تھا۔ تمہیں یا اسے لاعلم رکھ کر اور اب جبکہ کافی گتھیاں سلجھ گئی ہیں جو دو کو اس کے لائق جاب مل گئی ہے۔ ان کے والدین تک اپنی خواہش پہنچا سکے ہیں ڈاکٹر صاحب۔ انہیں بھلا کیا اعتراض ہو گا۔ آج ہم تاریخ طے کرنے جا رہے ہیں۔“

سب سنا کر اسے ہکا بکا چھوڑ کر آئی شاپنگ کے لیے نرس کو لے کر چلی گئیں۔

اس کی شادی کی ذمہ داری۔ اور کلینک میں شور مچا ہو گیا۔ مبارک سلامت۔ کوارٹر میں رات کو کمرہ بند کر کے گانا بجانا بھی روا تھا انا۔ ہنگامہ ہی ہنگامہ۔ مسلسل ہنگامہ، جیلے، مذاق اور وقت بہت تیزی سے گزر گیا۔ بارات نکاح رخصتی سب کچھ ڈاکٹر انکل کی مرضی اور ذمہ داری پر لیکن حیرت کا ایک اور جھٹکا۔
ماموں، ماموں آگئے تھے اس کے سر پرست۔۔۔

اسے خبر نہ ہوئی۔ شادی کے دن دلہن بن کر اسے بہت شرم آ رہی تھی۔ ہائے اللہ! جو اد کیا سوچتا ہو گا۔ میں نے کتنا ڈانٹا۔ اب۔۔۔ کیا ہو گا۔ رخصتی نے بھی ایک سربراہز دیا۔ جب وہ رخصت ہو کر خود اپنے گھر پہنچائی گئی۔

سراسیمگی کا عالم طاری تھا۔ وہ امی والے کمرے میں لے جاتی گئی تھی۔ کمرہ باقاعدہ جملہ عروسی بنا ہوا تھا اور تب شکو سلام کرنی محضے پن سے آکر لپٹ گئی۔
”نعمی بی بی! آپ کو مبارک ہو۔ میں اتنا خوش ہوں اتنا خوش کہ بتا نہیں سکتی۔ آپ اپنے گھر آگئیں۔ میری بی بی جی بھی بہت خوش ہو رہی ہوں گی اور صاحب جی بھی۔“ کمرے میں ابابھی تھے اور اماں اور جو ابابھی وہ شرمائی۔

”تم یہاں کب سے، کس نے بلایا تمہیں؟“
بوکھلا کر اتنا ہی پوچھ سکی۔

”میں تو اسی دن سے یہاں ہوں۔ جب آپ مل کر آگئیں۔ میرا میاں بھی یہیں ہے۔ ہم نے خود سارے گھر کی صفائی کی۔ میرے میاں نے سفیدی کی دیکھو کیسا لٹکارے مار رہا ہے سارا گھر۔ ہم تو اسی دن سے صفائی ستھرائی میں لگ گئے۔ یہیں رہتے ہیں پکاتے آپ کی چچی والا اور شن ہمارے قبضے میں تھا۔“
وہ بول رہی تھی اور اس کی آواز اسے پچھلے دور میں لے گئی۔ جب امی تھیں۔ اباجان اور وہ شکو سے ناراض۔ مگر آج اس وقت اسے شکو کی موجودگی سے بے حد خوشی ہو رہی تھی۔ کتنا اپنا پن تھا اس کے۔ بے ساختہ انداز میں۔

”اب تو جی ہم یہیں رہیں گے۔ میرا میاں کھانا پکائے گا۔ میں صفائی کروں گی۔ آپ کے ساس سسر کی خدمت کروں گی۔ میرا میاں مالی کا کام کرے گا۔ میرا بیٹا۔۔۔ برآمدے میں کھیلا رہے گا۔ بس جی فیصلہ ہو گیا۔“ شکو کے فیصلے۔

اس نے اب دیکھا۔ جو اد اس کی بہنیں اماں سب ہنس رہے ہیں شکو کی باتوں پر۔

”اور تم رہو گی کہاں؟“ وہ گھبرائی۔ ایک نیا قبضہ گروپ۔ چچی والے پورشن پر قبضہ۔

راگ بھی لاتا رہا۔ اس محبت نے ہی تو۔۔۔ اسے بچانے کے لیے کوئی کھالی تھی۔

صبح ناشتے کی میز پر جو کہ شکو کی تیز دستی کا ثبوت تھا۔ حلوہ پوری، آلو چھوڑنے کی ترکاری۔ آلیٹ۔ امی کی بات درست تھی۔ وہ واقعی تیز دست تھی۔ سویرے سے اٹھ کر میاں کے ساتھ لگ گئی۔

اس کے لیے ماموں نے سروٹ کوارٹر بنوایا تھا۔ کچن کے ساتھ۔ اف ماموں۔ رازداری۔ ٹھی کی زندگی میں رازداری کا بہت دخل تھا۔ (کسی واردات کی طرح۔ بقول ماموں)

ناشتہ کرنے کے بعد اس نے ابا کی طرف دیکھا۔ وہ بیگم کے آنکھ کے اشارے نہ دیکھنے کے لیے۔ جو منع کر رہی تھیں حلوہ کھانے سے۔ نظر جھکائے کھا رہے تھے۔ بے پروا۔ ٹھی نے چیمہ پلیٹ پر مار کر متوجہ کیا۔ ”ابا! مل! مل! مل!۔ یہ گھر میں نے آپ کے بیٹے کو کرائے پر دیا ہے۔ کرایہ کچھ زیادہ ہے۔ مگر یہ کل مولوی صاحب کے سامنے اقرار نامے پر دستخط کر چکے ہیں، قبول ہے، قبول ہے، قبول ہے کے الفاظ کے ساتھ۔ اپنے بیٹے سے کہہ دیے۔ یہ مجھے براہ کرایہ دینے کے پابند ہیں۔ یقین کریں۔ ایسی مالک مکان ثابت ہوں گی۔ تبھی گھر خالی کرنے کا نوٹس نہیں دوں گی۔ کرایہ ملے یا نہ ملے۔“

اماں! ابا تو محض سر کر مسکرا دیے۔ مگر ہنوں کے حلق سے ہنستے پھوٹ پڑے۔ جو اس چالاکی پر حیران ابا کو دیکھ رہا تھا جو اقرار میں گردن ہلا رہے تھے۔ نظریں مگر اب بھی حلوہ پر مرکوز تھیں۔ اس کی زندگی میں تبدیلی آگئی تھی۔ خوشگوار تبدیلی۔

اسے پورا خاندان مل گیا تھا۔ انکل آنٹی جیسے مہمان بے لوث رشتے دار۔ اپنا گھر۔ شکو جیسی تیز دست خیر خواہ نوکر۔ اس کا شوہر بے مثال باورچی۔ مالی وقت پر بجلی کا فیوز بھی ٹھیک کرتا۔ گیس کے معاملات بھی درست کرتا۔ ابا کے پیروں کی مالش پابندی سے کرتا۔ ان سے پوچھ کر ان کی پسند کے کھانے بناتا۔ اماں کو گو کہ اختلاف ہوتا مگر آیا اور خاندان کا گھ جوڑ کافی

”سروٹ کوارٹر میں رہے گی۔“ ماموں اندر آ گئے تھے۔ ”میں نے بنوایا ہے اور ہر۔“

واہ۔ ایک انکل۔ ایک ماموں اور وہ اپنوں کے لیے ترستی رہی۔ جو انے اپنا خون بہا کر اپنے پن کا ثبوت دے دیا تھا۔ (غیر کے لیے؟) اس کا نذرانہ محبت۔

”جو اب بہت نیک اور غیرت مند نوجوان ہے۔“ ماموں اس کے پاس آ بیٹھے۔ ”مجھے ڈاکٹر کے انتخاب پر بہت خوشی ہوئی۔ اطمینان ہو گیا۔ سب فکریں ختم۔ تم بھی اپنے مہمان انکل کے فیصلے کو سراہنا۔ جو اب کے ساتھ ہم آپنگلی، محبت اور رفاقت کا بھرپور ثبوت دے کر۔ اس کے والدین کی اطاعت اور خدمت کرنا۔ اپنے مالی باپ سمجھ کر۔ سنا سے تمہیں بہنوں کی خواہش تھی۔ وہ از خود تمہیں مل گئیں۔ تمہیں اللہ نے پورا خاندان عطا کر دیا۔ دیکھا اللہ کتنا مہربان ہے۔ (بے شک)“

”اور اس گھر میں تمہارے خاندان کو لانے کے لیے میں نے تم سے رازداری رکھی۔ جو اب کو اعتراض تھا۔ مجھے امید ہے اس کا جواب تم خواہے دے سکو گی۔ مناسکو گی۔“

ماموں کی بے پایاں محبت اور رازداری۔ وہ ان کے بازو سے لپٹ گئی۔ جیسے ابا جان سے لپٹی تھی۔ انہوں نے بھی ابا جان کی طرح اسے پیار کیا۔

”دیکھو بیٹا! زندگی میں کچھ حادثے، کچھ وارداتیں ہوتی ہیں۔ سب کا بہادری سے مقابلہ کرنا ہی زندگی کا اصول ہے۔ صبر برداشت اور دکھ دینے والوں کو معاف کرنا سب سے بڑی دہری ہے اور خوش باش زندگی کی علامت۔ میں پچھلے دو ہفتے سے آپا کے پاس تھا۔ ڈاکٹر کی اطلاع پر فوراً آ گیا تھا۔ آپا بہت پچھتاہی ہیں۔ روٹی ہیں۔ تم انہیں معاف کر کے اپنا دل صاف کر لو۔ وہ شادی میں نہیں آئیں۔ تمہیں شاید تکلیف ہوتی۔ مگر اب آپ آئیں تو ان سے خوش دلی سے ملنا۔“ نصیحتیں شفقت اور ہدایت۔

رات بھر جو اب کی کن ترابی، شکوے، اعتراض سنتی رہی۔ سسرال کے گھر میں رہنا اس جیسے آدمی کے لیے بے غیرتی کا طعنہ تھا۔ لیکن۔۔۔ اس دوران اپنی محبت کا

مضبوط تھا۔ بہنوں نے الگ الگ کمرے سجالیے۔ نہ جانے ماموں نے کتنا وقت گھر کی درستی پر صرف کیا۔ وقت اور پیسہ۔

وہ ماموں کی ممنون تھی۔ ساتھ ہی ابا، اماں کی بے انداز محبت شفقت اسے اپنا اسیر بنا چکی تھی۔ وہ جواد کے ساتھ سیر تفریح کر کے خوش باش واپس آئی۔ جواد کی مزید خوبیاں اجاگر ہوئیں۔ وہ جتنا شکر کرتی کم تھا۔ ہم دم۔ ہم راز۔ دوسرا۔ آئیڈیل شریک حیات۔

خالہ آئیں۔ کچھ رکی رکی سی۔ وہ ان سے اسی طرح لپٹ گئی جیسے امی سے۔ بے تکلف ہو کر۔ دل صاف تھاشے کی طرح۔ خالہ بے چاری مگر اب بھی متاسف سی تھیں۔ شکوے گھر کے لان میں لگے آؤ تو ذکر پیش کیے۔ شکو اور اس کے میاں کی بدولت لان پہلے جیسا ہر ابھر۔ پھلوں کے بیڑ بھی سرسبز ملے۔ ابا کی فرمائش پر لان میں رنگین جھولا لگا دیکھا۔ پتا چلا ابا کی فرمائش تھی۔ وہ جھولا جھولتے تھے۔ اماں بڑبڑاتی تھیں۔

”بڑھے منہ مہاسے لوگ چلے تماشے۔ کچھ نہیں سوچتے تمہارے ابا۔ لوگ دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔“

ابا سے زیادہ ان کی بیٹیاں اور اب بہو اور بیٹا بھی دلچسپی لینے لگے۔ باری نکلتی تھی جھولنے کی۔ رات کو شکو بیٹے کو گود میں چڑھا کر چٹکیں لیتی۔ نمی تو بہت خوش تھی۔

اماں نے کہا۔ ”اے بیٹا! تم اپنے گھر میں یہ سر سر کے تماشے دیکھ کر کچھ کتنی کیوں نہیں۔ تم نمی ہوئی تھیں مری اور تمہارے ابا ایک خرگوش کا جوڑا لے آئے۔ میں نے چپکے سے پھکوا یا۔ سارا لان چر جاتے تو۔“

نمی چیخ پڑی۔ ”خرگوش‘ ہائے اماں کیوں پھکوا آئے۔“ ابا نے کہا۔ ”شکو نے اپنے کوارٹر میں چھپائے ہوئے ہیں۔“ وہ دوڑی کوارٹر کی طرف۔ اماں تاسف سے بڑبڑاتی تھیں۔

”یہ لڑکی بھی دیوانی ہو گئی ان سب کے ساتھ۔“ اور اندر چلی گئیں۔ نمی کو خرگوش پسند تھے۔ جواد نے ان کے لیے بڑا سا بچہ بنوا دیا۔ اماں کو یقین ہو گیا۔ بیٹا بھی

پگھلا گیا اور جب ابا کے ساتھ ہو بیٹا لوڈو کھیلے انہیں بہت غصہ آتا۔ ابا جھگڑا کرتے۔ ہارنا تو چاہتے نہ تھے۔ بہو ان سے بے محابا مقابلہ کرتی۔ یا اللہ کون کسے گایہ سر بہو ہیں۔ بھجولی نکلتے ہیں۔

نمی نے کئی بار محسوس کیا۔ اماں اس کی اٹھکھیلیاں پسند نہیں کرتیں۔ بہت معصوم صورت بنا کر ایک دن کہہ ہی دیا۔

”اماں مجھے اندازہ ہے، آپ مجھے ابا سے لڑتا دیکھ کر پسند نہیں کرتیں مگر ابا کی صحت کے لیے ضروری ہے۔ ان کی توجہ بنانا، دل، بھلانا، مصروف رکھنا۔ بوڑھوں کو بھی تازہ ہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے لان میں بیٹھے رہنے اور جھولے کا مزہ لینے سے بھی صحت پر اچھا اثر ہوتا ہے۔ آپ کو پسند نہیں تو میں کل سے۔“

اماں بے قرار ہو گئیں۔ اس کا چہرہ ہتھیلیوں میں لے کر بولیں۔ ”میرے بچے! میرے آنکھن کی چاندنی میں کیوں نا پسند کر دیں گی۔ تم تو ہمارے گھر کے لیے ایک فرشتہ ہو۔ اب نہیں، شادی سے پہلے سے قائل ہوں تمہاری نیکی اور پاکیزگی اور نرم دلی کی۔ ہم نے تو سوچا بھی نہ تھا کہ بھی ایسے شاندار گھر میں رہیں گے۔ اتنا عیش کریں گے۔ اتنے خدمت گزار نوکر دیں تو قیاس بھی نہ تھی۔ تم سے کبھی رشتہ جوڑ سکیں گے یہ خواب میں بھی نہ تھا۔ تم نے تو ہماری کیا پلٹ دی۔ ہمارے لیے تم ہیرے کی کان ثابت ہوئی ہو۔ تمہارا ہر فعل سر آنکھوں پر۔ مجھے تو تمہارے بڑھے سر پر غصہ آتا ہے۔ تم سے برابر کرتے ہیں۔ بھلا بتاؤ۔ یوں لڑتے ہیں جیسے۔“

”اپنے بیڑ کی بھی خبر لے لیا کریں۔“ وہ اماں کی تعریفوں پر شرمندہ ہو کر جھل مٹانے کو بولی۔ ”اس مہینے کا کرایہ بھی نہیں دیا۔ اب کس سے کہوں میں۔“ موضوع سے ہٹنے کا بہانہ۔

اماں کو ہنسی آئی۔ بہنیں بھی قہقہے لگانے لگیں۔ ابا جھومنے لگے۔ جواد دروازے پر کھڑا ٹھیکہ دیکھا رہا تھا۔ نمی کا دل خوشی سے بے قابو ہو گیا۔ وہ بھی سب کے ساتھ ہنسنے لگی۔ تبدیلی آگئی تھی۔



جندر سے منسلک رہے تھے۔ انھوں نے بھی اپنی تمام زندگی اسی جندر سے روٹی کھاتے گزار دی تھی اور آنے والے کل میں عبدالشکور کی نسلوں نے بھی اپنی روٹی اسی جندر سے کھائی تھی۔ اس جندر پر لوگ اپنی گندم پہناتے، بعض اوقات گندم کے بدلے اور کچھ پیسوں کے عوض آتا لے جاتے۔

اس کا نام بھاگاں والی تھا۔ نہ جانے کیسی بھاگاں والی تھی پیدا ہوئی تو ماں مر گئی، باپ دوسری عورت کا ہو گیا۔ پالنے والی عورت اس کے خاندان تک کی نہ تھی، بس بے اولاد دھیسوا سے لے آئی۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ جہاں سے کچھ خریدتی تو اس شخص کا کاروبار چمک اٹھتا تھا۔ وہ بھاگ جگا سکتی تھی لیکن اپنے نہیں۔ اس کا اپنا خیال تھا کہ وہ بھاگاں والی نہیں۔ اس کا نصیب کچھ زیادہ اچھا نہیں تھا یا اسے محسوس ہوتا تھا کہ اچھا نہیں۔

”آٹے کا بھاؤ کیوں بڑھاتے ہو؟“ عبدالشکور نے آٹا تھیلی میں ڈال کر اس سے پیسے طلب کیے تو وہ ترخ کے بولی۔

”بی بی! گندم مہنگی ہو چلی ہے۔ گندم کی قیمت سے آٹے کی قیمت بڑھتی ہے۔“ عبدالشکور نے کہا۔ وہ والدین کی اکلونی اور قدرے اکڑواوا دھتا۔ ہر بات پر اکڑنا اس کی ذات کا خاصہ تھا۔

”بی بی، نہیں، بھاگاں والی نام ہے میرا۔“ اس نے بھی تند لہجے میں کہا۔ عبدالشکور نے گھور کر اس کی جانب دیکھا۔ قدرے معصوم سا چہرہ، سانولا رنگ، عام سا لباس، چھوٹا قد اور چھوٹے چھوٹے ہاتھ۔ لیکن اس کے انداز میں ایک خاص کشش تھی۔ اس نے بھاگاں والی کو دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔

بھاگاں والی کیسا عجیب نام تھا۔ ”بھاگاں والی۔“ وہ ہنس پڑا۔ ”بھاگاں والی اور اتنی غریب نئے کپڑے بھی نہیں؟“ ”ہاں، ہوں بھاگاں والی۔“ ”تھیں کیا پتا؟“ اس نے لڑنے والے انداز میں کہا۔ اس کے لہجے میں اپنی

دریا کے بہاؤ پر لگی یہ جندر نہ جانے کتنے عرصے سے اس دریا پر موجود ہے۔ پانی کا تیز بہاؤ اس کے چکی کے پیسے کو گھمراہا تھا ہر چکر پورا ہونے پر چکی کے دونوں پاٹ گول گھومتے اور ان کے بیچ موجود مٹی، یا گندم کے دانے پس کر آتا بن جاتے۔ یہ آٹا ایک بڑے تھال میں گرتا۔ عبدالشکور اس آٹے کو اکٹھا کرتا اور باس رکھے تھیلوں میں بھرتا جاتا۔ جندر کا چلنا اور دانوں کی پسائی ایک عجیب سی آواز پیدا کرتی۔ گاؤں کے لوگوں کی صبح اس آواز کے ساتھ ہی ہو جایا کرتی۔ اس خاندان کی روٹی روزی کا دار و مدار سل در نسل سے اسی جندر پر تھا۔ نہ جانے یہ جندر اس خاندان کے کس شخص کے یہاں لگائی تھی۔ اس کے باپ دادا اسی



ذات کے لیے فخر تھا۔

”تو میں نے کب کہا کہ نہیں ہو بھاگاں والی؟“ عبدالشکور نے مسکراتے یوں کہا جیسے اس کا مذاق اڑا رہا ہو۔

بھاگاں والی نے آنے کی تھیلی پکڑی اور پاؤں پختی چل دی۔ عبدالشکور اسے جاتا دیکھ رہا تھا۔ اس دن اس نے جتنی گندم پیسی وہ تمام بک گئی۔ وہ جب بستر پر لیٹا تو اسے بھاگاں والی اس کے سامنے

چھپا کر کے آگئی۔ بھاگاں والی کیاج میں بھاگاں والی تھی آج اس کی خوب کمائی ہوئی تھی۔ وہ خوش تھا۔ کمائی کس کو بری لگتی ہے اس نے بچپن میں سنا تھا کہ کچھ لوگ خوش قدم ہوتے ہیں اور کچھ سبز قدم۔ کیا بھاگاں والی اس کے لیے خوش قدم تھی؟ وہ اس کو سوچے گیا۔ شاید اس کا لہجہ اسے متاثر کر گیا تھا۔

وہ کئی روز تک اس کی جندر پر نہیں آئی تھی۔ وہ بھی بھاگاں والی کو بھول گیا تھا۔ ایک ہی ملاقات میں کوئی کسی کو یاد نہیں رکھتا۔ قریباً دو ہفتوں کے بعد اس روز وہ پھر سے جندر پر چلی آئی تھی۔ اس نے اسے آتے دیکھا تو پھپھلی ملاقات اور اس میں ہونے والی جھڑپ یاد آگئی۔ وہ پھر سے مسکراتے لگا۔

”عبدالشکور نام ہے میرا۔ سب مجھے شکور کہتے ہیں۔“ عبدالشکور نے اسے دیکھتے ہی دو سیر آنا پلاسٹک کی تھیلی میں ڈالا اور اسے پکڑاتے ہوئے کہا۔ ”تیرا نام عبدالشکور ہے تو میں کیا کروں؟ کتنے

پیسے ہوئے؟“ اپنے ہاتھ میں پکڑے گندم کے ایک سیر دانے اس کی جانب بڑھاتے ہوئے وہ اپنی عادت کے مطابق تنک کر بولی۔

”ساٹھ روپے۔“ عبدالشکور ابھی تنک خوش اخلاقی سے کہہ رہا تھا۔

”ساٹھ تو بہت زیادہ ہیں۔ چل کوئی نہیں بھاگاں والی کا صدقہ۔“ اس نے قدرے غرور سے کہا۔

”جانی بی! بڑی آئی بھاگاں والی۔ صدقہ و دق بھی کوئی نہیں۔ گندم ہے پسائی کے پیسے تو لگتے ہیں۔“ عبدالشکور کو اس کے الفاظ نے تپا دیا۔

”تو میں کون سا مفت لیے جا رہی ہوں؟ پیسے

دیے ہیں۔“ بھاگاں والی نے اس سے ترخ کر کہا۔ ”اے بی بی اگر تو اتنی ہی بھاگاں والی ہوتی تو کیا ان پرانے کپڑوں میں اور یوں اکیلی جندر پر آتی؟“ عبدالشکور کچھ غصے میں تھا، کچھ اسے بھاگاں والی کی بات نے غصہ دلا دیا تھا۔ ”ہوں تو بھاگاں والی تم کیا جانو.....“ بھاگاں والی نے اکر کر کہا اور چل دی۔ وہ جب بھی آتی تھی اس سے لڑ کر جاتی۔

اس دن بھی عبدالشکور کا سارا آنا، ساری گندم بک گئی۔ وہ خوش تھا آج بھی خوب کمائی ہوئی تھی۔ بھاگاں والی شاید سچ ہی کہتی ہے، وہ ہے ہی بھاگاں والی۔ چھوٹی سی گڑیا۔ عبدالشکور کا دل بے اختیار اس کے بارے میں سوچنے لگا۔ کیسی عجیب سی لڑکی تھی، باقیوں سے کتنی مختلف۔ وہ نہایت عام ہوتے ہوئے بھی عام نہیں تھی۔ اس کا جی چاہا وہ اس کے پاس، اس کی دسترس میں ہو، وہ اس کے پھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام لے۔

اس کے بعد یوں ہوا کہ جب بھی بھاگاں والی اس کی جندر پر آتی وہ آنے کی قیمت کم کر دیتا کیونکہ اسے علم تھا کہ اس دن اس کی تمام گندم بک جائے گی۔ اب ان کے درمیان ملکی پھلکی بات بھی ہو جاتی تھی۔ عبدالشکور کو محسوس ہو چلا تھا کہ اب وہ بھاگاں والی کا عادی ہوتا جا رہا ہے۔ وہ اس کے آنے کا انتظار کرنے لگا تھا۔ جب اس کو جندر پر آئے ہوئے چند دن گزر جاتے تھے وہ بے چین ہونے لگتا۔ پھر آہستہ آہستہ ان کی بات چیت میں اضافہ ہونے لگا۔ بھاگاں والی اس کی جندر پر آتی تو وہ اس کا حال پوچھتا اور بھاگاں والی اس کا۔

عبدالشکور بھاگاں والی کا خیال کرنے لگا تھا اور بھاگاں والی نے اب اس سے لڑنا چھوڑ دیا تھا۔

الفاظ ایک ایسا پل ہیں جو انجان لوگوں کے درمیان ربط اور تعلق پیدا کرتے ہیں، جب تک یہ ربط قائم رہتا ہے دو انسانوں کے بیچ ایک رشتہ استوار رہتا ہے چاہے اس رشتے کا کوئی نام ہو یا نہ ہو۔ الفاظ کے پل جب ٹوٹتے ہیں تو رشتے کمزور ہو جاتے ہیں۔

وہ یکسر بدلتی جا رہی تھی۔ عبدالشکور اسے دیکھتا رہتا اور دل ہی دل میں اسے اپنی ذات کا حصہ سمجھنے لگا۔

☆☆☆

اس دن سرمئی موسم تھا۔ ٹھنڈی ہوائے ماحول کو خوشگوار بنا دیا تھا۔ جب بھاگاں والی اس کی جندر پر آئی تو اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تھے۔ ”ایک سیر آتا۔“ اس نے آتے ہی پیسے عبدالشکور کی جانب بڑھائے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ ”خیر تو ہے بھاگی.....؟ نہ سلام نہ دعا۔“ عبدالشکور نے فکر مندی سے کہا۔ اب وہ اسے بھاگی کہنے لگا تھا۔ خوابوں خیالوں میں بھاگاں والی کو اسے گھر میں کام کاج کرتے دیکھنے لگا تھا۔ ”ہو سکتی ہے خیر؟“ بھاگاں والی نے الٹا سوال دیا۔

عورت کو خدا نے ایک خاص حس سے نوازا ہے۔ وہ مرد کے بات کرنے کے انداز سے اس کے دل کا حال جان لیتی ہے۔ بھاگاں والی کو بھی شکور کے دل کا حال معلوم ہو چلا تھا۔ وہ بھی خیالوں ہی خیالوں میں عبدالشکور کے گھر کی چار دیواری میں ملکہ بنی ٹھومتی رہتی تھی عبدالشکور اس کے ہاتھوں کو چوما کرتا تھا۔ لیکن یہ سب خیالوں تک ہی محدود تھا۔ جب بالے کا رشتہ اس کے لیے آیا تو اس کا دل پھل اٹھا۔ بالاکو چوان کا بیٹا تھا، کوچوان ہی تھا۔ اچھی خاصی کمائی کر لیتا تھا۔ لیکن اسے اس کوئی غرض نہ تھی۔

”اگر بھاگی شکورے کو سلام دعا بھی نہ کرے تو خیر نہیں ہو سکتی۔“ عبدالشکور نے مان سے کہا۔

”شکورے، تو یہاں اپنی جندر پر بیٹھا رہ، خالہ میرا رشتہ بالے سے طے کر رہی ہے۔“ وہ باقاعدہ رو پڑی۔

”کیا کہہ رہی ہے تو؟“ عبدالشکور کو ایک دھچکا لگا۔

”میری سگائی ہو جانی ہے۔ تو آرام کر۔“ وہ جلتے لہجے میں بول رہی تھی۔

”بھاگی! کون ہے وہ؟“ عبدالشکور نے پوچھا۔

الفاظ ان کے درمیان بھی ایک بے نام اور ان دیکھا رشتہ استوار کرتے جا رہے تھے۔

وہ اب اکثر جندر پر آنے لگی تھی۔ عبدالشکور بنا کہے آنے کے دام کم کرنے لگا تھا۔ اس دن جس تھا۔ وہ جب جندر پر آئی تو پیسے میں بھیگی ہوئی سانس پھولی ہوئی۔ عبدالشکور نے اسے دور سے آتے دیکھ کر آٹا الگ کر کے رکھ دیا۔ وہ آتے ہی جندر کے ساتھ پڑے ہوئے پتھر پر بیٹھ گئی۔ عبدالشکور اسے دیکھنے لگا۔

”ایک بات کہوں بھاگی؟“ عبدالشکور نے پیار سے کہا۔

”ہاں کہو.....“ بھاگاں والی کی ساری توجہ اس کے پیسے سے بھرے چہرے پر تھی۔ اس نے اپنے دوپٹے سے اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

”بھاگی! کبھی بھی میرا دل کرتا ہے کہ میں تجھے تیری خالہ سے چرالوں۔“ عبدالشکور نے کہا۔

”چرالوں.....! بھاگاں والی مسکرائی۔

”ہاں تو..... اور کبھی واپس نہ دوں۔“ عبدالشکور نے کہا۔

”کسی نے روکا ہے کیا؟“ بھاگاں والی نے شرماتے ہوئے کہا۔

”میں کسی کو روکنے دوں گا بھی نہیں۔ آئی سمجھ۔“ عبدالشکور نے اکر کر کہا۔

بھاگاں والی نے دھیرے سے اپنی پلکیں اٹھائیں اور پھر نیچی کر لیں۔ عبدالشکور نے اس کا ایسا روپ

دیکھا کہ اس نے اس کا ایسا روپ

دیکھا کہ اس نے اس کا ایسا روپ

دیکھا کہ اس نے اس کا ایسا روپ

دیکھا کہ اس نے اس کا ایسا روپ

”وہ کوئی بھی ہو؟ کچھ فرق نہیں پڑتا۔ کوئی بھی ہو خالہ کا گھر لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ لوگوں کو بٹھانے کے کیا فرق پڑتا ہے؟“ اس نے سر جھکا کر کہا۔
 ”فرق تو پڑتا ہے ناں۔ کچھ تو پتا ہو؟“ عبدالشکور نے کہا۔

عبدالشکور! تو خالہ کے پاس آ جا۔ سگائی سے پہلے میں خالہ کو منالوں گی۔“ بھاگاں والی نے کہا اس کی آنکھیں تھیں کہ ساون کی طرح برستی جانی تھیں۔
 ”بھاگاں والی میں کیسے آؤں؟ نہ ٹپڑا نہ لٹا۔ اور نہ ہی کوئی دوست یا میرے ساتھ چلے گا۔“ عبدالشکور نے کہا۔

”آتا ہے تو آ جاویں ہی بنا کسی زیور، کپڑے کے۔“ بھاگاں والی نے کہا اور اس کی بات سننے بغیر جندر سے پلٹ گئی۔

”میں آؤں گا۔ ہاں ضرور آؤں گا۔“ عبدالشکور نے کہا۔

جندر کی آواز گونجنے لگی، چکی کے پاٹ گھومنے لگے، گھریوں بسنے لگا۔ عبدالشکور اسی سوچ میں گم بیٹھا رہا۔ کرے تو کرے کیا؟ اسے انتظام تو کرنا ہی تھا۔ یوں خالی ہاتھ کیسے جاتا؟ لوگ کیا کہتے؟ خالہ کیا سوچتی؟ اور وقت اپنی رفتار سے چلتا رہا۔

بھاگاں والی انتظار کرتی رہی۔ لیکن جس نے آنا تھا وہ نہ آیا۔ اس کی آنکھوں سے ساون برسنے لگا۔ دیکھنے والوں کو لگتا تھا جیسے اسے خالہ سے بچھڑنے کا

دکھ تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کے اندر کیا کچھ ٹوٹ گیا تھا۔ ایک ماں، ایک یقین تھا کہ عبدالشکور آئے گا۔ اس یقین کے خاتمے نے بھاگاں والی کی ذات کے درود یوازہ ہلا کر رکھ دیے تھے۔ وہ بس سوئے جاتی تھی روئے جاتی تھی۔ دل میں کئی بار اس نے عبدالشکور کو پکارا لیکن اس کی پکار عبدالشکور کے کانوں تک نہیں پہنچی۔

اس وقت اس کا آنا اہم تھا۔ اس کے علاوہ کسی چیز کی ضرورت ہی نہ تھی۔

☆☆☆

بھاگاں والی کی آج سگائی تھی۔ اس کی منہ بولی

والی کی برائیاں کر رہے تھے، کچھ انھیں سراہ رہی تھیں۔ گاؤں کی لڑکیاں رنگ برنگے کپڑے پہنے تیلیں کی طرح اڑتیں، ہنسیں اور ہلکھلاتیں۔ ڈھولک کی تھاپ پر گانے گائے جا رہے تھے۔ گانوں کے ساتھ ساتھ لڑکیاں باری باری لڈی ڈالنے لگیں۔ خالہ خوشی سے ہنستی پھر رہی تھیں۔ خالہ ہر ایک کے پاس جا جا کر شربت پیش کر رہی تھیں۔ کئی کئی بار گاؤں کی عورتوں سے حال چال پوچھ رہی تھیں۔

بھاگاں والی کو سرخ چوڑا پہنایا گیا تھا۔ وہ پنڈال میں سر جھکائے بیٹھی تھی۔ ضبط سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اس تمام ہنگامے میں بھاگاں والی کا دل خاموش تھا۔ اس کے ارمان مر چکے تھے۔ وہ جاہتی تھی کہ خوش ہو سکے لیکن نہیں ہو پارہی تھی۔ اس کی سہیلیاں اسے بار بار چھیننے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔ کبھی کبھی کی ایک زبردستی کی مسکراہٹ اس کے چہرے پر آ جاتی۔ دیکھنے والوں کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ شرم کی وجہ سے سر جھکائے ہے۔ اس کے برابر میں بالا بیٹھا تھا۔ مولوی صاحب کا انتظار تھا۔ عبدالشکور بھاگ کر اس کی خالہ کے پاس پہنچا۔

”خالہ!“ اس نے پکارا۔

”خالہ بھاگاں والی.....“ اس سے الفاظ ادا ہی نہ

ہو پارہے تھے۔ مہمانوں کے بیچ خالہ سنتی بھی تو کیا؟

”عبدالشکور۔ یہ لے بہن کی سگائی کے لڈو کھا۔

اللہ نے بڑا نیک بر دیا ہے۔“ خالہ نے عبدالشکور کے ہاتھ میں لڈو تھماتے ہوئے کہا۔

”خالہ اس طرح نہ کرؤ۔ خالہ.....“ عبدالشکور نہ

جانے کیا کیا کہتا رہا۔ خالہ سنی ان سنی کر کے چل دی۔

”خالہ میری بات تو سنو.....“ عبدالشکور نے کہا۔

”خالہ.....!“ وہ خالہ کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا

تھا لیکن خالہ تو اپنی ہی دھن میں مگن تھی۔

سہری صبح

دعا کی والدہ کا چانک انتقال ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی ماں اور سوتیلے بھائی حماد کے ساتھ رہتی ہے۔ دعا کے دو ماموں، ریاض احمد جن کی بیوی رابعہ احمد ہیں اور الیاس احمد جن کی بیوی مریم ہے۔ رابعہ احمد کے کتنے پر ریاض احمد دعا کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں کہ سوتیلے بھائی کے ساتھ رہنے کا اب جواز نہیں ہے۔

ریاض احمد کے دو بیٹے عمیر اور عمر ہیں اور ایک بیٹی نوال ہے۔ عمیر بہت سلجھا ہوا نوجوان ہے جس نے باپ کے ساتھ مل کر ان کا کاروبار بھی سنبھال رکھا ہے۔ جبکہ عمر ایک گڑا ہوا ضدی اور خود سر نوجوان ہے۔

الیاس احمد اپنے بڑے بھائی ریاض احمد کے برابر میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ آنے جانے کے لیے درمیان میں دروازہ ہے۔ ان کی بیوی مریم ایک امیر خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ بیوی کی جائیداد، تھیانے کی کوشش میں ہیں۔ مریم کا ایک بھائی ایکسڈنٹ میں مغدور ہو جاتا ہے اور اس کی بیوی مرعاتی ہے وہ ذہنی طور پر بھی ڈسٹرب ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر اس کا علاج شادی تجویز کرتے ہیں۔

مکمل ناول





Carmelita

انعم اور احسن ایک خوشگوار زندگی گزار رہے ہیں۔ لیکن اولاد کی کمی ان کی زندگی میں ہے۔ انعم کے شک کرنے پر احسن اپنا ٹیسٹ کروا تا ہے۔ انعم بہت پریشان ہے، احسن اسے تسلی دیتا ہے۔ لیکن اس کے بار بار پریشان ہونے پر ناراض ہو کر اسلام آباد چلا جاتا ہے۔ اس کی رپورٹ پازینو آتی ہیں، وہ بالکل نارمل ہوتا ہے۔ انعم کا ندوس بریک ڈاؤن ہو جاتا ہے۔ کمی اس میں ہوتی ہے۔

الیاس احمد بنیادی طور پر لالچی آدمی ہے۔ اسے رشتوں کا بھی پاس نہیں۔ وہ اپنی بیوی سے بھی اکھڑا اکھڑا رہتا ہے اور اپنے بچے عمیر کو بھی باپ بھائی کے خلاف بھڑکا تا ہے۔

عمیر اور دعا ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ رابعہ احمد یہ پسند نہیں کرتیں۔ عمیر اور نوال دونوں بسن بھائی دعا کو اک کی ماں کے غم سے باہر نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ریاض احمد کو بسن اور بھانجی سے بہت محبت ہے۔ وہ اس کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ عمر کو دعا ایک آنکھ نہیں بھاتی، وہ اسے ہر وقت ذلیل کرتا رہتا ہے۔

دعا کو دیکھ کر الیاس احمد کا لالچی ذہن مختلف منصوبے بنانے لگتا ہے۔ الیاس احمد، عمر کے کئے پر اس کے والد سے اس کے علیحدہ بزنس کی سفارش کرتے ہیں، جسے ریاض احمد سختی سے رد کر دیتے ہیں۔ عمران سے مزید برگشتہ ہو جاتا ہے۔

تبریز ملک اپنے معذور بھائی کی شادی اور مریم کو ان کا حصہ دے کر عیشہ کے لیے امریکہ میں رہائش پذیر ہونا چاہتے ہیں۔ یہ سن کر الیاس احمد ایک شاطرانہ منصوبہ بنا تا ہے۔ اور عمر کو اپنے ساتھ ملا لیتے ہیں۔ عمر کا رویہ دعا کے ساتھ انتہائی دوستانہ ہو جاتا ہے۔ رابعہ احمد بھی اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں، کیونکہ انہیں مریم نے مشورہ دیا ہوتا ہے کہ عمر اور دعا کی شادی ہو گئی تو باپ، بیٹے کے درمیان فاصلے کم ہو جائیں گے۔

ریاض احمد، عمر اور دعا کی باہم پسندیدگی کو جانتے ہیں۔ اور ان کی شادی کا عندیہ دیتے ہیں، مگر رابعہ، دعا کا عمر سے شادی سے گریز اور بار بار عمر اور دعا کے اچھے تعلقات کو جتنا ہی رہتی ہیں۔ دعا کے رویے سے عمر کھٹک جاتا ہے۔

رابعہ احمد کی کوششوں سے عمر اور دعا کا تعلق سب کی نظر میں آ جاتا ہے۔ ریاض احمد کو کھیل سمجھ میں آنے لگتا ہے۔ عمر کو اسلام آباد رانچ کا چارج دے دیتے ہیں۔

عمیر کو دعا کا شادی سے انکار اور عمر سے تعلق کا رویہ الجھن میں ڈال دیتا ہے۔ دعا بھی ممائی کی نیت کا فتور سمجھ جاتی ہے، مگر کم ہمتی اور کوئی اور ٹھکانہ ہونے کے سبب خاموش رہتی ہے۔

منصوبے کے مطابق الیاس احمد بیمار ہو کر ریاض احمد کے گھر جاتے ہیں جہاں دعا، عمر کے کمرے سے برآمد ہوتی ہے۔ عمر گناہ کا اعتراف کرتا ہے۔ رابعہ کو اس سارے ڈرامے کے باوجود دعا کی پاک دامنی پر یقین ہوتا ہے، وہ عمر کو ڈانٹتی ہیں۔

ریاض احمد صدمے سے بیمار ہو کر اسپتال پہنچ جاتے ہیں۔ اور دعا کو الیاس احمد اپنے گھر لے آتے ہیں، جہاں مریم اسے خوب لعن طعن کرتی ہے۔ دعا اپنی پاک دامنی ثابت نہیں کر پاتی، اس کے باوجود عمیر کا دل اسے قصور وار نہیں مانتا۔

الیاس احمد، مریم کے معذور بھائی کے لیے دعا کا نام پیش کرتے ہیں۔

الیاس احمد اپنی چھپے دار باتوں سے مریم اور رابعہ احمد کو دعا کی آصف سے شادی پر راضی کر لیتے ہیں۔ ریاض احمد اور نوال کے کئے پر عمیر، دعا کو اس کی شادی سے ایک روز قبل الیاس کے چنگل سے چھڑا لیتا ہے اور اسے اپنی محبت کا یقین دلا کر اس کے سوتیلے بھائی کے دروازے پر چھوڑ آتا ہے۔

اس کا سوتیلہ بھائی ملک چھوڑ کر جا چکا ہے۔ دعا گھرنون کرتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ عمر نے عمیر کو گولی مار دی ہے۔ نوکرانی اسے کہیں اور جانے کا مشورہ دیتی ہے۔ بہت بری حالت میں دعا اپنی دوست انعم کے گھر پہنچ جاتی ہے اور اسے اپنے حالات بتاتی ہے۔

دعا کے متعلق رابعہ کے اصل خیالات اور عمر کے کروت جان کر ریاض احمد ان سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ آصفؑ

انعمؑ دعا کو اپنے گھر میں پناہ دے دیتی ہے۔ انعم کی ساس کینڈا سے ملنے آتی ہیں۔ انیس یہ بات پسند نہیں آتی۔ وہ انعم اور دعا کو موازنہ کرتی ہیں۔ یہ بات دعا کو الجھن میں ڈال دیتی ہے۔ وہ انعم کو اس کی بے اولادی کا احساس دلاتی ہیں۔ عمیرؑ تھانہ حملے میں بچ جاتا ہے۔ ریاض احمدؑ عمیرؑ اور نوال کی بے رخیؑ رابعہ احمدؑ کو اپنی غلطیاں سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ مرثیہ کی حالت میں ماں سے بھی بدتمیزی کرتا ہے اور الیاس احمدؑ سے بھی پیسوں کا تقاضا کرتا ہے اور سارا چ مریم کے سامنے اگل دیتا ہے۔ دونوں کا جھگڑا ہو جاتا ہے اور عمرؑ الیاس احمدؑ پر فائر کھول دیتا ہے۔ عمیرؑ الیاس احمدؑ کو اسپتال لے جاتا ہے۔ مریمؑ عمیرؑ کو عمرؑ اور الیاس احمدؑ کے گھٹھ جوڑ اور سازش کا بتاتی ہے۔ عمرؑ کو پولیس پکڑ کر لے جاتی ہے۔ تھانے میں اس پر تشدد ہوتا ہے۔ عمیرؑ اور ریاض احمدؑ تھانے جاتے ہیں جہاں سے رہائی پانے کی خاطر عمرؑ انیسؑ سچ سچ بتا دیتا ہے۔

سائیں قنط

طرف دوڑی۔ وہ دونوں یونیفارم تبدیل کیے بغیر کھڑکی میں کھڑے لان کا منظر دیکھ رہے تھے۔ مریمؑ بغیر آہٹ پیدا کیے ان کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ گھنے درخت کے نیچے مالیؑ اس کی بیوی اور چار سالہ بیٹا بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ بچے کے منہ میں ایک نوالہ مال تو دوسرا باپ ڈالتا، وہ آپٹس میں باتیں کرتے اور ہنستے تھے۔ یہ منظر ان کے لیے اداسی کا سبب تھا۔ مریمؑ کی اپنی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ اس نے ان کے کندھوں پر اپنے دونوں ہاتھ دھرے تو وہ چونک گئے۔

”اُدھر میرے پاس آ کر بیٹھو۔“ وہ ان کے گرد بازو حائل کر کے، انہیں بیڈنک لے آئی۔

”ناراض ہو مجھ سے۔“ اس نے ان کی آنکھوں میں حسرت بڑھی۔ ان کے نرم نرم گال پھولے ہوئے اور آنکھوں میں واضح ٹھنکی تھی۔ جواب خاموشی تھا۔

”آپ تو ماما کی جان ہو، اگر ماما نے پہلی بار تھوڑا سا زیادہ ڈانٹ دیا تو میں سوری کر لیتی ہوں، آئم رینی سوری۔“ اس نے اپنے دونوں کان پکڑ لیے۔ عروہ نے جھٹ سے ماں کا دایاں اور زین نے بایاں ہاتھ پکڑ لیا۔

بچوں کو اسکول بھیجنے کے بعد مریمؑ سارا دن اپنے کمرے میں منہ پر تکیہ رکھے پڑی رہی۔ بچے اتنے بے خبر نہیں تھے جتنا وہ انہیں سمجھ رہی تھی۔ آج انہوں نے پولیس کی بات نوٹ کی، شاید وہ اس سے زیادہ بھی کچھ جانتے ہوں۔ آخر انہیں اپنے باپ کے متعلق جس توہا کہ وہ اچانک غائب کہاں ہو گیا۔ مریمؑ کے پاس ان کے کسی سوال کا مناسب یا سلیکٹیشن جواب نہیں تھا۔ وہ خود اپنی ذات میں بہت ایسکی تھی۔ حمزہ ملک نے اسے بھی مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا تھا۔ وہ ان سے کچھ کہہ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اسے اپنی غلطی اور زیادتی کا احساس ہو گیا تھا۔ اس کی مزادہ بھگت رہی تھی۔ جو ذلت اور رسوائی اس کے صے میں آ رہی تھی، وہ اس کی برداشت سے بہت زیادہ تھی۔ سب اس سے دور تھے کوئی ٹھنک نہیں تھا۔ اس کا ریاض احمدؑ سے کوئی رابطہ نہیں تھا، خود سے حوصلہ نہیں پڑتا تھا کہ انہیں کال کرے۔ اس نے تکیہ منہ سے ہٹا کے، وال کلاک کی طرف دیکھا۔ جو دو بج رہا تھا۔ وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی۔ بچے ڈیڑھ بجے اسکول سے آ جاتے تھے۔ وہ لاؤنج سے ہی اسے پکارتے، آوازیں لگاتے ہوئے آتے تھے۔ آج وہ اس کے پاس نہیں آئے تھے۔

وہ چنچل پیروں میں اس کے ان کے بیڈروم کی

”ماما ہم آپ سے ناراض نہیں ہیں۔“ عروہ نے ماں کا ہاتھ چوما۔

”پلیز ماما جان، ہمیں پاپا جان کے پاس جانا ہے۔ آپ اپنے گھر چلیں۔“ زین روہانسا ہو گیا۔ وہ باپ کا لاڈلا تھا۔ اپنی فرمائشیں اور ضدیں سرچڑھ کے پوری کروا لیتا تھا۔

”میری جان تمہارے ابو علاج کے لیے باہر گئے ہیں، جیسے ہی لوٹیں گے، ہمیں لینے آئیں گے۔ پھر ہم اپنے گھر جائیں گے۔ تم دعا کرو پاپا جان جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔“ میں دعا کروں گی کہ ہمارے پاپا جان جلدی ٹھیک ہو جائیں۔“ عروہ نے نم لہجہ میں آہستگی سے کہا۔

اپنی آنکھوں کی نمی چھپاتے ہوئے اس نے دونوں بچوں کو خود میں چھپا لیا۔

☆☆☆

وہ عشاء کی نماز ادا کر کے، وظیفہ پڑھ کے کمرے میں آئی تھیں۔ ریاض احمد سو رہے تھے۔ زیر و پا در کالبل، کمرے کا اندھیرا کم کرنے میں کافی دھیرہ لگا رہا تھا۔ وہ بیڈ کی بائنتی پہ ان کے پیروں میں بیٹھ گئیں۔ انہوں نے ٹپکپکاتے ہاتھ ان کے پاؤں کی طرف بڑھائے۔ مگر پھر پیچھے ہٹ چلے، پھر سے ہمت جمع کر کے پیروں پر انگلیاں پھیریں اور غیر محسوس طریقے سے دونوں پیر اٹھا کے گود میں دھر لیے۔ ریاض احمد نے اس لمس کو نیند میں محسوس کر کے نہیں، بائیں چہرہ ہلایا، کسی کے قرب کے احساس کو پا کے آنکھیں کھول دیں۔

راجہ احمد کی توجہ ان کے چہرے پر ہی مرکوز رہی۔ ریاض احمد نے ان کا ارتکاز نہ توڑا۔ چند لمحوں بعد انہیں سسکی سنائی دی۔ انہوں نے تھوڑا سا اوپر کو اٹھنے کے بیوی کا چہرہ دیکھا۔ وہ رو رہی تھیں۔ وہ آہستگی سے لباس لٹھچ کے پھر سے لیٹ گئے۔ ان کے آنسوؤں کے قطرے پیروں پر گر گئے۔

ایک، دو، تین، چار۔۔۔

وہ ایک دم اٹھ بیٹھے۔ ٹانگیں کھینچ کے سینے لگالیں۔ راجہ احمد بھی سمٹ گئیں۔

”راجہ۔۔۔۔۔“ انہوں نے ان کے کندھے ہاتھ دھرا۔ راجہ احمد کو لگا ان کا دل بند ہو جا گا۔ بہت دنوں بعد ان کی زبان سے اپنے نام کی پک سنی تھی۔

”ریاض۔۔۔۔۔ ریاض صاحب! پلیز مجھے معاف کر دیں۔ پلیز معاف کر دیں، میرا گناہ بخش دیں۔ ورنہ میں مر جاؤں گی۔ میری سانسیں رک جائیں گی۔ بس کر دیں۔ اس خاموشی کو توڑ دیں یا اپنے ہاتھوں سے میرا گلہ گھونٹ دیں۔ لیکن مجھ سے دو مت جائیں ریاض صاحب۔“ وہ ان کے کھڑے گھٹنوں پر سر رکھے روئے جا رہی تھیں۔

ان سے مزید برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ وہ حالات سے لڑتے اور مقابلہ کرتے کرتے تھک گئی تھیں۔ سب سے زیادہ بے سکونی مجازی خدا کی خاموشی ناراضی کی تھی۔ وہ جلتے پیر کی بلی کی طرح سارے گھر میں چکرانی پھرتیں۔

وہ آفس سے آ کے اسٹڈی روم میں بند ہو جاتے۔ چائے وہیں منگوا لی جاتی۔ رات کے کھانے پہ عمیر اور نوال کی خاطر ٹیبل تک آتے، نوالے گن کر منہ میں ڈالتے، چند منٹوں میں نشو سے انگلیاں صاف کرتے اٹھ جاتے۔ عمیر اور نوال انہیں روکتے رہ جاتے، ان کی ”نوٹھنٹس، نوٹھنٹس کی تکرار ڈانٹنگ روم سے باہر نکلنے تک نہ رکتی۔ راجہ احمد کا

بھی وہ آخری نوالہ ہوتا۔ انہوں نے ان کے ہاتھ کاٹا یا پر ہیزی کھانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ عمیر ان کے آگے ڈوٹا رکھتا مگر وہ اس سالن کی طرف دیکھتے بھی نہیں۔

”پلیز راجہ، ایسا مت کرو۔“ انہوں نے راجہ بیگم کو سیدھا کیا۔ ”میں تمہارا مجازی خدا ہوں، خدا نہیں، مجھ سے بھی بہت سی غلطیاں ہوئی ہیں جن کا مجھے احساس ہو چکا ہے لیکن میرا دل، میرا دل مجھے اندر سے ختم ہو گیا ہے۔ مردہ ہو گیا ہے، اس میں خوشی

چڑھاؤ سے آگاہ تھی۔ خاموشی سے باہر کی طرف بڑھ گئی۔

دعا نے رخ پھیر کے منہ پر تکیہ رکھ لیا اور زہرو زار رونے لگی۔ کمرے سے باہر جاتی انم اس کے رونے پر پلٹی۔ اسے گہرا دکھ ہوا، لیکن وہ اسے چپ کروانے کے لیے اپنا کاندھانہیں دے سکتی تھی۔

دل آرا کا حکم تھا کہ اگر وہ برا بھلا کہے تو اسے روکا نہ جائے کہنے دیا جائے، اس کے چلنے چلنے کا برا نہ ماننا، اسے شک لگا ہے۔ وہ برا مانے کی غصہ کر کے دل کی بھر اس نکالے گی، تم خاموش رہنا، وہ آہستہ آہستہ خود ہی مان جائے گی کیونکہ ان کا مقصد تو اس تک پہنچ ہی چکا تھا۔

”پلیز اللہ میاں جی، یہ سب میرے ساتھ کیوں ہو رہا ہے۔“ وہ اٹھ کے بیٹھ گئی، اس کی حالت قابل دیدہ تھی۔

”میں کہاں جاؤں، میرا کوئی ٹھکانا نہیں، جی“ اتنی بڑی زمین ہے، اتنی مخلوق ہے تیری، لیکن تیرا اس بندی کے پاس، ایک بھی تخلص رشتہ نہیں جو بہن یا بیٹی سمجھ کے پناہ دے سکے۔ میں کہاں جاؤں، جہاں یہ خود غرض رشتے نہ ہوں۔ جہاں مطلبی لوگ نہ ہوں، کوئی تو ہوگا، میرا بھی، وہ مجھے کہاں ملے گا؟ تو میری کب سے گا، کب سے گا، پروردگار۔“ وہ تڑپ تڑپ کے رو رہی تھی۔ اس کی زبان پہلی بار اپنے رب سے شکوہ کناں تھی۔

*** وہ گہری نیند سے ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا تھا۔ اس کا جسم اور چہرہ پسینے سے شرابور تھا۔ اس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ اس نے بہت برا خواب دیکھا تھا۔

وہ ننگے پیر اٹھا اور نیپل پر دھرے جگ سے پانی کا گلاس بھر کے ایک ہی گھونٹ میں چڑھا گیا۔ گلاس واپس نیپل پر پینے کے بھی اس کے اندر کی ٹھنڈی ذرا کم نہ ہوئی۔ اسے لگا کہ کمرے میں جس بڑھ گیا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ درمیانی دروازہ کھول کے ٹیرس پر آ گیا تاکہ تازہ ہوا اس کے اندر کی کٹانوں کو نکال دے۔

اور امید کی کوئی رمتی نہیں جاگتی۔ میرا دل کسی سے ملنے کو نہیں چاہتا۔ مجھے کسی سے کوئی گدہ شکوہ نہیں۔ نہ تم سے نہ عمر سے، شاید یہ ذلت میرے مقدر میں لکھ دی گئی تھی۔“

ریاض احمد کے دل کا غبار بھی نکاسی کا راستہ اسے ہی نکل پڑا۔

”پلیز ریاض! میں چاہتی ہوں کہ آپ پھر پہلے کی طرح ہو جائیں۔ مجھے معاف کر کے، اپنا دل صاف کر کے دل محل کے رہیں۔ میں اپنی غلطی پر بہت تادم ہوں، پلیز مجھے معاف کر دیں۔ میرے لیے نہیں تو نوال اور عمیر کی خاطر..... پلیز ریاض۔“

راجہ احمد نے ان کے آگے دو دنوں ہاتھ جوڑ دیے۔ ریاض احمد نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔ ان کے چہرے پر بہت سی پر سوچ لکیریں ابھریں۔ راجہ احمد کے دل میں ایک گونہ سکون سراپا ہو گیا۔

☆☆☆

دل آرا نے نیپل ڈاکٹر کو بلوایا تھا۔ دعا کی نبض تقریباً نارمل چل رہی تھی لیکن اسے کافی سخت شک لگا تھا۔ جس سے وہ چمکا کے گر گئی۔ اس کے حواس لال ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر نے اسے انجکشنز لگائے تھے۔ اس کی حالت خطرے سے باہر ہونے کی تصدیق کر دی تھی پر اس کے حواس ابھی بھی مفلج تھے۔ انم کے لب اس پر کچھ نہ کچھ پڑھ کے پھونکنے ہاتے، اس کا خوف اور پریشانی سے برا حال تھا۔

تین گھنٹے بعد اس کی آنکھوں کے پونے رکٹ میں آئے انم نے اس کا گال تھپکا۔ اس نے انکھیں کھول کر دیکھا۔

”ٹھیکس گاڈ، تمہیں ہوش تو آیا۔“ انم نے انہماک پر کر کے خدا کا شکر ادا کیا۔ تو دعا کو بے ہوشی سے لال کا منظر یاد آ گیا۔

”انم پلیز لیوی الون۔“ دعا کے ماتھے پر ہل پڑ گئے تھے۔

انم کا کھٹا منہ بند ہو گیا۔ وہ اس کے ذہنی اتار

کر سیکے۔ اس نے خواب میں دعا کو دیکھا تھا۔ وہ رو رہی تھی۔ کسی ویران سنان جگہ پر پڑی، بے سائبان، کسی کو مدد کے لیے یکاری تھی، وہ بہت ڈری سہی لگ رہی تھی۔ اس کا دل جسے بھی میں جکڑ گیا تھا۔

”دعا..... تم کہاں ہو دعا، میں نہیں جانتا۔ میں نے تمہیں بہت ڈھونڈا ہے، تم کہاں جا چھپی ہو۔ تم مجھے کال کر سکتی ہو، مجھے بلا سکتی ہو..... یہ کیسی ضد ہے دعا، کیوں تم نے میرے اور اپنے بیچ اتنا کی دیوار اٹھالی ہے۔ کیوں؟ میں پتھر رہا ہوں، ٹوٹ رہا ہوں دعا، پلیز صرف ایک بار..... ایک بار مجھے بکارو.....“

اس کی آنکھوں میں نمی جمع ہو گئی تھی۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ اس کے جذبات پلھل رہے تھے۔

☆☆☆

مریم نے خود کو بچوں کے ساتھ بہت زیادہ مصروف کر لیا تھا۔ وہ ان کی ہر ضرورت کا خود خیال رکھتی، چکن میں کھڑی ہو کے ان کے لیے فرماؤں کھانا بناتی۔ انہیں خود بڑھانے لگی تھی۔ شام کو لان میں ان کے ساتھ کرکٹ کھیلتا اور وہ بات کو گھنٹہ بھر کارٹون دیکھتا اس نے اپنا معمول بنالیا تھا۔ بچے بھی پہلے سے کافی سنبھل گئے تھے۔ وہ ماں کی لمبی آواز بھانسنے لگے۔ اگر وہ باپ کو بھولے نہیں تھے تو ماں کو تنگ کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

عروہ سمجھ دار تھی۔ اس کا جب بھی اداس ہوتا تو وہ لان میں جا بیٹھتی۔ ابھی بھی گھنٹوں سے گھنٹوں میں سر دیے سوچوں میں غرق تھی۔ تبریز ملک کی مرہٹنڈ گیٹ سے داخل ہوئی۔ گاڑی سے اترتے ہوئے تبریز ملک کی نظروں کی زد میں عروہ آ گئی۔ وہ گاڑی کا دروازہ بند کر کے، اس کی طرف بڑھے، جو اپنے ارد گرد سے بے گانہ تھی۔

”چندا! یہاں کیوں بیٹھی ہو؟“ وہ اس کے برابر آ بیٹھے۔ عروہ نے سر اٹھایا، اس کی آنکھیں نم تھیں۔

”عروہ بیٹی! ام مو رہی ہو۔“ انہوں نے اس

کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ عروہ کے رونے میں تیزی آ گئی، اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”بٹ وائے بنا جانی، کسی نے مارا ہے یا کچھ چاہیے۔“ انہوں نے نرمی سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے دریافت کیا۔

”کسی نے کچھ نہیں کہا، مجھے بابا جان یاد آ رہے ہیں اور اپنا گھر بھی۔“ اس نے پھر سے سر گھٹنوں میں دے لیا۔

”بیٹی! یہ بھی تو آپ کا اپنا گھر ہے، یہاں کوئی آپ کو ڈانٹتا ہے یا کوئی خواہش پوری نہیں ہوتی۔“ انہوں نے اس کا سر اوپر اٹھایا۔

”کوئی کچھ نہیں کہتا لیکن مجھے بابا جان کی فکر ہے۔ مجھے پتا ہے میرے بابا جان کدھر ہیں۔ ماہ جان، ہم سب سے چھپانی ہیں مگر ہم چھوٹے بچے نہیں ہیں۔“

وہ اپنے دل کی بھڑاس اپنے شفیق سے ماموں جان کے سامنے باہر نکالنے لگی۔ وہ اسے مسکا لگ رہے تھے۔

”کہاں ہیں تمہارے بابا جان؟“ تبریز ملک کا دماغ اس جملے میں انک گیا تھا۔

”میرے بابا کو پولیس اریسٹ کر کے جیل لے گئی ہے۔“ عروہ اونچی آواز میں رونے لگی۔ انہیں اپنے کان اور ہنسی کے منہ سے نکلے الفاظ جھوٹ لگے۔

”تمہیں یہ کس نے بتایا؟“ ان کا دل نہیں مانا تھا کہ مریم یہ سب اس کے ذہن میں ڈال سکتی ہے۔

”میں نے اپنے گھر کے سرڈنس کو باتیں کرتے سنا تھا۔ ماموں جی! کیا پولیس میرے بابا کو مارتی ہوگی، وہ روتے ہوں گے۔ انہیں تو اپنے بیڑوم کے علاوہ کہیں اور نیند بھی نہیں آتی۔“

عروہ پھر سے زار و زار رونے لگی۔ تبریز ملک کی نگاہیں اس معصوم چہرے پر گڑ کے رہ گئیں۔ ان کے سامنے لاتعداد سوالیہ نشان کھڑے تھے۔

سوئی۔“ نوال رو ہا ہی ہوگئی۔ اس نے اب تک ان کے ساتھ یہ موضوع نہیں چھیڑا تھا۔ وہ دل ہی دل میں کڑھتی رہتی تھی۔

”تم بھی اپنی ماں کو مجرم سمجھتی ہو۔ جو ہوا اس سب کی میں اکیلی تصور وار ہوں۔“ بیٹی کی گفتیش انہیں تکلیف سے دوچار کر رہی تھی۔ وہ ان سے کس قدر بدگمان تھی۔

”آپ نے اس کا خیال کیوں نہیں دکھا، ماں کہلوانے کے حوالے سے آپ اس کا بہت آگرا تھیں۔ آپ اس کے لیے اسٹینڈ لے سکتی تھیں۔ بیٹی نہ سہی یتیم و حکمین لڑکی سہی، ثواب حاصل کرنے کے چکر میں، آپ سچائی کا ساتھ دے سکتی تھیں۔“

وہ جی سے بولتی جا رہی تھی۔ اس کے اندر بھانجہ بھل رہے تھے۔ باپ کی انتہائی بنجیدہ خاموشی، عمیر کا بجھا بجھا چہرہ، گھر کی دیرانی سب اسے بہت چھتا تھا۔ یہ تمام عناصر مل کے اس کی میڈیکل کی مشکل پر بھائی کو متاثر کرتے تھے۔

”سچ بتائیں ماما! کیا آپ نے عمر کو بچانے کے لیے..... اس سے آگے اس سے بولا نہ گیا۔

دعا اس کی واحد کزن، سیمپلی اور بہن تھی۔ جب کبھی وہ ناراض ہوتی وہ نوال کی غلطی کے باوجود ہمیشہ اسے منالیتی۔ وہ ہر مسئلے میں اسے مفید مشورہ دیتی۔

”پلیز نوال! میرے لیے اپنے دل میں اتنا کینہ مت پالو۔ میں ماں ہوں، اس گھر کی بڑی ہوں۔ مجھے بہت سے رشتے دیکھنے پڑتے ہیں۔ ناپائے ہوتے ہیں۔ تم سب لوگ مجھے غلط اور تصور وار کیوں سمجھتے ہو۔ میں نے اسے یہاں پلاؤنگ کے تحت رکھا تھا؟ میں نے اس پر ظلم ڈھانے؟ عمر کو میں نے فورس کیا؟ میں بری ہوں۔ سب مجھے مجرم ٹھہرا کے میرا سکون برباد کر دو۔“

وہ زور، زور سے اونچا بولتی ہوئی کہتی تھی۔ نوال ذہنی تکلیف سے دوچار ماں کو جانتا تھا۔ وہ جی۔

☆☆☆

نوال صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے بائیں اچھ بالوں میں الجھائے بیٹھی تھی۔ رابعہ احمد اس کے لیے فریش جوس کا گلاس لیے آئیں۔

”نوال! یہاں ایسے کیوں بیٹھی ہو؟“ وہ بیٹی کا چہرہ دیکھتے ہی بھانپ گئیں۔ جوس کا گلاس ٹیبل پر دھر دیا۔

”کیا مطلب، آئی تھنک بیٹھے کا یہ ہی درست طریقہ ہے۔“ نوال جھنجھائی ہوئی تھی۔

”ٹم ٹھیک نہیں لگ رہیں۔ کوئی ٹینشن ہے کیا؟“ وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گئیں۔ ان سے بیٹی کی اتاری صورت برداشت نہیں ہو رہی تھی۔

”کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے ماما جان، آپ کو میری ٹینشن کی پروا کیوں ہونے لگی۔“ اس کا موڈ سخت خراب تھا۔

”میں تمہاری ماں ہوں، میں پروا نہیں کروں گی تو کون کرے گا میری گڑیا۔“ ان کا لہجہ محبت سے پُور تھا۔

”صرف بائیں ہی خیال کرتی ہیں، سگی مائیں، منہ بولی مائیں نہیں۔ کیا منہ بولا رشتہ جھوٹ ہوتا ہے۔ جس طرح آپ نے دعا کو دھوکے میں الجھائے رکھا۔“

وہ موضوع کو گھما کے کسی اور طرف لے گئی۔ ”مم..... ماں..... تو ماں ہوتی ہے۔ اس کے دل میں اولاد کے لیے صرف شفقت اور ممتا بھری ہوتی ہے۔ سگے اور سوتیلے رشتے تو کم ظرف لوگ بناتے ہیں۔“

وہ اس بار جواب گول نہیں کر سکی تھیں۔ انہیں اب صرف سچ بولنا تھا۔ ٹوٹے رشتوں کو جوڑنے کی سعی۔

”آپ کم ظرف تو نہ تھیں ماما۔ سب کے لیے دل بڑانے کر سکیں۔ اسے بھی تو بیٹی سمجھتی تھی۔ اس کے لیے آپ متا کھنا

ہم اپنے بیٹے کے لیے سنکڑوں لڑکیاں کھڑے کھڑے خرید سکتے ہیں۔ بس تم پلان کہہ رہی ہونا.....“ انہوں نے زور دے کے ”پلان“ کا لفظ ادا کیا۔

”یہ پلان میں نے تب سے سوچ رکھا تھا جب مجھے پتا چلا تھا کہ انعم ماں نہیں بن سکتی۔ لیکن مجھے اپنے خاندانی شان و شوکت، وقار کے مطابق لڑکی کی تلاش تھی۔ جو خاندانی اور نیک ماں، باپ کی اولاد ہو۔ جس کے خاندان کی سات پشتوں کے دامن پر بھی کوئی داغ نہ ہو۔ مجھے ایسا خاندان مل نہیں رہا تھا۔ لیکن پھر تمہاری صورت میں، میرے پروردگار نے سب بنادیا۔

تمہارا یہاں آنا معجزہ ہے دعا، ورنہ تمہارے دو ہاموں جو تم سے اتنی محبت کرتے تھے، جنہیں تم باپ کہتی تھیں، تمہارے کزن جو تمہارے دوست تھے۔ ممائی جان تمہاری ماں کے برابر تھیں، اتنے برسوں سے تمہارا کردار ان کے سامنے بے داغ تھا، پھر سب، یہ کیا پلٹ کیسے گئی، کوئی ایک بھی تمہارے لیے اسٹینڈ کیوں نہ لے سکا۔ ان کے دل میں تمہارے لیے ڈھیروں پیار و شفقت تھا۔ پھر اتنے بڑے وسیع گھر کے کسی کو نے کھدے میں تمہارے لیے جگہ کیوں نہ نکل سکی۔ صرف اس لیے..... اس لیے کہ تمہیں یہاں تک لانا مقصود تھا۔ یہی گھر تمہارا مقصد تھا۔ اسی لیے اتنے مجسم مسائل بنتے گئے۔ معاملات اس قدر اچھے دودھ کی ٹھوکریں کھاتی تم یہاں تک پہنچیں۔ تاکہ اس گھر کی دیرانی کو تمہارا وجود علم کر سکے۔

ہمارے دل جو اس خوشی کے بنا مڑ جائے ہیں، مردہ ہو گئے ہیں، انہیں تم اپنے دم سے پھر سے آہا کر دو، یہ سب یوں ہی ہونا اول دن سے طے تھا۔ ہم سب کو یوں ہی انجام تک پہنچنا تھا۔ تم ہماری سالا جانداد، حتیٰ کہ سائیں تک گروی رکھ لو مگر پلیز اللہ مت کرو، ہم سے ہماری خوشی مت چھینو۔ تمہیں

دعا لایں کے جھولے میں سر ٹیکے آنکھیں موندے بیٹھی تھی۔ انعم اور دل آرا پورج سے لان میں آئیں تو، دو تہا بیٹھی دعا پر نظر پڑتے ہی رک گئیں۔ ”ماما جی! اب پلیز کچھ کریں۔ مجھے سامنے پاتے ہی وہ گم سم ہو جاتی ہے۔ ایسی یاسیت بھری نظروں سے میری طرف دیکھتی ہے کہ میرا دل چاہتا ہے کہ زمین پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں۔“ اس کا لٹکا ہوا چہرہ اور روئی صورت انعم دل کو کچھ کے لگائی۔ وہ دل ہی دل میں خود کو اس کی مجرم ٹھہراتی۔

”بے وقوف لڑکی! حالات سے لڑنا اور ڈٹ جانا سیکھو۔“ دل آرا نے تنبیہی انداز میں اسے گھورا۔ دعا ان کی آمد سے بے خبر تھی۔ وہ دونوں سے چھپتی پھرتی، الگ تھلگ گھر کے کسی خالی کونے میں دبکی رہتی۔

”دعا! دل آرا اس سے ذرا فاصلے پر جا بیٹھیں۔ انہیں اپنی عقل کا استعمال کرنا تھا۔ انعم ابھی چینی طور پر چپ تھی۔ بہت سے مراحل پر ڈگمگا جاتی تھی۔

”جی.....“ دعا نے نم آنکھیں کھول کے انہیں دیکھا اور جھکائیں۔ انعم نے کھڑے رہنے پر اکتفا کیا۔

”تم ہم سے ناراض ہو۔“ انہوں نے بڑے دلار سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

دعا کا سر نیچے میں ہلا۔ حلق میں پانی کا گولا اٹکا تھا۔ ”شاید ہم نے تمہارے طرف سے بڑھ کر مانگ لیا ہے۔“ انہوں نے دعا کے اندر کا پریشر چیک کیا۔

”آپ نے خود سے، اتنا کچھ میرے بارے میں پلان کر لیا۔“ دعا ردی۔ الفاظ حلق میں اٹک گئے۔

”تمہارے بارے میں نہیں، شاید اپنے لیے، اسے تم ہماری خود غرضی سمجھ لو، لیکن یہ ہماری خود غرضی نہیں، مجبوری ہے، ہمارے پاس اتنا پیسہ ہے دعا کہ

موقع دے، میں اپنی اصلاح ضرور کروں گا، میں ان سب لوگوں سے معافی مانگ لوں گا، جن کو میں نے نقصان پہنچایا۔

تو میرے بھگے سر کا مان رکھ لے۔ مجھے خالی ہاتھ، خالی دامن نہ لوٹانا، ان میں اپنے رحم کی خیرات ڈال دے، مجھے معاف کر دے، ایک موقع دے دے۔“ وہ چہرہ کھڑے گھٹنوں میں دے کے گزر گئے۔

ان سے بظاہر دور رہے جس و حرکت لینا، جو بظاہر سرور ہاتھ۔ اس مجبور باپ کی اپنی اولاد سے ملن کی التجا میں سستا ہوا دل میں خود بخود رور ہاتھ۔

دعا لان میں رکھی کرسیوں میں، ایک کرسی پر چپ چاپ بیٹھی تھی۔ ورنہ اس وقت وہ کچن میں شام کی چائے کے ساتھ فرمائشی لوازمات تیار کرنے میں مصروف ہوئی، ساتھ ہی ڈنر کی تیاری بھی کی جاتی، لیکن اس نے کچن میں جانا ترک کر دیا تھا۔ اب بھی وہ دل آرا کے کہنے پر باہر آئی تھی، دل آرا اسکا پ پر جنید آفندی کے ساتھ ہاتھ باتیں کرتیں، اٹھ کے اس سے کافی فاصلے پر بیٹھ کر جا بیٹھیں۔ انم کچن میں چکن سینڈوچ کے ساتھ نبرد آزما تھی۔

احسن کی گاڑی روٹ پر دوڑتی پورچ میں آ رکی۔ گاڑی سے اتر کر وہ کافی دن بعد لان میں بیٹھی گم صمی دعا کی طرف آ گیا۔ اسے دعا کی غیر حاضری پہ معلوم ہوا تھا کہ وہ بیمار ہے۔ چونکہ وہ اس کی موجودگی میں کمرے سے باہر قدم نہیں نکالتی تھی۔ اس لیے اسے دعا کی خیر، خیریت پوچھنے کا موقع نہیں مل پایا تھا۔

”ہیلو! اداس لڑکی۔“ اس کے ہونٹوں پر نرم سے مسکراہٹ تھی۔ دعا بری طرح گڑبڑا کے کھڑی ہوئی۔ اس آواز اور شخص نے اس کے اوسان خطا کر دیے۔

”آ..... آپ۔“ اس نے سر سینے تک جھکا لیا۔ ”تمہاری طبیعت اب کیسی ہے۔ چہرے سے تو تم مجھے بہت کمزور اور مرجھائی ہوئی لگ رہی ہو۔“

ٹھوکر س لگی ہیں۔ تم اس تکلیف سے دوچار ہو تو خدا کے لیے میری بیٹی اعم کو اس تکلیف میں مبتلا ہونے سے بچاؤ۔ وہ دوسروں سے اس اذیت کو جیل رہی ہے۔ گھر کیسے ٹوٹے ہیں۔ یہ تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ میری بیٹی کا گھر ٹوٹنے سے بچاؤ۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔“ دل آرا نے سچ سچ اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

دعا کا کارہ گئی۔ اس کے آنسوؤں میں روانی آ گئی۔ اس نے ان کے دونوں ہاتھ تھام کے ان پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے پاس انکار کے لیے ایک لفظ نہیں تھا۔

☆☆☆

جیل میں سب قیدی سو رہے تھے۔ الیاس احمد ایک کونے میں صاف کپڑا بچھائے رات کے آخری پہر نوافل ادا کر کے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے ہوئے تھے۔

انہیں بیوی، بچے بے تحاشا یاد آ رہے تھے۔ کل عروہ کی سالگرہ تھی۔ وہ پورے دس برس کی ہو جاتی اور ہر سال الیاس احمد اس کی سالگرہ بڑی دھوم دھام سے مناتے تھے۔

اس کال کوٹھڑی میں اپنی ان خوشیوں کا یاد کر رہے تھے۔ ان کے ہاتھ دعا کے لیے اٹھے تو پچھلی بندھ گئی۔ ”اے میرے پروردگار، تو نے مجھے بہت نوازا۔ تو میری ناشکری کے باوجود دیتا ہی گیا۔ میں گناہ گار، تیری اس بڑائی اور رحیمی پر شکر ادا کرنے کے بجائے اسے اپنی عقل مندی گردانے لگا۔ اس دنیا کے مال و اسباب میں اس قدر غرق ہو گیا کہ اچھے اور برے میں فرق ہی نہ کر پایا۔

میں اس مال کے لالچ میں اس قدر اندھا ہو گیا کہ ایک یتیم و بے سہارا لڑکی کی عزت و آبرو کو دنیا کے سامنے تار تار کر دیا۔ اس کو در بدر کیا۔ سب کی نظروں میں گرادیا۔ میں جانتا ہوں کہ میری خطا میں بلکہ گناہ ناقابل معافی ہیں۔ تو بہت غفور الرحیم ہے۔ مجھے ایک بار خود کو سدھارنے اور نیک اعمال کرنے کا

اس نے کافی بار یک بنی سے اس کا جائزہ لے ڈالا۔
 انعم، احسن کی گاڑی کا ہارن سن کر حسب معمول
 دوڑی آئی تھی۔ اسے لان میں دعا کے پاس کھڑا دیکھ
 کے وہ بھی وہیں چلی آئی۔

”نہیں..... میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ اس کی
 موجودگی سے اس کا دل کھبرار ہاتھا۔ اس کا جی چاہا کہ
 وہ تیزی سے اندر بھاگ جائے۔ اس کے کسی سوال کا
 جواب نہ دے، لیکن یہ حرکت سراسر بدتمیزی کے
 زمرے میں آئی کیونکہ احسن اپنی ماں اور بیوی کی
 منصوبہ بندی سے بے خبر تھا۔

”ٹھیک کہاں ہو؟ نہ تو ٹیبل تک آتی ہو نہ ہی
 تمہارے ہاتھ کا مزے دار کھانا کھانے کو ملتا ہے۔“
 تب ہی انعم اس کے برابر آ کھڑی ہوئی۔ احسن نے
 جملے کا آخری حصہ بیوی کو دیکھ کے مسکرا کر ادا کیا۔

دعا نے ذرا سا سر اٹھا کے ایک نگاہ دوست پر
 ڈالنے پر وہ بس..... یوں ہی۔“ دونوں ہاتھ کی
 انگلیوں ایک دوسرے میں پھنسائے وہ خاصی الجھی
 ہوئی تھی۔

”دیکھ لو دعا، احسن بھی تمہارے ہاتھ کے
 ڈالنے کے تین ہیں، انہیں تو شیف تک کا کھانا پسند
 نہیں آ رہا، اور تم ہو کہ پچھت پھر رہی ہو۔“ انعم نے
 مسکراتے اسے ذومعنی لہجے میں چھیڑا۔

”اچھا یار! میں فرلش ہو کے آتا ہوں، تم
 چائے پیس لان میں لگاؤ۔ ماما بھی فری ہو جا میں گی
 اور دعا! تم کہیں مت جانا، ہم سب اکٹھے چائے پیس
 گئے۔“ اس نے اٹھ اٹھا کے روہانسی کھڑی دعا کو تنبیہ
 کی۔

”خوشیاں خریدی نہیں، تلاش کی جاتیں
 ہیں، چھوٹی چھوٹی باتوں پر مسکراتا سیکھ لو، دل اعتدال
 پر دھڑکنے لگا سیکھ جائے گا۔“

احسن نے اسے مشورہ سے نوازتے سر پر ہلکی سی
 چپٹ لگائی تھی۔ اس کے حلق سے سسکی نکلی، جو گلے
 میں ہی گھٹ گئی۔ یہ چپٹ سیدھی اس کے دل پر جا لگی
 تھی۔ کسی کا وجود تصور میں آ نہیں تھا۔

”تم اور اس ساتھ کھڑے اچھے لگ رہے
 تھے، بلکہ بہت اچھے۔“ انعم نے جاتے شوہر کی پشت کو
 تکتے سچائی سے اعتراف کیا۔ وہ ان دونوں کو کسی اور
 ہی نگاہ سے جانچ رہی تھی۔

”واٹ ریش انو، میں تمہارا منہ توڑ دوں گی۔“
 دعا روہانسی ہو کے چیخ پڑی۔ اتنے روز کی جب کا
 روزہ ٹوٹ گیا تھا۔ اتنے برس کی دوستی میں وہ پہلی بار
 انعم پر چیختی تھی۔

”اوئے، تمہیں تو غصہ بھی آتا ہے۔“ وہ زور
 سے ہنسی۔ ”ڈرنا پڑے گا بھی۔“ اب وہ اس کا مذاق
 اڑا رہی تھی۔

”پلیز ڈونٹ اسمائل انو۔“ وہ روہانسی ہو کے
 دوبارہ چیختی۔

”مجھے ہنسی تم پر نہیں، اپنی بے بسی پر آ رہی
 ہے۔“ انعم نے بمشکل اپنی مسکراہٹ روکی۔ اندر کی
 کشافوں کو باہر نکالنے کا یہ منفرد طریقہ تھا۔

”تم کیوں بے بسی کی حد تک آ گئی ہو، کیوں
 دوسروں کے بہکاوے میں مگ گئی ہو۔ مجھے بخش دو اور
 اپنی لائف میں احسن کے ساتھ خوش رہو۔“ دعا نے
 اسے گلہ گیر لہجے میں مشورہ دیا۔

”اگر میں تمہاری پوزیشن میں ہوتی تو شاید،
 اس طرح کے کئی نادر مشورے میں بھی دیتی، تم لوگوں
 کو میری تکلیف کا اندازہ جو نہیں، اس لیے سب
 مزے سے اپنی ہانک دیتے ہو۔ ماما اپنے بیٹے کی

دوسری شادی کا فیصلہ کر چکی ہیں، تم نہ سہی۔ کوئی اور
 سہی، فرق تو میری ذات اور زندگی کو پڑے گا، آئی
 سو بڑ دعا، مجھے تم سے کوئی لاچ نہیں تھا، ماما کا دھیان
 تم پر گیا۔ اسے میری خود غرضی کہہ لو، مجھے لگا کہ واقعی تم

بیٹس چو آس ہو۔ میری دوست، ہم دم، راز دار،
 غمگسار، ہم ایک دوسرے کے دکھ اور تکلیفوں کو اچھے
 سے بینڈل کر سکتی ہیں۔ شاید ہم اسے مامین اس

جڑنے والے نئے رشتے کو بہت طریقے سے
 نبھالیں۔ میں نے زندگی میں پہلی بار کسی کے سامنے
 جھولی پھیلائی ہے۔ بڑے مان اور آس سے، مجھے

خیال دل سے نکال دو۔ اسے اگر واقعی تم سے محبت ہوئی تو وہ تمہیں کوئی محفوظ پناہ گاہ دیتا۔ یوں بچ رہا میں بے آسرا چھوڑ کے نہ بھاگتا، اسے تم سے بالکل ویسی ہی محبت تھی، جیسی اس کی ماں کو۔ دکھاؤ، ڈھونگ، وہ تمہارے لیے بہ آسانی بہت کچھ کر سکتا تھا۔ لیکن نہیں، وہ تمہیں چھوڑ کے فرار ہو گیا۔“ انم بہت تلخ بول رہی تھی۔ دعا کے چہرے کا رنگ زرد پڑتا جا رہا تھا۔

”زندگی رسک کا دوسرا نام ہے، میں اپنے محبوب شوہر کے لیے رسک لے رہی ہوں، تم اپنی محبت کے لیے رسک لو، تاکہ تمہارے دل میں کوئی پھانس نہ رہے۔ اسے کال کرو۔ وہ تمہیں کھا نہیں جائے گا۔ البتہ اس کی اصلیت ضرور عیاں ہو جائے گی۔ اگر اس نے تمہیں اپنا لیا تو میں تمہیں اس گھر سے، بہن بن کر رخصت کروں گی، اگر نہیں تو پھر تمہیں احسن سے ہی شادی کرنا ہوگی۔“

انم نے اس کے سامنے کسوٹی رکھ دی تھی۔ دعا نفی میں سر ہلاتی روتی ہوئی، اندر بھاگ گئی۔ اس کی عقل بالکل ماؤف ہو چکی تھی۔

☆☆☆

تبریز ملک شام کو گھر لوٹے تو عروہ اور زین پزل جوڑ رہے تھے۔

”اوھر آؤ عروہ میرے پاس۔“ وہ دوسرے صوفے پر بیٹھ گئے۔ عروہ سب چھوڑ چھاڑ کے فوراً ماموں کے پاس آئی۔

”آج تمہارا برتھ ڈے ہے۔“ انہوں نے اس کی پوٹی کھینچی۔

”جی ماموں جان، لیکن میں نے ڈیساڈ کیا ہے کہ جب میرے پاپا جان لوٹیں گے، تب ہم سب مل کے سیلبرٹ کریں گے۔“ اس نے اپنی سوچ سے انہیں بھی آگاہ کیا۔

”اگر ماموں جان کہیں گے، تب بھی یکے نہیں کاٹو گی؟ باقی ساری پارٹیز تو تم لوگوں نے اپنے گھر پر کی تھیں اب یہاں کوئی نہیں رہتا۔ تم لوگوں کے

خالی دامن مت لوٹانا، پلیز دعا۔۔۔۔۔ تم میری آخری امید ہو۔“

انم زندگی میں دوسری بار اس کے سامنے رو رہی تھی۔ جو ہمیشہ اسے کا ندھا دیتی آئی تھی، آج اسے دعا کے کمزور کا ندھے کی ضرورت تھی۔

”اور میری محبت۔“ بے اختیار دعا کی زبان سرگوشی میں پھسل گئی۔

انم کے آنسو ٹھہم گئے۔ وہ گنگ رہ گئی۔ یہ اس کی ذہنی روکس طرف بہہ گئی تھی۔

انم نے مڑ کر دل آرا کو دیکھا۔ جو شوہر کی کسی چھیڑ خانی پر ترقیبہ لگا رہی تھیں۔ ہر غم و فکر سے بے گانہ روشن چہرہ۔ دعا کی نگاہیں اس کے چہرے پر گڑی تھیں۔ اس کے دل میں یہ پھانس ابھی بھی اٹکی ہوئی تھی۔

”اگر میں اپنے محبوب شوہر کو سیو کرنے کے لیے اتنا بڑا قدم اٹھانے کو تیار ہوں تو تم بھی ہمت پکڑو، عمیر کو کال کرو، اسے کہو کہ وہ اپنا نام تمہیں دے کے پوری عزت کے ساتھ تمہیں یہاں سے لے جائے، میں اور میری ماں اتنی بھی ظالم نہیں، تم ہماری مہمان، ہماری پناہ گاہ میں، ہم پر اعتماد کر کے ٹھہری ہو۔ ہم اپنی زبان سے پھرنے والے نہیں۔“ انم نے کہہ کر موبائل والا ہاتھ اس کی آنکھوں کے سامنے کھول دیا۔

دعا حق دق رہ گئی۔ اس میں اتنا حوصلہ کہاں، وہ بہت ڈر پوک اور بزدل لڑکی تھی۔ وہ کبھی بھی عمیر کو کال کر کے، محبت اور عزت کی بھیک نہیں مانگ سکتی تھی۔ یہ اس کی خودداری تھی جو اس کی ماں نے اسے سکھائی تھی۔

اس گھر سے اس کے حصے میں جتنی ذلت اور نفرت آئی تھی، وہاں خود سے پلٹ کر جانے کا تصور بھی سوہان روح تھا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ میں یہ نہیں کر سکتی۔“ اس نے زور سے نفی میں سر ہلایا۔

”تو پھر جو میں کہہ رہی ہوں وہ کر لو، عمیر کا

آنے سے رونق ہوئی ہے، میرا دل چاہتا ہے کہ آج ہم سب تھوڑی سی مستی کر لیں۔“ انہوں نے خاصا معصوم منہ بنا کے اسے درغلا نا چاہا۔

”ٹھیک ہے، آپ کسی کو بلائیے گا مت، میں آپ کے لیے کاٹ لوں گی۔“ عروہ ماموں کے اختتام میں نیم رضامند ہوئی۔ زین بھی یکم چھوڑ چھاڑ بخور ان کی گفتگو میں رہا تھا۔

”مریم..... مریم۔“ انہوں نے زور سے آواز دیا۔ مریم نے بے وقارم پر لپس کرتے اس کے ہاتھ پر ہلکا سا دھچکا مارا۔ وہ جلدی سے استری کا پلگ نکالتی اور بڑی تیزی سے روز بعد بھائی صاحب نے اس کا ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

”جی بھائی صاحب۔“ وہ تیز تیز سانس لے رہی تھی۔

”عروہ کے برتھ ڈے کی تم نے تیاری نہیں کی۔“ ان کا موڈ قدرے نارمل تھا۔ اس نے ہونٹوں کی طرح لٹی میں سر ہلایا۔

”گھر میں بنانے کا اب نام نہیں ہے، تم ان کے فیورٹ ریسٹورنٹ سے سب آؤ گے۔“ وہ مریم کے ہونٹ چہرے کا زیادہ نوکس نہیں لے رہے تھے۔ وہ بھائی صاحب کو انکار نہیں کر سکتی تھی۔

”ماموں جان، پاپا مجھ سے ناراض تو نہیں ہوں گے نا کہ میں نے ان کے بغیر ہی.....“ عروہ نے انگلیاں مروڑتے اپنی پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”بالکل نہیں ہوں گے، میں نے آپ کے لیے بہت بڑا گفٹ لیا ہے۔“ تبریز ملک نے اس کا ذہن ہلکا پھلکا کیا۔

”سچ میں ماموں جان! بہت بڑا گفٹ۔“ زین کا بھی اشتیاق بڑھا، وہ سب چھوڑ چھاڑ کے ان کے نزدیک ہوا۔

”صرف عروہ کے لیے نہیں، تمہارے لیے بھی بہت بڑا سر پرائز ہے، تم دونوں خوش ہو جاؤ گے۔“

زین اچک کے ان کی گود میں چڑھ گیا، اسے اب اگلا ایک ٹکھنہ ان کا دماغ چاٹنا تھا، جبکہ عروہ کا ذہن پاپا جان میں انک کے رہ گیا تھا۔

☆☆☆

دعارات کے کھانے پر باہر نہیں آئی تھی۔ انم کا خیال تھا کہ چند دن اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ انم کے دل میں کوئی کھوٹ نہیں تھا، وہ چاہتی کہ اب دعا شادی کر لے، احسن سے نہیں عیسر سے ہی، تاکہ اس کا مستقل ٹھکانا تو ہو۔ دل آ رہی دل کی اتنی بری نہیں تھی، دعا کی خوشی کے لیے راضی ہو جاتیں۔ اس کے چار سواندھیرا تھا۔ وہ کارپٹ پر بیڈ سے کمرٹیکے بیٹھی تھی۔

”اگر عیسر کو بھی واقعی تم سے محبت ہوتی تو وہ تمہیں کوئی محفوظ پناہ گاہ دیتا۔ یوں سچ راہ میں بے آسرا چھوڑ کے نہ بھاگتا۔“ اس کے دماغ میں بار بار اسی جملے کی بازگشت ہو رہی تھی۔ انم کی بات اس کے ذہن میں کھب گئی تھی۔

”شاید وہ سچ کہتی ہے۔ وہ میرے لیے بہت کچھ کر سکتا تھا۔ لیکن وہ کیوں کرتا، اپنی ماں کا فرماں بردار تھا اور پھر میرے مقابل اس کا بھائی تھا۔ وہ کیونکر میری طرف داری کرتا۔“

وہ خود سے سوال کرتی، الجھتی، بوڑھائی تھی۔ وہ تو عیسر کی احسان مند بھی کہ اس نے اسے الیا اس احمد اور عمر کے جنگل سے چھڑانے میں مدد فرماہم کی۔ آج یہ تشکر بھی چکنا چور ہو گیا تھا۔ اس نے دوسرے رخ سے سوچنا شروع کر دیا تھا۔ وہ واقعی اس کے لیے بہت کچھ کر سکتا تھا۔

”بٹ..... مجھے ایک دفعہ کال کر کے، سب کیلیر کر لینا چاہیے، شاید ابھی بھی کوئی گنجائش نکل آئے۔“ اس نے اپنی سوچ کو اس سمت دوڑایا۔

”مگر میں کہوں گی کیا؟“ بہت بڑا سوالیہ نشان۔

”تم مجھ سے محبت کرتے ہو، میں تم سے محبت کرتی ہوں یا ڈائریکٹ یہ کہ مجھ سے شادی کر لو۔“ اس

نے مکالمہ دہرایا۔
 ”اگر میں خود کال کر کے، اپنی زبان سے یہ سب کہوں گی تو میری عزت نفس بہت ہلکی پڑ جائے گی، شاید وہ یہ سمجھے کہ میں واقعی کردار کی بہت.....“
 اس نے زور سے نفی میں سر ہلایا۔
 ”رابعہ مامی کی آنکھوں سے جھلکتی نفرت، عمر کے گھٹیا جملے بازی اور ہوس، مریم مامی کی مجھ پر پے اعتباری، کیا عمیر کے ساتھ رشتہ جوڑنے سے، باقی رشتے مخلص ہو جائیں گے؟ میں ان سب کا اعتماد جیت پاؤں گی؟ شاید عمیر کے حوالے سے اس گھر میں میری عجائز نکل آئے، لیکن دل میں نہیں، میں یہ رسک نہیں لے سکتی۔“ وہ ہر طرح سے سے سوچتی اور انکار کے کھاتے میں ڈالتی جا رہی تھی۔
 ”عمیر کو واقعی مجھ سے محبت تھی تو وہ مجھے سہارا دیتا، بیچ سڑک میں اپنی محبت کو چھوڑ کے کون جاتا ہے۔“

وہ سوچتی جاتی، الجھتی جاتی۔ اس کا ذہن کسی ایک سوچ یہ نہیں بٹھہر رہا تھا۔
 ”میں کس گرداب میں پھنس گئی ہوں، اسے اللہ! میری مدد فرما۔“
 اس نے بالوں میں انگلیاں پھنسا کے اپنے رب کو مدد کے لیے پکار لیا۔

☆ ☆ ☆
 اس نے گاڑی ویران سڑک کے سائیڈ پر روک دی۔ سر اسٹیرنگ یہ گرا دیا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی ہلکی غنودگی اترنے لگی۔ وہ شاید سو جاتا، لیکن اس کے موبائل کی بپ نے اس کا سارا سکون برباد کر دیا۔ اس نے بے شکل پیماری ہوتا سر اوپر اٹھایا۔ ریاض احمد کی کال آ رہی تھی۔ اس نے موبائل آف کر کے، ڈیش بورڈ پر پھینک دیا۔ اسے تو خوابوں نے پریشان کر رکھا تھا۔ جس میں دعا اسے روٹی دھونی، مدد کے لیے پکارتی ملتی تھی۔

وہ روز نئے سرے سے اس کی تلاش شروع کرتا، سڑکیں نا پتیا بے سبب کئی کئی میل پیدل چلتا

☆ ☆ ☆
 مریم نے بڑی خوب صورتی سے میز پر سب سیٹ کر دیا تھا۔ زین اور عروہ نے کپڑے پہنے میز کے گرد کھڑے تھے۔ زین کا جوش قابل دید تھا۔ عروہ بھی ان ساری تیار یوں پر خوش تھی، لیکن اس کے دل میں انکی پھانس اسے کھل کے مسکرانے نہیں دے رہی تھی۔

”چلو بھئی! کیک کاٹو، مجھ سے مزید صبر نہیں ہو رہا۔“ تبریز ملک ضروری کال اٹینڈ کر کے بڑے باشاش موڈ میں لوٹے تھے۔

”یہ لو عروہ، کیک کاٹو۔“ مریم نے چھری اٹھا کے اسے تھمائی۔ عروہ نے ہچکچاتے ہوئے چھری تھامی۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل رہا تھا۔
 ”جسٹ آ منٹ، آئی تھنک مجھے پہلے ان دونوں کو سر پر انزگفت دینا چاہیے۔ اتنی بری شکل کے ساتھ کیک کھانے کا خاک مزہ آئے گا۔“ انہوں نے عروہ کا کیک کی طرف بڑھتا ہاتھ روک دیا۔

”ماموں جان گفت تو کیک کاٹنے کے بعد دیا جاتا ہے۔“ زین نے بڑی سمجھداری کا مظاہرہ کیا۔
 ”اپنی عروہ بیٹی کی خوشیاں بھی تو دیکھنی ہیں۔“ انہوں نے آنکھ دبا کے زین کے کندھے پر زور ڈالا۔
 ”ایک منٹ صبر کرو، میں تمہارا گفت لے کر آتا ہوں۔“ وہ ان سب کو منتظر چھوڑ کے باہر چلے گئے۔

ان تینوں کی نظریں دروازے پر ہی جمی تھیں۔ تبریز ملک جس شخصیت کو لیے داخل ہوئے۔ مریم، زین اور عروہ کی آنکھیں پھٹی کئی پھٹی رہ گئیں۔

الیاس احمد بھی اپنی جگہ پر جم گئے۔ ان تینوں کو دیکھنے کے لیے وہ بہت تڑپے تھے، روئے تھے۔

”پاپا جانی.....“ سب سے پہلے عروہ باپ کی طرف دوڑی، زین کا سکتہ بھی ٹوٹ گیا۔ اس نے عروہ سے بھی تیز دوڑ لگائی۔ الیاس احمد نے دونوں بازو اکر کے دونوں کو سینے میں سمولیا۔ عروہ دائیں اور زین باپ کا بائیں گال چوم رہا تھا۔ الیاس احمد کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ مریم کی آنکھیں نم اور دل انجانی خوشی سے بھر گیا۔ وہ بچوں کو باپ سے لاڈ کرتے دیکھتی، تبریز ملک کے سینے سے جا لگی۔ تبریز ملک کی محویت ٹوٹ گئی، انہوں نے خود سے لپٹی سگی بہن کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے بازو اس کے گرد لپیٹ دیے۔

”میری بیٹی مریم۔“ انہوں نے زیر لب کہہ کے اپنی ناراضی ختم کر دی۔

”تھنک یو بھائی جان۔“ مریم نے ہولے سے سرگوشی کی۔ بہت سے شکر کے آنسو بھائی کے سینے میں سما گئے۔

☆☆☆

وہ کھڑکی کھولے باہر دیکھ رہی تھی۔ کمرے میں گھب اندھیرا تھا۔ کھڑکی کھلنے سے باہر کی روشنی ہلکی لکیر کی صورت گہرے اندھیرے کو چرنے کے لیے ناکافی تھی۔ اس نے اپنے نم گال ہاتھ کی پشت سے رگڑ کر صاف کیے۔

”میں کیوں روؤں، میں کیوں شرمندہ ہوں۔ میرا عیوب بالکل مطمئن ہے، میں نے کچھ نہیں کیا، مجھ پر یہ ظلم ہوا ہے اگر میں خود اپنے آپ پر اعتبار نہیں کروں تو دوسرے کیسے مجھے جینے دیں گے۔ میں زندگی اس پشیمانی کے ساتھ نہیں گزار سکتی کہ میں نے آخری کوشش نہیں کی میں اسے کال کروں گی“ ضرور کروں گی محبت یا اعتبار نہ سہی یہ جاننے کے لیے کہ میں اس کی نظروں میں پاک دامن ہوں یا داعدار۔“ دعا ارادہ کر کے ایک عزم سے اٹھی۔ اس کے انداز میں چستی تھی۔

☆☆☆

تبریز ملک نے بہن کی نہیں بچوں کی خاطر الیاس احمد کو بخش دیا تھا۔ کیونکہ وہ خود کو خدا نہیں سمجھتے تھے۔ سزا جزا دینے پر وہی قادر ہے۔

”جاؤ بچو! گاڑی میں جا کے اپنے گفٹس اور ٹوائزر رکھو ماما، پاپا بھی آرہے ہیں۔“ تبریز ملک نے بچوں کو دہاں سے ہٹایا۔ وہ دونوں گھر واپسی کا سن کر خوشی سے باہر کود پڑے۔

”تم لوگوں نے جو کچھ کیا، وہ بالکل قابل معافی نہیں تھا۔ میں نے عروہ اور زین کی خاطر معاف کر دیا ہے۔ میرا ارادہ ابھی تمہیں بہت لمبی سزا دینے کا تھا۔ مریم سے بھی میرا دل بہت بدظن ہے کہ اس نے میری تربیت کو یکسر بھلا دیا۔ وہ شوہر کو راہ راست پر لانے کے بجائے خود اس کی راہ پر چل نکلی۔ ایسی راہ جس کا اختتام ذلت و رسوائی کے علاوہ کچھ نہیں۔ تم نے اپنی بھانجی کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے، میں چاہتا ہوں کہ تم اپنے گھر واپس لوٹ جاؤ، اپنے بڑے بھائی اور بھانجی سے بھی معافی مانگو دعا کے سامنے بھی اپنے گناہ کا اعتراف کر لیتا، اس بچی کا کردار دھل جائے گا۔

اپنی اولاد کے مستقبل کا بھی سوچا کرو۔ اگر یہی سب کچھ تمہاری بیٹی کے ساتھ۔۔۔“

”پلیز بھائی صاحب، مجھے اس سے زیادہ شرمندہ مت کریں، مجھے پوری طرح اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ شاید میں زندگی بھر اس گناہ کا کفارہ ادا نہ کر سکوں۔ میں کوشش ضرور کروں گا۔ آپ بھی مجھے معاف کر دیں میں نے آپ کے اعتبار کو مان کو بھی نہیں پہنچائی ہے۔“

الیاس احمد نے ان کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ان کا سر نہامت سے جھکا تھا۔

”معافی مانگتی ہے تو اپنے بھابھی، بھائی اور مریم سے مانگو، جن کے ساتھ تم نے جھوٹ بولا، دغا دیا اور دھوکے میں رکھا۔“

الیاس احمد کے چہرے پر چھائی خفت انہیں

بہت کچھ باور کروا گئی تھی۔

☆☆☆

انہیں بھی انعم کی یہ بے بنیاد جھنجھلاہٹ بہت بری لگی تھی۔
”آپ لوگوں کی حرکتیں مجھے بہت مشکوک لگ رہی ہیں۔“ احسن جھنجھلاتا ہوا کپ رکھ کے اٹھ گیا۔
دل آرا پھر سے اسکرین کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

☆☆☆

آج بہت عرصہ بعد ریاض احمد کا دل ڈنر کے بعد کافی پیٹنے کو چاہا تھا۔ انہوں نے رابعہ احمد سے کریم کافی کی قرآنش کی۔ عمیر نے احتیاطاً پہلے انہیں میڈین کھلائی۔

رابعہ اور ریاض احمد کافی، عمیر اور نوال دودھ پی رہے تھے۔

نوال اور رابعہ احمد ان کی گفتگو سے محفوظ ہو رہی تھیں تب ہی مریم اور الیاس احمد نے لاؤنج میں قدم دھرے۔ ان پر سب سے پہلی نظر نوال کی پڑی۔
”ماما جان۔“

اس نے ماں کے کندھے پر ہاتھ کا دباؤ بڑھایا۔
رابعہ احمد نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا اور ساکت رہ گئیں۔ وہ جھکے سر لیے، ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ریاض احمد اور عمیر بھی کھڑے ہو گئے، ریاض احمد کے اعصاب تن گئے۔ جڑے بھیج گئے۔

”تم۔۔“ برداشت کرتے ہوئے بھی چیخ نکلی۔

”بد بخت، گناہگار انسان، اپنے منحوس قدم یہیں سے موڑ لو۔ اس گھر کو اجاڑ دیا، ہمارا سکون برباد کر دیا، اب یہ کالا منہ لے کر کیوں آئے ہو۔ تمہیں شرم نہیں آئی اس طرف کا رخ کرتے۔“ غصے سے بولتے ہوئے ان کا سانس پھول گیا۔ ہاتھ کپکپانے لگے۔

”پاپا جان پلیز، کنٹرول یور سیلف۔“ عمیر نے باپ کو پکڑ کر صوفے پر بٹھایا۔ نوال پانی لینے بھاگی۔

ڈنر کے بعد وہ لاؤنج میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ دل آرا کا دھیان اسکرین کی طرف تھا۔ درمیانی صوفے پر انعم اور احسن دونوں بیٹھے تھے۔

”میں نے نوٹ کیا ہے انودعا کافی خاموش اور ڈپریشن سی ہے۔ کیا سیریلی کوئی پرابلم ہے جو مجھ سے چھپایا جا رہا ہے۔“ اسے ڈنر پر نہ پا کے اس کا ذہن کھٹکا تھا۔

انعم اس اچانک اور صحیح اندازے پر گڑ بڑا گئی۔
”نہ۔۔ نہیں تو۔۔ آپ اتنے غور سے دعا کو کب سے نوٹ کرنے لگے۔“ سوال سے زیادہ اس کا لہجہ چہتا ہوا تھا۔ دل آرا انعم کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”وہ جب ہمارے گھر آئی تھی تب بھی ایسا ہی فیس بنا کے کسی نہ کسی کوٹنے میں پڑی رہتی تھی۔ اب پھر اسکی وہی روئین ہے۔“ احسن نے اپنا تجزیہ بیان کیا۔

”کیسا فیس بنا کے؟“ اس کے ماتھے پر بل پڑ چکے تھے۔

وہ واقعی ٹھیک سوچتی تھی۔ وہ اور لڑکیوں کے چہرے بہت غور سے دیکھتا، نوٹ کرتا تھا۔ پہلے تو اسے بیوی کے علاوہ کبھی کچھ نظر ہی نہیں آیا تھا۔

”وہ آج لان میں، میں نے دیکھا، وہ بہت اداس تھی۔“ احسن انعم کی نفیثیت سے الجھ رہا تھا۔

انعم کے دل پر زور کا پھپر لگا یعنی وہ اس کے چہرے کی کیفیت اور اس پر بھروسے موسم اور آتے جاتے رنگوں کو بھی شناخت کر لیتا تھا۔

انعم کی برداشت یہیں تک تھی۔

”مجھ سے انکو آڑی کرنے کے بجائے، خود اس سے جا کے پوچھ لو۔“ اس کی گود میں قریب رکھا کشن پھینکا، کپ زور سے میز پر پٹا اور اٹھ گئی۔

”اسے کیا ہوا؟ اس نے حیرانی اور تاسف سے اس کی یہ حرکت دیکھی۔

”آئی ڈونٹ نو۔“ دل آرا نے کندھے اچکائے۔

”تم کتنی دیدہ دلیری سے ہمارے سامنے آ گئے ہو آخر تم چاہتے کیا ہو؟ ریاض احمد کی جان لے کر ٹلو گے۔“

رابعہ احمد نے نوال سے پانی لے کر ان کے منہ سے لگا دیا۔

انہیں الیاس احمد اور مریم سخت برے لگ رہے تھے۔ وہ ان کی پڑھائی گئی پٹیوں پر عمل کرنے کی وجہ سے اپنے ہی گھر میں غیر بن کے رہ گئی تھیں۔

”بھائی جان۔۔۔“ الیاس احمد نے ان کے قدموں میں ڈھیر ہو کے ہاتھ ان کے آگے باندھ دیے۔

”بھائی جان مجھے معاف کر دیں۔ میں جانتا ہوں کہ میرا گناہ معافی کے قابل نہیں ہے، میں نے اپنے گھر کی عزت کو ذلیل و رسوا کیا۔ میں نے اللہ سے بھی معافی مانگی ہے جب تک آپ لوگ مجھے معاف نہیں کریں گے، اللہ بھی نہیں کرے گا۔ میں دعا کے قدموں میں بھی گر کے معافی مانگ لوں گا۔“

وہ بھائی کے گھٹنوں پر سر رکھے زار و زار رو رہے تھے۔ رابعہ احمد کا دل پیچنے لگا۔ ریاض احمد کے آنسو آنکھوں میں منجمد ہو گئے۔

”صرف ایک بار، صرف ایک بار اور آخری بار بھائی جان!“ وہ منت و سماجت کرتے روتے جا رہے تھے۔

تب ہی عمیر کے موبائل کی بیل بجنے لگی۔ اس نے موبائل جیب سے نکالا۔ باپ کو دیکھا جوش و خروش میں گھرے تھے اور لیس کا بیٹن دبا دیا۔

”ہیلو۔۔۔ ہیلو کون۔۔۔ کون۔۔۔ کون۔۔۔؟“ دوسری طرف سکوت تھا۔

”پلیز پاپا جان! چاچو کو معاف کر دیں۔ ہم سب پھر سے ایک ہو جائیں گے۔“ نوال نے آگے بڑھ کر سفارش کی۔ عمیر نے موبائل کان سے ہٹا کر دیکھا۔ مریم اور رابعہ احمد بھی ہاتھ باندھے کھڑی تھیں۔ عمیر نے مال کو دیکھا، ان کی آنکھوں میں خاموش التجا تھی۔

ماں کے بندھے ہاتھ اور آنکھیں اس کے کلیجے میں اپنی کی صورت گڑ گئے۔ وہ موبائل آف کیے بغیر میکا کی انداز میں چلتا باپ کے پاس آیا۔ اس سب میں اسے بھی اپنا حصہ ڈالنا تھا۔ آخری کوشش کے طور پر۔

”پاپا جان! ہمارا گھر اور رشتے ٹوٹ چکے ہیں، آپ کی ایک معافی، سب کچھ پہلے کی طرح جوڑ دے گی دعا کی قسمت میں شاید یہی سب ہونا لکھا گیا تھا۔ جو رشتے موجود ہیں، آپ انہیں خود سے دور مت کریں، بڑے گھر اور رشتوں کو جوڑتے ہیں۔ سب ایک ہو جائیں شاید اسی سے ہمارے دلوں کو سکون نصیب ہو۔“ اس کا لہجہ مصلحت آمیز تھا۔

وہ اس سب کے بیچ ایک پل کا کردار ادا کر رہا تھا۔ یہ جانے بغیر کہ فون پر دوسری طرف کوئی سانس روکے، اسے سن رہا ہے۔ اس کے ہمدردی میں ڈوبے الفاظ اس کے دل کو کسی تیز دھار سے چیر رہے ہیں۔

☆☆☆

اس کے رونے میں اس قدر شدت تھی کہ وہ اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کے منہ سے ایلنے والی چیخوں کو روک رہی تھی۔ وہ اس زندگی کی کشمکش سے آزادی چاہتی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اپنا سر پٹخ پٹخ کے لبو لبان کرے۔

اس نے انہم کی باتوں میں آ کے عمیر سے بات کرنے کا ارادہ باندھا۔

وہ کوریڈو میں نکلی وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے یہاں کے لینڈ لائن نمبر سے عمیر کا موبائل نمبر ڈائل کیا۔ بیل جا رہی تھی کوئی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ اس نے دوبارہ کال ملائی، اس بار تیسری بیل پر کال ریسیو کر لی گئی۔

”ہیلو۔۔۔ ہیلو کون۔۔۔ کون؟“

اسے لگا کہ وہ صدیوں بعد اس آواز کا اپنے کانوں میں اتار رہی ہے۔ زندگی نے اسے جس دور پہ بڑا کھڑا کیا تھا۔ وہاں سے عمیر ہی اسے پہچانے کی آخری امید تھا۔ اسے اور کوئی یاد نہیں آ رہا تھا

کے ہی لان میں نماز فجر ادا کر کے چہل قدمی کر لیتے۔
 عمیر نے ان کا ہاتھ تھام کے انہیں فٹ پاتھ سے نیچے
 گھاس پر اتارا۔ وہ دونوں بیچ کی طرف بڑھ گئے۔
 ”عمیر! میرا دل رات سے بہت عجیب ہو رہا
 ہے۔ کیا میں نے دعا کے مجرموں کو معاف کر کے
 ٹھیک کیا۔“

وہ دونوں بیچ پر بیٹھ چکے تھے۔ عمیر کا اپنا دل بھی
 ڈنڈا ڈول تھا۔

”میرا رب سب دیکھ رہا ہے۔ وہ ضرور انصاف
 کرے گا۔ ظالموں کو ان کے ظلم کا بدلہ دے گا۔ میری
 بیچی کے زخموں کو بھی ٹھنڈ پڑے گی، جب ان سب کو
 ان کے کیے کی سزا ملے گی۔“

ان کا دل بالکل صاف نہیں ہوا تھا۔

”اللہ تعالیٰ کو وہی لوگ پسند ہیں جو صلہ رحمی
 سے پیش آتے ہیں۔ آپ نے نہ چاہنے کے باوجود
 بھی سب کو معاف کیا۔ ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑا۔
 اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر ضرور دے گا۔ ہم کون
 ہوتے ہیں سزاوار جزا مقرر کرنے والے۔“

عمیر نے بہت نرمی سے انہیں وہی حوالہ دے
 کے مطمئن کیا اور واقعی ان کے دل میں یک گونہ سکون
 سرایت کر گیا۔

”میرا دل دعا کے لیے بہت دکھتا ہے عمیر
 پتا نہیں دہ وہاں خوش ہوگی یا نہیں۔“

وہ بہت معصوم سے تھے۔ وہ صرف عمیر سے
 اس کی باتیں کر کے دل بہلا لیتے۔

”آپ اس کے لیے دعا مانگا کریں کہ اللہ اسے
 جہاں بھی رکھے اسے اپنی حفظ و امان میں رکھے۔“

عمیر نے نرم مسکراہٹ سے ان کے بوڑھے
 دل کو حوصلہ دیا۔

”میں اسی لیے تم سے دل کی بات کہہ سن لیتا
 ہوں کیونکہ تم بہت خوب ڈھارس دیتے ہو۔“

ان کا دل کافی ہلکا ہو چکا تھا۔ انہوں نے عمیر
 کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرا۔

اس لاڈ پران کا دل فربان ہو گیا، وہ ان کے گرد

سوائے عمیر کے، وہ اس سے ہر بات بلا جھجک شیخ کر لیا
 کرتی تھی۔ آج اس کی زبان جھجک گئی، انگ گئی تھی۔
 اس کی زبان بولنے سے قاصر تھی۔ وہ پھر سے کئی لمحے
 اس سوچ میں غرق ہو گئی کہ وہ کس طرح سے ری
 ایکٹ کرے گا۔ وہ ان ہی سوچوں میں غرق تھی جب
 عمیر کے الفاظ اسے بے یقینی کی موت مار گئے۔

اس کا وہ نہیں تو بس ان ہی سوچوں میں جک گیا تھا۔
 ”دعا کی قسمت میں عمیر کی سب ہونا لکھا گیا

تھا۔ جو رشتے موجود ہیں، انہیں خود سے دور مت
 کریں۔ سب کو معاف کر دیں۔“ یہ الفاظ تھے بائشتر۔
 اس کے ہاتھ سے ریسور چھوٹ کے گرا۔
 پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔

”سب کو معاف کریں۔“ یہ الفاظ اس کے
 دماغ میں کسی تھوڑے کی مانند لگ رہے تھے۔

نفلی میں سر ہلاتی ——— ریزہ ریزہ وجود
 میں ہمت جمع کر کے وہاں سے بھاگ لی۔

کو ریڈر کے آخری سرے پر سینے پر بازو لپیٹے
 انعم کھڑی تھی۔ دعا اس کے قریب سے رونی ہوئی نکل
 گئی۔

”عمیر نے میرے مجرموں کو معافی دلوائی
 سفارش میں کیا اور قسمت میں یہی ہونا لکھا تھا۔ میری بی

عہمت خراب تھی۔ میں نے ایسا کون سا گناہ کر دیا ہے
 جس کی سزا شتم نہیں ہو رہی۔ وہ سب لوگ اتنا سب کچھ کر

کے آواز پر سکون اور خوش و خرم زندگی گزاریں، میں ان
 کے لیے قصہ پارینہ، ماضی کی ایک تلخ جھلک، وہ تو ان سب

رشتوں کے ساتھ مل جل کے رہنے کی اسکیم بنا رہا ہے۔
 میں شاید کہیں بھی نہیں ہوں۔ میری عہد۔ جو مجھے لگتا

ہے کہ وہ مجھ سے کتنا تھا، وہ کہاں گئی؟ کیا وہ سب میری
 نظر اور کم عقلی کا جھوٹا تھا، وہ اب بھی میری تکلیف اور

دور بینی کے بجائے مل جل کے رہنے کو فو قیت دے رہا
 ہے۔“ وہ درد کے جھک چکی تھی۔

☆☆☆

بہت عرصے بعد ریاض احمد صبح کی سیر کے لیے
 عمیر کے ساتھ نزدیکی پارک تک آئے تھے درندہ گھر

باز دلیپتے تھا۔

”ہم نے اپنی خواہش کیا ظاہر کی، تم تو بالکل ہی ہم سے دور ہو گئی ہو۔ گپ چپ سی، اپنے کمرے تک محدود۔“ دل آرا نے شکوہ کر ہی دیا۔
”مجھے آپ سے کچھ کہنا تھا۔“ اس نے تمہید نہیں باندھی تھی۔

”عمر یاد آ رہا ہے۔“ آلیٹ والا پراٹھا اسکا فیورٹ تھا۔ پچھڑے بیٹے کی یاد آنا فطری تھا۔
”نن۔۔ نہیں وہ بھلا مجھے کیوں یاد آئے گا۔“ آنکھوں میں تیرنی نمی چھپانے کو وہ نظریں چرا رہی تھیں۔

”ہاں ہاں کہو۔“ دل آرا اور انعم نے معنی خیزی سے ایک دوسرے کو دیکھا، انعم کی سانس سینے میں انک گئی۔

”ادھر میری طرف دیکھیں۔“ اس نے ان کا رخ موڑا۔ وہ نظریں نہ اٹھایا کیں۔

”میں۔۔ احسن سے شادی کے لیے راضی ہوں۔“

”اسے یاد کرنے پر کوئی پابندی نہیں ہے، وہ آپ کا بیٹا آپ کا تخت جگر ہے، مجھے پایا جان کو کوئی حق نہیں کہ آپ پر روک ٹوک لگائیں۔“
اسے ماں کی حالت پر ترس آیا۔

اس پتھر کی مورت میں کوئی جذبہ، کوئی احساس باقی نہیں تھا۔ انعم کی ذات کے پرچے اس ”ہاں“ سے اڑ گئے۔ اس کے چہرے پر کرب کے واضح نشان ابھرے تھے۔

”میں اپنے اور ریاض صاحب کے مابین پھر سے کوئی بد مزگی نہیں چاہتی۔“ انہیں یہی خدشہ تھا۔
”تھوڑا وقت لگے گا، سب کچھ اعتدال پر آنے میں، آپ اپنی ہرٹیشن فری کر کے، اچھے موڈ کے ساتھ ناشتہ بنائیں، حاجی صاحب نے بڑے لاڈ سے فرمائش کی ہے۔“

”تم سن رہی ہو انعم، دعا بیٹی شادی کیلئے راضی ہے۔“ دل آرا خوشی جھوم اٹھیں۔ اور اپنی جگہ سے اٹھیں، دعا کو کھڑا کیا اور زبردستی خود سے لگایا۔

”تھینک یو۔“ تھینک یو میری بجی، تم جیسی ہوتی ہیں، جو دوستی کا بھرم رشتی ہیں۔ میں نہ کہتی تھی انوکہ دعا جیسی معصوم اور فرشتہ صفت لڑکی، ہمیں انکار کر رہی نہیں سکتی۔“ وہ خود ہی بولے جا رہی تھیں۔ ان کی خوشی قابل دیدنی تھی۔

☆☆☆

انعم بنے چہرے کی ٹوٹ پھوٹ چھپانے کو الماری بند کرنے کو مزگئی۔ دعا کی آنکھیں چہرہ اور دل ساکت تھا۔ سب آنسوؤں کے سمندر میں کب کا بہہ چکا تھا۔

دعا ایک عزم کے ساتھ بہت مضبوط قدموں سے انعم کے بیڈروم میں آئی تھی، الماری کھلی تھی۔ انعم ریڈ کلر کا سوٹ اپنے ساتھ لگائے تھی۔

☆ ☆ ☆
دل آرا اور انعم، احسن کے بیڈروم کے باہر کھڑی کھسر پھسر کر رہی تھیں۔
”احسن کو منانا، آپ کی رسا نسلیٹی ہے۔ میں اس پھڈے میں نہیں پڑنے والی۔“ انعم نے آہستگی سے انہیں یاد دلایا۔

”ماما جی پڑ لیں احسن میرے لیے حیدر آباد سے لائے تھے، انہیں ہمیشہ سے لگتا ہے کہ سرخ رنگ مجھ پر چلتا ہے۔“ ناکس ہے ناں۔“ وہ ڈریس خود سے لگائے کھوم گئی۔

☆ ☆ ☆
تب ہی اس کی نگاہ دہلیز پر کھڑی دعا پر پڑی۔
”تم پر ہر رنگ بجا ہے۔“ دل آرا نے تعریف کرتے ہوئے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔

”آؤ نانا دعا، ایسے کیوں کھڑی ہو، ادھر میرے پاس آ کے بیٹھو۔“ انہوں نے کپڑے اٹھا کے انعم کو تھمائے اور دعا کے بیٹھنے کی جگہ اپنے قریب ہی بنائی۔
انعم تھکی۔ اتنے روز بعد وہ یوں ہی منہ اٹھائے نہیں چلا آئی تھی۔

”میں ہی ٹاپک چھیڑوں گی، تم میرے ساتھ کھڑی رہنا، اس طرح مجھے سپورٹ ملے گی، ہم

دونوں نے مل کر اسے راضی کرنا ہے بے وقوف۔“ دل آرانے اسے بازو سے پکڑ کر اندر دھکیلا۔

”ناشتہ کھا لے انو۔“ احسن کھڑی ہو رہی تھی۔
 ”تھوڑی دیر رک جاؤ احسن! مجھے تم سے کچھ ڈسکس کرنا ہے۔“ اسی آواز میں انم کے پیچھے داخل ہوئیں۔

”ابھی کرنا ضروری ہے“ آئی مین آفس سے لوٹ کے کر لیں گے۔“ اس نے پرفیوم اٹھا کے خود پر اسپرے کیا اور وال کلاک دیکھا۔
 ”میں تمہارا زیادہ ناٹم نہیں لوں گی۔ مختصر سی بات ہے۔“ ان کا لہجہ سرسری سا ہو گیا۔

”تمی کہیے۔“ اس نے موبائل اور چابی اٹھالی۔
 ”تم جانتے ہو نا کہ تمہارے بابا جان کا اتنا وسیع بزنس، مہون کنٹریز تک پھیلا ہوا۔ گاؤں میں بھی زمین ہے، بنگلوں، شوروم، پیٹرول.....“
 ”پلیز ماما جان، یہ سب میں بچپن سے جانتا ہوں۔ کچھ نیا بتائیں۔“ احسن نے بے چارگی سے ماں کو ٹوکا۔

دل آرانے گلا صاف کیا۔ ”تم میرے اکلوتے وارث ہو۔ تمہارا کوئی وارث نہیں، ہمیں اپنی نسل کو آگے بڑھانا ہے، ہم اپنی نسل کو ختم ہوتا نہیں دیکھ سکتے۔“ ان کا انداز اطمینان بھرا تھا۔

اس نے ناٹمی سے سر ہلاتے انم کو دیکھا۔ جو ماں کے برابر کھڑی سب چپ چاپ بن رہی تھی۔
 ”یونو ویل، انم! تم ماں نہیں بن سکتی، پھر آپ کیوں اس خواہش کو ہرا رہی ہیں۔“ اسے حیرت ہوئی۔

”انم ماں نہیں بن سکتی، لیکن تم تو باپ بن سکتے ہوتا۔“ انہوں نے بیٹی کی آنکھوں میں جھانکا۔
 ”کک۔۔ کیا مطلب۔۔“ اس کے اوسان خطا ہو گئے۔

”میں تمہاری دوسری شادی کروا رہی ہوں۔“ دل آرانے بغور جوان خوبرو بیٹے کو دیکھا۔
 ”واٹ! آپ کتنا کوہلی کیڈنسن کری ایٹ کر

رہی ہیں، میری جگہ سے آپ لوگ بالاتر ہیں۔“ اس کے منہ سے الفاظ بکھل نکل پارہے تھے۔

”بہت آسان الفاظ میں بتا رہی ہوں کہ تمہاری دوسری شادی کے لیے لڑکی پسند کر چکی ہوں، جو ہمیں وارث دے سکتی ہو، تم اپنا ہینڈ میک اپ کر لو۔“ دل آرا بھی اکھڑی گئیں۔ احسن اتنا سیدھی کھیر نہیں تھا۔

”اگر آپ لوگ میری آزمائش کر رہی ہیں تو بہت ہی چپ حرکت ہے۔ فضول میں میرا ٹائم ویسٹ مت کریں۔“ وہ انم کے جھکے سر پر عینکی نگاہ ڈالتا باہر بڑھا۔

”میں تمہیں کوئی جوک نہیں سنارہی۔ تم اچھی طرح غور و فکر کرو! شام کو ڈنیل میں ڈسکس کریں گے۔“ دل آرا کی آواز نے اس کے جاتے قدم جکڑ لیے۔
 وہ دونوں اس کے پاس سے گزر کے باہر نکل گئیں۔ وہ آنکھیں پھاڑے انہیں جاتا دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

دل آرا اپنے موبائل پر مصروف تھیں۔ انم نوڈلز کلاؤ اپنا لہجہ بھر بھر کے منہ میں ڈالتی جا رہی تھی۔ دل آرا نے موبائل سے نظر اٹھائی تو دعا پر جا پڑی۔ دل آرا نے موبائل بند کر دیا۔

”ادھر آؤ دعا۔۔ میرے پاس۔“

انہوں خاموش کھڑی دعا کو پکارا۔ وہ بغیر جواب دیے ان کے قریب آ گئی۔

”میرا خیال ہے انو، ہمیں شادی کی شاپنگ شروع کر دینی چاہیے۔ انہوں نے اچانک سے پروگرام بنا ڈالا۔

انم کا پیالہ بھی اختتام پذیر تھا۔

دعا کا دل انگیزیوں میں دھڑک گیا، انم کا منہ کی طرف جاتا چمچ واپس پیالے میں گر گیا۔

”ات۔۔ اتنی جلدی۔۔“ اس نے پیالہ میز پر رکھ دیا۔

”مجھے واپس بھی جانا ہے، میری تاخیر جیند آفندی کو شک میں مبتلا نہ کر دے، وہ مجھے واپس بلا

رہے ہیں۔“ انہوں نے وجہ بتائی۔

”ابھی تو احسن بھی نہیں مانا، آئی تھنک وہ نام لے گا۔“

اس کا دل دھک دھک کرنے لگا تھا، بلا وجہ احسن کا جواز پیش کر دیا۔

”تمہیں اس کی فرماں برداری پر کوئی شک ہے۔ وہ بالکل وہی کرے گا جو میں اور تم اسے کہیں گے۔“ انہوں نے سنجیدگی سے اسے گھر کا۔

”دعا راضی ہے، ہم اس کی شاپنگ اشارت کرتے ہیں، وہ اپنی خود سے کرے گا، چلو تم دونوں جلدی سے تیار ہو جاؤ۔“ انہوں نے حکم جاری کر دیا۔

”مم۔۔۔ میں نہیں جاؤں گا۔“ دعا بدکی۔

”کیوں؟“ دل آرا کا ”کیوں“ چھتا ہوا تھا۔

”میں نے خود سے بھی شاپنگ نہیں کی، مجھے کوئی تجربہ نہیں، آپ جو لادیں گی، میں وہی پہن لوں گی۔“

اس نے سچ بتایا۔

دل آرا کا دل اس کی اس قدر نا اہلی پر اش کرا تھا۔ انہوں نے بڑے فخر سے گردن اکڑا کے، انم کو دیکھا۔ وہ کندھے اچکا کے رہ گئی۔

”دعا ایسی ہی ہے۔ جو اس کی امی اور ممانی جان دیتی تھیں، وہی یہ پہن لیتی تھیں۔“ انم اس کے سچ کی گواہ تھی۔

”او کے فائن، تم ریٹ کرو۔ بچن میں نہیں جانا، صرف چند روز ہیں شادی میں۔“

دل آرا کا کہنا تھا کہ وہ اھل پھل ہوئے جذبات کو سنبھالتی اٹھ کر بھاگ نکلی۔ انہوں نے اس کی پشت کو سکرا کے دیکھا۔

☆☆☆

بہت زیادہ دھول اڑ رہی تھی۔ نہ آندھی آرہی تھی نہ طوفان چاروں اور مٹی کا غبار تھا، دھول جھاڑو سے اڑائی جا رہی تھی۔ گرد مٹی اس قدر تھی کہ میں جھاڑو لگانے والے کا دھندلا سا عکس دکھائی دیتا تھا۔

اس نے سارا کوڑا ایک جگہ ڈھیر کیا۔ دھول کا غبار بھی آہستہ آہستہ چھٹنے لگا تو واضح ہوا کہ جھاڑو لگانے والا مرد ہے۔ اس کا چہرہ گردوغبار سے اٹا ہوا تھا، تین نقش ابھر نہیں رہے تھے۔ وہ جھاڑو پھینک کے وہیں کوڑے کے پاس ڈھیر ہو گیا۔ بڑے سے شا پر میں بھی بھر بھر کوڑا ڈالنے لگا۔

”اے میرے خدا، مجھے معاف کر دے، میری التجاس لے، میری رہائی کا بھی سبب بنادے، میرے باپ کو بھی مجھ پر رحم آجائے، اس کی زبان مل کھا گئی۔ دماغ میں جھماکا سا ہوا۔

”رحم۔۔۔ رحم۔۔۔ میرا باپ۔۔۔ میرا باپ کون ہے، کیا نام ہے اس کا؟ ریاض۔۔۔ ریاض احمد۔۔۔ نہیں۔ نہیں۔۔۔ وہ تو نوال اور میر کا باپ ہے۔ میں کیا بن باپ کے ہوں۔“ اس کا ذہن غیر حاضر تھا۔ آنکھیں انجان سی، وہ شا پر پھینک چکا تھا۔

”وہ کہاں گئے۔ مجھے چھڑوانے کیوں نہیں آرہے، میری ماں، میرا باپ۔۔۔ میری ماں۔۔۔ ہاں میری ماں۔“ انہیں آواز دیں دیتا ہوا وہ زور زور سے رونے لگا۔

☆☆☆

دل آرا اور انم ڈیزائنر بوتیک میں بڑے تنقیدی انداز میں کپڑوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ دل آرا اس کے لیے سب کچھ ہنگام اور خوبصورت خریدنا چاہتی تھیں۔

انم نے بے بی ٹیک کلر کا سوٹ اپنے ساتھ لگا کے دیوار پر لگے شے میں دائیں بائیں گھوم کے دیکھا، دل آرا نے ذرا پیچھے ہٹ کے تنقیدی جائزہ لیا اور اثبات میں سر ہلادیا۔ انم نے وہ سوٹ دکان دار کو پکڑا دیا۔

انہوں نے بلیک کلر کا سوٹ اتارا اور انم کو پکڑایا تاکہ وہ اپنے ساتھ لگائے۔ وہ بھی بہترین تھا۔

دل آرا آگے بڑھ گئیں۔ انم مزید مینگز کو آگے پیچھے کھسکاتی فائن کلر ڈھونڈ رہی تھی۔

اس کے موبائل کی بیل بجنے لگی۔ اس نے ہینڈ بیگ میں سے موبائل نکالا۔ اسکرین پر ”احسن کا انک“ چمک رہا تھا۔

کرنے۔“

وہ ماں کی طرف دوڑی۔

”ماما۔ احسن کی کال ہے۔“ اس نے موبائل آگے کیا۔
”تو ریسو کرو ناں۔“ وہ اپنے ساتھ سوٹ لگا رہی تھیں۔

”واٹ ریش‘ میری نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھایا جا رہا ہے، کس کی پریشانی سے تم اپنی من مانی کرتی پھر رہی ہو۔ میری لائف کا۔“

”بی کوانٹ احسن۔“ دل آرا کا ضبط جواب دے گیا۔ اس کا رد عمل بالکل درست تھا۔ وہ آگے بڑھیں۔

”تم نے مزید ایک لفظ بھی انعم سے کہا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا اور تم مجھ سے پوچھو مجھ پر چلاؤ‘ کیونکہ تمہاری دوسری شادی کا فیصلہ میں نے کیا ہے اس نے نہیں۔“ وہ اس کے سامنے تن کیس۔

”کیا اس اچانک فیصلے کی وجہ دریافت کرنے کا حق رکھتے ہو۔“ اس کے لہجے کی کئی ذرا کم ہوئی۔
”وجہ تمہیں معلوم ہے۔ انعم تمہیں وارث نہیں دے سکتی، ہمیں تمہاری اولاد چاہیے۔“ انہوں نے دو ٹوک بتایا۔

انعم کے دل پر زبردست گھونسا پڑا۔
”مجھے وارث نہیں چاہیے ماما، ہم اولاد کے بغیر بھی بہت خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں۔“ وہ بے بس کھڑا تھا۔

”کب تک؟ ایک وقت آئے گا، جب تم سوچو گے کہ کاش میرا کوئی بازو کوئی سہارا ہوتا لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی ہوگی۔“ دل آرا نے اسے احساس دلایا۔

”یہ وقت کبھی نہیں آئے گا۔ آپ اس ٹاپک کو کلوز۔“

”پلیز احسن، تمہیں مجھ پر ٹرسٹ نہیں ہے۔ میں تمہاری اور انعم دونوں کی ماں ہوں۔ میں نے کبھی اپنی مرضی تم لوگوں پر نہیں تھوپنی، کبھی اپنا کوئی فیصلہ لاؤ نہیں کیا۔ تم لوگوں کو کیا کھانا پیتا ہے، تمہیں آنا جانا

”وہ دوسرے حصے میں ہے اس کا بیگ میرے پاس ہے۔“ انہوں نے جھوٹ گھڑا۔

”کہاں ہیں آپ لوگ؟“ وہ سخت بد مزاج ہوا۔
”ہم تمہاری دہن کیلئے شاپنگ کرنے نکلے ہیں پلیز ہمیں ڈسٹرب مت کرو آرام سے سب پر چیز کرنے دو۔“ انہوں نے اپنی کہہ کے اس کی سنے بغیر کال کاٹ دی۔ احسن نے بند موبائل کان سے ہٹا کے گھورا۔

”شادی کی شاپنگ، وہ مانی گاڈ۔“
اس نے بالوں میں انگلیاں پھنسا لیں۔ اس کے ماتھے پر بل تھے۔

☆☆☆

احسن آفس ٹائم سے ایک گھنٹہ قبل گھر پہنچ گیا۔
دعا لاؤنج میں بیٹھی گاجریں چھیل رہی تھیں۔ اس نے مرکزی دروازہ زوردار آواز کے ساتھ بند کیا۔
دعا کا گاجر چھیلتا ہاتھ رک گیا، اس نے مڑ کے آنے والے کو دیکھا اور سب چھوڑ چھاڑ کے اندر کو بھاگی۔

”بے وقوف لڑکی۔ وہ دانت کچکا کے رہ گیا۔
”انعم۔ انعم۔“ اس نے بآواز بلند کارا۔
انعم سے پہلے دل آرا نکل آئیں۔ انعم کے کمرے کا دروازہ کھلا۔

”جج۔ جی۔“ وہ نیند سے ہڑبڑا کے جاگتی تھی۔
”تم بازار گئی تھیں، میری شادی کی شاپنگ

”ہاتھ مت لگانا“ دور رہو مجھ سے۔“ وہ یکدم چیخ پڑا۔

انعم نے کبھی اس کی ناراضی یا غصہ برداشت نہیں کیا تھا۔ وہ ہمیشہ اس کے ساتھ میانہ روی سے پیش آتا تھا۔

”میں نے کیا کیا ہے، آپ بھلا میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔“ اس سے مزید برداشت نہیں ہوتی۔

”تم لہو ماما، میرے ساتھ اتنا بڑا گیم کھیل رہی ہو لہذا ابھی بھی پوچھتی ہو کہ میں نے کیا کیا ہے۔“ وہ اٹھ بیٹھا۔

”وہ سب ماما نے آپ سے کہا ہے۔“ اس نے اپنا دفاع کیا۔

”تمہاری خاموشی اور شکل بتاتی ہے کہ تم ماما کی سپیوٹر ہو پس ذرا سارے نچا بولوں تو رونا دھونا شروع اور جو اتنا پہلے کر کے اپنی سمیت اور شوہر کا ہٹوارہ کرنے جا رہی ہو۔“

احسن نے اس کے منہ پر زور کا تازیانہ لگایا۔

لفظ ”بیواری“ کتا تکلیف دہ تھا۔

سے چکیاں لینے لگی۔

”میرے پاس تم سے بدگمان نہ ہوں یہ سب ماما جی کا پالانگ ہے۔“ اس نے کہا۔

”سمجھوں کہ یہ بد کرنے کی۔“ وہ تلخ ہوا۔

”آپ ملا علی قلی کی محبت پر شک کر رہے

ہیں۔ ہم انہیں کو اس کا کیا قصہ ہے۔ ”میری سگی ماں

کھانے پر آپ کی قویں۔ انہوں نے مجھے یہ

اس کی وجہ سے ان سے بھلائی ہوئی

اور

“*Myself and my friends*”

استیغنی عن الخمر والذمیر

“آخوندی، آخوندی”

”اگر اس شخص کو سزا دی جائے تو اس کی سزا کیسے ہوگی؟“

اور اس کے ساتھ ساتھ وہ دماغ سے سینے

ہے، کس سبکیٹ کو لینا ہے، حتیٰ کہ تم دونوں نے کہا کہ ماما ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، اب ہماری اسٹڈیز کمپلیٹ ہے، شادی کروادیں، میں تب بھی تم لوگوں کی رضا میں خوش رہی۔ میں تم لوگوں کے کبھی کسی ایک معاملے میں بھی روایتی ماں یا دیوار نہیں بنی، تم لوگوں کی خوشی میں اپنی خوشی تلاش کی، لیور اگر آج میں نے اپنی مہتاب کے ہاتھیں چھو رکھے، ٹیک خواہش کا اظہار کر دیا، تو تم مجھے مجھے مقررہ کر دو گے، میرے کون سے دفاتر ہیں اور ہیں یا بیٹیاں ہیں جو میں دوسرے بچوں یا نواسوں سے دل بہلا لیں، ٹھیک ہے تمہاری زندگی، تم جیسے جاہو جیو، میں بھلا کون بھولی ہوں، پلیز میری سیٹ کفرم کروادینا۔“ دل تارا کا لہجہ گلو گلو ہو گیا۔

احسن کا دل کھنٹی میں آ گیا۔ اس نے کبھی بھی
 ماں کو روئے تے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بہت مضبوط اعصاب
 کی مالک تھیں۔ انہم نے تاسف سے شوہر کو دیکھا
 اسے بھی ماں کا دل ٹوٹنے کا دکھا۔

★ ★ ★

وہ دیوار سے پشت لے کر بیٹھ گیا، اُن کیسے دیکھ کر
اوجھائی پر ہنسے، 'جھپٹ جھپٹ' ان کیسے زمین
پر سیدی پھیلائے۔ جھپٹ جھپٹ ان کیسے سبز سیاح
تھے، رنگت زرد، شبنم خاصی بڑی، جھپٹ جھپٹ
نہیں، جھپٹ جھپٹ تھا۔ لیکن ایسا خاہری جھپٹ
جھپٹ تھا۔ جھپٹ جھپٹ تھا۔ جھپٹ جھپٹ تھا۔

★ ★ ★

دل آرا انہم کو اس کے کرے تک پہنچا دے
تھیں۔ احسن علیہ کو بندھا۔ اب انہم
جانے گئے۔ انہوں نے اے گنہگار کے
اندر بیجا۔

نکمرے میں نیم اور چراغ۔ مصلحت سے
اعصاب کو مضبوط کرتی خود کو حوصلے کا درس دیتی
اپنی سائیڈ پر آ کے اوپر کوہ کے بیٹھ گئی۔

”محسن۔۔“ اس نے اس کے بازو پہ ہاتھ رکھا۔

ہیں۔ رحیم سے محبت کرتی ہیں اس لیے اس نے ان کے کندھے پر رکھ کے چلائے
رشتوں میں تقسیم کرنا چاہتی ہیں جو میں انہیں نہیں دے سکتی۔ اس نے نرم رویہ رکھا۔
”کیا اولاد کے لیے میں دوسری شادی

رچا لوں۔“ وہ بگڑا

اس میں برائی کیا ہے۔ وہ ماں ہیں اپنی کو تو ہیں۔ ان کی باتیں اس کے نرم چہرے پر گزرتی ہیں۔
اپنے اکلوتے بیٹے کی اولاد کو کھلانا چاہتی ہیں میرے۔ اس نے ایک یتیم بچی کو
سر پر ہاتھ رکھ کے قسم کھائیں کہ میں اس کی ماں کی محبت و شفقت دی۔

کدو آپ کے بھی بچے ہوں! میں نے چپوٹم چباتے پڑے لا
قطاریاں مگوئیں۔ اس نے احسن کا ہاتھ پکڑ لیا۔ مجھے سوپ دیا۔

واپس پہنچ لیا۔ ”رکھو ہاتھ میرے سر پر ہاتھیں۔“
محبت آزمائش کے دور تھے پر کھڑی تھی۔ اس نے میری بے اولاد کی خبر

چپ تھا اس کی نظریں جھکی تھیں۔ ”کیا بے وقوفی ہے انوکھا۔“
اما کو انکار کرنے کا حوصلہ نہیں رہتی میں میری محبت
اور میرا شوہر اس خواہش پر قربان۔ ”وہ احسن کے
گلے لگ کے رو دی۔ احسن کا جسم بے جان و ساکت
تھا۔“

”پلیز احسن مان جاؤ اپنی ماں کو کبھی انکار مت
کرنا ہم نے ان کے مان اور محبت کو نہیں توڑنا پلیز
مان جاؤ میں بالکل دل سے کہہ رہی ہوں۔“
اس نے آج تک کبھی انہم کا کہا نہیں ٹالا تھا۔
اس کی کوئی منہ سے نکلی بات روئیں کی تھی۔ آج بھی
وہ چپ تھا۔ اس کی اس چپ میں ”ہاں“ پوشیدہ تھی۔
(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

کھوٹھی سی آواز۔ انہم کا جی چاہا کہ روزِ محشر بیاہو
جائے۔ دل آرا نے مردِ ذات کے متعلق بالکل
درست اندازہ لگایا تھا جب شام سے احسن کمرہ بند تھا
تو اس کا ایمان بھی ڈانوا ڈول ہوا تھا۔

وہ اس سے واقعی پہلے جیسی محبت کرتا ہے۔ اس
کے دل میں وہم آیا ہے اور دل آرا اس وہم کا فائدہ
اٹھا رہی ہیں۔ اسکی ساری خوش فہمی اس بلی دھری کی
دھری رہ گئی تھی۔

”نظریں چرانے سے حقیقت نہیں چھپتی میرا
دل چاہتا ہے کہ میرے بچے ہوں میں آپ سے اتنی
محبت کرتی ہوں کہ آپ کا نام اس دنیا میں باقی رکھنے
کے لیے اس دل پر پتھر رکھ لوں گی سوتن برداشت
کر لوں گی۔“

انہم نے اپنی طرف سے اسے مکمل طور پر مطمئن
کرنا چاہا کہ وہ اس کی طرف سے بے فکر ہو گئے اس
مسئلے پر غور کرے۔ انہم جانتی تھی اگر وہ دل آرا سے
چوری چوری کسی کی دوسری شادی کے لیے منع

حساب دل رہے وہ



نبیلہ عزیز

میر نے کسی خدا کا جو بچہ کی طرح پکارا
کہ خدا کا بچہ خدا ہے ہی ہے میری آغوش کی
مجھے چھو بیٹا، کہ خدا ہے نہ کہ کھانا
جس کا گوشت کھانے والی ہوتی ہے کھانا
خدا میری کن عی میں سحر سحر ہے۔

دوسری طرف چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ اس کے بعد آپا کے کھانسنے کی آواز آئی۔

”عجب..... ہمارے بھائی! کیوں آخر، ایسی بات کہہ کر گئے؟“

آپا نے روتے ہوئے کہا: ”کیا شرمناک کام لے رہے ہو؟“

”میری شادی ہے تو کیا ہر مرد بھائی کی طرح مجھ سے ملے؟“

طرف آپا کو بھی جیسے سکتہ ہو گیا تھا۔ انہیں شاید اب اندازہ ہوا تھا کہ میں اردو کی استانی ارجند بانو کے لیے کس قدر سنجیدہ ہوں۔ ویسے آپا کے اس طرح کے رد عمل کا مجھے پہلے سے ہی اندازہ تھا۔ حالت تو میری بھی غیر ہوئی تھی جب پہلی بار میرا باقاعدہ ارجند بانو سے تعارف ہوا تھا۔ اس سے پہلے کتنے ہی مواقع آئے تھے جب میں اس سے نہ صرف مل سکتا تھا، بلکہ اس کی قربت میں وقت بھی گزار سکتا تھا۔ اس کا باتیں کرتا، زیر لب مسکراتا، دائیں ابرو اٹھائے بہت اٹھاک سے کتاب کی ورق گردانی کرتے دیکھ سکتا تھا، مگر نہیں، میں نے اپنی کم علمی میں کتنے ہی ایسے سنہری مواقع گنوا دیے۔ صرف یہ سوچ کر کہ وہ اردو کی ایک معمولی سی استانی ہی تو ہے، اور رہی کسی کسر اس کے نام نے پوری کر دی تھی۔



جب بھی مجھے بتایا جاتا کہ زوہیب اور سعد یہ کی اردو کی استانی ارجمند بانو آئی بیٹھی ہیں اور بچوں کو نیچے اترنے میں دقت لگ رہا ہے تو میں چاہ کر بھی اپنی اسٹڈی سے اٹھ کر ڈرائنگ روم میں نہ جاتا۔ کیونکہ مجھے یہ ہی لگتا تھا کہ میں اگر ملنے گیا بھی تو برقعے یا بڑی سی میلی سی چادر میں لپٹی بدرنگ، بے ڈھنگے سے کپڑے پہنے، پیروں میں دوپٹی کی ہوائی چپل ڈالے لوہیز عمر کی خاتون سے ملاقات ہوگی، جو مجھے یعنی کسی غیر مرد کو دیکھتے کے ساتھ ہی ”اوی ماں“ کہہ کر دانتوں میں اپنی چادر کا ایک کونا دبا لے گی اور میرے حال چال پوچھنے پر صوفے پر شرم سے لوٹ پوٹ ہوتی رہے گی۔ حالانکہ اس کی جگہ جب بھی جیوگرانی یا میتھ کے ٹیچر کو انتظار کرنا پڑتا تو میں فوراً سب کام چھوڑ کر ان کے پاس جا بیٹھتا اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے ان کے انتظار کو آسان بناتا، مگر اس اردو کی استانی کا نام ہی سن کر میری ریڑھ کی ہڈی میں سے جیسے کوئی ساری جان کھینچ کر نکال دیتا اور میں خود کو ملامت کر کے بھی اس کے انتظار کی کوفت ختم کرنے نہ پہنچتا۔

ایسے میں یہ کام مومو بڑی خوش اسلوبی سے نبھاتی۔ گو وہ ابھی کافی چھوٹی تھی، مگر اسے ارجمند بانو بڑی پسند تھی۔ زوہیب اور سعد یہ کے برعکس مومو، ارجمند بانو کے آنے سے پہلے ہی ڈرائنگ روم میں جیسے اس کے استقبال کے لیے پہنچ جاتی، اسکول سے واپس آ کر زوہیب اور سعد یہ ایک ڈیڑھ گھنٹے کے لیے سو جاتے تھے اور ارجمند بانو کے آنے پر جاگتے۔ لہذا اکثر ہی مومو کو ارجمند بانو کے ساتھ کافی وقت مل جاتا تھا۔ میں جب بھی گھر جلدی آ جاتا تو اپنی اسٹڈی میں بیٹھا آفس کے مختلف کام پنپایا کرتا اور وہیں مومو کے ہتھ سترا اور مسکرا دیتا۔

بچوں کی یہ ہی بات تو سب سے اچھی ہوتی ہے کہ وہ ظاہری شکل و صورت سے — لا پرواہ ہوتے ہیں، بلکہ شاید وہ ایسے کسی شخص پر زیادہ ہی مہربان ہوتے ہیں۔ جس پر دنیا بد صورتی یا نا پسندیدگی کا ٹیبل

لگا دیتی ہے۔ شاید یہ ہی وجہ تھی کہ مومو، ارجمند بانو کے آنے کا باقاعدہ انتظار کرتی تھی اور جب وہ زوہیب اور سعد یہ کو پڑھا چکی ہوتی تو دونوں کے ساتھ مل کر اسے دروازے تک چھوڑنے جاتی۔ اس معاملے میں مجھے خوشی ہوتی تھی کہ چلو میرے بچوں کو اپنے کسی ٹیچر کی تو عزت کرنی آتی ہے، چاہے وہ اردو کی استانی ہی کیوں نہ ہو۔ جب ایک کی عزت کرنی سیکھ گئے ہیں تو دوسروں کی بھی عزت کرنی آ جائے گی۔ کبھی مجھے لگتا کہ کہیں اس اردو کی استانی نے ان تینوں کو ذرا دھمکا کر تو یہ شرط نہیں لگا رکھی کہ اس کے جانے پر وہ تینوں دروازے تک اسے چھوڑنے جائیں۔

ایک، دو بار میں نے تینوں کو کرکیدا بھی، مگر وہ تینوں ارجمند بانو کے نام سے ہی ٹھل اٹھتے اور جبکے لگتے۔ تعریفوں کے بل باندھ دیے جاتے۔ میں نے سوچا بچے ہی ہیں، بے چارے ماں کی کمی کو اب کچھ زیادہ ہی محسوس کرنے لگے ہیں۔ زوہیب اور سعد یہ تک تو ٹھیک تھا۔ وہ دونوں اپنی مرحوم ماں شاہینہ کے ساتھ اپنے ہوش میں آنے تک وقت گزار چکے تھے، مگر چھوٹی مومو، اسے شاہینہ کے لمس کا احساس تو تھا، مگر اس کے وجود کا کوئی تصور اس کے ذہن میں نہیں تھا۔ تصاویر میں مومو، شاہینہ کو حیران نظروں سے دیکھتی تھی اور اکثر ہی رونے لگتی۔ وہ معصوم بچی اس بات پر رو پڑتی تھی کہ یہ تصویر میں نظر آنے والی اگر اس کی ماں ہے تو مومو اس سے اس قدر نا مانوس کیسے ہے؟

☆☆☆

شاہینہ سے بھی میں نے پسند سے شادی کی تھی۔ وہ میری یونی ورسی فیلو تھی۔ نام کی شاہینہ تھی اور خاندان اور شخصیت کی بھی شاہانہ تھی۔ ایم بی اے کے بعد میں نے کینیڈا کی شہریت کے لیے اپلائی کر دیا تھا اور امی، ابو بعد تھے کہ میں شادی کر کے بیوی کے ساتھ پریس سدھاروں۔ میں نے شاہینہ کا نام لیا۔ امی کو وہ فوراً پسند آ گئی۔ شادی کے چند سال یہاں گزر کر کہ ہم کینیڈا سدھار گئے۔ میرے والد کا جو کاروبار پاکستان میں تھا، میں

نے اسی کی شاخ ٹورنٹو میں کھول لی اور ابو کی مدد اور میری دن رات کی محنت سے پندرہ سال میں میرا کاروبار اچھا خاصا ترقی کر گیا۔ اسی دوران زویب اور سعدیہ کی پیدائش ہوئی۔ مومو کے وقت شاہینہ کو کینسر کا خدشہ لاحق ہوا۔ میں مومو کے حق میں نہیں تھا، مجھے شاہینہ کی زندگی عزیز تھی، مگر وہ رسک لینے پر بضد ہو گئی۔ مومو کی پیدائش سے شاہینہ کی طبیعت جو بگڑی تو دس مہینوں میں ہی وہ ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئی۔ کینیڈا میں اتنے چھوٹے بچوں کو تہادیکھنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ میں نے اپنا کاروبار جلد از جلد سمیٹا اور واپس پاکستان اپنے آبائی گھر آ گیا۔ جس میں میرے والدین کے انتقال کے بعد اب تین پورشن بن چکے تھے۔

ایک میں آبا رہتیں، ایک میں میرا چھوٹا بھائی اپنی بیوی، بچوں کے ساتھ رہتا تھا اور ایک پورشن جو خالی پڑا تھا میرے حوالے کر دیا گیا۔ والد کا کاروبار اب چھوٹا بھائی سنبھالتا تھا۔ میں نے اپنا الگ سیٹ اپ بنانے کا سوچا اور اسی سلسلے میں کافی مصروف رہتا تھا۔ مگر ایک اطمینان تھا کہ بچے گھر پر اس کے نہیں ہیں۔ آپا کے تمام بچے شادی بیاہ کر کے الگ گھروں میں آباد تھے۔ آپا میرے بچوں کو کافی وقت دیا کرتی تھیں، پھر چھوٹے بھائی کی بیوی، افشاں بھی میرے بچوں کے ساتھ کافی اچھی تھی۔

زویب صرف تیرہ سال کا تھا، مگر اپنے سے دو سال چھوٹی سعدیہ اور سات سالہ مومو کا خیال مجھ سے کہیں زیادہ رکھتا تھا۔ کسی محفل میں یا گھر میں ہی آئے ہوئے مہمانوں کے سامنے وہ اپنی دونوں بہنوں پر جیسے کڑی نظر رکھتا کہ وہ دونوں کوئی ایسی بات یا حرکت نہ کر گزریں جس سے بعد میں مجھے یا آپا کو شکایت ہو۔ آپا کو اس کی بردباری بڑی پسند آتی تھی، مگر میرے دل پر لگ جاتی۔ ابھی تو اس کے کھیلنے کودنے کے دن ہیں۔ اس کی ماں ہوتی تو اکلوتا لڑکا ہونے کے باعث اس کو کس قدر لاڈ، پیار سے رکھتی۔ ہفتہ اور اتوار کے علاوہ بچے ہر شام کو مصروف

رہتے تھے۔ کینیڈا سے آنے پر بچوں کو یہاں اچھے اسکول میں داخلہ کرانے پر بھی ان کو یوشن دلوانا میری مجبوری تھی۔ کیوں کہ پاکستان کی پڑھائی کینیڈا کی پڑھائی کی بہ نسبت زیادہ مشکل تھی۔ وہاں تو میزے بچے اسکول سے کوئی ہوم ورک بھی لے کر نہیں آتے تھے۔ یہاں لگتا تھا کہ سارے سال کا کورس ہوم ورک کی صورت ایک ہی دن میں مکمل کرنے کے لیے بچوں کو دے دیا گیا ہے۔ نہ آئے دن ٹیسٹ ہوتے تھے کہ سارا سال زور و شور سے پڑھائی جاری رکھنی پڑے۔ یہاں آ کر ہی مجھے معلوم ہوا تھا کہ بچوں کی پڑھائی وہ بلا ہے۔ جونہ بچوں کو چین لینے دے اور نہ والدین کو، پتا نہیں ان لوگوں کو پڑھانے والے استادوں کا کیا حال ہوتا ہوگا۔

☆☆☆

شروع کے چند مہینے تو میں نے بچوں پر زور دیا کہ وہ کسی طرح خود ہی اسکول کی پڑھائی میں جدوجہد کریں، مگر پھر ٹرین نے یکے بعد دیگرے بچوں کے لیے مختلف استاد بھیج دیے اور ہل محلہ میرے بچے دنیا کی مصروف ترین شخصیت بن گئے۔ ساڑھے چھ بجے سے دن کا آغاز ہوتا۔ اسکول سے آ کر چند گھنٹے سو کر ساڑھے چار بجے سے اٹھ کر اردو، میتھ اور جیو گرافی کی ٹیوشن لیتے لیتے رات کے آٹھ بج جاتے، کھانا کھاتے، ایک آدھ گھنٹہ آپا ان کو قرآن شریف پڑھا دیا کرتیں۔ ٹھوڑا سا سنی وی دی دیکھ پاتے اور اس قدر تھک جاتے کہ گیارہ بجے تک بے سدھ سو جاتے۔ ہفتے اور اتوار کے روز بھی آدھے سے زیادہ دن ہوم ورک کرنے میں گزارتے۔

زویب اور سعدیہ اس قدر محنت سے کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہو گئے تھے، جبکہ مومو کے مزے آ گئے تھے۔ اس کا داخلہ ابھی پہلی کلاس میں ہوا تھا، جہاں اس کو بڑے بھائی بہن کی طرح محنت نہیں کرنی پڑتی، لہذا وہ گھر پر آنے والے بھانت بھانت کے پیچرز کے ساتھ گپ لگاتی رہتی اور جو وقت بچ جاتا اس میں آبا یا افشاں کی جان کھاتی رہتی۔ چھوٹے بھائی کی شادی

میری شادی کے ساتھ ہی ہو گئی تھی۔ اس کے دو بچے تھے جو کہ زوہیب اور سعید ہی کی عمر کے تھے۔ لہذا مومنو گھر کی واحد چھوٹی بچی تھی، جس کو بات کرنے کے لیے بڑی تعداد میں لوگ ملے ہوئے تھے۔

میں نے بچوں پر واضح کر دیا تھا کہ ابھی تو ٹیوشن دلوار ہا ہوں، مگر ایک دو سال بعد ان لوگوں کو اس قدر خود پر بھروسہ کرنا آ جانا چاہیے کہ ٹیوشن کی ضرورت نہ پڑے اور میرے بچے میری بات پر دل و جاں سے عمل کر رہے تھے اور ان کی محنت صاف دکھائی دیتی تھی۔ باقی مضمون کے بارے میں تو مجھے یقین تھا کہ میرے بچے جلد ان پر قابو پالیں گے، مگر اردو کے سلسلے میں ان کی کمزوری کا مجھے شدت سے احساس تھا۔ اسی لیے میں نے جلد از جلد اردو کی نیچر کا بندوبست کرنے کا سوچا تھا اور جب ثمرین نے مجھ سے ایک گورنمنٹ اسکول میں اردو پڑھانے والی ارجمند بانو کا تذکرہ کیا تو میں نے فوراً ہی ہامی بھری تھی۔ کیوں کہ میں بچوں کے اسکول میں اردو پڑھانے والی نیچر سے مل چکا تھا۔ جس کی اردو اس قدر خراب تھی کہ مجھ جیسے بندے کو بھی اس سے بات کر کے الجھن ہو رہی تھی۔

نہ وہ ٹھیک سے اردو میں بات کر رہی تھی، نہ ہی انگلش میں، اگر صرف امتحانات میں پاس کرانا مقصود ہوتا تو میں یقیناً اس کو بھی رکھ لیتا، مگر میں چاہتا تھا کہ میرے بچے صحیح معنوں میں اردو سیکھیں، تاکہ آئندہ وہ اردو زبان میں دلچسپی لے سکیں۔ پھر بھی مجھے اپنے ہی بچپن کے گورنمنٹ اسکول کے اردو کے استاد کی یاد آئی تھی، جو کہ منہ میں پان بھر کر رکھتے تھے۔ لہذا منہ سے زیادہ ان کے ہاتھ چلتے تھے۔

ڈھیلا ڈھالا شکن زعمہ سفید کرتے پاجامے پر صدیوں پرانی کالے رنگ کی شیر دانی زیب تن کیے وہ ہمیشہ جیسے اچانک ہی کلاس میں وارد ہوتے اور اچانک ہی کلاس سے غائب ہو جاتے۔ بات وہ نہ کرتے تھے، نہ ہی سنتے تھے۔ سب بچوں کو معلوم تھا کہ ان کے آتے ہی اردو کی کتاب کھول کر سامنے

رکھنی ہے۔ وہ بلیک بورڈ پر صفحہ نمبر لکھتے، ہم سب مطلوبہ صفحے پر آ کر اسے خاموشی سے سیکھتے جاتے اور سمجھ نہ پاتے کہ اب کیا کریں۔ ان کے ہاتھوں اور آنکھوں کی دہشت ایسی تھی کہ پوچھ بھی نہ پاتے۔ بہر حال وہ تھوڑی دیر سب کو غضب ناک نگاہوں سے تولتے رہتے، پھر کسی ایک کو اپنے غضب کا نشانہ بناتے۔ جب اس سے نیٹ لیتے تو بلیک بورڈ پر ہی کچھ سطر لکھتے، یعنی کہ کچھ سوال جواب جو اس دن کے صفحے کے متعلق ہوتے، اور اس سے پہلے کہ ہم پللیں جھکیں، وہ نظروں سے غائب ہو جاتے۔ میں اکثر ان کے جانے کے بعد سوچتا کہ ویسے تو بڑی مری سی چال چلتے ہیں، مگر کلاس میں داخل ہوتے اور جاتے ہوئے بتائیں ان کی رفتار اتنی تیز کیسے ہو جاتی ہے کہ کبھی پکڑائی نہیں دیتے۔

بہر حال ایک بات تو طے تھی کہ ان کی کلاس میں آج تک کوئی میل نہیں ہوا تھا۔ بتائیں کس طرح گھول کر پورا کورس پلاتے تھے کہ میں آج تک سب کچھ بھول کر بھی اردو کے کئی اسباق یاد رکھتا ہوں۔ میں نے بچوں کو پہلے ہی سکھا پڑھا دیا تھا کہ اگر کبھی اردو کی استانی ان کو مارے بیٹے یا کوئی اور زیادتی کرے تو بلا جھجک مجھے بتائیں، مگر مجھے بڑی حیرت تھی کہ بچے ارجمند بانو سے کافی خوش تھے۔ اور اکثر دونوں کے اردو ٹیسٹ میں اچھے گریڈ دیکھ کر مجھے بھی اطمینان ہو گیا تھا کہ ان کی اردو کی استانی گھول کر پلانے میں ویسی ہی ماہر ہے جیسے میرے اردو کے استاد تھے۔

☆☆☆

آیا کو ثمرین پسند تھی، لہذا اس کے بھیجے ہوئے تمام نیچرز کو وہ اس کے ایجنٹ کہا کرتی تھیں اور بچوں کے ٹیوشن کے اوقات میں شاذ ہی ہماری طرف آتی تھیں۔ ویسے تو میں نے کچھ ہی دنوں میں اندازہ کر لیا تھا کہ آیا اور افشاں دونوں ہی ثمرین کی طرف سے تھوڑی اٹھری ہوئی سی رہتی تھیں اور جب ثمرین گھر پر آتی تو یہ دونوں کوئی نہ کوئی بہانا بنا کر اپنے اپنے پورشن میں چلی جاتی تھیں۔

رہی تھی۔ افشاں اتنی مگن تھی کہ اسے میرے آنے کی خبر تک نہیں ہوئی اور اتنی ہی دیر میں، میں نے اپنے مقابل پر غور کیا۔ صاف، شفاف جھکتے ہوئے چہرے پر بڑی بڑی گہری سوچتی ہوئی آنکھیں اور کانوں سے لٹکتے ہوئے جھولتے لمبے آؤ بڑے جو اس کی پتلی لمبی گردن کا پتہ دیتے تھے۔ میری نظر کو خود پر مرکوز دیکھ کر اس نے مسکرا کر مجھے دیکھ کر افشاں کی طرف دیکھا، جیسے اسے احساس دل رہی ہو کہ اب ہمارے ساتھ کوئی اور بھی کھڑا ہے۔

”بھائی جان! اپنی دیر لگا دی۔ آپ کے انتظار میں کھانا لگانے کو بیٹھے ہیں۔“ افشاں نے تھوڑی دیر اپنی بات جاری رکھنے کے بعد آخر کار مجھے مخاطب کر کے کہا۔

میں منمنّا کر رہ گیا اور اس سے پہلے کہ کچھ کہتا، افشاں تیزی سے دوسری طرف چلی گئی۔ اس سے تعارف کی حسرت میرے دل میں ہی رہ گئی۔ افشاں کے جاتے ہی وہ بھی مسکرا کر آگے بڑھنے والی تھی کہ مومو دور سے بھاگتی ہوئی آکر اس سے لپٹ گئی۔ اس کے پیچھے ہی سعدیہ بھاگتی دوڑتی آئی اور اس کا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اس سے خوشی خوشی باتیں کرنے لگی۔

میں حیران ہوا۔

”آخر یہ ہے کون جس کو میرا پورا خاندان جانتا ہے اور ایک میں ہی اس سے لاعلم ہوں؟“ اس کی جگہ کوئی اور خاتون ہوتی تو میں کبھی بھی اس طرح بار بار اس کے کسی اور سے باتیں کرنے کے ددران زد بردستی تحمل ہونے کا سوچتا بھی نہیں۔ مگر اس کو جاننے کے شوق نے میرے تمام تر رکھ رکھاؤ کا بیڑہ غرق کر دیا تھا۔ میں زبردستی اس کے ساتھ کھڑا اپنے بچوں کی اس سے بات چیت سنتا رہا تھا کہ اس نے ایک بار پھر سے نظریں اٹھا کر مجھے غور سے دیکھا۔

”آپ بچوں کی پڑھائی کے بارے میں کچھ بات کرنا چاہ رہے ہیں؟“

سعدیہ کے وہاں سے جاتے ہی اس نے مجھ سے سنجیدگی سے پوچھا۔

میں گڑبڑا گیا۔ ”بہت بہت معافی چاہتا ہوں، مگر اصل میں..... میں آپ کو..... پہچان نہیں پا رہا۔ آپ اسکول میں کون سا مضمون لے رہی ہیں؟“

میری بات سن کر ایک لمحے کے لیے اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی، پھر اس نے ہونٹ ہینچ لیے۔ وہ شاید ہنسنا چاہتی تھی، مگر مجھے شرمندگی سے بچانے کے لیے خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”میں جس اسکول میں پڑھاتی ہوں، وہاں آپ کے بچے نہیں پڑھتے۔ ارجمند بانو نام ہے میرا۔ شاید آپ کو یاد ہو، میں آپ کے بچوں کو ہر شام دو گھنٹے اردو کی ٹیوشن دیتی ہوں۔“

میں ابھی سکتے سے باہر نہیں آیا تھا کہ میرے پاس ثمرین چلی آئی۔

”آؤ، آؤ ثمرین..... ان سے ملو، یہ..... یہ ارجمند بانو بچوں کو اردو کی ٹیوشن دیتی ہوں۔“ میں نے جیسے نیند میں ڈوبے لہجے میں بے ربطی سے کہا۔ میں مخاطب تو ثمرین سے تھا، مگر میری نظریں ابھی تک ارجمند بانو پر ہی لگی ہوئی تھیں۔

”اوہ اچھا اچھا! آپ ہیں ارجمند بانو، کافی تعریف کرتے ہیں، آپ کی شجاع انکل، خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“ ثمرین نے ٹھوس انگریزی میں سب کچھ کہہ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

مجھے ثمرین کی یہ بات بہت عجیب لگی۔ میں نے شرمندہ سی نظروں سے ارجمند بانو کو دیکھا، مگر وہ میری شرمندگی سے بے خبر جب تک ثمرین سے ہاتھ ملا چکی تھی۔

”شجاع سر بذات خود بہت اچھے انسان ہیں۔ میرے استاد بھی ہیں اور محسن بھی۔ مجھے واقعی خوشی ہوئی کہ انہوں نے میرے لیے اچھے الفاظ استعمال کیے۔“

میرے ساتھ ساتھ ثمرین بھی جڑبڑ ہو گئی تھی کیونکہ ارجمند بانو نے ثمرین کی ہی طرح ٹھوس

ار جند بانو کو نکالنے کا کہہ دے کی۔ اس نے۔۔۔
پتھر ز میرے پاس رکھوائے تھے۔ لہذا وہ خود کو سب کی
قسمت کا ان داتا جھتی تھی۔

میں اس دن بے حد مصروف تھا۔ ایک میٹنگ
نپٹا کر نکلا تھا اور دوسری میں جانے کے لیے مختلف
ٹینڈرز کی فائلیں کھولے اپنے لیے اہم نکتے لکھ رہا تھا
کہ اس کا فون آ گیا۔ اکثر ہی وہ فون کر لیا کرتی تھی اور
میری فرصت کا سن کر آفس چلی آتی تھی، مگر آج اس کا
لجہ نہایت اکھڑا ہوا تھا۔ میرے جیلو کہتے ہی اس نے
مجھ سے کسی طرح کی بھی رسمی گفتگو کرنے کے بجائے
ار جند بانو کو ابھی اور اسی وقت فارغ کر دینے کا کہا۔

میں نے وجہ جاننے کے بجائے اسے دلاسا دیا
اور یہ ہی بتایا کہ ابھی تو آفس میں ہوں، آ کر بات
کرتا ہوں، مگر وہ لبند ہو گئی۔ کہنے لگی کہ میں گھر پر فون
کروں، کیونکہ وہ خود بھی میرے گھر پر موجود تھی اور
ار جند بانو بچوں کو ٹیوشن پڑھا رہی تھی۔

”اس نے بہت بد تمیزی کی ہے۔ تم ابھی گھر پر
فون کر کے اس سے بات کرو اور اسے ابھی فوراً اس
گھر سے نکل جانے کا کہو۔ میں ایک منٹ اس عورت
کا وجود برداشت نہیں کر سکتی۔“ ثمرین نے دو ٹوک
انداز میں فون پر تقریباً چیختے ہوئے مجھ سے کہا اور
کھٹ سے فون بند کر دیا۔

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ ثمرین اس قدر
اکھڑی ہوئی کیوں ہے۔ ویسے تو اس کا مزاج زیادہ تر
گجڑا ہوا ہی رہتا تھا۔ مگر میرے سامنے وہ ہر ممکن خوش
اخلاق نظر آنے کی کوشش کرتی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ
آپا اور افطال تو ویسے بھی ثمرین کے آتے کے ساتھ
ہی اپنے پورش میں چلی جاتی ہیں۔ ملازم وغیرہ بھی
اپنے کاموں میں مصروف ہوتے ہیں۔ کیا معلوم کیا
ہوا ہے؟ کیا ار جند بانو نے میرے بچوں کے۔۔۔

کوئی زیادتی۔۔۔ ثمرین۔۔۔ اس نے ساہ
بد تمیزی کی ہے۔ بد تمیزی۔۔۔ اس نے ساہ
ثمرین اس کا وجود برداشت نہیں کر سکتی۔ غصے میں
ثمرین اپنی بات بھی ٹھیک سے نہیں کر سکتی تھی۔

بڑی میں جواب دیا اور یہ کہتے ہی وہ سر کو ذرا سا خم
اے گردوسری طرف مڑ گئی تھی۔ میں نے محسوس کر لیا
کہ ثمرین کو ار جند بانو پسند نہیں آتی تھی اور ار جند
انے بھی صاف ظاہر کر دیا تھا کہ اسے ثمرین کی
لہذا پسند کی ذرہ بھر بھی پروا نہیں ہے۔ میں پورا وقت
کی طرح اس سے قریب ہونے کی ترکیب سوچتا رہا
مگر ہر بار ناکامی ہوئی۔ ادھر ثمرین بھی میرے
سامنے کی طرح لگ گئی تھی اور میں جانتا تھا کہ
ثمرین کے سامنے اس سے بات کرنا ناممکن ہے۔
”چلو کوئی بات نہیں۔ اب جب یہ بچوں کو
مانے آئے گی تو یہی ڈھنگ سے انٹرویو لوں گا۔“
میں نے دل میں سوچا۔

عجیب سی جستجو محسوس ہوئی تھی مجھے، ار جند بانو
میں متعلق جاننے کی شدید خواہش۔ ایسا میرے ساتھ
لمبے عرصے نہیں ہوا تھا۔ یقیناً بہت زیادہ پڑھی لکھی ہے۔
ب صورت بھی، کمپوز اور انداز سے بھی کسی
نئے گھر کی لگ رہی تھی۔ ثمرین نے جس طرح
ع انکل کا تذکرہ کیا تھا اس کا مطلب تھا یہ کوئی
نئی ہی تھی، مگر آج تک جان پہچان کے لوگوں کی
محفل میں نظر نہیں آئی اور پھر جوشوخی، خود پرمان
انداز اس کی شخصیت کا خاصا ہونے چاہئیں۔

دستے۔
کچھ لوگ کتنے واضح، کتنے صاف شفاف نظر
ہیں، مگر پھر بھی پہلی ہی نظر میں ان کو دیکھتے کے
بعد ہی احساس ہوتا ہے جیسے ان کے دل گہرے
کی مانند کئی طوفان سیٹھے بظاہر خاموش اور مطمئن
کر ملنے والوں کو کھلا دھوکا دینے میں مصروف
میں اس کے دھوکے میں رہنا نہیں چاہتا۔ اب
میرے سامنے عمل طور پر کھلتا ہوگا۔ سوال تو بس
تھا کہ کیا وہ بھی ایسا چاہے گی۔ مجھ سے سب کچھ
میرے سامنے اپنا آپ کھولے گی؟

☆☆☆

ثمرین کی ناپسندیدگی محسوس تو ہوئی تھی، مگر اس
س کہ وہ دعوت کے تیسرے ہی دن مجھ سے

میں میٹنگ کو پس پشت ڈال کر گھر کے لیے نکل پڑا۔ میں اپنے بچوں کے لیے بہت حساس تھا۔ اس طرح فون کرنا مجھے بہت سے غصے کا باعث بن چکا تھا۔ میں نے ننگے سے پہلے ایک سائیکس ٹرین کو کر دیا تھا کہ میں خود آ کر سٹاپ کو دیکھتا ہوں، وہ میرا انتظار کرے اور جب تک میں نہ آؤں، بچوں کی خاطر گھر پر رہے۔ گھر پہنچا تو ٹرین لان میں ہی پہنچتی نظر آ گئی۔

میرے گاڑی سے اترتے ہی وہ تیزی سے میرے پاس آ گئی۔

”اس جیسی عورتوں کو میں اچھی طرح سے جانتی ہوں، گھنٹیڈی، مغرور، بدتمیز۔“ ٹرین غصے سے کانپ رہی تھی۔

میں نے دلاسا دینے کے لیے اس کا ہاتھ پکڑا۔ ”چلو میری اسٹڈی میں۔“ وہ میری بات سن کر جھنجھلا گئی۔ ”اسٹڈی میں کس خوشی میں، وہ تمہارے بچوں کو لیے ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہے۔ وہاں جاؤ اور ابھی اسے نکال باہر کرو۔“

”ہاں ٹھیک ہے۔ میں وہی کروں گا جو تم کہہ رہی ہو۔ مگر پہلے مجھے سب بتاؤ کہ ہوا کیا ہے؟“ میں نے نکل سے جواب دیا۔

”ہوا کیا ہے؟ خود سرتو وہ ہمیشہ سے ہے۔ ہر بات میں ٹانگ اڑانے والی۔ ایسی نہ ہوئی تو آج کو اپنا تانہ بند سم شوہر نہ سنبھالے بیٹھی ہوتی؟“ ٹرین کا غصہ کسی طرح کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ ہم اب اسٹڈی میں آ گئے تھے۔ میں نے کمرے میں آتے ہوئے ایک ملازم سے کہہ دیا تھا کہ ہم جند بانو کو فورا میری اسٹڈی میں بھیجے۔

”میری ہی غلطی ہے۔ مجھے شہاء انکل کی بات مانتی ہی نہیں چاہیے تھی۔ ایسی ڈریسڈ عورت، جس کے ڈریسنگ گورنر کرنے کے لیے شہاء انکل نے اسے گورنمنٹ اسکول میں پڑھانے کے لیے کہا تھا۔ مجھے سوچنا چاہیے تھا کہ بھلا اس طرح کوئی ڈریسنگ گورنر ہوا ہے؟ سائیکو، میٹل، ہونہہ!“

دروازے پر ہلکی دستک دے کر وہ اندر چلی آئی تھی اور شاید اس نے ٹرین کی بات کا آخری کا کچھ حصہ سن لیا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے دکھ نظر آیا، مگر وہ فوراً ہی سنبھل گئی اور خاموشی سے آ کر میرے سامنے میز کی دوسری طرف کرسی بھینٹ کر بیٹھ گئی۔ اس نے ایک بار بھی ٹرین کی طرف دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

”جہادی بہت کیسے ہوئی مجھ سے بدتمیز کرنے کی؟ بولو؟“ ٹرین اس کی لاسنتی سے جھجھکی اور بھڑک گئی اور میرے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی اس پر برس پڑی۔

اس نے بہت اطمینان سے سر گھما کر ٹرین کی طرف دیکھا اور واپس میری طرف دیکھنے لگی۔

”آپ نے..... مجھے بلایا ہے؟“ اس نے ”آپ“ پر زور دے کر مجھ سے پوچھا۔ میں گڑبڑا گیا۔ ٹرین غصے سے اور پاگل ہونے لگی۔ وہ ایک لمحہ مجھ سے بھنکارتے ہوئے بولی۔

”اس نے..... اس نے..... میرا ہاتھ..... اس نے کیا کیا یہ میرا ہاتھ توڑ دے گی۔ یہ کتنی کیا ہے اپنے آپ کو.....؟“

”یقین کیجئے، میں واقعی ایسا کر سکتی ہوں۔ بچوں سے زیادتی میں کسی طرح برداشت نہیں کر سکتی۔ چاہے وہ کسی کے بھی بچے ہوں۔“ ہم جند بانو نے اسی اطمینان سے مجھ سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں اسے صرف کچھ کھانسی دے گا۔“ اس نے کہا۔ ”مگر تم کیا جالو بھڑک رہی ہو؟ تم تو خود اپنے شوہر سے لڑ کر اس سے کھینچ ہوئی ہو۔“ ٹرین نے اسی طرح بھڑک کر دانت پیچے ہوئے کہا۔ ”کس کو تم بھڑک رہی تھیں؟ کس بات پر؟“

میں ٹرین کے منہ سے بچوں کے بارے میں سن کر چونک پڑا۔ اس سے پہلے میں یہ ہی سمجھ رہا تھا کہ یہ صرف ہم جند بانو اور ٹرین کے درمیان ہونے والی کسی جھجکاوت کا نتیجہ ہے۔

”یہ مومو کو دھڑا دھڑ پیٹ کر ان سے بغیر کیا تو؟“

ان کے لائے ہوئے کیک سے ایک حصہ لینے لیں۔ میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر روکا تو انہوں نے جذبات میں آ کر بچوں کے سامنے ہی جو وہاں استعمال کی ہے وہ میں بتا نہیں سکتی۔“ ارجمند ہانے پہلی بار شمرین کو گہری نظروں سے دیکھا۔ ”ہاں تو تم نے بھی تو کہا کہ میرا ہاتھ توڑ دو گی۔ تم کیا بڑی پارسیا ہو؟“ شمرین اپنا پول کھلتا دیکھ کر دم پر ہڈی نظر آ رہی تھی۔

”شمرین..... تم باہر جاؤ۔“ میں نے شمرین کو صحت لہجے میں ہدایت کی۔ شمرین نے پہلے اس کی طرف دیکھا۔ پھر میری طرف اور سر جھٹک کر تیزی سے باہر نکل گئی اور اپنے پیچھے زوردار دھماکے سے اسٹڈی کا دروازہ بند کر گئی۔ جس کی آواز سے ارجمند بالوائیک دم لرز گئی۔

”ارجمند بانو..... میں جو کچھ بھی پوچھوں اس کا دلوک الفاظ میں جواب دیں۔ سمجھ رہی ہیں آپ؟“ میں نے شمرین کے جاتے ہی ارجمند بانو کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

اس نے پہلے تو نظریں چڑائیں، پھر جیسے کچھ مویج کر فیصلہ کن سانس لی۔ حسب عادت اس کی دائیں ابرو اٹھی اور آنکھیں مجھ پر ٹپک گئیں۔

میں نے اپنی تمام ہمت جمع کی۔ مجھے اپنے الفاظ بہت تپ تول کر کہنے تھے۔ آج سے پہلے میں کئی بڑے لوگوں سے ملا۔ بہت سی بڑیں میٹنگز میں اپنی بات منوائی۔ مگر کہیں بھی آج تک مجھے اس طرح اپنے الفاظ پر بولنے سے پہلے غور نہیں کرنا پڑا تھا۔ لہذا الفاظ جیسے میرے حق میں خود بخود میری زبان سے ادا ہوتے جاتے تھے۔ مگر آج میں پہلی بار اپنے لفظوں کو باقاعدہ ترتیب دے رہا تھا۔

”ارجمند بانو..... کیا تم..... مجھ سے شادی کرو گی؟“

کہنے کو تو میں کہہ گیا، مگر خود ہی حیرت میں دب گیا۔ یہ میرے منہ سے ابھی ابھی جو نکلا ہے وہ یاد اٹھی میں نے ہی کہا ہے؟ میں یہ تو نہیں کہنا چاہتا

تھا۔ پتا نہیں میں کیا کہنا چاہتا تھا اور کیا کہہ گیا تھا۔ مگر اب تو کہہ ہی گیا تھا اور اپنی بات واپس لینا بھی مجھے گوارا نہیں تھا۔ ”جی؟“ ارجمند بانو کو بھی میری بات سے اتنی ہی حیرت ہوئی تھی جتنی مجھے خود اپنے سوال سے ہوئی تھی۔

”آپ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتے اور شاید آپ کو ضرورت بھی نہیں ہے۔“ وہ تھوڑی دیر مجھے اسی طرح حیرت سے تکتے رہنے کے بعد گویا ہوئی۔

”میں انکل شجاع سے مل چکا ہوں۔ تمہارے ماضی سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مگر کیا تمہیں میرے ماضی سے فرق پڑتا ہے؟“ میں نے جلدی سے کہا۔

مجھے فکر تھی تو بس یہ ہی کہ وہ دونوک انکار کر کے نہ اٹھ جائے۔ مجھے انکل شجاع نے پہلے ہی اس کے دنیا سے کنارہ کرنے کے بارے میں بتا دیا تھا۔ ابھی وہ کچھ کہتی کہ شمرین ایک بار پھر بغیر دستک دیے کمرے میں جا رہا نہ چلی آئی۔

”ہاں تو بولو؟ کیا جھوٹ سنایا ہے اس نے تمہیں؟ نکالنا تم نے اسے یا نہیں؟“

شمرین کا غصہ ابھی تک ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ وہ اس قدر بدبیزاری سے ارجمند بانو کے بارے میں بات کر رہی تھی کہ مجھے اس کا یہ انداز بالکل پسند نہیں آ رہا تھا۔ میں نے امید سے ارجمند بانو کی طرف دیکھا۔

”ہاں..... نکال دیا ہے میں نے اردو کی استانی؟ ارجمند بانو کو..... کیونکہ.....“

”کیونکہ؟ کیونکہ کیا؟“ میرے بیچ میں بات روک دینے پر شمرین ایک بار پھر جھنجھلا گئی تھی۔

میں نے دیکھا کہ ارجمند بانو دھیرے سے مسکرانے لگی تھی اور میرے لیے اس کی طرف سے اتنی ہی ہمت افزائی کافی تھی۔ خوشی سے میری نظر ارجمند بانو پر پڑی تھی وہ گئی تھی۔ آخر کار میں نے ارجمند بانو کی مسکراہٹ کی خوشی میں شونی سے جواب دیا۔

”کیوں کہ میں اور ارجمند بانو..... شادی کر رہے ہیں۔“

مُحَلِّ ناول

”تھوڑی دیر صبر کر لیں نانی جان، ہو سکتا ہے
طبع منہل جائے“

”اے شاباش! لڑکی الموصہر سر ہے کہ درد سے
بھٹنے کو ہے، بلڈ پریشر بڑھ چلا جا رہا ہے اور تم صبر
کا مشورہ دے رہی ہو اگر طبیعت سننے کے بجائے بکڑ
گئی اور میں چل بسی تب بھی تو کفن و دفن کا انتظام
کروانے کے لیے ہمسائیوں کے گھر کہنے جاؤ گی یا
نہیں۔“

”اودہ نانی جان! کیسی خوفناک باتیں کرتی ہیں
آپ!“

زیب النساء نے کچھ خوفزدہ سے انداز میں ان

ہوں۔ لڑکیوں کی بھی کافی تعداد معلوم ہوتی ہے کہ
نہ کوئی دوالا ہی دے گا۔“

”نانی! اودہ اتنی بڑی کوٹھی ہے، پتا نہیں کس حرا
کے لوگ ہوں گے۔ امیر لوگ غریبوں کو منہ لگاتا کہ
پسند کرتے ہیں، جب انہیں پتا چلے گا کہ میں اس
پرانے سے مکان سے آئی ہوں تو ہو سکتا ہے سیدھے
منہ بات بھی نہ کریں۔“

”تم بس گھر بیٹھی اندازے لگاتی جاؤ اور کوئی
ایسی عالیشان کوٹھی بھی نہیں ہے، ہائے میرا سر لگتا ہے
آج تو نہیں بچوں کی میں۔“

انہوں نے سرد دُنوں ہاتھوں میں تھام لیا اور

متمہ بخاری

پندرہ سون کی کھیل

کی صورت دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ سچائی ہے، بوڑھی جان ہوں قبر میں پاؤں
لٹکائے بیٹھی ہوں۔ ذرا سا بہانا ہی موت کا سبب بن
سکتا ہے۔ اور میں پوچھتی ہوں تم آخر ان کے ہاں
جانے سے اس قدر بچپا کیوں رہی ہو۔“

”نانی! کل تو ہم اس گھر میں آئے تھے، اب بھی
پاس پڑوس واقفیت بھی نہیں ہے اور میں جا کر کیوں کہ
یہ دوائیں لا دیجیے۔ کچھ مناسب نہیں۔“

بازار سے آئی ہوں کہ کچھ منگوائے۔
”وہ بے چاری اس بازار سے ہمارے گھر
آئے گی اور میں اسے گھر چلاؤں گی۔“
سے نہیں ہوتا۔ تم جاؤ پڑوسیوں کے ہاں۔ مہر پر اکھر
”کرں کی بھی آوازیں میں کل سے سن رہی

پیشن گوئیاں کرنے لگیں۔

”نانی! کیا زیادہ طبیعت خراب ہے؟“ زیبہ
النساء نے گھبرا کر پوچھا۔

”اے تو تمہارے خیال میں، میں اتنی دیر سے
ڈرنا کہتا ہوں۔“ انہوں نے سچ کر کہا پھر دوبارہ
کہنے لگیں۔

”آپ پریشان نہ ہوں، ذرا حوصلہ پکڑیں میں
جانی ہوں۔“ انہوں کی طرف سے نہ چاہتے ہوئے
وہ اٹھ کھڑی ہوئی، سیاہ چادر کھوئی سے اتار کر سر
میں الماری سے کچھ پیسے لیے اور ابھتی گھبرائی
سے باہر آ گئی۔

پتا نہیں کس مزاج کے لوگ ہوں گے، دوالا کر
دیں گے بھی یا نہیں، کئی مرتبہ نانی سے کہا ہے



میں اسے لاکھڑا کیا اور بولا۔
 ”یہاں اس وقت گھر کے تین افراد موجود ہیں
 آپ کو جو پسند آئے اس سے بات کر لیں۔“
 زبیا نے پلکیں اٹھا کر دیکھا سامنے بچہ تخت پر
 امی کی عمر کی ایک خاتون بیٹھی تھیں، ان کے برابر کرسی
 پر بھی امی کی عمر کی ہی ایک اور خاتون پھر نیچے قالین پر
 اسی لڑکے کا ہم عمر ایک لڑکا بیٹھا تھا اور یہ سب زبیا ہی
 کو دیکھ رہے تھے۔

”السلام علیکم!“ اس نے گھبراہٹ کے عالم
 میں سلام کیا اور اپنی ہی آواز کچھ اجنبی سی محسوس ہوئی
 تینوں نے جواب دیا اور کرسی والی خاتون نے اسے
 اپنے برابر میں رکھی کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔
 ”کہاں سے آئی ہو بیٹی؟ میں نے پہچانا نہیں
 کیا تم فری کی سہیلی ہو؟“

جواب ظاہر ہے کفنی میں ہونا تھا۔
 ”اچھا اچھا“ پھر نالکہ کے ملنے والوں میں
 ہو گئی۔ جواب پھر ناں میں اب کے وہ سوالیہ انداز
 میں اس کی صورت دیکھنے لگیں۔
 ”یہ جو آپ کے گھر سے بائیں طرف ایک گھر
 ہے ہم لوگ کل وہاں آئے ہیں۔“ گھر کی حالت کی
 وجہ سے وہ شرمندگی سے بتا رہی تھی۔

”اچھا تو تم بھائی ظفر اللہ کے کرائے دار ہو،
 ہاں کل نو ماہ اور ماہی بتا رہے تھے کہ سامان آیا ہے
 بڑی آرہے ہیں مگر ہم نے دھیان نہیں دیا۔ بیٹی تم
 تھیک سے بیٹھ جاؤ۔“
 تخت پر بیٹھی خاتون نے محبت سے کہا پھر اس
 لڑکے سے جو اسے یہاں تک لے کر آیا تھا بولیں۔
 ”تم کھڑے کیا کر رہے ہو اس محسوس بکری کا
 بچہ کو گو سے اتار دو اور فرج سے شربت نکال کر لاؤ۔“
 ”آپ اسے محسوس نہ کہا کریں میں نے اسے
 بیٹا بنایا ہے اس لحاظ سے آپ اس کی دادی لگتی ہیں۔“
 ”بکومت!“ اس کی بات پر قالین پر بیٹھا لڑکا
 ہنس پڑا تھا اور یہ ہنسی خاتون کو تپا گئی تھی۔

ضرورت کی اشیاء ختم ہونے سے پہلے ہی منگوا کر رکھ
 لیا کریں۔ اب امی بھی گھر پر نہیں ہیں مجھے ایروں
 غیروں سے مدد لینا پڑ رہی ہے۔ سوچتی اچھتی وہ
 ہمسائیوں کے اونچے سے سفید گیٹ کے سامنے آگئی
 گیٹ کھلا تھا۔ پھر چھی اس نے اطلاعی کھنٹی بجائی،
 دوسری مرتبہ انگلی رکھنے پر ایک پیارا سا بچہ نمودار ہوا
 اور سوالیہ انداز میں اسے دیکھنے لگا۔
 ”اندر آتا ہے مجھے!“

وہ اثبات میں سر ہلا کر پیچھے ہٹا اور بولا۔
 ”آپ ضرور فری خالہ کی سہیلی ہوں گی مگر فری
 خالہ اس وقت آپ سے نہیں مل سکتیں ان کی چھوٹے
 ماموں سے لڑائی ہوئی ہے اور اب وہ اپنے کمرے
 میں بیٹھی رو رہی ہیں۔“

وہ بچے کی بات کے جواب میں کچھ کہے بغیر
 اندر آگئی یہاں لان میں جو نظارہ دیکھا وہ کچھ حیران
 کن سا تھا۔ ایک اچھا خاصا سارنٹ نو جوان پیارے
 سے بکری کے بچے کی دونوں اگلی ٹانگیں پکڑے اسے
 ہوا میں گول گول گھمار رہا تھا اور ساتھ میں کوئی گیت
 گنگنا رہا تھا۔

”یہ ہمارے چھوٹے ماموں ہیں اور یہ بیٹی
 ہے۔ بیٹی ان کی بکری کا بچہ ہے، مگر ماموں کہتے ہیں
 اسے اپنا ہی بچہ سمجھتا ہوں۔“

چھوٹا سا لڑکا بڑی سنجیدگی سے بتا رہا تھا۔
 زیب النساء کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی مگر
 چند لمحوں کے لیے کہ وہ نو جوان اب ادھر ہی آ رہا تھا۔
 ”کس سے ملنا ہے آپ کو؟“ بیٹی کو گود میں لیے
 اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے وہ زبیا سے
 مخاطب تھا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے اسے، خاموش
 کھڑی رہی۔ ”آخر کسی سے تو ملنا ہی ہوگا، چلیے اندر
 تشریف لے چلیے۔“

کہتے ہی وہ شاید رہنمائی کے خیال سے آگے
 چل پڑا۔ راہداری سے ہو کر ایک بڑے سے کمرے

جس جیس گے ورنہ ہماری اماں تو ہر شے کو سنبھال سنبھال کر رکھتی ہیں۔“ یہ کہہ کر گلاس منہ سے لگا لیا وہ تیز قدموں سے باہر آگئی۔

نانی اس کی منتظر تھیں جوں ہی کمرے میں داخل ہوئی بولیں۔

”ہاں کیا کہتے ہیں لا کر دیں گے یا نہیں؟“
 ”نانی! وہ تو بہت اچھے لوگ ہیں انہوں نے فوراً اپنے لڑکے کو دودھ لانے بھیج دیا بس چند منٹوں میں لے کر آتا ہوگا“ کہہ رہی تھیں ہم تمہاری نانی کا حال پوچھنے آئیں گے۔“

”اور تم تھیں کہ ان کی طرف جانا ہی نہیں چاہ رہی تھیں۔ پڑوسیوں سے میل ملاقات رکھنا چاہئے اب میں تو اپنی پیاریوں کی وجہ سے ایسی لاچار ہوئی ہوں کہ کہیں آج جا ہی نہیں سکتی ورنہ تو خود ان کے گھر جا جاتی۔“

”نانی جان! میں تو اس خیال سے نہیں جا رہی تھی کہ معلوم نہیں کس مزاج کے لوگ ہوں گے۔ اتنا بڑا سا گھر ہے ان کا مزاج بھی نخریلا سا ہوگا، مگر وہاں بڑے گھروں والی کوئی بات ہی نہیں سادہ سا سفر پھر ہے اور بہت اچھے مزاج کی خواتین ہیں، دونوں ہی سادہ اور پر خلوص تھیں۔ ان کے گھر میں دو لڑکیاں بھی ہیں، پہلے وہ یہی سمجھیں کہ میں ان کی لڑکیوں کی پہلی ہوں اور نانی جان ان کے گھر میں ایک لڑکا ہے اس نے بکری کا ایک بچہ پال رکھا ہے بلکہ اس کو پانا بیٹا بنایا ہوا ہے جب میں ان کے گھر میں داخل ہوئی تب وہ اسے ہوا میں گول چکر دے رہا تھا۔“

اس نے ہنستے ہوئے نانی کو یہ بات بتائی تھی سن کر بولیں۔

”ہاں بھئی ہوتے ہیں کچھ لوگ جو جانوروں سے بہت محبت کرتے ہیں مگر ہمیں ان کے لڑکوں کو دیکھنے ان کی عادات جاننے کی کوئی ضرورت نہیں بس لڑکیوں کے پاس چلی جایا کرنا اور کچھ دیر بیٹھ کر واپس آ جایا کرنا۔“

”بیٹی! کیا نام ہے تمہارا؟“ کرسی پر جو بیٹھی تھیں وہ پوچھ رہی تھیں۔
 ”زیب النساء“ اس نے دھیرے سے بتایا پھر بولی۔

”میں ایک کام کے لیے آئی تھی اگر کر دیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔“

”ہاں ہاں ضرور بتاؤ کیا کام ہے“ دونوں دل و جان سے تیار دکھائی دیئے لگیں۔
 اس نے نانی کی بیماری کا بتایا اور دوا کا نام بتا کر بولی۔

”ای بھی بازار گئی ہیں ورنہ آپ کو زحمت نہ دیتے۔“

”اس میں زحمت کی بھلا کیا بات ہے۔ پڑوسیوں کا تو بڑا حق ہوتا ہے چلو جنید! بہن کو دودھ الا کر دو۔“

انہوں نے لڑکے سے کہا، وہ بھی فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور ساتھ ہی زبیاہ یہ کہتے ہوئے آگئی۔
 ”نانی گھر میں آئی ہوں گی، میں چلتی ہوں۔ پندرہ منٹ کے بعد آ کر پتا کر جاؤں گی۔“

”یہ خود دو تمہارے گھر دے آئے گا اور جب تمہاری نانی کی طبیعت ٹھیک ہو جائے پھر ہماری طرف ضرور آنا۔ فری اور نائلہ تم سے مل کر بہت خوش ہوں گی، اپنی نانی اور امی کو ہماری طرف سے سلام کہنا اور یہ بھی کہ ہم نانی کا حال پوچھنے آئیں گے تمہاری طرف۔“

وہ ان لوگوں کے اخلاق سے متاثر ہوتی خدا حافظ کہتی باہر نکلی تو راہداری میں بکری والا لڑکا کھرا گیا۔

وہ ان لوگوں کے اخلاق سے متاثر ہوتی خدا حافظ کہتی باہر نکلی تو راہداری میں بکری والا لڑکا کھرا گیا۔

”آپ جوں پہ بغیر تشریف لے جا رہی ہیں؟“
 لہجہ شائستہ مگر آنکھوں میں شوخی و شرارت سی تھی۔

”جی بس مجھے جلدی ہے آپ کا شکریہ۔“ اس نے جانے کو قدم بڑھائے۔

”شکریہ تو آپ کا کہ آپ کی بدولت آج ہم

”کمال کرتی ہیں آپ بھی نانی! اب بھلا میں کوئی ایسی ویسی ہوں مجھے تو اس کی اس محبت پر ہنسی آرہی تھی اس لیے آپ سے بھی ذکر کر دیا“

”بہت دیر گردی تمہاری ماں نے اب تک تو آ جانا چاہیے تھا۔ چلو خیر آ جائے گی خریداری بھی تو خاصی کرنا تھی۔“

خود ہی سوال خود ہی جواب زیب کی رائے نہیں چاہتی تھی ذرا دیر کے بعد بولیں۔

”مجھے پانی تو پلاؤ اور سنو اب جوان کا لڑکا دو ا لے کر آئے گا تو اسے دروازے سے ہی نہیں لوٹانا اندر بلا لینا چاہئے پلا کر بھیجتا۔“

”نانی! اتنی گرمی میں وہ بے چارہ دادائی لے کر آئے گا اور پھر اوپر سے مزید ظلم یہ کہ اسے چائے پلائی جائے گی وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے گا کہ میں نے ان کی مدد کر کے انتہائی غلطی کی ہے۔“

”اچھا زیادہ باتیں مت ہاؤ شربت ختم ہو چکا ہے اگر لیموں رکھے ہں تو تبکین بنالینا۔“ وہ اثبات میں سر ہلا کر چکن میں آگئی۔

کچھ دیر بعد امی اور ان کی آمد کے پانچ منٹ بعد جنید نانی کی دوا لے کر آگیا نانی نے امی سے کہا۔

”اسے میرے کمرے میں ہی لے آؤ ایسے نیک بچے کو دیکھ کر دعا تو دے دوں۔“

امی کی ساری شائنگ اسی کمرے میں نانی کے پلنگ کے برابر والے پلنگ پر پھیلی ہوئی تھی زیبا اور

امی نہیں چاہ رہی تھیں کہ جنید یہاں آئے مگر نانی نے آواز دے کر بلا لیا۔ سر پر دست شفقت پھیرا۔ حال احوال نام مشاغل غرض دس منٹ میں اچھا خاصا انرو یو کر ڈالا۔

”نانی! میرے کزن کو آپ جیسی خواتین بہت اچھی لگتی ہیں اگر وہ میرے ساتھ آتا تو آپ کو دیکھ کر مجھ سے کہیں زیادہ خوش ہوتا۔“

”اچھا کہاں ہوتا ہے تمہارا کزن؟“ نانی کو بھی دلچسپی پیدا ہوئی۔ ویسے جنید سے گفتگو کے دوران وہ

اپنی بیماری کو فرائض کر چکی تھیں اور خاصی فریض دکھائی دینے لگی تھیں۔

”یہیں گھر پر ہوتا ہے میرے ماموں کا بیٹا ہے وامق نام ہے اس کا۔“

”اچھا میری طبیعت سنبھل جائے تو میں آؤں گی تم لوگوں کی طرف۔“

جنید کچھ دیر بیٹھا پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

”کیسا سعادت مند بچہ ہے۔ نیک والدین کی اولاد لگتا ہے بتا رہا تھا والد حیات نہیں یہ اور اس کی بہن بس دو ہی بہن بھائی ہیں بہن اس سے چھوٹی ہے۔“

”واہ نانی! آپ نے تو مکمل معلومات حاصل کر لی ہیں۔“ وہ ہنس پڑی تھی۔

”پڑوسی ہیں ہمارے اور ان کے بارے میں ہمیں ایک نہ ایک روز تو سب علم ہونا ہی ہے پھر میں نے کوئی غلط بات نہیں کی اس کے ساتھ ادرا کر اسے ہم سے کچھ چھپانا ہوتا تو میری باتوں کے جواب دینا ہی نہیں نیسہ تم ہو آنا ان کی طرف اچھے لوگ ہیں۔ زیبا بھی بڑی تعریف کر رہی تھی۔“

”زیبا کو کس نے بتایا ان کے بارے میں امی حیران ہوئیں۔

جواب میں زیبا نے سب بتا دیا۔

”اکیلے جانے کی کیا ضرورت تھی ذرا دیر بعد میں آئی جاتی۔“

”اچھا! ماں کا کوئی احساس ہی نہیں میں چاہے دنیا سے اٹھ جاتی۔“ نانی کو سخت غصہ آگیا۔ بلڈ پریشر سہلے ہی ہائی تھا، دونوں پریشان ہو کر انہیں منانے لگیں۔

☆☆☆

شام کو زیبا نے سمو سے بنائے نانی کو پڑوسی ہا اگئے بولیں۔

”چار پانچ سمو سے پڑوس میں دے آئے۔“

”اچھا نہیں لگتا بار بار ان کے ہاں جانا۔“

جانا نہیں چاہ رہی سی۔
 ”کیوں اچھا نہیں لگتا“ یوں کہو کچھ دینا اچھا نہیں لگتا۔ بی بی! دل کو کشادہ رکھتے ہیں اور پڑوسیوں کا تو براحتی ہوتا ہے۔“
 ”وہاں اتنے سارے لوگ رہتے ہیں اور میں چار سو سے لے کر پینچ جاؤں اپنی اوقات بتانے۔“
 ”ایک تو تمہیں احساس کمتری نے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ اگر محل نہیں ہے ہمارے پاس تو جھونپڑا بھی تو نہیں اچھے خاصے کچے گھر میں رہتے ہیں۔ زیادہ نہیں مگر اتنی زرعی زمین تو ہے کہ ہم مینوں کی گزر بسر ہو سکے۔ تم بتائیں کن سوچوں میں رہتی ہو دولت کی خواہش نے تمہیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔“
 ”یہ بات نہیں ہے نانی جان! میں تو بس اتنا کہنا چاہ رہی تھی۔“

”کوئی ضرورت نہیں صفائیاں پیش کرنے کی، سمو سے رکھو پلیٹ میں اور دے کر آؤ ان کے ہاں۔“
 ”ای سے تو پوچھ لوں! انہیں پہلے بھی میرے ادھر جانے پر اعتراض ہو رہا تھا۔“
 ”کوئی اعتراض نہیں تھا۔ چلو جلدی دے کر واپس آؤ میں چائے کے انتظار میں بیٹھی ہوں۔“
 دوپٹہ درست کرتی پلیٹ میں پانچ سمو سے رکھے وہ شرمندہ سی ایک بار پھر ان کے گیٹ پر کھڑی تھی۔

”آئیے آئیے رک کیوں گئیں۔“ وہی بکری والا لڑکا یہاں قریب ہی کھڑا پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ زیبا نے اندر آ کر شائستگی سے سلام کیا۔ جس کا جواب دینا اس نے ضروری نہیں سمجھا پلیٹ پر نگاہیں جمائے بولا۔
 ”کیا لے کر آئی ہیں؟“

اس نے جواب دینے کے بجائے اسے تھما دی ملید کروشیے کا رومال ہٹا کر دیکھا اور بولا۔
 ”آپا! سموئے تو یہ خوشبوئیں آپ کے گھر سے

اٹھ رہی تھیں، ادھر میں بری طرح بے چین ہو رہا تھا ہمارے گھر میں تو سب کے سب نئے کام چور ہیں، تین وقت کی روٹی کے سوا کچھ نہیں پکتا یہاں۔ آپ جب بھی ایسی مزے مزے کی چیزیں پکایا کریں مجھے ضرور بھیجا کریں۔“ ایسی بے لکھی اور نیدے پن پر وہ حیران تو ہوئی مگر حیرت ظاہر نہیں کی اثبات میں سر ہلادیا۔

وہ ایک سموہ اٹھا کر کھانے لگا ساتھ میں تعریف بھی جاری رہی اور کھانے کے بعد بولا۔
 ”مجھے جنید نے بتایا تھا آپ کے گھر میں ایک نانی بھی ہیں جو مجھے بے حد پسند آئیں گی، اور اب تو میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ یہ پڑوسی ہی مجھے بے حد پسند آئیں گے۔“

”میں اب چلتی ہوں۔“ وہ اسے اندر جانے کو بھی نہیں کہہ رہا تھا۔ گیٹ کے سامنے اس کا راستہ روکے ہی کھڑا سموں سے انصاف کرنے میں مشغول تھا۔

”اتنی جلدی بھی کیا ہے۔“
 ”مجھے چائے بنانی ہے۔ نانی انتظار کر رہی ہوں گی۔“

اس نے واپسی کے لیے قدم بڑھائے۔
 ”اپنی پلیٹ تو لیتی جائیں۔“
 ”پھر کبھی لے جاؤں گی۔“

”چلو جیسے آپ کی مرضی۔“ اور وہ واپس آگئی لگتا ہے سب سمو سے یہی کھا جائے گا گھر والوں کو تو پتا بھی نہیں چلے گا کہ میں کچھ لے کر آئی تھی ویسے مجھے پلیٹ واپس لے آئی چاہئے تھی اتنا قیمتی سیٹ ہے



ہمارا اب جو یہ پلیٹ اس نے ادھر ادھر رکھ دی تو سب خراب ہو جائے گا۔

گھر آئی تو نانی رپورٹ لینے کو بے تاب اس کی منتظر بیٹھی تھیں۔

”ہاں پھر دیے تم نے ان کو سمو سے؟ لے کر کیا کہا انہوں نے؟“

”نانی! ان کا بکری والا لڑکا گیٹ پر ہی مل گیا تھا اس نے پلیٹ وہیں پکڑ لی اور میں واپس آ گئی“

”اے ہے یہی بے وقوف ہو تم اندر جا کر کسی خاتون کے ہاتھ میں پکڑانی تھی۔ لڑکے تو بڑے چنورے ہوتے ہیں وہ سب خود ہی کھا جائے گا گھر کی عورتوں کو تو علم بھی نہیں ہوگا۔“

”چلیں نہیں تو نہ سہی“ ہم کون سے سونے کے سمو سے لے کر گئے تھے۔“

نانی اس کی حماقت پر بڑبڑاتی رہیں وہ کچن میں آ گئی امی نے چائے بنائی تھی اب کپوں میں انڈیل رہی تھیں وہ بھی ان کے قریب آ کھڑی ہوئی۔

”زیبا کتنے لوگ ہیں پڑوس میں؟“ انہوں نے پوچھا۔

”پتا نہیں امی میری ملاقات ابھی سب سے نہیں ہوئی ویسے میرا خیال ہے کافی سارے لوگ ہیں تقریباً سات اٹھ یا شاید اس سے بھی زیادہ بھرے پڑے گھر کتنے اچھے لگتے ہیں ہے ناں امی!“

اس کے لہجے میں حسرت تھی۔ انہوں نے محسوس کیا جواب میں بولیں کچھ نہیں ”اگر ممانی اتنے تیز مزاج کی نہ ہوتیں تو ہم ان کے ساتھ رہ سکتے تھے ان کی دونوں بیٹیوں سے تو میری اچھی دوستی تھی، ہم ان سے کچھ مانگتے تو نہیں تھے پھر بھی ممانی کو ہمارا وہاں رہنا اچھا نہیں لگا۔ بے چاری نانی بھی آپ کی خاطر بیٹے کا گھر چھوڑ آئیں“

”اب چھوڑو ان باتوں کو“ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔“

”امی! اگر ابا دوسری شادی نہ کرتے تب ہم اتنے اکیلے نہ ہوتے“ ان کی بات ان سنی کر کے وہ کہہ

رہی تھی۔

”اگر، مگر“ کاش ان باتوں سے بھلا کیا ہوتا ہے۔ جو قسمت میں لکھا ہو وہ ہو کر رہتا ہے“ انہوں نے دھیرے سے کہا۔

”اب بھی تو ابا کو دو مزید بیٹیاں ہی ملی ہیں بیٹے کی آرزو میں دوسری شادی کی تھی مگر بیٹیاں نہیں ہوا اور میری دعا ہے وہ بھی نہیں۔ انہوں نے ہم پر ظلم توڑا ہے انہیں سزا ملنی چاہئے۔“

”تم جی مت جلایا کرو خوش رہا کرو“ میں اور اماں تو ہیں تمہارے سر پر پھر تمہیں کس بات کی فکر ہے۔“

”امی! مجھے ابا پر بڑا غصہ آتا ہے۔ کس طرح انہوں نے بیوی اور بیٹی کو در بدر کر دیا۔ ہمیں زمانے کے سرد گرم سننے کو اکیلا چھوڑ دیا۔ یوں بھول گئے جیسے ہم سے کوئی تعلق تھا ہی نہیں۔“

”نہ مرد ذات ایسی ہی ہوتی ہے“ امی کے منہ سے آہ نکل گئی۔

”اور ماموں، انہیں بھی تو توفیق نہیں ہوتی کہ مبینے دو مبینے بعد ہمارا نہیں تو نانی کا ہی حال پوچھنے آ جایا کریں۔“

”سچ امی! اگر نانی کی یہ تھوڑی سی جائیداد آپ کے حصے میں نہ آتی تو ہم تو بھیک مانگنے پر مجبور ہو جاتے“ اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

”ایسے نہیں سوچتے بیٹی! اللہ تعالیٰ سب کا رازق ہے وہ تو وہاں سے بھی رزق عطا کرتا ہے جہاں سے انسان کو امید بھی نہیں ہوتی، چلو شام یہ چائے کے برتن باہر رکھو اماں منتظر بیٹھی ہوں گی ان کے سامنے ایسی کوئی بات نہیں ہونی چاہیے ان کی طبیعت آج ویسے بھی کچھ ٹھیک نہیں۔“

وہ ان سے برتنوں کی ٹرے لے کر باہر آ گئی جہاں نانی واقعی منتظر بیٹھی تھیں۔ امی آئیں تو انہیں دیکھتے ہی بولیں۔

”تم نے سنا! یہ پلیٹ کسے تھا آئی ہے“ اور پھر تفصیل سے اس کی حماقت کے بارے میں بتانے

گلیں۔
”چلیں اماں کوئی بات نہیں، دانے دانے پر مہر ہوتی ہے اگر یہ اس لڑکے کی قسمت کا تھا تو پھر وہی کھائے گا آپ غصہ نہ کریں“

نانی اماں کو سوسو پسند نہیں آئے، مریں زیادہ لگ رہی تھیں انہیں اور ایک اعتراض یہ بھی تھا۔
”تم نے ٹھیک طرح سے لال نہیں کیے کچے ہی نکال لیے ہیں۔ زیا تم حد سے زیادہ کام چور ہوتی جا رہی ہو، ایسے سوسو کھا کر ہمسائے کیا سوچیں گے ہمارے بارے میں، کیسی پھوپھو عورتیں ہیں، کچھ بنانے پکانے کا سلیقہ ہی نہیں ہے انہیں۔“
”نانی! ایسی باتیں خواتین کرتی ہیں اور یہ تو ان تک پہنچیں گے ہی نہیں۔ وہ لڑکا سارے کے سارے ٹرپ کر چکا ہوگا۔“

”خدا کرے ایسا ہی ہو۔“
کوئی انہیں یا ان کے خاندان کو پھوپھو کہہ نہ سکتی تھی ان کی برداشت سے باہر تھا کہ وہ واقعی بڑی طریقے سلیقے والی خاتون تھیں اب تو صحت اجازت نہیں دیتی تھی کہ کچھ پکانے کو کچن میں جائیں یا سلائی بنانی کریں جب تک صحت رہی، خاندان میں اور ملنے والوں میں ان کی بے حد تعریف اور دھوم رہی، وہ چاہتی تھیں سارے ہنر اب نوای کو بھی سکھا دیں مگر زیا کو اپنی پڑھائی بڑی عزیز تھی کچن کا کام تو دلچسپی سے کر لیتی مگر اون کروشیے میں اسے بالکل مزا نہیں آتا تھا یہ بھی بھلا کوئی بات ہے، ایک خانہ اتار دے چڑھاؤ، نظر نکائے صبح سے شام اچھے رہو، البتہ اس کی ای یعنی نیسہ بیگم بہت باہر تھیں سلائی بنانی اور کروشیے کے کام میں۔

☆☆☆

”کیسا اجاڑ سا مہن ہے اور ہے بھی اچھا خاصا اگر ادھر کیاری بنا کر گلاب موتیا اور کچھ بنزریاں لگائی جائیں تو بہت اچھا رہے۔“ نانی آج گھر کے ایک ایک کونے کو سنوارنے کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنفہ	قیمت
اساطول	آمنہ ریاض	500/-
ذروم	راحت جمیل	1000/-
زندگی ایک روشنی	رخسانہ نگار صدتان	500/-
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رخسانہ نگار صدتان	200/-
شہر دل کے دروازے	شازیہ پودھری	500/-
تیرے نام کی شہرت	شازیہ پودھری	250/-
دل ایک شہر جوں	آسیہ مرزا	450/-
آئیوں کا شہر	فاخرہ افکار	500/-
بھول بھلیاں تیری گلیاں	فاخرہ افکار	600/-
پھلاں دے دے گنگ کالے	فاخرہ افکار	250/-
یہ گلیاں یہ پوہارے	فاخرہ افکار	300/-
سین سے گورت	غزالیہ عزیز	200/-
دل آسے ڈھوپ لایا	آسیہ ذوقی	350/-
بکھرنا چاہیں خواب	آسیہ ذوقی	200/-
دھم کو خدقہ سیمائی سے	فوزیہ یاسین	250/-
اماں کا چاند	بٹری سمیعہ	200/-
رنگ خوشبو و اماں	افسانہ آفریدی	500/-
درو کے قاسطے	رضیہ جمیل	500/-
آج سگن پچانے کوں	رضیہ جمیل	200/-
درو کی منزل	رضیہ جمیل	200/-
میرے دل میرے مسافر	حیمہ قریشی	300/-
جیری راہ میں زل گئی	میمونہ خورشیدی	225/-
شام آرزو	ایم سلطانہ فخر	400/-

”ہاں نانی جان! نمائز کے پودے تو بہت سارے ہونے پائیں پھر جب لال لال نمائز لگیں گے تو میں کچپ بناؤں گی۔“

”صرف نمائز ہی نہیں مولیاں، گاجریں، مٹر اور بھتہد رسب ہی کچھ لگ سکتا ہے نسیمہ کل تم بازار جاؤ تو بیچ لیتی آتا۔“

”اماں! آج آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں، صبح کیاریاں بنانے میں لگ جائیں گی، کچھ دن آرام کریں پھر یہ سب دیکھا جائے گا۔“

”برسات تو بس شروع ہوا ہی جا رہی ہے اس موسم میں بنری لگا دوں گی تو اچھا رہے گا بس تم کل بیچ لیتی آتا۔“

شام تک موسم بالکل ٹھیک تھا، یہ تینوں رات نو بجے تک صحن میں ہی بیٹھی رہیں۔ نانی کی طبیعت بھی بہتر تھی وہ موڈ میں بھی تھیں۔ پرانے قصبے کہانیاں جن میں زبیا کو ہمیشہ ہی بڑی دلچسپی اور کشش محسوس ہوتی تھی سناتی رہیں۔ نانی بتایا کرتی تھیں۔

”میرا میکہ بہت امیر تھا بہت سے باغات ہماری ملکیت تھے۔ لکڑی کا کام یعنی درختوں کی خرید و فروخت بھی ہوتی تھی۔“ میرے ابا کا بہت بڑا بنگلہ تھا جس کے کمرے اتنے بڑے تھے کہ پوری بارائت آرام سے سما سکتی تھی، ہمارے ہاں لحافوں کے غلاف خالص ریشم کے بنے تھے ان پر سچا گونا گونا جاتا تھا یا پھر شنیل کے خوبصورت لحاف ہوا کرتے تھے۔ مسہری پر باریک جالی جس پر چاندی کا خوبصورت کام بنا ہوتا تھا ڈالی جالی تھی اور ملازم عورتیں باورچی خانے میں تھکی ہر وقت ہی کوئی نہ کوئی مزیدار چیز تیار کرتی رہتی تھیں۔ چوبیس گھنٹے مہمانوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا اور چوبیس گھنٹے ہی ہمارے ہاں چولہا جلتا تھا۔“

آنے والے مہمانوں کے قصبے جو بے حد نفیس تھے، تحائف کے ساتھ نانی کے ابا کی حویلی میں اترا کرتے تھے، گھر میں رہنے والی پھوپھیوں، چاچوں کے قصبے اور اس دور کی بہت سی باتیں برسات یوں منائی جاتی تھی۔ جاڑے کا استقبال، بخیر ی اور حلوہ

جات بنا کر کیا جاتا تھا۔

گرمائے کے آغاز پر ڈھاکہ سے ملل منگوائی جاتی تھی۔

”ہائے کیا دور تھا اور کیا مزے تھے نانی اماں کے۔ کتنا خوبصورت اور بھرپور دقت گزارا ہے انہوں نے۔ اسی لیے تو بسا با اعتماد ہیں۔ کسی کی ددلت سے قطعاً مرعوب نہیں ہوتیں، کبھی جو میں ایسی بات منہ سے نکال دوں تو کندھے اچکا کر کہتی ہیں۔“ یہ تو کچھ بھی نہیں میرے لبا کے پاس تو اس سے کہیں زیادہ دولت تھی اور ساری کی ساری حق حلال کی کمائی تھی۔

ایک میں ہوں، جب سے ہوش سنبھلا ہے۔ اماں کو ترس رہی ہوں۔ اچھا گھر میرا خواب ہے۔ نانی کے بتا چکنی دولت نہ ہوا تھے ٹھٹھ نہ ملیں مگر کچھ نہ کچھ تو ہونا چاہئے۔ اب یہ گھر اس میں تو رہتے ہوئے شرم آتی ہے، کمرہ کی حالت تو درست ہے مگر بیرہی دروازہ اور دیوار کیسی بدرنگ ہو رہی ہے، باہر سے دیکھو تو یہ بالکل کھنڈر معلوم ہوتا ہے۔ ظفر اللہ صاحب نے کہا یہ بہت کم مانگا تھا۔ امی نے غنیمت جانا اور آگئیں یہاں پر دیئے ظفر اللہ صاحب کو ایسے کھنڈر کا کرایہ مانگتے ہوئے شرم آتی چاہیے تھی، بھلا یہ انسانوں کے رہنے کے قابل ہے دو کمرے اور جھڑتے سینٹ کی دیواروں والا صحن جس کا فرش آدھا کچا ہے آدھے میں ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کے ٹکڑے لگے ہوئے ہیں۔ صحن میں نکلوتو سنبھل کر چلنا پڑتا ہے ورنہ ٹھوکر کھا کر گر بھی سکتے ہیں پتا نہیں مجھے بھی کسی ایسے سے گھر میں رہنا نصیب بھی ہو گا یا نہیں۔ ہائے مالک مجھے ان حسرتوں کے ساتھ ہی دنیا سے نہ اٹھالیا تیرے یہاں کس چیز کی کمی ہے بس مجھے اچھا سا گھر اور آسودہ حال زندگی عطا فرمادے۔“

نانی اور امی سونے کے لیے برآمدے میں بستر لگا کر لیٹ چکی تھیں اور اس کے ذہن میں نانی کی سنائی کہانیاں چکرارہتی تھیں۔ وہ کھلے کھلے آنگن جن میں مویچے اور گلاب کے خوشبو لٹاتے پھول کھلتے تھے۔ بڑے بڑے سجے سجائے کمرے اور زیورات

میں لدی قیمتی کپڑوں میں ملبوس ہنستی مسکراتی ادھر سے ادھر جاتی لڑکیاں۔

وہ صحن میں بیٹھی دور بہت دور کہیں گم تھی۔ پھر اسے نیند آگئی وہ وہیں تخت پر لیٹی اور سو گئی۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ کچھ ناموس سے شور سے آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور بجلی بڑے زور و شور کے ساتھ چمک رہی تھی بارش بس شروع ہوا چاہتی تھی۔ وہ برآمدے میں آکر امی کے برابر والے بستر پر لیٹ گئی۔

بادل کی گرج اور بجلی کی چمک نے نانی اور امی کو بھی بیدار کر دیا تھا نانی اور زیادہ دونوں ہی کڑکتی چمکتی بجلیوں سے بہت ڈرتی تھیں اور موسم کے تیور انہیں سہائے جاتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ ایسا طوفان کہ دل سہم جاتے تھے انہیں یہ فکر بھی تھی کہیں کوئی دیوار نہ گر جائے۔ مگر خیریت ہی رہی۔

”اماں ابھی تو آپ کیاریاں بنانے کی بات کر رہی تھیں اب ہمسائیوں کے ہاں جارہی ہیں۔“

نیسہ بیگم چادر اوڑھ کر بازار جانے کو تیار کھڑی تھیں۔ ”گھڑی دو گھڑی بیٹھ کر واپس آجائیں گے، ہم نے کون سی داستان امیر حمزہ شروع کرنا ہے وہاں جا کر۔“

امی بازار چلی گئیں۔ زربا نے منہ ہاتھ دھو کر بال بتا لیے مگر نانی کی تیاری مکمل ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ آنکھوں میں سرمہ لگایا پھر دونوں کلاٹوں میں سونے کے کڑے، ہاتھ میں انگوٹھیاں، کانوں میں ہلکی سی جھبکیاں مگر انہیں لگنا کہ شاید کی رہ گئی ہے۔ ”ابھی بھی تیاری نا مکمل ہے چلیں ناں نانی جان! اب تو دیر ہو رہی ہے۔“

”دیر کا ہے کی صبح کے ساڑھے نو بج رہے ہیں“

”مگر آپ اتنی لمبی چوڑی تیاریوں میں کیوں لگ جاتی ہیں۔“

”یہ ضروری ہے زربا بیٹی! آخر لوگوں کو یہ علم ہوتا چاہیے کہ ہم شروع سے ہی حالات کے ستائے ہوئے ہرگز نہیں ہیں، کبھی ہم بھی بہت فضل رہا ہے ہم طریقے سیتے والی فیملی سے تعلق رکھتے ہیں اور کہیں آنے جانے، ملنے ملانے کا ڈھنگ آتا ہے ہمیں۔“

وہ بھی نانی کی بات کی قائل ہو گئی واقعی اگر نانی زبورات پہن کر ان کے ہاں جائیں گی تو زیادہ قدر ہوگی۔

دونوں جب اس سفید عمارت میں داخل ہوئیں تو یہاں وہاں دیرانی تھی لان بالکل سنسان تھا۔ ”بڑے ہی بد ذوق لوگ ہیں۔ ایسے موسم میں بھی کمرے میں گھسے بیٹھے ہیں!“ نانی نے ناک چڑھا کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

”گھٹ کھلا تھا ہم بغیر نیل دے اندر آ گئے، میرا خیال ہے کال نیل بجائی جائے تاکہ کوئی باہر آئے وہ دوبارہ گھٹ کی طرف بڑھی نانی بڑے شوق سے

☆ ☆ ☆
صبح موسم بہت خوشگوار تھا۔ دھوپ نہیں نکلی یاد دل چھائے ہوئے تھے ادھر وہاں میں مستی سی بھری تھی۔ نانی بہت خوش تھیں۔ امی سے کہہ دیا تھا آج میں کیاریاں بناؤں گی۔ بازار سے سبزی گوشت لینے جاؤ تو بج یاد سے لیتی آتا۔ زربا صحن میں کھڑی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی اس کے چھوٹے سے گھر کے برابر میں کھڑی وہ بڑی سی عالی شان عمارت جس میں کئی درخت تھے اور سبز درختوں میں گھری وہ سفید عمارت جس پر سرمئی بادلوں کا سایہ تھا، گنتی دلکش دکھائی دے رہی تھی۔ لیکن بھی اچھے سادہ مزاج کے مالک ہیں اگر ان کے ہاں جایا جائے اور ان کے لان میں لگے پھولوں کو چھوا جائے تو ہرگز برا نہیں مانیں گے۔“

”نانی جان! کیا خیال ہے موسم بہت اچھا ہو رہا ہے آج ہم ہمسائیوں کے ہاں نہ ہوا میں؟“

”خیال تو نیک ہے، میں کپڑے بدل کر بالوں میں کٹکھاکریوں پھر چلتے ہیں۔“ نانی کو اپنے ہار کٹھا کر بڑی فکر رہتی تھی۔

گا۔ آنے جانے میں اصل میں ہمارے رشتے کے ایک دادا ابا چاک صرف پچاس سال کی عمر عزیز پا کر اس دار فانی سے کوچ کر گئے ہیں۔

صبح ہی صبح جب سب گھر والے خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے، انہیں دادا کی ابدی نیند کی اطلاع ملی لپک جھپک جیسے تیسے سب تیار ہوئے اور افسوس کو چل پڑے۔ گھر میں صرف میں ہوں اور میں نے ابھی ناشتا بھی نہیں کیا کیونکہ مجھے صرف انڈا بنانا اور تو س گرم کرنا آتا ہے اور مڑے گی بات آج گھر میں نہ انڈے ہیں نہ تو س، میں صبح سے خیالوں ہی خیالوں میں مزیدار پرائیٹے کھا کر خود کو بہلا رہا ہوں اب یہ آپ کی نواسی آئیں تو بیان نہیں کر سکتا مجھے کیسی مسرت حاصل ہوئی تھی خیال تھا موسم کی مناسبت سے حلوہ پوری وغیرہ بنا کر لائی ہوں گی، مگر ہائے افسوس ایسے نصیب والے بھی کہاں ہیں ہم کہ جو آرزو کریں وہ جھٹ سے پوری ہو جائے۔

”ہائے بچے صبح سے بھوکے بیٹھے ہوئے ساتھ تو ہمارا گھر تھا دروازہ کھٹکٹا دیتے زیبا چہمیں ناشتا بنا دیتی۔“

”کون زیبا؟“

”میرا نام زیبا ہے۔“ اس نے دھیرے سے

یاد دلایا۔

”بہت شکریہ نانی جان! ایسے پُر خلوص لوگوں کے لیے میرے دل میں خود بخود جگہ بن جاتی ہے میں آپ کے اخلاق سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔“

”جاؤ بیٹی! بادرچی خانے کا پوچھ لو اور بھائی کے لیے ناشتا بنا دو۔“

”کیا؟ آپ کے بھائی نے بھی ابھی تک ناشتا نہیں کیا؟“

”میرا تو کوئی بھائی نہیں، نانی آپ کے لیے ناشتا بنانے کو کہہ رہی ہیں۔“

”میرا نام دامت ہے۔ دامت فرحان۔“ اس نے وضاحت کی۔

”کچن کس طرف ہے؟“ نانی نے پھر اشارہ کیا

یہاں کھلے پیارے پیارے پھولوں کو دیکھنے لگیں نیل کی آواز پر دہی شوخ سا لڑکا باہر آیا تھا پہلے نگاہ نانی پر پڑی اس نے سلام کیا اور بولا۔

”آپ شاید سلیم کی دادی ہیں، اگر دہی ہیں تو سلیم سے کہہ دیجئے گا۔ اب بہت دن ہو گئے مجھ سے جو نوٹس لے کر گئے تھے واپس کر دو۔ اتفاق سے وہ میں نے اپنے لیے تیار کیے تھے، اور ایک شکایت مجھے اور بھی کرنا تھی آپ سے۔“

”السلام علیکم!“ زیبا نے دھیرے سے کہا اس نے نانی سے نگاہ مٹا کر اسے دیکھا اور بولا۔

”آئیے میں۔۔۔ صبح سے آپ کا انتظار کر رہا تھا۔ ایسی بات پر نانی کی آنکھیں پھٹ سی گئیں اور منہ کھل گیا۔ ادھر زیبا کا رنگ واضح طور پر بدلا اور چہرے پر گھبراہٹ چھا گئی۔ ادھر وہ کہہ رہا تھا۔ ”اصل میں مجھے پوری امید تھی کہ ہمارے بازو قہم سائے ایسی پیاری برسات کو منائے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ وہ ضرور برسات کے اس حسین موسم کی مناسبت سے کوئی پکوان تیار کر رہے ہوں گے، بس میں انتظار میں ہی تھا مگر آپ تو خالی ہاتھ دکھائی دے رہی ہیں۔“ اس کی وضاحت سے دونوں کی جان میں جان آئی۔

”یہ میری نانی ہیں۔ انہیں میں لے کر آئی ہوں۔“

اس نے تعارف کر دیا۔

”اچھا تو آپ کے ہاں برسات کے موسم میں پکوان کے بجائے نانی۔“

کچھ کہتے کہتے خیال آیا فقرہ نامکمل چھوڑا اور بات بدل کر بولا ”میں پہلے ہی سوچ رہا تھا ایسی معقول خاتون سلیم کی دادی ہونی نہیں سکتیں۔“

”آئیے۔ آپ لوگ اندر آ جائیں۔“

اس نے انہیں اسی بڑے سے کمرے میں لا بٹھایا جہاں کل لے کر آیا تھا مگر آج یہاں کوئی موجود نہیں تھا۔

”بیٹا! تمہاری والدہ کہاں ہیں انہیں بلو!“

”نانی! انہیں بلو تو لوں مگر کافی تاخیر لگ جائے

تو اسے اٹھنا پڑا اور نہ پرانے گھر میں جہاں معلوم ہی نہیں کون سی چیز کہاں رکھی ہے ناشتا بنانا اسے خاصا مشکل لگ رہا تھا۔

اس نے اشارے سے بتا دیا اور خود تانی کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”بنا! تمہارے دادا بیمار تھے کیا؟“

”نہیں، بیمار کہاں تھے سنا ہے چنگے بھلے تھے

اچانک ہی ظالم موت نے آن دبوچا۔ ہائے ہائے حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مر جھائے۔“

انسوس اور دکھ کا گہرا تاثر اس وقت اس لڑکے کے چہرے پر دیکھا جاسکتا تھا۔

”رشتے کے دادا بتایا ہے تا تم نے؟“

”جی ہاں، وہ میری بہن کے شوہر کے چچا تھے۔

سسرال کا معاملہ تھا اس لیے بھی سب سویرے ہی سویرے چل پڑے۔ مجھے بھی جگایا تو سمیتر تھا مگر میں

اس وقت ایک بڑا ہی اچھا خواب دیکھ رہا تھا کہہ دیا میرے جانے سے وہ زندہ تھوڑی ہو جائیں گے مجھے

سو یاد سنے دیں آپ لوگ ہو کر آئیں ویسے بھی گھر میں کسی نہ کسی کو تو ٹھہرنا تھا۔“

تانی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ یہ سب مذاق کے رنگ میں کہہ رہا ہے یا اس کے بات کرنے کا انداز ہی ایسا ہے۔

”میں آپ کو اپنے غنئی سے ملواتا ہوں۔ بڑا ہی شریر اور ہنس کھ ہے آپ اس سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔“

وہ اٹھ کر غنئی کو لینے چلا گیا اس کے جانے کے تھوڑی دیر بعد زبانا شتابنا کر لے آئی۔

”کہاں گئے؟ آپ اکیلے بیٹھی ہیں۔“

”کسی غنئی کو لینے گیا ہے کہتا ہے بڑا پیارا بچہ ہے۔“

وہ ہنس پڑی اور بولی۔ وہ تو اس کی بکری کا نام ہے۔

”اچھا میں سمجھی کوئی بھانجا بھتیجا ہوگا، یہ لڑکا مزاج کا اچھا ہے، مگر میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا،

باقی کچھ عجیب سی ہیں اس کی۔“

”نانی! ان کا گھر کتنا پیارا ہے، اور یہ صوفے کتنے نرم نرم ہیں بیٹھ جاؤ تو اٹھنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔“

تانی نے سرسری انداز میں نگاہ ادھر ادھر دوڑائی اور ہلکے سے ہنکارا بھرا پھر بولیں۔

”وہ بتا رہا تھا۔ گھر میں نہ تو انڈے ہیں نہ تو س تم نے ناشتا کیا بتایا ہے۔“

”ان کے فریج میں تھوڑا قیمہ پڑا تھا۔ آنا بھی مگدھا ہوا رکھا تھا۔ قیمے والا پڑھا بتایا ہے اور ساتھ میں وہی ہے۔“

”دہی میں کالی مرچ، نمک اور زبردہ ڈال لیتا تھا۔“

”جی تانی جان! ڈال دیا ہے۔“

”یہ دیکھیے یہ ہے غنئی! آپ کے بارے میں بتایا تو خوش ہو کر آپ سے ملنے کے لیے آ گیا ہے

ورنہ بڑے غرے دکھاتا ہے، ہر کسی سے نہیں ملتا۔“

غنئی کو لا کر تانی کے برابر والی کرسی پر بٹھا دیا اور خود ناشتے کی طرف متوجہ ہوا۔

”آہا! کتنے دنوں کے بعد ایسا مزے کا ناشتا کر رہا ہوں، آپ کا بہت شکریہ۔“

”چائے بناؤں؟“

”نہیں صبح سے نجانے کتنے کپ چائے کے پی چکا ہوں۔ اب مزید نہیں پی سکتا۔“

”میں! اہم کیا کرتے ہو آج کل؟“

”نانی! میں ہر فن مولا ہوں، سب کچھ کرتا ہوں اور آج کل ہی کیا میں تو شروع سے بیک وقت کئی منصوبے شروع کرنے کا عادی ہوں۔ دیکھیے ناں

اس طرح ناکامی کے امکانات خاص کم ہو جاتے ہیں کہ آخر ایک آدھ منصوبہ تو پایہ تکمیل تک پہنچ ہی جاتا ہے، کیوں آپ کی کیا رائے ہے؟“ اس نے خاموشی سے غنئی کو دیکھی زبانا کو متوجہ کیا۔

وہ جواب دینے کے بجائے تانی کو دیکھنے لگی کہ واقعی سمجھ میں نہیں آیا تھا، کیا کہنا چاہیے اس کی اس بات سے سراسر اختلاف تھا مگر یہ کہہ دینا بھی کچھ مناسب نہیں تھا۔

نانی بھی خاموشی سے وامق کی بات سن رہی تھیں وہ گلاس میں پانی انڈیلنے لگا تو بولیں۔
”میرا مطلب تھا بیٹا! پڑھتے ہو یا کہیں ملازم ہو؟“

”پڑھتا بھی ہوں، اگر اتنے سارے منصوبوں سے ٹائم بچ جائے تو ویسے میں حیرت انگیز حد تک ذہین ہوں۔ ایک بار کتاب پر نظر دوڑا لوں تو سب یاد ہو جاتا ہے، اگر ذرا محنت کروں تو اگلے پچھلے سارے ریکارڈ تو ڈسکتا ہوں، مگر مجھے توڑ پھوڑ سے سخت نفرت ہے آپ پڑھتی ہیں؟ اس نے زیبا سے پوچھا۔
اس سے پہلے کہ زیبا جواب دیتی نانی بولیں۔
”ہاں بے جاری پڑھ رہی ہے اور یہ اسی کی ہمت ہے ورنہ جس طرح کے حالات تھے اور جتنی یہ نازک مزاج ہے، اس کا پڑھائی کر لینا کسی معجزے سے کم نہیں۔“

”کیسے حالات؟“ اس نے پوری طرح دلچسپی لی۔
”میرا خیال ہے، اب ہم چلتے ہیں پھر کسی روز آئیں گے، جب آپ کی پچھو اور امی گھر پر ہوں گی۔“
زیبا نے نانی کو کچھ بتانے نہیں دیا۔
”آپ کو کیسے پتا چلا کہ اس گھر میں میری پھوپھو بھی رہتی ہیں؟“ اس نے آنکھیں نچا کر حیرت کا اظہار کیا۔

”ہمیں جنید نے بتایا تھا وہ بھی بڑا سلجھا ہوا بچہ ہے اور بڑا ہی نیک فطرت بڑی مدد کی اس نے میری۔“

”اچھا تو جنید کو بھی جانتی ہیں مگر کیسے؟“ اس کی بے چینی اور بھی بڑھی۔

نانی نے اسے تفصیل سے جنید کی اپنے ہاں آمد کے بارے میں بتایا۔

”اوہ تو اس کا مطلب ہے جنید گھر تک ہو آیا ہے اب میری باری ہے میں بھی چلے گاؤں گا۔“
”ضرور ضرور تمہارا اپنا گھر ہے۔“

”اب ہم چلتے ہیں۔“ زیبا آخر اٹھ کھڑی ہوئی نانی نے بھی اپنی چٹکن گی آف وائٹ چادر سنہالی یہ

چادروہ گزشتہ کئی برس سے استعمال کر رہی تھیں، پہلے اس کا رنگ سفید ہوتا تھا مگر یہ سفید رنگ کب تک سفید رہتا۔ آخر نانی نے اسے آف وائٹ کلر کرالیا۔

”اتنا اچھا ناشتہ بنانے کا بہت شکریہ،“ اس نے زیبا کو مخاطب کیا وہ جواب میں کچھ نہیں بولی۔ جب دونوں گھر واپس آئیں تو نانی کو اس گھر کی خواتین سے ملاقات نہ ہو سکنے کا بے حد افسوس تھا۔

”پونہی حفاظت سے رکھا ہوا زیور نکالا اگر علم ہوتا گھر پر نہیں ہیں تو کاہے کو اتنی تیاری کرتی۔“
وہ اتنا کہہ کر کپڑے تبدیل کرنے چلی گئیں کہ یہ جو سوٹ آج وہ پہن کر گئی تھیں۔ یہ بہت نرم ملائم قیمتی لان کا تھا اور وہ صرف کہیں خاص جگہوں پر آنے جانے کے لیے ہی استعمال کرتی تھیں۔

زیبا اگلی بل بھی اس گھر کے بارے میں سوچنے لگی، ہائے وہ کچن تھا کیسا قیمتی سامان اور میں تو جانتی بھی نہیں، پتا نہیں کون کون سی بجلی کی مشینیں تھیں وہاں پر پھر کراکری ایسی خوبصورت فرنیچ میں اتنا ڈھیر سارا پھل، کیسے خوش قسمت ہیں وہ لوگ جن کے پاس اتنی دولت ہے۔ ایک ہم ہیں، یہ ٹوٹا پھوٹا مکان ہے اور وہ بھی اپنا نہیں اگر یہ گھر اپنا ہوتا تو چلو آہستہ آہستہ مرمت ہی کروا لیتے۔

”زیبا! تم کیا سوچ رہی ہو، چلو آؤ کیا ریاں بناتے ہیں۔“

”نانی! ان لوگوں کا کچن دیکھنے کے قابل ہے اتنا قیمتی سامان رکھا ہوا تھا وہاں پر اور کھانے پینے کا سامان بھی بہت تھا خاصے امیر لوگ ہیں وہ۔“

”ہمیں ان کی امارت، غربت سے کیا لینا دینا مزاج کے اچھے ہوئے تو اچھے ہیں، ورنہ پھر میں تو نہ جاؤں گی ان۔ کہہ ویسے اچھے ہی لگتے ہیں۔ گھر کی عورتیں اچھے اخلاق والی ہوں تب ہی بچوں کی تربیت بھی اچھی ہوتی ہے اور یہ دونوں ہی لڑکے اچھے اخلاق والے ہیں۔“

جس وقت نسیم بازار سے گھر واپس آئیں یہ دونوں ایک لمبی سی کیاری بنا چکی تھیں۔

”بڑی جلدی آگئیں آپ دونوں‘ پڑوسیوں کے ہاں سے؟“
 ”وہ لوگ گھر پر ہی نہیں تھے۔ بس ایک لڑکا گھر میں موجود تھا، تھوڑی دیر بیٹھ کر واپس آگئے۔“
 وہ سر ہلا کر کچن میں چلی گئیں اور لایا ہوا سودا سلف رکھنے لگیں۔

نے کل سمو سے بھیجے آج میں نے ناشتا بنا کر دیا۔ سچ ہے امیر لوگوں کے دل بڑے تھوڑے ہوتے ہیں۔ یہ ہم جیسے ہی ہیں جو ہر کسی کے کام آنے کو تیار رہتے ہیں۔ ویسے امی اگر ہم امیر بھی ہو جائیں تب بھی ہمارے دل تو سختی ہی رہیں گے، ہم تو کسی سے برائی کر ہی نہیں سکتے۔“

”تم اٹھ کر کپڑے الماری میں رکھ لو کل میں دھوئے تھے آج بھی کرسی پر اسی طرح پڑے ہیں۔“
 وہ سستی سے اٹھ کر اندر آگئی کپڑے تہہ کرتے ہوئے بھی یہ سوچتی رہی اگر اللہ مجھے دولت دے گا تو میں اسی طرح اتراؤں گی نہیں جو مستحق ہوگا اس کی مدد کروں گی اور بہت اچھا سا گھر بناؤں گی۔“

کام سے فارغ ہو کر وہ بستر پر آ لیٹی اور اسی بارے میں سوچتی رہی۔ یہ اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ خیالوں ہی خیالوں میں وہ خود کو ایک امیر کپڑوں کے روپ میں دیکھا کرتی تھی جس کے پاس قیمتی کپڑوں اور جیولری کا ڈھیر تھا۔ جس کا گھر بہت خوبصورت تھا۔ اور وہ لڑکی جب بازار جاتی تھی تو ڈھیروں شلنگ کیا کرتی تھی۔ یہی خواب جاگتی آنکھوں سے دیکھتی وہ نیند کی وادی میں اتر گئی۔

☆☆☆

شام کو امی نے اسے چکایا تھا، وہ جاگنے کے باوجود اٹھنے میں سستی کر رہی تھی۔

”اب اٹھ بھی جاؤ پڑوس سے ایک لڑکی اور دو عورتیں آئی ہیں۔“

تب وہ ایک دم سے جاگ گئی۔ بالوں کی چوٹی دوبارہ بنائی تو خاصا ٹائم لگ جاتا۔ بس اور برس پھیرا منہ دھویا اور نانی کے کمرے میں چلی آئی جہاں مہمان بیٹھی تھیں۔ دونوں خواتین سے تو وہ مل چکی تھی اب لڑکی سے ملاقات ہوئی اور بتایا یہ فرح ہے ہم اسے فری کہتے ہیں۔“

نانی امی اور دونوں خواتین باتیں کرنے لگیں، وہ اور فرح خاموش بیٹھی بس ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔

بادل اب پہلے سے زیادہ گہرے ہو گئے تھے لگتا تھا ایک بار پھر زور کا مینہ برے گا۔
 ”پتا نہیں پڑوس کی عورتیں کب واپس آئیں وہ لڑکا بے چارہ بھوکا پیاسا رہے گا۔“ دوپہر میں بھی جب امی گوشت کا سالہ بھونا رہی تھیں تو نانی کورہ رہ کر واقع کا خیال آ رہا تھا۔

”نانی جان! اب ایسا بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے ان کے فریج میں ڈھیروں ڈھیر پھل رکھے ہوئے تھے۔ دودھ بھی موجود تھا بھوک لگے گی تو کچھ بھی کھالے گا۔“
 ”اے نسیم! تم بازار آگئیں موسم ایسا اچھا ہو رہا ہے۔ سوچی ہی لے آئیں، شام میں حلوہ بنا لیتے۔“ اب اس عمر میں آکر نانی کی اور تو کوئی مصروفیت رہی نہ تھی۔ دھیان کھانے پینے کی طرف ہی رہتا تھا۔

”اماں! سوچی تو گھر میں موجود ہے مگر مجھے تو یہ بادل دیکھ کر فکر ہو رہی ہے۔ خستہ حال دیواریں ہیں گھر کی، کہیں کوئی دیوار گر نہ پڑے۔ کچھ بھی بنانے اور کھانے کوئی نہیں چاہ رہا۔“

”چار دیواری پرانی ضرور ہے مگر میں جائزہ لے چکی ہوں۔ چٹائی اچھی کی گئی ہے۔ بظاہر دیوار جھڑتی دکھائی دے رہی ہے، مگر اندر سے حالت اتنی بری نہیں ہے۔ یہ کوئی آج کا بنا ہوا مکان تو ہے نہیں کہ ایک سال بنانے کو ہوا اور ادھر زور کی آندھی چلی ادھر دیوار سجدہ ریز ہو گئی۔ پرانی عمارت ہے اور خاصی مضبوط ہے تم اس طرف سے توبہ فکر ہو۔“

”ای! ہمسائیوں کے گھر میں اتنے بڑے بڑے گلاب ہیں اور ان کے ہاں جاسن کا بیڑ بھی ہے، خوب موٹے موٹے جاسن لگے ہوئے تھے اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ ایک پلیٹ جاسن ہی ادھر بھیج دیں۔ ہم

نہیں پوچھا۔ سچ ہم تو سخت شرمندہ ہیں آپ سے۔“
 ”بیٹی! شرمندگی کا ہے کی لڑکے ایسے ہی لالہ بابی
 ہوتے ہیں، بھلا انہیں مہمان داری کا کیا علم۔“

فری زیا سے اس کی تعلیم سبکیٹ وغیرہ کے
 بارے میں پوچھنے لگی پھر بات پسند ناپسند تک پہنچی بھلا
 اس کا اور فری کا کیا مقابلہ۔ شوق تو دونوں کو شاپنگ کا
 تھا مگر زیا کے پاس اتنے پیسے کہاں ہوتے تھے کہ وہ
 یہ شوق پورا بھی کر سکے جبکہ فری اسے بتا رہی تھی فلاں
 مارکیٹ میں کچھ اچھا ملتا ہے جیولری میں وہاں سے
 خریدی ہوں کا میٹکس یہاں سے، زیا بس خاموشی
 سے سنتی رہی۔

”میرا ٹیلر بہت اچھا ہے میں ریڈی میڈ
 خریدنے کے بجائے ڈیزائن بنا کر سلوائتی ہوں اپنا
 خریدتا ہوا کپڑا ایک تو پائیدار ہوتا ہے اور پھر مجھے خود
 سے کپڑا خریدنے اور پھر سلوانے میں مزاج بھی بہت
 آتا ہے۔ تم کپڑے کہاں سے سلواتی ہو؟“
 آخر وہ سوال آہی گیا جس سے زیا خوفزدہ ہو
 رہی تھی۔

”بیٹا! ہم تو کپڑے گھر پر ہی سی لیتے ہیں۔“
 امی نے بتایا نانی بولیں۔

”نسیہ کو تو بڑا شوق تھا سلائی بنائی کا جبکہ زیا
 کو تو ہم نے زبردستی ہی سکھائی ہے، اور سلائی کڑھائی
 بھی بس اس نے اسی لیے سیکھ لی کہ اپنے کپڑے اچھے
 ڈیزائن کے بنا سکے۔“

”اچھا تو آپ خود سی لیتی ہیں دکھائیں کوئی
 سوٹ!“ فری بڑے شوق سے کہہ رہی تھی۔ شکر ہوا
 ابھی پچھلے دنوں اس نے ایک نیا سوٹ بنایا تھا۔ فان
 کلر پر بلک اور میرون کڑھائی کی تھی۔ سلائی اتنی
 صاف، کنگ فنگ شان دار اور سب سے بڑھ کر
 ایمر ایڈریٹیویو دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ فری از حد
 متاثر دکھائی دینے لگی۔

”کیا آپ یہ ڈیزائن مجھے دیں گی؟“ وہ
 لجاجت سے کہہ رہی تھی۔
 ”جی کیوں نہیں۔“ اس نے فراخ دلی دکھائی۔

”لڑکیو! کچھ بات کر ڈفری دیے تو تمہیں بڑا
 شوق تھا کہ تمہاری کوئی دوست تمہارے گھر کے قریب
 بھی رہتی ہو اور اب کیسے منہ میں کھٹکدیاں ڈال کر بیٹھ
 گئی ہو۔“
 ”وہ اصل میں ہم، آپ لوگوں کی باتیں سن
 رہے تھے۔“

”کیا بتاؤں خالہ جی! ہم یہاں کتنا بور ہوتے
 رہے ہیں۔ آپ کو تو علم ہی ہے اس جگہ پر آبادی کوئی
 خاص نہیں، یہاں سے ٹھوڑی دور آبادی ہے مرد وہاں
 کے لوگ ان پڑھ اور مزدور قسم کے ہیں۔ یہاں جو
 چند ایک گھر ہیں۔ ان میں فیملی نام کی کوئی چیز نہیں
 ہے۔ ادھر ایک ملک صاحب ہیں وہ ایک ملازم کے
 ساتھ اتنے بڑے گھر میں اکیلے رہتے ہیں اور سامنے
 والے گھر میں جو میاں بیوی رہتے ہیں ان سے تو اللہ
 بچائے اور دونوں ہر وقت مرچیں چائے رکھتے ہیں
 پھر اس سے آگے جو دو مکان ہیں وہ کسی نے کرائے پر
 لے کر وہاں پلاسٹک کی بوتلیں بنانے کی مشینیں لگا
 رکھی ہیں۔ ہم تو سمجھیں بالکل ویرانے میں ہی بیٹھے
 تھے آپ کے آنے سے بڑی خوشی ہوئی ہے کل جنید
 آپ کے ہاں سے ہو کر گیا تو آپ کی بڑی تعریف کر
 رہا تھا کہہ رہا تھا، بہت نیک اور اچھے مزاج کی نانی
 اماں ہیں پھر آج واقع نے بتایا کہ آپ لوگ ہم سے
 ملنے آئی تھیں اور کل جو سمو سے بھیجے تھے ان کا بھی
 واقع نے آج بتایا۔ میں نے تو خوب ڈانٹا کہ ہمارا
 حصہ رکھا ہی نہیں خود ہی سب کھا گیا۔“

”مجھے ایسی شرارت تو کرتے ہیں۔“ امی نے
 کہا تو واقع جی امی بولیں۔

”وہ صرف شرارت ہی کرتا ہے اور کچھ نہیں آتا
 اسے اب صبح آپ لوگ آئیں، بجائے اس کے کہ وہ
 مہمانوں کی خاطر مدارت کرتا لانا بچی سے ناشتا بنا کر
 کھایا اس نے بہت ڈانٹا ہے میں نے اس کو“

”کوئی بات نہیں، اپنا ہی بچہ ہے اسے بھوک
 لگ رہی تھی ناشتا بنا دیا تو کیا ہوا؟“
 ”مگر خالہ جی! اس نے مہمانوں کو پانی تک

”ایسا اچھا تو میرا ٹیلر بھی نہیں سیتا۔“

”فری بیٹا! تم آج کل فارغ ہی ہو، موقع سے فائدہ اٹھاؤ اور زیبا سے کچھ سیکھ لو، یہ بڑی گمنوں والی بچی ہے۔“

فرح کی والدہ ناصرہ بیگم اسے سمجھا رہی تھیں، مگر فرح اچھی خاصی کام چور واقع ہوئی تھی اور پھر جب اللہ نے اتنا دیا تھا کہ وہ اپنی پسند کی چیز چند پیسے خرچ کر کے خرید سکتی تھی تو پھر اتنی محنت اور جانفشانی کی کیا ضرورت تھی۔

”اگر کچھ سلوانا ہو تو زیبا کو دے دیتا، یہ سلائی کر دے گی۔“

نانی کی اس پیشکش پر فری نے بے یقینی سے زیبا کی طرف دیکھا اس نے ہنسنے لگا کہ اثبات میں سر ہلا دیا اور بولی۔

”مجھے بھلا گھر میں کام ہی کیا ہوتا ہے۔ کھانا پکانا اور صفائی کرنا گھر کی، بس اس کے بعد میں فارغ ہی ہوتی ہوں آپ جب چاہیں مجھ سے سوٹ سلائی کروالیں۔“

”ٹھیک ہے پھر میں بازار جاؤں گی، اور اسی کمر کا سوٹ لے کر آؤں گی بالکل ایسا ہی سی کر دیتا۔“

”دیکھو کیسی اچھی بیٹی ہے۔ کتنی گنوں والی ہے گھر کے سارے کام بھی کرتی ہے اور سلائی کڑھائی بھی خود کرتی ہے۔ ایک تم ہو سارا دن فارغ بیٹھی رہتی ہو اور پھر بھی کوئی کام کہے تو جواب ہوتا ہے میرے پاس وقت نہیں ہے۔“ اس کی امی بیٹیں بیٹھی اسے ڈانٹنے لگیں مگر فری اچھی خاصی لاپرواہ لگی تھی اس ڈانٹ ڈپٹ کا نہ تو برا مانا اور نہ ہی کوئی اثر لیا۔

پھر وہ لوگ جانے کی اجازت لے کر اور انہیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دے کر چلی گئیں۔

”کیسے اچھے ہمسائے ملے ہیں ہمیں۔“ امی بہت خوش تھیں، اور ان لوگوں کے سادہ مزاج کی تعریف کر رہی تھیں۔

نانی بھی تعریف کرتی رہیں، جبکہ زیبا خاموش بیٹھی تھی وہ کچھ اداسی ہو رہی تھی پتا نہیں کچھ لوگ

اتنے امیر اور کچھ اتنے غریب کیوں ہوتے ہیں۔ فری نے کتنے خوبصورت ٹاپس پہن رکھے تھے، نگ اتنا چمکدار کہ روشنی اس کے چہرے پر پڑتی تھی اور نیل پالش کا کلر بھی بڑا خوبصورت تھا ہوگی کسی مہنگی سی کمپنی کی میرے حصے میں تو یہی ایک میڈورا آتی ہے اور اس میں چند ایک کڑی مجھے پسند ہیں۔ بس بار بار وہی استعمال کیے جاؤں اور فری نے سینڈل بھی کیسی اچھی پہن رکھی تھی حالانکہ اس کا رنگ اتنا صاف نہیں مگر وہ سینڈل اس کے پاؤں میں بہت اچھی لگ رہی تھی۔

”زیبا! تم کیا سوچنے بیٹھ گئیں؟“ امی کسی کام سے باہر نکلیں تو نانی کی توجہ اس کی طرف ہوئی۔ وہ گہری سی سانس کھینچ کر بولی۔

”نانی جان! بس میں ایسے ہی الٹی سیدھی سوچ میں الجھی ہوئی تھی۔“

”ناں، پھر بھی پتا تو چلے اتنی اداس اور خاموش کیوں دکھائی دے رہی ہو۔“

”نانی جان! یہ کیسی نا انصافی ہے دنیا میں کوئی اتنا امیر اور کوئی اتنا غریب، میں ایک ایک چیز کو ترستی ہوں، مجھے کتنا شوق ہے اچھے کپڑوں اور خوبصورت جیولری کا، مگر میرے پاس اتنے پیسے ہی کب ہوتے ہیں، میں تو بس یہ سب خواب میں ہی دیکھ سکتی ہوں، اچھا سا خوبصورت گھر، جس میں قیمتی فرنیچر ہو ایسا کہ دیکھنے والے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں، ہائے، یہ سب ہماری قسمت میں کہاں نانی مجھے تو آپ پر بھی رشک آتا ہے کہ آپ نے جوانی بہت اچھے ماحول میں گزاری ہے، آپ کو کسی چیز کے لیے ترسنا نہیں پڑا، آپ نے جو چاہا حاصل کر لیا، زندگی تو یہی ہے۔“

”زیبا! تم نے پہلے تو کبھی ایسی بات نہیں کی۔“ نانی شدید حیرت کے عالم میں تھیں وہ چپ رہی اور سر جھکا کر اسے ہاتھوں کو دیکھنے لگی نانی کے چہرے پر دکھ اور جھکن کے سائے پھیل گئے۔

”زیبا! کیا ہوا؟ کچھ تو بولو! کیا ہوا ہے تمہیں؟“

اکٹھے رہنے میں مزا آتا ہے۔ یہاں گھر میں وامق روغن لگائے رکھتا ہے۔ جنید بھائی خاموش طبیعت کے مالک ہیں، معصوم سے ہیں۔ وامق کے ساتھ ان کی کافی دوستی ہے حالانکہ دونوں کا مزاج ایک دوسرے سے کافی مختلف ہے۔ زینب تم آؤ ناں کسی روز ہمارے گھر؟“

”ہاں میں امی اور نانی کے ساتھ آؤں گی وہ دونوں بروگرام تو بنا رہی ہیں دیکھیں کب تک تم لوگوں کے گھر آتی ہیں۔“

”یہ ساتھ تو گھر ہے ہمارا تم اکیلی بھی تو آ سکتی ہو کوئی اچھی سی سووی دیکھیں گے۔ میں تمہیں اپنی جیولری اور چیزیں دکھاؤں گی۔“

☆☆☆

فری کو گھر میں کوئی کام تو ہوتا نہیں تھا اور باتیں کرنے کو اسے کوئی دوست چاہتے تھا بس وہ آتی تو واپس جانا جیسے بھول ہی جاتی زیبا بچن میں کام کر رہی ہے تو وہ بچن کے دروازے کے سامنے برآمدے میں کرسی رکھے بیٹھی ہے اور دنیا جہان کے قصے چل رہے ہیں۔ وہ کسی کام سے کمرے میں آتی ہے تو بھی فری پیچھے ہے۔

”چلو زیبا کو بھی کوئی دوست تو ملی بے چاری سارا دن خاموشی سے ادھر ادھر کے کام نبھاتی پھرتی تھی۔“ امی فری کی آمد سے خوش تھیں۔

جبکہ نانی کل سے کچھ خاموش سی تھیں، اب جو فری ان کے ہاں آئی تھی تو انہوں نے فری اور پھر اپنی زیبا کو بغور دیکھا تھا فری عام سی شکل و صورت کی مالک لا پرواہی لڑکی تھی جس نے بیس لان کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اور گلے میں سونے کی خوبصورت چین تھی۔

جبکہ اس کے مقابلے میں ان کی زیبا کیسے پیاری صورت کی مالک تھی۔ عام سے کپڑوں میں بھی اس کا روپ جیسے دمسکتا تھا۔ اس کے لہجے اور چال میں ایک ٹھہراؤ کی سی کیفیت تھی، اور وہ بہت سلیقے سے بات کرنے کی عادی تھی۔

”بس نانی! یہ میری خواہش ہے۔ مجھے بڑے بڑے خوبصورت گھراچھے لگتے ہیں۔“

اس کی خواہش جان کر نانی کچھ خاموش سی ہو گئیں۔ ان کے چہرے پر تفکر اور آنکھوں میں ایک سوچ تھی۔

نماز میں نانی سجدے تو پہلے بھی طویل کرتی تھیں مگر آج جب انہوں نے نماز بڑھی تو سجدے پہلے سے بھی طویل ہو گئے اور آنسو آنکھوں سے اک تواتر سے بہتے رہے۔

☆☆☆

فری دوسرے روز ہی بازار جا کر کپڑا خرید لائی تھی۔

”دیکھو بے ناوی کلر۔“

”ہاں کلر تو وہی ہے،“ زینب نے کپڑے پر ہاتھ پھیر کر اس کی ملائیت پر غور کیا۔ یہ کپڑا اس کے سوٹ کے مقابلے میں کہیں زیادہ قیمت کا ہوگا۔

”میں آج ہی اس پر ٹریس کر کے کڑھائی شروع کر دوں گی، کڑھائی میں کافی دیر لگتی ہے۔ اس لیے آپ کو کچھ دن انتظار کرنا پڑے گا۔“

”یہ آپ جناب کیا ہوا۔ بس اب ہم اچھی دوست ہیں ہمیں ان تکلفات میں نہیں پڑنا چاہئے اور مجھے کچھ ایسی جلدی بھی نہیں ہے تم آرام سے سوٹ تیار کر لیتا۔“

”وامق کہہ رہا تھا ہم مانی کی سالگرہ منائیں گے تو میں سوچ رہی ہوں۔ یہ سوٹ اس کی سالگرہ پر پہنوں تم بھی ایسا ہی پہننا، اچھا لگے گا دونوں کا ایک جیسا۔“

”مانی کون ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”مانی ہمارا بھانجا ہے نائلہ باجی کا بیٹا۔ نائلہ باجی وامق کی بڑی بہن ہیں، یعنی میری ماموں زاد، پہلے ہم لوگ فیصل آباد میں رہا کرتے تھے تب بھی میرے پاپا ملک سے باہر تھے پھر جنید بھائی نے ادھر لاہور میں انڈیشن لے لیا تو ہم بھی ادھر ماموں کے پاس آ گئے نائلہ باجی اسے گھر کی ہیں کبھی کبھار ہی آتی ہیں گھر میں میری تو کوئی ہم عمر نہیں مگر پھر بھی

بیروں میں چل بھی نہیں تھی۔ پھر جونہی نگاہ اس پر پڑی، تجھک کر رک گئی اور دوپٹہ درست کرنے لگی۔
وامق اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور نگاہوں کی تپش زیبا کے ہاتھ پاؤں بھلا رہی تھی۔

”کیا پیو گے پینا؟ چائے یا شربت؟ شربت فالسے کا ہے۔ ہم نے گھر میں تیار کیا ہے بہت ذائقہ دار ہے۔“

”چلیں پھر آج شربت ہی پی لیتا ہوں جب اگلی مرتبہ آؤں گا تب چائے پلوادیتے گا۔“
”کیوں نہیں بچے تمہارا اپنا گھر ہے۔ جم جم آؤ۔“

”ہا وامق! تم کب آئے؟“ فری نے کمرے کے دروازے سے جھانکا اور اس کی یہاں آمد پر شدید حیرت کا اظہار کرتے ہوئے دریافت کیا۔

”میں تمہیں سارے شہر میں تلاش کرنے کے بعد آخر کار یہاں پہنچا ہوں۔ یہ بتاؤ کچھ یاد بھی ہے کہ تمہارا ایک گھر بھی ہے جہاں تمہاری امی۔ ممائی اور ایک عدد ہونق بھائی رہتا ہے۔“

”ہونق کس کو کہا؟ جنید بھائی کو اچھا میں جانتے ہی تمہاری شکایت لگاؤں گی۔“

”لگا دینا شکایت۔ میں بھی بتا دوں گا کہ پیار سے کہا ہے۔“

پھر اس نے ان تینوں پر نگاہ ڈالی۔

”تینوں ہی یہاں موجود ہیں، شربت کون بنائے گا۔“

”زیبا! جاؤ جلدی سے بنا کر لاؤ بچے کو پیاس لگ رہی ہے۔“

”بچہ پیاسا نہیں بھوکا ہے۔“ فری نے جھٹ سے کہا۔

”اور تم صبح سے یہاں آئی بیٹھی ہو۔ پتا نہیں ان کا بجٹ کتنا ڈسٹرب ہووا ہوگا آج۔“

”نہیں یہ تو بڑی پیاری بیٹی ہے۔ زیبا سے تو بہت دوستی ہوگئی ہے اس کی۔“ نیسہ فرح کو بہت پیار سے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں جبکہ نانی، وامق کو

”خدا یا میری بچی کا نصیب اچھا کرنا، اسے زندگی میں کسی چیز کی کمی نہ آنے دینا۔“

دونوں لڑکیاں چکن میں تھیں۔ جب نانی نے نیسہ بیگم سے کہا۔

”ہم جب ان کے ہاں جائیں گے تو یاد سے فرح کی امی سے پوچھنا اس لڑکی کا رشتہ کہیں طے ہو چکا ہے یا نہیں۔“

”کیوں اماں! آپ بھلا اتنی دلچسپی کیوں لے رہی ہیں، کوئی لڑکا ہے نظر میں؟“ نیسہ ان کی بات سن کر مزاح کے رنگ میں بولی تھیں۔

ان کی بات جیسے نانی نے سنی ہی نہیں خود کلامی کے انداز میں بولیں۔

”اگر طے ہو گیا ہے یا نہیں بھی ہوا تو مجھے کیا فرق پڑتا ہے ویسے بھی لڑکے تو دو ہیں ان کے گھر میں اور جنید تو فرح کا بھائی ہوتا ہے۔“ پھر ان کے چہرے پر اطمینان سا جھلکنے لگا۔

فرح نے دوپہر کو کھانا بھی ان کی طرف کھایا اور جب جانے کا ارادہ کر ہی رہی تھی تو وامق آگیا۔

دروازہ امی نے کھولا، نانی اس وقت برآمدے میں بیٹھی تھیں۔ دروازے پر کھڑے وامق کو دیکھا تو لپک کر گئیں اور اسے اندر لے آئیں۔

”نانی! میں تو فری کو لینے آیا تھا۔ اسے یہ یاد دلانا تھا کہ اس کا گھر یہ نہیں بلکہ ساتھ والا ہے۔“

”کیوں کوئی کام تھا فرح سے؟“ نانی نے اس کے چہرے کو جانچنے والی نظر میں رکھ کر سوال کیا۔

”اس غمی لڑکی سے بھلا کیا کام ہو سکتا ہے۔ اسے تو بندہ کچھ کہہ کر بچھتا ہے۔“

انہیں قدرے اطمینان ہوا سر ہلا کر بولیں۔

”بیٹھو اب آئے ہو تو کچھ شربت چائے وغیرہ پی کر ہی جانا۔“

”کیوں نہیں نانی یہ تو مہمان کا حق ہوتا ہے۔“ وہ بھی جھٹ بیٹھ گیا۔

نانی زیبا کو آوازیں دے لگیں وہ اپنے دھیان میں کمرے میں سے نکلی یوں کہ دوپٹہ گلے میں تھا اور

بڑے گھر کی بیٹیاں ہی بیاہ کر بڑے گھروں میں جاسکتی ہیں، ہم جیسوں کے مقدر میں جھاڑ اور چولہا ہی لکھا ہے یہ انصاف تو نہیں ہے۔

جب تک یہ لوگ بیٹھے رہے، وہ خاموش اپنی سوچ میں گم نہیں رہی پھر واقعہ فرخ کو لے کر چلا گیا تو تانی بولیں۔

”لڑکیوں میں طریقہ سلیقہ ضرور ہونا چاہیے گھر میں چاہے کتنے بھی ملازم ہوں اگر مالکن توجہ نہ دے تو گدھے لوٹنے دکھائی دیتے ہیں۔“

”ابھی تو آپ کہہ رہی تھیں فرخ کو کام کاج سیکھنے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔“ امی نے کچھ حیرت کے انداز میں انہیں یاد دلایا۔

انہوں نے سن کر بھی ان کی کردی اور بولیں۔

”یہ برتن کچن میں رکھ آؤ برسات کا موسم ہے کھیاں بھی بہت ہو رہی ہیں۔ دھو کر خشک کر کے رکھو تو بہتر ہے۔“

نسیہ برتن اٹھا کر لے گئیں تو زیبا سے بولیں۔

”میری بچی! میں دیکھ رہی ہوں تم بولتے بولتے یکدم سے چپ ہو گئی ہو۔ خیر تو ہے طبیعت تو ٹھیک ہے۔ کہیں سر میں درد تو نہیں ہو گیا؟ وہ بچی فرخ بولتی بھی تو بہت ہے۔“

”نہیں تانی! وہ تو بہت اچھی لڑکی ہے میں تو آپ کی کہی بات کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔ یہ کیسا چلن ہے دنیا کا۔ امیر کی بیٹی بیاہ کر بھی امیر کے گھر میں جاتی ہے اور غریب کی بیٹی لاکھ خویوں کی مالک ہو پھر بھی اس کے نصیب میں ایک جھونپڑے کے بعد دوسرا جھونپڑا ہی لکھا ہوتا ہے۔ وہ محلوں کے خواب تو دیکھ سکتی ہے مگر رانی بن نہیں سکتی۔“

تانی نے اس کے دکھ اور حسرت کو دل سے محسوس کیا ذرا دیر کی خاموشی کے بعد بولیں۔

”یہ کچھ ایسا ضروری بھی نہیں۔ کوشش سے نظام کو بدلا جاسکتا ہے۔ بس ہمت نہیں ہارنا چاہیے اور نہ ہی جی چھوڑ کر نا چاہیے تم ایسی باتیں سوچ سوچ کر اپنا دل خراب نہ کرو سارے پھیل قسمت کے ہوتے

بتانے لگیں کہ زیبا کھانے کے علاوہ سلائی کڑھائی میں بھی پوری مہارت رکھتی ہے اور فرخ کا سوٹ بھی وہی رہی ہے۔

”فرخ! تمہیں شرم نہیں آتی ایک تو وہ گھر کا کام سنبھالتی ہے اور تم نے اسے اپنے کپڑے بھی سینے کے لیے دے دیے ہیں۔“

”تم کیوں جلتے ہو۔ ہم تو سہیلیاں بن گئی ہیں جیسے زیبا میرا کام کر رہی ہے ایسے ہی میں بھی اس کا کوئی کام کروں گی۔“

”تم صرف کام خراب کر سکتی ہو۔“

”ایسے ہی خواجواہ۔“ فرخ نے ناراضی دکھائی اور واقعہ تانی کو اس کے پھو ہڑ پن کے قصے سنانے لگا جنہیں سن کر تانی کا دل باغ باغ ہو گیا۔ بے حد تسلی ہوئی کہ واقعہ کو اس لڑکی میں کوئی خوبی دکھائی نہیں دیتی اور برائیاں بے شمار یاد رکھے ہوئے ہے۔

زیبا شربت لے کر آئی واقعہ نے پیار اور بہت تعریف کی۔ تانی نے واقعہ سے کہا۔

”بیٹا! تمہارا اپنا گھر ہے آتے جاتے رہا کرو۔“

”جی ضرور کیوں نہیں۔“

”ہاں تانی جان! اجاں کھانے پینے کو اچھی چیزیں مل رہی ہوں وہاں تو واقعہ بھائی ضرور جائیں گے۔“ فری نے جمل کر کہا۔

جواب میں وہ پوری طرح اتفاق کرتے ہوئے بولا۔

”واقعہ اس گھر میں سلیقہ بہت ہے۔ کھانا بھی اچھا بنتا ہے۔ صفائی سہرائی بھی دیکھو کتنی اچھی کی گئی ہے۔“

پھر نسیہ سے بولا۔ ”آئی! کچھ روز کے لیے فری کو اپنے ہاں رکھ لیں اور ٹریننگ دیں اسے۔“

”فری بیٹی کو کیا ضرورت ہے گھر کے کام کاج کرنے کی بڑے گھر کی بیٹی ہے بیاہ کر بھی بڑے گھر میں جائے گی۔“

تانی کی اس بات پر فری واقعہ کو چلانے کے انداز میں مسکرا دی جبکہ زیبا کو دھچکا سا لگا تھا۔ کیا

تب اس نے ایک مرغی پالی تھی اور سارا دن اس کی ناز برداری میں گزارا کرتا تھا اب یہ مصیبت بکری کا بچہ ہوتا نہیں کہاں سے اُچھلایا ہے۔“

”خبردار جو میری یا بھئی کی شان میں گستاخی کی ورنہ مہمان کے سامنے تمہاری بہت زیادہ عزت افزائی ہو جائے گی۔“

”یہ جو صفائی ستھرائی کا رونا روتا رہتا ہے ناں کبھی تم اس کا کمراد دیکھنا ایسا گند مچا رکھا ہے کہ وہاں کھڑے ہونے کو جی نہیں چاہتا۔ آؤ تمہیں ایک جھلک دکھاؤں۔“

فرح نے کہنے کے ساتھ ہی قدم بڑھائے زیبا نے تقلید کی تو وہ بولا۔

”غیر لڑکی کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ نا محرم کے کمرے میں جھانکتی پھرے۔“

اور زیبا کے بڑھتے قدم رک گئے۔ وہ فرح سے بولی۔

”تمہارا کمر کون سا ہے۔ وہاں چل کر بیٹھتے ہیں۔“ فری اثبات میں سر ہلا کر اسے اپنے کمرے میں لے گئی۔

”سنو فرح! مہمان کی خاطر تواضع کے لیے کچھ منگو آؤ تو مجھے بھی دے جانا۔ صبح سے منہ کچھ پھیکا سا ہو رہا ہے۔“

”امی اور ممانی ہال میں بیٹھی ہیں ان سے پوچھ لو کیا منگوانا ہے اور جا کر لے آؤ۔“

”اب اتنی تیز دھوپ میں، میں بھلا کہاں جاؤں گا تم گھر میں ہی کچھ بنا لو۔“

”کام چور ہو پورے اور باتیں دوسروں کو بناتے ہو۔ اب جو بھی بنے گا تمہیں بالکل نہیں ملے گا۔“

”ہونہہ یہاں بنتا کیا ہے ایک، ایک گلاس شربت پر مہمانوں کو ٹر خادوگی۔“

”آؤ زیبا! اسے تو بولنے کا خط ہے۔“ فری اسے اپنے کمرے میں لے آئی۔

☆☆☆

”نانی! میں تو فرح کا کمراد دیکھ کر حیران ہی رہ

ہیں۔ اب مجھے ہی دیکھ لو میرے ابا کتنی بڑی جائیداد کے مالک تھے مگر بیاہ کر میں درمیانے درجے کے زمینداروں کے ہاں آئی تھی۔ جہاں کا ماحول میرے میکے کے گھر کے ماحول کے مقابلے میں بے حد اجڑا اور غریب سا تھا مگر میں نے صبر شکر کر کے وہ وقت کاٹ ہی لیا اور اب تو وہ درمیانے درجے کا زمیندارہ بھی پاس نہیں۔ تمہیں یہ سب اس لیے بتا رہی ہوں کہ اس بات کو سمجھو وقت ایک سانپ نہیں رہتا حالات بدلنے دیر نہیں لگتی، بس تدبیر ساتھ ساتھ ہونا چاہیے تمہیں اچھے گھر میں بیاہنا میرا بھی خواب ہے۔“

نسیہ برتن الماری میں لگا کر واپس آئیں تو نانی نے بات بدل دی اور موسم پر تبصرہ کرنے لگیں۔

☆☆☆

چند روز کے بعد یہ تینوں فرح کی طرف گئیں تو گھر کے سب ہی افراد گھر پر تھے دونوں خواتین اور فری بڑے تپاک سے ملیں۔ نسیہ تو کم گوئیں۔ نانی البتہ باتوں کی شوقین تھیں۔ آج بھی زیور کہنے پہن کر گئی تھیں جبکہ اس کے مقابلے میں نسیہ بالکل سادہ تھیں۔

”آپ کی چوڑیوں کا ڈیزائن بہت خوبصورت ہے خالہ!“ فری کی امی نے ان کے بازو میں بڑی چھ سونے کی چوڑیوں کی تعریف کی۔ نانی کھل اٹھیں اور انہیں بتانے لگیں کہ ”چوڑیاں مجھے میرے تبا نے بنا کر دی تھیں۔ تب سونا خالص اور سستا تھا مگر خیر سستا صرف ان لوگوں کے لیے تھا جن کے پاس پیسہ تھا اور میرے تبا تو شہر کے رئیسوں میں شمار ہوتے تھے۔“ پھر نانی نے انہیں اپنے تبا کی امارت اور دولت کے کئی قصے سنائے ان کا انداز ایسا دلکش اور سادہ ہوتا تھا کہ سننے والے کو برا نہیں لگتا تھا۔ وہ دونوں بڑی ہی دلچسپی سے سن رہی تھیں زیبا، فری کے ساتھ باہر آگئی اور واقع سے ملاقات ہوگئی جو اپنے بنی کو گود میں اٹھائے ہلکے سروں میں گنگنا رہا تھا۔

”یہ واقع شروع سے ہی کچھ کر یک ہے۔ مجھے یاد ہے جب ہم بچپن میں ان کے گھر آیا کرتے تھے

کی طرح دکھائی دیتی ہے۔“
 ”مگر شہزادی نہیں ہے کہ اسے کوئی شہزادہ
 بیاتنے آجائے۔“
 امی کی باتیں اس کا دل برا کر رہی تھیں۔ وہ اٹھ
 کر کچن میں آگئی۔

”تمہیں سننے پڑوسی کیسے لگے؟ ان کے دو بیٹے
 ہیں۔ پہلے تو مجھے وامق زیادہ پسند آیا تھا مگر اب میں
 سوچتی ہوں ہماری بچی بہت معصوم اور کم گو ہے اس
 کے لیے ایسا ہی لڑکا ہونا چاہیے اور اس لحاظ سے اب
 میں جنید کے بارے میں سوچنے لگی ہوں وہ بھی بہت
 سنجیدہ مزاج کا مالک‘ سادہ سالک ہے۔ میری زبیا کے
 مزاج سے بہت ملتا ہے اس کا مزاج ذہین بھی ہے اور
 محنتی بھی۔ ناصرو بتا رہی تھی ہماری دو کونھیاں اسلام
 آباد میں ہیں اس کے علاوہ بھی جائیداد ہے مگر پھر بھی
 وہ لڑکا پڑھائی میں محنت کرتا ہے اور خود کچھ بننا چاہتا
 ہے۔“

”اماں! کیسی باتیں کرتی ہیں آپ‘ ان لوگوں
 کے پتا نہیں کتنے اونچے خیالات ہوں گے اور آپ
 یوں بات کر رہی ہیں جیسے دونوں کے رشتے آئے
 ہوئے ہیں اور آپ کو کسی ایک کے لیے ہاں کر کے
 دوسرے کو انکار کرتا ہے۔ زبیا کے سامنے ایسی باتیں
 مت کریں۔ وہ بچی عمر میں ہے نادان لڑکی ہے یونہی
 خواب آنکھوں میں سجا بیٹھی تو زندگی بہت مشکل ہو
 جائے گی اس کے لیے۔“

”تم نہیں جانتیں نیسہ! زبیا مجھے کتنی پیاری ہے
 میری اس معصوم بچی نے آج تک کوئی خوشی نہیں
 دیکھی‘ اچھے وقت کا انتظار وہ اس شدت سے کر رہی
 ہے پہلے مجھے اندازہ نہیں تھا مگر چند روز پہلے اچانک
 میں ہی وہ اپنی خواہشات کا ذکر مجھ سے کرتی چلی گئی
 اور یقیناً مانو میرا تو دل رونے لگا ہائے میری معصوم
 بچی کیسے کیسے خواب آنکھوں میں بسائے بظاہر کتنے
 صبر اور سکون کے ساتھ دن کاٹ رہی ہے۔ میں نے
 تو اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کے خوابوں کو حقیقت کا
 رنگ دینے کے لیے مجھ سے جو بھی ہو سکا میں وہ

گئی۔ میں نے پہلے کبھی کسی لڑکی کے پاس اتنا کچھ
 نہیں دیکھا۔ الماری بھی کپڑوں سے بھری ہوئی‘
 ڈریسنگ ٹیبل پر اتنا سامان‘ ٹیل پالش اور لپ اسٹک
 کے اتنے شید کہ کیا بتاؤں۔ جیولری بھی وہ بہت مہنگی
 اور خوبصورت، اور اس کے کمرے میں بیوی بھی تھا‘
 وہ کہتی ہے میرے ابو مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں وہ
 میری کوئی فرمائش نہیں ٹالتے۔ امی کی بھی میں لاڈلی
 بیٹی ہوں میں نے جو بھی مانگا انہوں نے مجھے دلا دیا۔
 تب میں سوچ رہی تھی نانی! یہ سب تو پیسے کے کھیل
 ہیں ناں اب اگر میری امی مجھے مہنگے والے کپڑے
 نہیں دلا سکتیں یا میرے لیے اتنی مہنگی جیولری نہیں
 خرید سکتیں تو اس کا یہ مطلب تو نہیں بنتا کہ انہیں مجھ
 سے محبت نہیں ہے۔“

”ہاں زبیا بیٹی! یہ سب پیسے کے کھیل ہیں۔
 میری بچی کے پاس بھی اتنا پیسہ ہوگا کہ جو چاہے گی
 خرید لے گی۔“

انہیں پتا نہیں چلا نیسہ ساتھ کے کمرے میں
 موجود ان کی باتیں سن رہی ہیں وہ ادھر آئیں اور
 بولیں۔

”دولت سے زیور کپڑا تو خریدا جا سکتا ہے مگر
 سکون اور محبت نہیں اور یاد رکھو بیٹی! دنیا میں سکون اور
 محبت سے بڑھ کر تو کچھ بھی نہیں۔“

”جب سب کچھ حاصل ہو جائے امی تو پھر
 سکون تو خود بخود حاصل ہو جاتا ہے اور جہاں آسودگی
 ہو وہاں محبت بھی ہوتی ہے۔ دکھ پریشانی‘ نفرت‘ یہ
 سب تو غربت کی دین ہیں۔ کیوں نانی جان! میں
 ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں؟“

”ہاں ہاں تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔“
 ”اماں! آپ بجائے اسے سمجھانے کے خود بھی
 اس کے ساتھ مل جی ہیں۔ اسے بتائیں ہر خواہش
 پوری ہونے کے لیے نہیں ہوتی اور پھر دولت کی چاہ کو
 سر پر سوار کر لیتا تو بے وقوفی ہے۔ یہ خواہش سوائے
 دکھ کے اور کچھ نہیں دیتی۔“

”کس چیز کی کمی ہے ہماری زبیا میں شہزادیوں

کروں گی۔“

”وہ سب تو ٹھیک ہے اماں! مگر کہاں پڑوس میں رہنے والے آسودہ حال لوگ اور کہاں ہم تین پریشان حال اپنوں کے ہوتے ہوئے بھی بے سہارا غورتیں وہ تو ہمارے بارے میں سوچیں گے بھی نہیں۔“

”کیوں نہیں سوچیں گے، تم شاید اس وقت وامق کی امی سے باتوں میں مصروف تھیں میں نے ناصرہ کو اپنا حسب نسب، خاندانی شرافت اور دولت سب کے بارے میں بتایا تھا اور سن کر وہ بے حد متاثر بھی ہوئی تھی۔ ارے یہ تو اب میاں کے بیرون ملک جانے سے امیر ہوئی ہے، ہم تو حدی پشتی ریش رہے ہیں۔ ہائے بدلتا ہے رنگ آسمان کیسے کیسے وہ حویلیاں، نوکر چاکر، زبورات کے بکس کپڑوں کی الماریاں، سب خواب ہو میں مگر وہ عزت و وقار تو ہم سے کوئی نہیں چھین سکتا، ہم خاندانی لوگ ہیں۔“

انہیں سمجھانا شاید بے کار ہی ہے۔ سچ ہے بڑھاپے میں انسان پھر سے بچہ بن جاتا ہے ایک بار جس نئے سے طبیعت آجائے پھر کسی طرح دھیان ہٹا نہیں ہے۔ نسیم نے زیادہ بحث مناسب نہیں سمجھی انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔

☆☆☆

زیبا کو فرح کا سوٹ پہلے بھی جلد مکمل کرنا تھا اور اب تو جیسے وہ چاہ رہی تھی چند گھنٹوں میں سلائی کڑھائی سب مکمل ہو جائے اور اس بہانے وہ ایک بار پھر فرح کے گھر جائے۔ کتنے اچھے لوگ ہیں وہ، غرور تو نام کو نہیں۔ فرح بار بار آنے کو کہہ رہی تھی اور اس کا کمر اتو ایسا اچھا اتنا شان دار سا ہے کہ بے اختیار جی چاہتا ہے کاش یہ میرا ہوتا اور وہ جو وامق ہے اس کا خیال آیا تو دل دھڑک اٹھا۔ دیکھنے میں کیسا لاپرواہا سا ہے مگر فرح بتا رہی تھی بہت ذہین ہے پڑھتے تو ہر وقت جنید ہیں مگر نمبر ہمیشہ وامق کے زیادہ آتے رہے ہیں۔ وامق کے انداز میں کس قدر بے تکلفی اور اپنائیت ہے۔

وہ فرح کے ہاں جانا چاہ رہی تھی مگر سوٹ مکمل

ہونے کے بعد لیکن نانی نے سویرے اٹھتے ہی بڑی محنت کے ساتھ انڈوں کا حلوہ تیار کیا اور اس سے بولیں۔

”یہ تم ہمسایوں کے ہاں دے آؤ۔ ٹھنڈا ہو جائے گا تو اچھا نہیں لگے گا ویسے بھی ابھی وہ ناشتا کر رہے ہوں گے وقت پر پہنچ جائے گا تو کھالیں گے۔“

”نانی! اتنے سویرے کسی کے ہاں جانا کچھ مناسب نہیں لگتا۔“

”کیا مناسب اور کیا غیر مناسب ارے پڑوسی ہیں وہ ہمارے، پڑوسی تو رشتے داروں سے بھی زیادہ قریب ہوتے ہیں اور پھر وہ بھی ہماری طرح سادہ مزاج کے پر خلوص لوگ ہیں۔ جاؤ تم جا کر دے آؤ۔“

جب وہ ان کے ہاں آگئی تو واقعی ادھر ناشتا ہو رہا تھا۔ چکن میں وامق کی امی مصروف تھیں۔ اس نے اندر جانے کے بجائے انہیں پلیٹ تھما دی۔

”تم اندر چلو۔ ناشتا کرو۔ سب کے ساتھ۔“

وہ بڑے پیار سے کہہ رہی تھیں مگر اس نے بتایا۔

”میں ناشتا کر چکی ہوں۔“

”اچھا پھر چائے پی لینا۔“

”ای! میں نے کہا بھی تھا میں ہاف فرائی انڈہ۔“

وامق کچھ کہتے ہوئے چکن میں داخل ہوا تھا پھر چونکا

زیبا پر بڑی تو بولا۔

”اتنے سویرے آپ یہاں خیریت تو ہے نا؟“

”ہاں ہاں اللہ کے فضل سے خیریت ہے۔ دیکھو تو بچی سویرے سویرے کیا بنا کر لائی ہے۔ بہت ہی سکھڑ اور پیاری بچی ہے۔“

”ارے آپ کھڑی کیوں ہیں، تشریف رکھیے۔“

پلیٹ دیکھتے ہی وامق کا انداز بدل گیا وہ اس کی شوخی کو سمجھ کر ہنس پڑی اور بولی۔

”فرح کدھر ہے؟ میں اس سے مل لوں تو پھر گھر واپس جاؤں گی۔“

”ضرور ملیں مگر اس حلوے کے بارے میں ہرگز نہ بتائیں پھر میرے حصے میں تو کچھ بھی نہیں آئے گا۔“

”شرم کرو وامق! اس سے پہلے بچی سمو سے

لے کر آئی تھی، وہ بھی سارے تم نے کھالے۔ اب حلوے پر بھی نظریں لگائے بیٹھے ہوتا چنور اپن بھی اچھا نہیں ہوتا مل بانٹ کر کھانے میں ویسے بھی برکت ہے۔

”ای ایک تو ہمارے ہاں تین وقت کی روٹی کے علاوہ کچھ بننا نہیں اب اگر ہمسائے مجھ پر ترس کھا کر کچھ بھیج دیتے ہیں تو اس پر بھی سب نظر لگا لیتے ہیں۔ یہ نانی نے میرے لیے بھیجا ہے جب وہ ہمارے ہاں آئی تھیں تو میں نے ان سے فرمائش کی تھی۔ کیوں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں؟“

اس نے زیا سے پوچھا وہ جواب دینے کے بجائے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ امی کو ہنسی آگئی بولیں۔ ”ہر کوئی تمہاری طرح دھڑلے سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ یہ تو بڑی نیک فطرت کی بچی ہے اس سے تو ہرگز یہ امید نہ رکھو کہ تمہارا ساتھ دے گی۔“

”ممائی! ناشتا تیار ہو گیا ہے؟“ فری نے کچن میں جھانک کر پوچھا پھر زیا پر نگاہ پڑی تو خوشی اور حیرت سے بولی۔

”تم اتنے سویرے ہمارے گھر میں آؤ اندر آ جاؤ۔“

آج ناشتا مل کر کریں گے۔“

وامق نے اس کی طرف سے رخ موڑ لیا تھا اور تیزی سے حلوہ کھا رہا تھا۔ فری نے اس خاموشی اور مصروفیت کو محسوس کیا آگے ہو کر سامنے آئی اور بولی۔ ”میں بھی کہوں، یہ اور خاموشی عجیب سی بات ہے یہ نہیں معلوم تھا آج ممائی نے ناشتے میں حلوہ بھی بنایا ہے اور یہ زیادہ کھانے کے چکر میں کچن میں گھسے کھڑے ہیں۔“

”تمہارا حصہ ٹیبل پر پہنچ جائے گا چلو سہیلی کو لے کر اندر چلو اس کے سامنے صبح لڑائی یہ کوئی اچھی بات نہیں اس سے مہمانوں پر برا اثر پڑ سکتا ہے۔“

”آؤ زیا!“ فرح اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر چلی گئی وامق نے اطمینان سے پلیٹ صاف کی اور پھر ڈائننگ روم میں آ بیٹھا جہاں اہل خانہ ناشتے کے انتظار میں

بیٹھے تھے۔

وامق کے لئے اخبار کی خبروں میں گم تھے۔ جنید کی خاموشی اور چہرے کے تاثرات بتاتے تھے کہ پوری شدت سے ناشتے کے انتظار میں ہے جبکہ فرح اور پھوپھو زیا کے ساتھ باتوں میں مصروف تھیں۔

”بتا دیا؟“ وامق نے جاتے ہی بڑی رازداری کے عالم میں زیا سے پوچھا اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”کیا؟ کس کے بارے میں پوچھ رہے ہو؟“ دونوں متوجہ ہوئیں۔

”کچھ نہیں ہماری آپس کی بات ہے۔“ وامق نے بڑے آرام سے کہہ دیا مگر اس کے اس انداز پر زیا کچھ گھبرا سی گئی۔ کیا سوچیں گے گھر والے میری وامق سے ایسی بے تکلفی کب سے ہو گئی جو سب سے چھپ کر ہم آپس میں راز کی باتیں کرنے لگے۔

”کیا مطلب ہے؟ صاف صاف بتاؤ ناں۔“ فرح وامق کے پیچھے بڑ گئی۔

”بس ہے نا ہماری آپس کی بات۔“ اس نے شانے اچکا کر مزے سے کہا۔

”میں بتاتی ہوں ویسے کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے، یہ تو بچی تنگ کر رہے ہیں ہمیں۔“ اس نے پہلے کہ کوئی بدگمان ہوتا زیا نے بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

”اے اے کچھ نہ بولنا ورنہ آج سزا کے طور پر یہ سب میرا شتا ضبط کر سکتے ہیں۔“

وہ روک رہا تھا مگر زیا کو تو اپنی پڑ گئی تھی بتا کر دم لیا۔

”میں ہی فرح اسے برا بھلا کہنے لگی اور اپنے ماموں سے بھی شکایت لگا دی۔“

”وامق! تم اتنے بڑے ہو کر بھی بچوں والی حرکتیں کرتے ہو۔ مجھے تمہاری تعریف تو بھی سنتے کو نہیں ملی۔ البتہ شکایتیں اکثر میرے پاس آتی ہیں۔“

”ابو! میں تو انہیں خوش کر لے گئے لیے یہ سب کرتا ہوں۔“ اس نے مصومیت سے کہا تھا۔

”جی ہاں، ہمیں خوش کرنے کے لیے یہ سب کچھ خود بڑپ کر جاتے ہیں۔“

اس روز غیر ارادی طور پر کئی بار اس نے دامتق کے بارے میں سوچا۔ بھلا لوگ اتنے زندہ دل خوش باش کس طرح سے ہوتے ہیں۔ اسے کسی کی پروا ہے نہ تجھک، کتنے اعتماد سے بات کرتا ہے وہ اس کے فقر و کوپا و کر کے کئی بار آپ ہی آپ مسکرائی۔

☆☆☆

دامتق کے بھانجے نانی کی سالگرہ تھی۔ فری ان کے ہاں آئی اور بتایا۔

”دامتق جا کر ناکہ باجی اور بچوں کو لے آیا ہے پرسوں نانی کی برتھ ڈے ہے ایک کا آرڈر بھی دامتق نے دیا ہے اور کہتا ہے سو سے تو ہسایوں سے بنواؤں گا کہ ایک بار کھائے تھے ذائقہ اب تک زبان پر ہے۔ ممانی نے تو بہت منع کیا کہ اتنی گرمی میں کہاں وہ لوگ اتنی محنت کریں گی۔“

”میں ایسی کوئی بات نہیں میں اور امی مل کر بنا لیں گے۔“

”اور آپ سب انوائٹڈ ہیں۔“

”ہم سب؟“ زینا کچھ ہچکچا کر بولی۔

”ہاں اس میں اس قدر حیرانی و پریشانی کی بھلا کیا بات ہے، گھر کے لوگ ہوں گے اور آپ سب بس اور تو کوئی نہیں۔“

”اچھا چلو ٹھیک ہے۔“ یہ سن کر اطمینان ہوا۔

جب سے فری نے برتھ ڈے کا ذکر کیا تھا۔ ان دونوں نانی، نواسی پر ایک ہی فکر سوار تھی۔ تحفہ کیا دیں گے ہم، ایسا ہونا چاہئے جو ان لوگوں کے شایان شان ہو، جبکہ امی مطمئن سی بیٹھی تھیں۔ کہہ دیا تھا جو ہماری حیثیت ہے اس کے مطابق دے دیں گے۔ پسند آجائے تو ٹھیک نہیں تو نہ سہی ہم نے تو اپنا بجٹ دیکھنا ہے۔“

”لو بھلا یہ کیا بات ہوئی وہ اتنے پیار سے بلا رہے ہیں اور ہم بچے کے لیے ڈھنگ کی ایک چیز بھی نہ لے کر جائیں۔“

نانی کو مکمل اختلاف تھا اور ان کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آ رہا تھا کہ دیں تو کیا دیں۔

”نانی! سوٹ تو میرا نیا ہی رکھا ہوا ہے یوں بھی

”اصل میں وہ حلوہ ان کی نانی نے بھیجا ہی میرے لیے تھا اب آپ چپ کھڑی میرا تماشا کیوں دیکھ رہی ہیں۔ بتائیں ناں انہیں کہ وہ تو آیا ہی میرے لیے تھا۔“

اور زینا نے گڑبڑا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ ابو ایک بار پھر اخبار میں گم ہو گئے وہ آکر پھوپھو اور فرح کے قریب بیٹھ گیا اور دھیرے سے بولا۔

”ہوگئی اب تو تسلی۔ اصل میں ان کی نانی کو میں نے بہن بنایا ہوا ہے تو وہ میرے لیے کچھ نہ کچھ بھیجتی رہتی ہیں۔“

”میں چلتی ہوں۔“ زینا اٹھ کھڑی ہوئی۔

”جی ضرور۔ آپ کو آئے ویسے بھی کافی ٹائم ہو چکا ہے۔“

دامتق کی بات نے اسے اچھا خاصا شرمندہ کر دیا۔ اور پھوپھو کے روکنے کے باوجود وہ پھر آڈن گئی کہہ کر باہر آگئی۔

دامتق بھی اس کے پیچھے آیا اور بولا۔ ”نانی جان کا شکریہ ادا کریں۔ آپ کا بھی بہت شکریہ کہ میرا ساتھ دیا۔“

وہ جواب میں کچھ بھی کہے بغیر چلی آئی۔ گھر آئی تو نانی نے چھوٹے ہی پوچھا۔

”دے آئیں کون ملا تھا؟ پلیٹ کس نے پکڑی؟“

جواب میں اس نے ساری بات بتادی۔ سن کر انہیں ہنسی آگئی اور بولیں۔

”بڑا ہی شریر لڑکا ہے اور میں نے بھلا کب اسے بھائی بنایا ہے۔“

”نانی! اتنے سویرے آپ نے مجھے ان لوگوں کے گھر بھیج دیا پتا ہے ابھی انہوں نے ناشتا بھی نہیں کیا تھا بھلا یہ بھی کوئی وقت ہے کسی کے ہاں جانے کا۔“

”جیند بیٹا کیا کر رہا تھا۔“ انہوں نے بڑی محبت اور اپنا بیٹے کے ساتھ جید کا ذکر کیا۔

”کچھ نہیں ناشتے کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ فرح کی امی اور ممانی آپ دونوں کو سلام کہہ رہی تھیں اور دامتق نے شکریہ ادا کیا تھا۔“

”اُمی! کیا کبھی ہم بھی امیر ہوں گے؟“ جواب میں انہوں نے ہنسنے لگا۔ تیز قدموں سے چلے گئیں اور اسے بھی تقلید کرنا تھی۔

☆☆☆

جس روز تقریب تھی وہ بہت دل سے تیار ہوئی تھی۔ نانی لٹاں کا بچے موتیوں کا سیٹ پہنا تو اسے اپنا آپ بہت ہی اچھا لگا۔ کاش ایسے بہت سے سیٹ میرے اپنے ہوں۔ نانی نے دیکھا تو نظر اتاری اور بولیں۔

”میں تمہاری تیاری سے پوری طرح مطمئن ہوں آج تو اگر وہ سرے شہر کی لڑکیاں بھی بلا لیں تو تمہارے مقابلے کی ایک بھی نہیں ہوگی۔“

”کیسی باتیں کرتی ہیں لٹاں! یہ کوئی مقابلہ حسن میں شرکت کے لیے جارہی ہے؟ مت اتنا چڑھائیں ایسے۔ کنواری بیٹیوں کی زیادہ تعریف اچھی نہیں ہوتی۔ یاد نہیں آپ کو آپ ہی کہا کرتی تھیں۔“

”سب یاد ہے مجھے اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ میری بیٹی بڑی نصیبوں والی ہے۔“

یہ لوگ فرح کے ہاں پہنچیں تو پہلے ملاقات جنید اور اس کی امی سے ہوئی۔

”ارے آج تو زیبا بہت ہی پیاری لگ رہی ہے اور یہ موتیوں کا سیٹ کتنا خوبصورت ہے۔“

”یہ سچے موتی ہیں“ نانی نے جھٹ بتایا۔

”بہت خوبصورت ہے اور پہننے والی بھی بہت اچھی ہے“ ناصرہ کی اس تعریف پر نانی کا ڈھیروں خون بڑھ گیا ان کی محنت رنگ لائی تھی۔ جنید بھی زیبا کو دیکھ کر مسکرایا تھا اور اس کی نگاہوں میں واضح ستائش تھی۔

”فری کہاں ہے آئی؟“ اس تعریف پر وہ شرما گئی اور فرح کے بارے میں پوچھنے لگی۔

”فرح شاید چمن میں ہوئی اور ہاں بھی سمو سے ہمیں مل گئے ہیں۔ بہت مزے کے بنے ہیں۔“

ابھی کچھ دیر پہلے ان کا ملازم لے کر گیا تھا اور

فری کہہ رہی تھی ہم ایک جیسے کپڑے پہنیں گے مگر یہ جوتوں کا کیا کروں ایک بھی تو ڈھنگ کا نہیں ہے میرے پاس۔“

”اے ہاں نسیہ! یہ تو بالکل سچ ہے۔ بے چاری زیبا کے پاس نہ ڈھنگ کے جوتے ہیں اور نہ ہی چوڑیاں ہیں۔ تم اسے بازار لے جا کر یہ دونوں چیزیں دلوا دو۔ باقی ہار بندے تو میرے پاس موتیوں کا سیٹ رکھا ہے وہ زیبا پہن لے گی۔“

”اماں! اتنے خرچے یہ تو وہی بات ہوگئی بے گانی شادی میں عبداللہ دیوانہ۔“

”بے گانی شادی کیوں پڑوس کا معاملہ ہے اور رشتہ داری بھی قائم ہوئی جائے گی۔“ آخری فقرہ ہولے سے کہا تاکہ زیبا نہ سن سکے۔

”لٹاں! آپ اپنے آپ بات کہیں سے کہیں پہنچا بیٹھی ہیں۔ کیا یہ دانشمندی ہے۔“ نسیہ نے سمجھانا چاہا۔

”اچھا بس اب اس بات پر مجھ سے بحث مت کرو میں کچھ بھی سننے کو تیار نہیں ہوں اور ہاں سمو سے دل سے بنانا جتنے اچھے ہوں گے اتنی ہی ہماری زیبا کی تعریف ہوگی۔“

نسیہ نے آخر اذیت میں سر ہلا دیا۔

فری کا سوٹ مکمل ہو گیا۔ زیبا ان کے ہاں دے کر خود امی کے ساتھ بازار چلی گئی نومی کے لیے ریڈی میڈ سوٹ خریدا۔ اپنے لیے چوڑیاں اور سینڈل ہزار سے لیے۔ خوب صورت پرنٹ والے سوٹ تھے جی چاہتا تھا سب نہیں تو ایک آدھ ہی خریدا مگر امی نے صاف انکار کر دیا اس کے اصرار پر بولیں۔

”میں تو پہلے ہی اتنے امیر پڑوسیوں کے ہاں زیادہ آنے جانے کی قائل ہی نہیں تھی مجھے پتا تھا تم ہاں جاؤ گی، ان لڑکیوں میں اٹھو بیٹھو گی تو اپنی ہر چیز میں گٹرے دکھائی دیں گے۔ لٹاں کو بھی سمجھا یا تھا مگر انہوں نے میری ایک نہیں سنی اتنا زیادہ آنا جانا رکھا ہے ان کے ہاں اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اب ہر چیز دیکھ کر نہ ہاراجی چلتا ہے اور تم ناشکری ہوئی جارہی ہو۔“

نیسہ پوچھنے ہی والی تھیں کہ پسند آئے یا نہیں ناصرہ نے خود ہی بتادیا۔

”میری زیا کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے اسی نے بنائے تھے“ نانی نے بتایا۔

وہ کچن میں آگئی۔ فرح یہاں موجود تھی اور اس نے وہی سوٹ پہن رکھا تھا جو زیا نے ہی کر دیا تھا اس کی جیولری بھی بے حد خوبصورت تھی وہ بتا رہی تھی یہ سیٹ ابھی پچھلے ماہ مجھے میرے پاپا نے بھیجا ہے اور یہ چوڑیاں دیکھو میں آج لے کر آئی ہوں اور پرفیوم۔“

کہتے کہتے رکی اور بولی۔

”تم نے پرفیوم نہیں لگایا ٹھہرو میں تمہارے لیے لے کر آئی ہوں تم ذرا الماری سے برتن نکالو۔“

اس کے جانے کے بعد زیا ابھی اوھر اوھر جائزہ ہی لے رہی تھی کہ پیچھے سے آکر کسی نے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

”آج تم کچن میں دکھائی دے رہی ہو؟ خیر تو ہے کہیں دشمنوں کی طبیعت تو ناساز نہیں ہے دماغ کو گرہی۔“

کہتے کہتے اس کا رخ بھی کہنے والے نے اپنی طرف موڑا اور پھر صورت دیکھ کر ایک دم سے ہاتھ پیچھے کر لیا۔

”سوری! میں سمجھا فری ہے۔“ واثق جلدی سے سنبھل گیا تھا جبکہ وہ شرمندہ سی کھڑی تھی۔

”ابھی کچھ دیر پہلے تو یہ کپڑے فری نے پہن رکھے تھے کیا یہ کسی پیر سے دم کروائے ہوئے ہیں اور اس نے کہا ہے کہ ان کو پہننے والی شوہر کے دل پر راج کرے گی اور سر پر چڑھ کر ناپے گی۔“

”میں نے اور فری نے ایک جیسے سوٹ بنوائے ہیں۔“ اس نے دھیرے سے سچ کی۔

”اوتب پھر میرا قصور تو رتی بھر نہ ہوا۔“ بندہ پوچھے ایک جیسے کپڑے سلوانے کی بھلا کیا تک ہے اتنے ڈیزائن ہیں اتنے ٹکڑے اور یہاں دونوں ایک جیسے بنا کر لوگوں کو بے وقوف بنا رہی ہیں۔“

”مجھ سے تو فرح نے کہا تھا۔“ وہ صفائیاں پیش

کرنے لگی۔

”فرح کا تو دماغ خراب ہے۔ آئندہ جب وہ کچھ کہے تو مجھ سے مشورہ لے لیا کرو۔“ اس نے جان چھڑانے کو جھٹ اثبات میں سر ہلادیا۔

”دیے بندہ پوچھے کیوں آپ کے پاس اپنا دماغ نہیں ہے جو میرے کہے پر عمل کر دے گی۔“ وہ بے بسی سے اس کی صورت دیکھنے لگی پھر سر جھکالیا۔

”اتنے کام مت کیا کرو، لوگ تو پھلتے چلے جاتے ہیں آج برتن سیٹ کر دوار ہے ہیں کل وھلوانے پر تل جاتیں گے۔“

”جی نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔“

”ارے لڑکی! تم نے ابھی دنیا دیکھی ہی کہاں ہے اس کا چلن تو بڑے بڑوں کی سمجھ میں نہیں آیا اکثر لوگ معصومیت میں ہی مارے جاتے ہیں۔ مجھے تم سے بڑی ہمدردی ہے، میں نہیں چاہتا تمہیں بھی بے خبری میں مات ہو جائے۔“

”زیبا تمہاری نانی جان دکھائی نہیں دے رہی ہیں کیا وہ نہیں آئیں؟“ فرح پرفیوم کی شیشی ہاتھ میں پکڑے پوچھ رہی تھی۔

”تمہیں نانی سے کیا کام پڑ گیا ہے نکلی لڑکی؟“ واثق اس کی طرف مڑا۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ یقیناً کھانوں کی خوشبو کے تعاقب میں آئے ہو۔“

”لڑکیوں کے تعاقب سے کہیں بہتر ہے کہ بندہ کھانے کا تعاقب کر لے، دیے پوچھ لو اپنی دوست سے میں نے ایک چیز بھی نہیں کھائی۔“

”زیبا! کام ختم ہو گیا ہے تو آؤ سب کے پاس جا کر بیٹھتے ہیں۔“

”اور اگر نہیں ختم ہوا تو تم کام کرو میں اکیلی باہر بیٹھتی ہوں، بے ناں یہی کہنا چاہ رہی ہوں تم؟ شرم کرو فری بلکہ شرم سے ڈوب مرو گھر آئے مہمانوں سے کام کرو اور ہی ہو۔“

”اچھا تم سے ایک بات کرنا تھی مجھے۔ فری سے تو تمہاری بہت دوستی ہے اور میرا اندازہ ہے وہ تمہیں پسند بھی بہت کرتی ہے بیٹا! میں نے دیکھا ہے تم جب بھی ان لوگوں کے ہاں جاتی ہو۔ صرف فری سے ہی چپکی رہتی ہو اکثر تو سلام کرنے کے بعد اس کے کمرے میں ہی چلی جاتی ہو۔ میں ہی ناصرہ اور فاخرہ سے باتیں کیے جاتی ہوں۔“

”نہیں نانی! اب تو نائلہ باجی بھی آئی ہوئی ہیں۔ وہ بہت اچھے مزاج کی ہیں۔ میرے ساتھ بالکل چھوٹی بہنوں والا پیار کرتی ہیں ان کے بچے بھی بہت پیارے ہیں۔ میں نائلہ باجی سے بھی کافی باتیں کر لیتی ہوں اور انہیں میری طرح کوکنگ کا بھی شوق ہے کہہ رہی تھیں کسی دن تمہارے گھر آ کر تم سے ایک دو شہز بنانا سیکھوں گی۔“

”ہاں ہاں ضرور دیکھو وہ واقعی بڑی ہی سادہ مزاج کی لڑکی ہے حالانکہ میں نے سنا ہے اس کا شوہر کافی بڑا افسر ہے مگر غرور نام کو نہیں۔ اصل میں خاندانی لوگ ہیں انہیں انسانیت کی قدر ہے دولت اور پیسہ پیسہ، نمودنماش اس چیز کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ ناصرہ تو جب بھی میں جاتی ہوں اپنے پاس ہی بٹھا لیتی ہے اور ادھر ادھر کے ٹیسے سنائی رہتی ہے۔ اس کی بھابھی فاخرہ البتہ خاموش مزاج کی ہے زیادہ بات چیت نہیں کرتی۔“

”گھر اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے نانی جان کہ وہ مغرور ہیں یا انہیں ہماری آمد اچھی نہیں لگتی۔ ملتی تو وہ بھی بہت پیار سے ہیں بس یہ تو اپنی اپنی طبیعت ہوتی ہے وہ زیادہ بات چیت کرتی ہی نہیں ہیں بس کچن کے کام نبٹاتی رہتی ہیں سارے گھر کی ذمہ داری بھی ان پر ہی ہے۔“

”ہاں اس کے بیٹے نے کسر پوری کر دی ہے تو بہ کس قدر تیز لڑکا ہے وہ۔ نہ بڑے کو دیکھتا ہے نہ چھوٹے کو بس اپنی ہی کچے جاتا ہے۔“

”ہاں نومی کی سالگرہ پر کتنی رونق لگائی انہوں نے۔“

”واثق کے ذکر پر زیبا کا دل خوشگوار انداز میں دھڑکنے لگا تھا۔“

”خاک رونق لگائی۔ اس کی ماں تو اس قدر

”تمہیں کیا تکلیف ہے۔ یہ میری دوست ہے۔“

”فری تمہارا فون ہے، جنید نے آکر بتایا۔“

”کس کا فون ہے؟“

”انیلا نام بتایا ہے۔“

”اکثر لوگ غلط نام بتا دیتے ہیں۔ انیلا تو دیلے بھی کچھ مشکوک سا نام ہے۔ فرخ ذرا سنبھل کے۔“

واثق کی بات پر جنید اس کی طرف متوجہ ہوا اور بولا۔

”تم یہاں کچن میں کھڑے کیا کر رہے ہو؟“

”کیوں ضروری ہے۔ جو کچن میں کھڑا ہوں وہ کچھ کرے بھی۔“

”ایسے ہی پوچھ لیا تھا بابا۔“

”دیکھا ہم یوں لا جواب کرتے ہیں۔“

واثق نے زیبا سے داد چاہی مگر وہ خاموشی سے اپنا کام کرتی رہی۔

”چلو آؤ میرے ساتھ۔“

جنید واثق کا ہاتھ پکڑ کر اسے لے گیا۔

فری فون اٹینڈ کرنے چلی گئی زیبا کچن میں ایسی کھڑی تھی اور آس پاس جیسے واثق کی آواز تھی اس کے لبوں پر آپ ہی آپ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

☆☆☆

”نانی جان! کچھ لوگ کس قدر خوش باش اور زندہ دل ہوتے ہیں ان سے مل کر ہم بھی اپنے دکھ اور محرومیاں بھولنے لگتے ہیں۔“

”ہاں ٹھیک کہتی ہو تم تمہارے نانا بھی ایسے ہی مزاج کے مالک تھے۔“

”نانی! اگر گھر میں ایک فرد بھی ایسا ہو تو کس قدر رونق رہتی ہے ہم تینوں تو بس ایک ہی مزاج کی ہیں۔“

”آج کل کا دور تو مصیبتوں اور پریشانیوں کا دور ہے ہر کسی کے ساتھ کوئی نہ کوئی مسئلہ ہے امیر ہو یا غریب، کسی نہ کسی پریشانی ابھرنے میں گرفتار دکھائی دیتے ہیں اور ایسے میں زندہ دلی ہو تو کیسے ہو۔“

”نہیں نانی! جو زندہ دل ہوتے ہیں وہ تو ہر حال میں خوش مزاجی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔“

شرمندہ ہو رہی تھی ابھی تک بچوں والی حرکتیں کرتا ہے اب وہ جو بکری کا بچہ پالا ہوا ہے کس قدر لاڈ اٹھاتا ہے اس کے۔ مجھے تو دیکھ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے“ اسی گھر میں وہ بچہ جنید بھی تو رہتا ہے کیسا سلبھا ہوا خاموش طبع اور نیک مزاج کا لڑکا ہے اس کے لیے تو دل سے دعا نکلتی ہے۔ اتنی سعادت مندی سے سلام کرتا ہے اور نظر پیچی کے بیٹھ جاتا ہے۔ دامق کی طرح نہیں کہ آندھی طوفان کی طرح آئے سارا کمر اگویا زلزلے کی زد میں ہے۔ تھوڑی دیر بیٹھے ایسی گفتگو کی جو کسی کے پلے نہیں پڑتی اور چلتے بنے۔“

”نانی! بہت بُرے لگتے ہیں وہ آپ کو؟“ زیبا نے مجھ دل کے ساتھ دریافت کیا۔

”نہیں مجھے کیوں برا لگنے لگا اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا ہے۔ آنکھوں کی ٹھنڈک دل کا سکون ہے۔ اللہ اسے صحت و تندرستی والی لمبی عمر عطا فرمائے۔ میں تو اس کی عادت کی بات کر رہی تھی کہ ماں جتنی خاموش طبع بیٹا اتنا ہی شوخ مزاج ہے۔ ہڈی میں چھین ہے ہی نہیں یہاں وہاں پھدکتا پھرتا ہے۔“

پھر فوراً توقف کے بعد بولیں۔

”لو بات کہاں سے شروع ہوئی تھی اور کہاں آ پہنچی۔ اصل میں میں تم سے کہتا یہ چاہ رہی تھی کہ جب تم فری کی طرف جایا کرو تو ناصرہ کو سلام کرنے کے بعد فوراً فری کی طرف دوڑ مت لگا دیا کرو۔ کچھ دیر ناصرہ کے پاس بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہا کرو اس سے اچھا اثر پڑتا ہے۔“

”وہ مجھ سے اتنی بڑی ہیں میں بھلا ان سے کیا بات کر سکتی ہوں۔“

”بڑوں کی بات سن بھی لیا کرو میں نے جو کہا ہے اس پر عمل کرو آپس کی بات چیت اچھا اثر ڈالتی ہے۔“

”اچھا نانی! بیٹھ جایا کروں گی میں ان کے پاس بھی مگر ان سے کہوں گی کیا یہ بھی بتا دیں؟“

”بات سے بات نکلتی جاتی ہے بھلا پہلے سے سوچ کر بھی گفتگو کی جاسکتی ہے۔ وہ سوال کر رہی ہیں

گندم اور تم جواب دے رہی ہو چنا“ اب یہ تو ہونے سے رہا۔“

ابھی نانی، نواسی میں یہ بات چیت ہو رہی تھی کہ فرح آ گئی۔

”آؤ بیٹی! ہم تم ہی لوگوں کا ذکر کر رہے تھے۔“

”زیبا! اٹھو بہن کے لیے چائے بناؤ۔“

”نہیں نانی! چائے نہیں پیتا مجھے، میں بہت جلدی میں ہوں میری دوست کا فون آیا ہے وہ میری منتظر بیٹھی ہے میں تو ابی کا یہ دوپٹہ دے آئی تھی انہوں نے کہا ہے کہ اس پر اچھی سی کروشی کی کوئی تیل بنا دیں۔“

”کروشیہ تو مجھے نہیں آتا“ زیبا نے معذرت کرنا چاہی تو نانی نے جلدی سے دوپٹہ فری کے ہاتھ سے لے لیا اور بولیں۔

”زیبا کو کہیں آتا کیا ہوا“ مجھے اور نسیہ کو تو آتا ہے۔“

”نانی! آپ کی اتنی نظر ہی کہاں ہے اور امی کے تو بازو میں درد رہتا ہے۔“

”اب ایسی بھی نظر کمزور نہیں فری تم ناصرہ سے کہہ دیتا، دو تین روز میں، میں یہ دوپٹہ تیار کر کے خود لے کر آؤں گی۔“

”اچھا جی بہت شکریہ“ فری خوش ہو گئی۔

”دشکریہ کی کیا بات ہے بیٹی ہم نے تو تم لوگوں کو کبھی غیر سمجھائی نہیں۔ ناصرہ میری بیٹی کی جگہ ہے اور تم میری زبانی ہی کی طرح ہو۔“

”اچھا اب میں چلتی ہوں، اصل میں وہ میری دوست انتظار میں ہوگی، ہے بھی کچھ اٹے دماغ کی فوراً ناراض ہو جاتی ہے۔“

فرح چلی گئی تو وہ زیبا سے بولیں۔

”تم کبھی بھی کس قدر احقانہ بات کر جاتی ہو۔“

ناصرہ نے نکتے مان کے ساتھ دوپٹہ بھیجا تھا اور تم انکار کی نئی نئی راہیں نکال رہی تھیں۔ مجھے تو اب یہ فکر ہے اگر اس نے گھر جا کر ناصرہ سے تمہاری باتوں کا ذکر کر دیا تو وہ کیا سوچے گی تمہارے بارے میں۔“

1

بیوٹی بکس کا تیار کردہ

سوہنی ہیر آئل

SOHNI HAIR OIL

- کرتے ہوئے بالوں کو روکتا ہے
- سٹے بال اکاٹا ہے۔
- بالوں کو مضبوط اور چمکدار بناتا ہے۔
- مردوں، عورتوں اور بچوں کے لئے
- یکساں مفید۔
- ہر موسم میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔



قیمت - 150/- روپے

سوہنی ہیر آئل 12 جلی بوتلیوں کا مرکب ہے اور اس کی تیاری کے مراحل بہت مشکل ہیں لہذا تھوڑی مقدار میں جاتا ہے، یہ ہزاروں ایکسیکوسٹریکٹس میں دستیاب نہیں، کراچی میں دستی خریدنا جاسکتا ہے، ایک بوتل کی قیمت صرف - 150/- روپے ہے، دوسرے فروشوں کے لئے آڈیٹ کرر جنرل پارسل سے منگوا لیں، رجسٹر سے منگوانے والے ملی آڈراس حساب سے بھجوائیں۔

- 2 بوتلوں کے لئے ----- 350/- روپے
- 3 بوتلوں کے لئے ----- 500/- روپے
- 6 بوتلوں کے لئے ----- 1000/- روپے

نوٹ: اس میں ڈاک خرچ اور پیکیج چارجز شامل ہیں۔

منی آڈر بھیجنے کے لئے ہمارا پتہ:

بیوٹی بکس، 53- اورنگز ہب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

دستی خریدنے والے حضرات سوہنی ہیر آئل ان جگہوں

میں حاصل کریں

بیوٹی بکس، 53- اورنگز ہب مارکیٹ، سیکنڈ فلور، ایم اے جناح روڈ، کراچی

کلیئر عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔

فون نمبر: 32735021

”میں نے ٹھیک ہی تو کہا ہے نانی! اب دیکھیں نال امی کے بازو میں ہر وقت درد کی شکایت اور آپ بھلا ایسا باریک کام آسانی سے کر سکتی ہیں؟“

”چلو آسانی سے نہ سہی تھوڑی تکلیف کے ساتھ ہی مگر انکار تو کسی صورت مناسب نہیں۔“

نسیہ بھی دوسرے کمرے سے اٹھ کر ادھر آ بیٹھیں اور آتے ہی پولیس۔

”لتاں میرا خیال ہے میں چند روز تک گاؤں کا چکر لگاؤں اگر مالک توجہ نہ دیں تو مزارعے بہت کچھ تو خود ہی ہضم کر جاتے ہیں۔“

”ہاں ٹھیک ہے تم ہو آؤ گاؤں سے میں تو دن رات یہی دعا کرتی ہوں اللہ تمہیں آرام چین کی زندگی دے اور اب تو لگتا ہے تمہاری یہ مشقت ختم ہونے والی ہے۔ آرام سے بستر پر بیٹھ کر حکم چلایا کر دی۔“

”وہ کیسے نانی؟“ زبیانے خوش ہو کر پوچھا۔

”بس مجھے ایسا ہی لگتا ہے۔“ وہ آسودگی سے مسکرائیں نسیہ بیگم ان کی بات سمجھ تو گئی تھیں مگر چہرے پر کوئی تاثر نہیں آیا۔ وہ سفر میں اٹھنے والے اخراجات کا حساب لگانے لگیں۔

”سنو یہ بھٹوں کا موسم ہے آتے ہوئے بھٹے لے آنا اور زیادہ لے کر آنا ہم تو تین ہی ہیں بلکہ میرا تو شمار ہی کیا مگر بڑوس میں تو اللہ کے فضل سے بھرا کنبہ آباد ہے ان کے ہاں بھی بھجواؤں گی۔“

”نانی! اپنا نہیں وہ کھاتے بھی ہیں یا نہیں؟“ زبیانے کہا۔

”لو کھاتے کیوں نہیں سادہ مزاج کے لوگ ہیں کوئی خزا تو ہے نہیں ان میں تم دیکھ لینا کتنا خوش ہو کر لے لیں گے۔“

☆☆☆

نانی نے نسیہ کو بازار بھیج کر بہت اچھا سادہا کا منگوا لیا اور پھر سر جھکا کروشیہ بنانے میں مصروف ہو گئیں زبیانے سمجھایا نسیہ نے منع کیا مگر انہوں نے ایک نہیں سنی۔

”لنٹاں! پھر رات کو سر میں درد ہوگا۔ آپ فرح سے کہہ دیتیں وہ برا نہیں مانتی۔“

”کیوں کہہ دیتی تم نہیں جانتیں نیسہ! اپنی زیبا کے لیے میں نے کتنی دعائیں کی ہیں، کیا کیا ارمان ہیں میرے دل میں اس کے لیے تمہاری طرف سے تو دل ٹھنڈا نہ ہوا، میں تمہیں دیکھ دیکھ کر تمہارے نصیب پر روتی ہی رہی مگر اپنی زیبا کے لیے میں نے رب کے حضور اتنی دعائیں کی ہیں کہ یقیناً سا آگیا ہے وہ راج کرے گی۔ ہمیشہ ہنسنے مسکرائے گی۔ ناصبرہ کا بیٹا مجھے اس کے لیے ہر لحاظ سے موزوں لگتا ہے اپنی زیبا کی طرح ہی ٹھنڈے سنجیدہ مزاج کا مالک ہے ایسے لوگ حساس طبیعت کے ہوتے ہیں دوسروں کا احساس کرتے ہیں۔ دل آزادی ان کی فطرت میں ہی نہیں ہوتی اور مجھے پورا یقین ہے زیبا کا نصیب اسی گھر میں کھلے گا۔“

”لنٹاں! اتنے یقین سے بات مت کریں پتا نہیں ان لوگوں کی مرضی کیا ہے اگر ایسا نہ ہو سکا تو آپ کا ماپوس چہرا مجھے بہت دکھ دے گا۔“

”تم اچھی امید رکھو۔“ وہ کرشمہ بنانے میں مصروف ہو گئیں۔

بڑی محنت کے ساتھ انہوں نے دوپٹہ مکمل کیا زیبا اور نیسہ نے بہت تعریف کی اور وہ مطمئن ہو کر بولیں۔

”آج شام ہی میں خود جا کر دوپٹہ ناصبرہ کو دے کر آؤں گی۔ زیبا تم بھی میرے ساتھ چلنا۔“

”ٹھیک ہے نانی جان! ضرور چلیں گے۔“

جب تک شام نہیں ہوگئی نانی جان نے کئی بار دوپٹے کا تنقیدی جائزہ لیا۔ ”کام میں صفائی تو ہے ناں؟“

”یہ ڈیزائن بھلا تو لگتا ہے؟“ بار بار سوال کرتیں اور زیبا ہر بار ہنستے ہوئے تسلی دیتی۔

شام کو جب وہ دونوں ان کے ہاں آئیں تو گھر میں تقریباً بھی موجود تھے جنید دکھائی نہیں دیا انہوں نے پوچھا تو پتا چلا کسی دوست کی طرف گیا ہوا ہے۔

”اچھا یہ دوپٹہ دیکھو اور بتاؤ نیل پسند آئی یا نہیں۔“

انہوں نے شاپر سے دوپٹہ نکال کر پھیلا دیا۔

”ارے اتنی جلدی بنالیا، مجھے کوئی ایسی خاص جلدی تو نہیں تھی۔“ انہوں نے نیل پر ہاتھ پھیرا اور ستائش بھرے انداز میں کہا فارخہ اور نائلہ نے بھی تعریف کی جبکہ فرح بولی۔

”آپ تو بہت اچھا کام جانتی ہیں نانی! اب تو میں بھی آپ سے اپنے دوپٹے پر نیل بنواؤں گی۔“

”کیوں نیل والے دوپٹے اوڑھنے سے کیا زیادہ ثواب ہوتا ہے۔“ وامق نے بظاہر بڑی سنجیدگی سے سوال کیا تھا۔

”اتنا خوبصورت لگ رہا ہے، میں تو ضرور بنواؤں گی۔“

”ضرور بیٹی! میں بہت خوشی سے بنا کر دوں گی۔“

”اچھا خالہ یاد آیا میں نے کہا تھا اس بار آپ سے سبزیوں کا اچار ڈلوانا ہے۔ میرے جنید کو بہت پسند ہے۔ بازار سے لا کر کھانا رہتا ہے مگر گھر کے اچار کی تو بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ سوچا تھا اس مرتبہ آپ سے ڈلوادوں گی۔ ذائقہ بھی بہت ہے آپ کے ہاتھ میں۔“

”کیوں نہیں زیبا بہت اچھا اچار ڈالتی ہے۔“

انہوں نے بڑی خوشی سے ہاں بھری۔

”تمہیں ایک چیز دکھاؤں، فری زیبا کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھاتے ہوئے بولی۔

”کیا چیز؟“ اس نے بیٹھے بیٹھے ہی پوچھا۔

”آج کل ہم بھائی کے رشتے کے چکر میں ہیں چاہتے ہیں جھٹ کسی اچھی لڑکی کو انگوٹھی پہنا کر پابند کر لیں اسی سلسلے میں دو تین تصویریں ہیں میرے پاس تم بتاؤ کون سی زیادہ اچھی ہے۔“

فری کی بات سن کر نانی کی تو جیسے دنیا ہی ڈول گئی۔ زیبا، فری کے ساتھ چلی گئی نانی کچھ توقف کے بعد بولیں۔

”ہم بھی آج کل زیبا کے رشتے کے لیے

چڑے پر پھیر کر غم آنکھیں خشک کیں اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔

ان کے جانے کے بعد ناصرہ، نانکھ اور فاخرہ سے بولیں۔

”لوگ بھی کیسی کیسی سوچتے لگتے ہیں۔ خالہ نے یہ نہیں دیکھا کہ ہم کہاں، وہ کہاں، اشاروں اشاروں میں اپنی بیٹی کی بات چھیڑدی۔ مجھے غصہ تو بہت آیا مگر صاف صیاف سنانے پر بھی ہم لوگوں کی طبیعت کہاں مائل ہوتی ہے بس لحاظ آ جاتا ہے۔ ویسے میں نے اپنی سوچ ان پر واضح کر دی ہے۔ اگر سمجھ دار ہوئیں تو دوبارہ ایسا ذکر بھی زبان پر نہیں لائیں گی۔“

وہ اتنا کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں تب نائلہ نے کسی گہری سوچ میں غم اپنی ماں کو دیکھا اور بولی۔

”آپ کیا سوچنے لگیں ہیں امی؟“

”بس میری نظر کے سامنے سے خالد جی کا اداس چہرہ نہیں ہٹ رہا، بے چاری کتنی آس کے ساتھ اشاروں میں بات کر رہی تھیں اور تمہاری پھوپھو نے کس بے دردی سے جواب دیا۔“

”ای! پھوپھو اور ان کے بچے تو ہیں ہی اسی مزاج کے! اپنا کام نکلوانے میں تیز ہیں۔ دوسروں کے جذبات کی انہیں کب پرواہ ہوتی ہے! اب اگر زیاسے

پریشان ہیں کوئی اچھا لڑکا ملے تو میں اس کی بات چکی
کردوں۔“

”زیبا جیسی لڑکی کے لیے رشتوں کی کیا کمی ہے“
نانکھ نے کہا تو وہ بولیں۔ ”بس مجھے نیک
شریف لوگ چاہئیں۔“

”آپ کے عزیزوں میں کوئی نہیں ہے خالہ؟
آج کل تو لڑکی سے زیادہ جمیزہ دیکھا جاتا ہے اور لوگ
اپنے برابر کے لوگوں میں ہی رشتہ کرنا پسند کرتے ہیں
اور یہ کچھ غلط نہیں۔ لڑکا لڑکی اگر ایک جیسے گھرانوں
کے ہوں تو ان کی سوچ کا انداز بھی ایک جیسا ہوتا ہے
اور نہ غریب گھر سے لڑکی بیاہ کر لے آؤ تو وہ دبی دہائی
بجھکتی سی رہتی ہے اور آج کل کے لڑکے بھلا ایسی
لڑکیوں کو کہاں پسند کرتے ہیں۔ میرا جنید تو کہتا ہے۔
ای کسی اونچے گھرانے میں ہی شادی کروں گا لڑکی
کے بھائی گورنمنٹ آفیسر ہونے چاہئیں اور لڑکی ایسی
جو میرے ساتھ چلتی اچھی لگے۔“

”ہاں جنید کے خیالات بہت اونچے ہیں“ نائلہ نے کہا تو ناصرہ بولیں۔

”کیوں نہ ہوں، آخر کس شے کی کمی ہے میرے بچے میں اور میں تو خود یہ چاہتی ہوں لڑکی ایسے اونچے گھرانے سے لاؤں کہ سب رشتے داروں میں واہ واہ ہو جائے۔ آپ بھی زیبا کے لیے کوئی دیرنہ دیر سیدھا سا لڑکا دیکھیں مرد تو کوئی ہے نہیں آپ کے گھر میں کوئی ایسا لڑکا دیکھیں جو آپ لوگوں کے ساتھ ہی رہ سکے۔“ وہ مشورہ دے کر نرمی سے باتیں کرنے لگیں اور نانی دھواں دھواں چہرے، اداس دل کے ساتھ گم صم سی بیٹھی کی بیٹھی رہ گئیں۔ پھر نالہ سے بولیں۔

”بیٹی! ذرا زیبا کو بلا دو میں گھر چلوں گی طبیعت چھی نہیں ہے۔“

”خالہ! بیٹھے میں چائے بناتی ہوں“، فاخرہ کے کہنے پر انہوں نے نفی میں سر ہلایا اور بولیں۔

”ہیں۔ میرے بازو میں بہت تکلیف ہے مجھ سے بیٹھا نہیں جا رہا۔“

بظاہر پسینہ پونچھنے کے بہانے انہوں نے دوپٹہ

سستی پلاسٹک

تہذیب و ثقافت

مترہ بخاری

قیمت - /300 روپے

مفت کاپی

کتبہ و عمران ڈائجسٹ، 37 - ایڈیٹر: ڈاکٹر ارباب - فون نمبر: 32735021

رشتہ نہیں بھی کرنا تھا تو اس قدر خشک اور چھتے ہوئے

لجے میں تو بات نہ کرتیں“ ویسے زیبا ہے بہت اچھی لڑکی اور یہ لوگ بے حد شریف اور خاندانی ہیں۔“
”تو پھر کیا خیال ہے، ہم نہ اپنے بھائی کے لیے مانگ لیں۔“

نانا نے شوخی سے واثق کی طرف دیکھا۔

”مجھے تو کوئی اعتراض نہیں البتہ واثق کا مجھے پتا نہیں اس کے خیالات بھی جنید کی طرح ہیں یا اس سے بھی اونچے ہیں۔“

”میرے خیالات واقعی جنید سے اونچے ہیں امی! مجھے صرف دولت اور ظاہری شان و شوکت متاثر نہیں کر سکتی۔ مجھے تو مخلص اور نیک دل ساتھی کی تمنا ہے جو ہر دکھ سکھ میں میرے ساتھ ہو۔“

”تو پھر کیا خیال ہے میں ابھی ابو کے آفس فون کر کے ان سے اجازت لیتی ہوں اور پھر چلتے ہیں زیبا کے گھر۔“ نانا نے ضرورت سے زیادہ پر جوش لگی اور یہی حال فاخرہ کا بھی تھا۔

نانی جس وقت سے فری کے ہاں سے ہو کر آئی تھیں چہرے پر درد و غم کے مسلسل چپکے چپکے روئے چلی جا رہی تھیں۔ زیبا بچن میں رات کا کھانا بنانے میں لگی تھی اور نسیہ بار بار ماں سے پوچھ چکی تھیں۔

”آپ ایسے کیوں لپٹی ہیں؟“ ہر بار انہوں نے سر درد کا بہانا بنایا تھا۔

”لٹاں! چائے ہی پی لیتیں۔“ وہ ایک بار پھر کمرے میں آئیں اور اب کے انہیں احساس ہوا تھا کہ دوری ہیں۔

”خیر تو ہے ناں لٹاں؟“ وہ ان کے پاس آ بیٹھیں نانی نے دو پٹے چہرے سے ہٹایا اور بولیں۔

”تم ٹھیک رہتی تھیں نسیہ! میں نے اپنی بچی کے لیے بہت اونچے خواب دیکھ لیے تھے۔ میں بھول گئی تھی غریب کی بیٹی بیاہ کر بھی غریب کے گھر ہی جاتی ہے۔“

”السلام علیکم“ نانا نے صحن میں آ کر زوردار سلام کیا۔ نانی جلدی سے آنسو بونچھ کر اٹھ بیٹھیں۔ نانا اور فاخرہ ان کے کمرے میں آ گئیں اور مٹھائی کا ڈبہ میز پر

رکھ کر نانی کے پلنگ پر ہی آ بیٹھیں۔
”کیا اتنی جلدی جنید کا رشتہ بھی طے ہو گیا؟“ مٹھائی دیکھ کر نانی نے یہی اندازہ لگایا، مگر جو بات انہوں نے کہی اور جس چاہ سے کہی۔ اس نے نانی اور نسیہ دونوں کو حیران کر دیا۔

”مگر فاخرہ! تمہارا واثق تو کچھ اور ہی مزاج کا ہے وہ کہاں راضی ہو گا۔“

وہ دودھ سے جلی تھیں چھانچھوٹک رہی تھیں۔
”ساری بات واثق کی مرضی معلوم کرنے کے بعد ہی تو کر رہے ہیں نانی لٹاں!“

نانا نے پیار سے ان کا ہاتھ ہاتھوں میں لے لیا فاخرہ بولیں۔

”اذاکرامت کیجئے گا خالہ! میں نے تو تب سے زیبا جیسی بھوکے خواب دیکھنے شروع کر دیے تھے جب سے میرا واثق پیدا ہوا تھا۔“

نانی نے نسیہ کی طرف دیکھا۔ وہ آسودگی سے مسکرا رہی تھیں۔ نانی نے اثبات میں سر ہلادیا۔ نانا نے جلدی سے مٹھائی کا ڈبا کھولا سب کا منہ میٹھا کر دیا پھر ڈبے کے کچن کی طرف بھاگی۔

مٹھائی کھاتے ہوئے نانی مسکرا رہی تھیں۔

”ہم انسانوں کی پہچان میں کس قدر غلطی کر چلتے ہیں۔ میں ہمیشہ فاخرہ کو مغرور اور تانصرہ کو اچھا سمجھتی رہی ایسے ہی خیالات واثق اور جنید کے بارے میں تھے مگر سب الٹ ہوا۔“

اور بچن میں بیٹھی زیبا صرف اور صرف واثق کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

”خدا یا تو نے احسان کیا مجھ پر۔ بندلوں سے جو چاہ میں نے کی تھی۔ تو نے اسے میرا نصیب بنا دیا۔“ واثق کی چاہ کرتے اس نے صرف اور صرف واثق کی شخصیت کو دیکھا تھا، دولت کے بارے میں نہیں سوچا تھا کہ جب محبت ہو جائے تو یہ سب پیچھے رہ جاتا ہے۔ سب سے بڑی دولت آپس کا اعتماد اور خلوص ہے۔ جس نے یہ دولت پائی اس نے سب پالیا۔ میں قدر کرنے والوں میں سے ہوں۔ ہمیشہ قدر کروں گی۔ اور یہ دعار ہے گی۔ خدا میرا مان سلامت رکھنا۔“

کچھ تو آپس میں ان اکھڑوں میں

کرئل شہاب کی تین بیٹیاں ہیں۔ ثانیہ میڈیکل کی اور مہرین انجینئرنگ کی طالبہ ہے۔ اقدس کو تین مرتبہ فیل ہولے پر یونیورسٹی سے نکال دیا جاتا ہے۔ وہ اپنی دوست مہر کے ساتھ ایک کوننگ انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لیتی ہے۔ جہاں کھانا بنانا سیکھنے کے دوران اس سے مزید حوافض ہوتی ہیں۔ اس کے اساتذہ اس سے عاجز آ جاتے ہیں۔ بالآخر انسٹی ٹیوٹ کے مالک روحان تیمور اسے اپنی اسٹوڈنٹ بنا لیتے ہیں۔

روحان تیمور اس کے والد کے دوست کے بیٹے ہیں۔ کرئل شہاب کو شیف کا پروفیشن پسند نہیں۔ ان کی سخت گیر طبیعت سے اقدس تالاں رہتی ہے۔ کرئل شہاب کے دوست کرئل سراج کی بیٹی فریال سراج بھی میڈیکل کی طالبہ ہے۔ دوران تعلیم ثانیہ کو ذلیل کروانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ ڈاکٹر حماد اسپتال کے سخت گیر ڈاکٹر ہیں۔ ان کا چھوٹا بھائی گوہر ثانیہ سے پڑھائی میں مدد لیتا ہے۔ ڈاکٹر فریال کی مگنی بچپن سے ہی اس کے ماموں کے ہاں طے ہے، مگر اس کی والدہ اور وہ خود اس رشتے میں دلچسپی نہیں لیتی۔ فریال بے حد حسین ہے اسے ڈاکٹر جنید بھی پسند کرتے ہیں، مگر انہیں زیادہ لفت نہیں کرواتی۔

فریال، روحان کو بھی جانتی ہے۔ یہ جان کر اقدس کو صدمہ پہنچتا ہے کیونکہ وہ روحان کو پسند کرنے لگی ہے۔ روحان اسے ایونٹس منجمنٹ کا کام بھی سکھاتا ہے۔ ایک روز روحان سے ملنے ایک لڑکی اور بچہ آتے ہیں۔ اقدس کا دل ٹوٹ جاتا

مکمل ٹافل





لے
لکھا
ٹ
کی
" "
ن کا
مک
رو
ان
جات

ہے۔

ٹانیہ کو روز مو باکل پر محبت بھرے میٹج ملتے ہیں۔ بالآخر پتا چلتا ہے کہ یہ میٹج ڈاکٹر حماد نے بھیجے ہیں۔ کوئی ٹانیہ کی آڈی ہیک کر کے فیس بک کے ذریعے یہ خبر پھیلا دیتا ہے کہ ڈاکٹر حماد نے ٹانیہ کو پرو پوز کیا ہے۔ ڈاکٹر حماد یہ پڑھ کر چہرہ پاہو جاتے ہیں۔ سارے اسپتال میں بات پھیل جاتی ہے۔ ٹانیہ کو بہت بے عزتی محسوس ہوتی ہے۔

۲

دوسری اور آخری قسط

”اوہو۔ اچھا آئس کریم ہی کھا لیتے ہیں بلکہ آئس کریم شیک پیتے ہیں۔“
پچھلے سے آئی اس آواز پر وہ بے اختیار مڑی تھی۔ اسے دھوکا نہیں ہوا تھا۔ اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس دن والی لڑکی اور وہ بچہ بھی اس کے ساتھ تھے۔ اقدس کا دل چاہا وہ فوراً یہاں سے بھاگ جائے۔ مگر پاؤں جیسے زمین نے جکڑ لیے تھے۔ مگر بھی انہیں دیکھ چکی تھی۔ اقدس کی حالت وہ سمجھ رہی تھی اس لیے آگے بڑھ کر اس نے نارمل انداز میں سلام کیا۔

”مجھے پتا چلا تھا کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور انسٹی ٹیوٹ سے چھٹی مار کر آپ یہاں گھوم رہی ہیں۔“
”مجھے تو اب بھی ان کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ آریو اونکے؟“ (کیا آپ ٹھیک ہیں) اس لڑکی نے پوچھا۔

اقدس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا وہ آنکھوں میں نرمی لیے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔
”جی بس طبیعت بہتر تھی۔ آج تو میں زبردستی لے آئی شاپنگ کے بہانے۔“ مہر نے جلدی سے صورت حال سنبھالی۔ ساتھ ہی ملا متی نظروں سے اقدس کو گھورا جو ابھی تک خاموش تھی۔ اقدس کو بھی تھوڑی شرمندگی محسوس ہوئی۔ اس نے بمشکل حال احوال پوچھا۔

”سوری“ میں تعارف کروانا بھول گیا۔ یہ ملیجہ ہیں اور یہ عبداللہ۔ اور ملیجہ! یہ اقدس ہیں۔ میری بہت

دودن سے اسے بخار تھا۔ اس دوران کیا سرگرمیاں ہو رہی تھیں؟ اسے کچھ ہوش نہ تھا۔ تیسرے دن اس کا بخار اتر اتر اتر سے پتا چلا کہ روحان تیمور کی فیملی شفٹ ہو چکی ہے۔ بلکہ دو مرتبہ امی ان کو ناشتہ بھی بھیج چکی تھیں۔ بخار تو اتر چکا تھا مگر طبیعت مضطرب تھی۔ عجیب سی اداسی اور سستی سی اس پر چھائی ہوئی تھی۔ اب بھی وہ لاؤنج کے صوفے پر منہ سر پیٹے پڑی تھی۔ امی قریبی صوفے پر آکر بیٹھیں۔

”اقدس! یہ کیا پوسٹیوں کی طرح پڑی ہو۔ دودن ہو گئے تمہارا بخار اترے ہوئے۔ انسٹی ٹیوٹ نہیں جانا تمہیں۔ روحان بھی پوچھ رہا تھا۔“
”چلی جاؤں گی امی۔“ اقدس نے بے دلی سے کہا۔
اس نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی لگا لیا۔ ذہن بنانے کا ایک یہی طریقہ اسے سوجھا تھا۔ وہ چھیل بدل رہی تھی جب مہر آگئی۔

”یہ کیا ابھی تک ایسے ہی پڑی ہو فوراً اٹھو، ہم شاپنگ پر جا رہے ہیں۔ ویسے پچی سنا ہے شاپنگ سے ہر قسم کا بخار اتر جاتا ہے۔“ مہر نے شرارتی لہجے میں کہا تھا۔ مہر کے اصرار پر وہ اٹھ گئی تھی۔

پھر ایک شاپ سے مہر نے اپنے اور اس کے لیے ٹراؤز اور شرٹس خرید لی تھیں۔ اقدس منع کرتی رہ گئی مگر مہر نے اس کی ذرا نہیں جلنے دی تھی۔
”چارنج گئے ہیں، کچھ کھا لیتے ہیں۔“ گھڑی دیکھتے ہی مہر کو ہوک کا احساس ہوا۔

”تم کھالو، میرا موڈ نہیں ہے۔“ اقدس بے دلی سے آس پاس کی موقوف کو دیکھ رہی تھی۔

”لوئی، یہ بھی آگئیں نئے سرے سے بال کی کھال اُدھڑنے۔ دونوں چھٹیوں پر تھیں تو کتنا سکون تھا ہسپتال میں۔“ حنا نے دل میں سوچا۔

”ثانیہ! تم تو بڑی چھپی رستم نکلیں، ہوا بھی نہیں لگنے دی کسی کو کہ ڈاکٹر حماد اور تمہارے درمیان کچھ ہے۔ اسی لیے تم اتنی حمایت کیا کرتی تھیں ان کی۔ ان کے بارے میں کی گئی پوسٹ پر تمہارے کمنٹس ایسے ہوتے تھے کہ تمہارے انٹرسٹ کا تو ہم اندازہ لگا سکتے تھے مگر ڈاکٹر حماد کی تمہارے ساتھ انوالومنٹ کا تو ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔“ مثال آتے ہی شروع ہو گئی تھی۔ اس کی نظریں ثانیہ کے سرخ چہرے پر تھیں۔

ثانیہ نے فریال کی طرف دیکھا جیسے اس کے بولنے کی منظر ہوا اور وہ واقعی شروع ہو گئی۔

”مبارک ہو ثانیہ! ویسے یہ خبر پہلے مجھ تک پہنچی چاہیے تھی۔ آخر پڑوسیوں کے بھی کچھ حقوق ہوتے ہیں اور اب ایسے ہی چپ چاپ اتے شادی مت کر لیتا۔“ فریال کی مسکراہٹ اسے بڑی عجیب لگی تھی۔ ثانیہ کے دماغ میں جیسے کلک ہوا تھا۔ ایک بار پہلے کی فریال کی کسی گئی باتیں اس کے ذہن میں گونجی تھیں۔

”تمہاری کامیابیوں نے ہمیشہ میری خوشیوں کو اگلا ہے۔ مگر اب میری باری ہے اور فریال سراج کبھی بار نہیں مانتی اور جو کرنے کی ٹھان لے کر کے چھوڑتی ہے سوہسٹ آف لک ثانیہ شہاب۔“

”کچھ بولو بھی۔“ مثال کی پُر جتس آواز نے اسے سوچوں سے نکالا۔

”ساری باتیں معلوم ہیں تو ہم سے کیا سنا چاہتی ہو۔“ جواب حنا کی طرف سے آیا تھا۔

ثانیہ اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر فریال کے قریب آئی تھی۔ ”ٹھیک کہا تم نے پڑوسیوں کے بڑے حقوق ہوتے ہیں۔“ تھینک یو فریال! نار ایوری تنہنگ

(شکریہ فریال، ہر چیز کے لیے)۔ ”نری سے اس کا کندھا تھپتی وہ آگے بڑھ گئی۔

اچھی اسٹوڈنٹ اور آپ اقدس کی دوست ہیں۔ آئم سوری مجھے آپ کا نام یاد نہیں رہا۔“

”مہر۔“ وہ جلدی سے بولی۔

”میرا خیال ہے باقی باتیں کہیں بیٹھ کر کرتے ہیں۔ ہم شیک بننے جا رہے تھے، آپ دونوں بھی آئیں۔“

یاحیہ نے آفر کی۔ اقدس نے منع کرنے کے لیے منہ کھولا مگر روحان نے حتیٰ انداز میں کہا۔

”یہ اچھا آئیڈیا ہے چلیں، آجائیں۔“ اقدس نے بے بسی سے مڑ کو دیکھا۔ اس نے کندھے اچکا دیے۔



لنچ بریک تھی مگر تینوں میں سے کسی کا کچھ کھانے کا موڈ نہیں تھا۔ ہاؤس آفیسرز روم کو خالی پا کر وہیں بیٹھ گئیں۔

”توبہ ہے سب کو ایسے ڈاکٹر حماد کی فکر ستانے لگی ہے جیسے شہر بھر میں مردوں کا کال پڑ گیا ہو۔“ حنا سخت تپتی ہوئی تھی۔

”یہی تھے کل تک جو ڈاکٹر حماد کا نام لیتے ہوئے بھی ڈرتے تھے۔“ فرج بولی۔

”سوچنے کی بات یہ ہے کہ اتنا منظم پلان بنایا کس نے ہے اور اس سب کے پیچھے مقصد کیا ہے۔“ فرج نے سوالیہ نظروں سے دونوں کو دیکھا۔

”کوئی اور بات کرو پلیز۔ ریلیکس کرنا چاہتی ہوں میں اس وقت۔“ گھر جا کر بھی یہ سوچیں چیخا نہیں

چھوڑیں۔“ ثانیہ نے اپنے دھتے ہوئے سر کو صوفے کی پشت پر رکھتے ہوئے کہا۔ دونوں خاموش ہو گئیں۔

کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اور کون سا موضوع چھیڑیں۔

دروازہ کھول کر اندر آتی مثال اور فریال کو دیکھ کر

حنا کا کھلتا منہ بند ہو گیا۔

”اف بہ کہاں سے آئیں۔“ فرج کو کوفت ہوئی۔

ثانیہ بھی انہیں دیکھ کر گہرا سانس لیتے ہوئے سیدھی

ہوئی۔

آخر کچھ تو بولنا تھا۔

”جوتے ہی خریدے ہیں، کپڑوں کی طرف ان دونوں نے دیکھنے ہی نہیں دیا۔ ایک تو پہلے ہی روحان نے مشکل سے ٹائم نکالا اور یہ دونوں اتنی جلدی بے زار ہو جاتے ہیں۔ اسی بات پر ہماری بحث چل رہی تھی۔ اطمینان سے شاپنگ ہی نہیں کرنے دیتے۔ مزاتو گرلز شاپنگ کا آتا ہے۔“ یلچہ بے تکلفی سے بتانے لگی۔

”یہ تو ہے شاپنگ کا مزاتو لڑکیوں کے ساتھ ہی آتا ہے۔“ مہر متفق تھی۔

”مہر بہت ایکسپرت ہے شاپنگ میں، اس کی خدمات آپ لے سکتی ہیں کسی بھی وقت۔“ اقدس نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

”پھر تو اچھا ہوا۔ ہماری ملاقات ہو گئی۔ اپنی شادی کی شاپنگ کے لیے بھی میں آپ کی مدد لے سکتی ہوں۔“ دونوں نے لٹھلک کر اسے دیکھا۔

”آپ کی شادی نہیں ہوئی۔“ مہر جلدی سے بولی۔

”نکاح ہوا ہے۔“

”میرا مطلب ہے، آپ سر کی وائف۔۔۔“ مہر کو متذبذب دیکھ کر وہ ہنسی تھی۔

”آپ لوگ اتنی دیر سے یہ سمجھ رہے تھے کہ میں اور روحان۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ اقدس خوشگوار حیرت سے اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

”عبداللہ کی وجہ سے آپ لوگ یہ سمجھ رہی ہوں گی۔“ مہر نے سہلایا۔ دونوں ہی اصل بات جاننے کے لیے بے تاب تھیں۔ یلچہ خوب صورت انداز میں مسکراتی۔

”میرے اور روحان کے بہت سارے رشتے ہیں۔ وہ میرا کزن بھی ہے، دودھ شریک بھائی بھی اور سب سے بڑھ کر ایک اچھا دوست۔ اور جہاں تک عبداللہ کی بات ہے۔ میری بڑی بہن کی شادی روحان کے بڑے بھائی آفاق سے ہوئی تھی۔ تین سال پہلے ایک ایکسپڈنٹ میں ان کی ڈیوٹی ہوئی۔ تب سے عبداللہ

اس کے بے تاثر لہجے میں کہے گئے الفاظ سن کر بل بھر کے لیے فریال کے چہرے کے تاثرات بدلے تھے۔ حنا اور فرح ان دونوں کو چھوڑ کر ٹائیہ کے پیچھے لپکیں۔

”اسے کیا ہوا۔“ مثال حیران تھی۔ فریال نے کندھے اچکائے۔ تیز قدموں سے دونوں ٹائیہ تک پہنچیں۔

”اوہو۔۔۔ چھوڑو ان دونوں کی تو عادت ہے طنزیہ باتیں کرنے کی۔ وہ نمبر بھی میں نے اپنے کزن کو دے دیا تھا جس سے تمہیں مسیحجڑ آتے تھے۔ دو دونوں میں وہ بتا دے گا کہ سم کس کی ہے۔“ فرح نے اسے تسلی دینی چاہی۔

”اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔“ اطمینان سے کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ جبکہ وہ دونوں حیرت سے وہیں کھڑی رہ گئیں۔



اقدس کے دائیں طرف عبداللہ بیٹھا تھا۔ ساتھ والی کرسی پر مہر تھی اور سامنے وہ دونوں بیٹھے تھے۔ عبداللہ کے کچھ بولنے پر اقدس نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ روحان سے مخاطب تھا۔ چھ سات سال کے اس بچے کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ آنکھوں پر نظر کا چشمہ، چہرے کی رنگت اور آنکھوں کی بناوٹ بالکل روحان جیسی تھی۔

”آپ لوگ بھی ہٹائیں، ہون سا شیک لیں گے۔“ روحان نے ان دونوں سے پوچھا۔

”پائن اہل شیک۔“ مہر نے جواب دے کر اقدس کو گھورا۔

”اسٹرابیری شیک۔“ اقدس کو بولنا دیا۔ اتنی دیر میں وہ اپنے آپ کو کسی حد تک کنٹرول کر چکی تھی۔ اب ان کے ساتھ بیٹھ ہی گئے تھے تو بات چیت کرنا بھی ضروری تھا۔ روحان اور عبداللہ شیک لینے کے لیے چلے گئے۔

”شاپنگ کی آپ نے۔“ مہر نے گفتگو کا آغاز کیا،

کے دفتر سے نکلتے ہوئے اس کاغذ سے برا حال تھا۔ وہ سیدھی ڈاکٹر حماد کے پاس آئی۔

”کیا مطلب ہے اس کا۔ آپ میرے اوپر فرضی کمسن ڈال کر مجھے ہاسپٹل سے نہیں نکلا سکتے۔ میری وجہ سے کبھی کسی مریض کو کوئی نقصان نہیں پہنچا اور یہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔“

ڈاکٹر حماد نے فائل پر سے نظریں اٹھا کر سنجیدگی سے ثانیہ کو دیکھا۔ جو ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بے خونی سے کھڑی تھی۔

”پہلے اپنی ٹون درست کریں۔ میں بدتمیزی برداشت نہیں کرتا۔“ ڈاکٹر حماد کا لہجہ سرد تھا۔ ”اور اتنا دوا دیا کیوں کر رہی ہیں۔ یہ سب اس کا جواب ہے جو آپ نے میرے ساتھ کیا ہے۔ آغاز آپ نے کیا ہے اس کہانی کو انجام تک میں پہنچاؤں گا۔“

”میں آپ کو بتا چکی ہوں میں نے کچھ نہیں کیا۔“ ثانیہ اس قدر ہی بول سکی۔

”اور میں تو جیسے یقین ہی کر لوں گا آپ کے اس ڈرامے پر۔ میں اگر آپ کے مسببوز کا جواب دے دیا کرتا تھا تو صرف اس لیے کہ پارٹ ون کے متعلق ہوتے تھے۔ آپ نے سمجھ لیا کہ یوں راہ و رسم بدھالیں گی۔“

”یہ ٹھیک ہے کہ میں پارٹ ون کی تیاری کر رہی ہوں مگر میں نے آپ سے کبھی کچھ پوچھنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے ہمیشہ ڈاکٹر جنید غنی سے پڑھائی میں مدد لی ہے اور اس بار بھی ان ہی سے لی ہے۔ آپ ان سے پوچھ سکتے ہیں۔“ ثانیہ نے حمل سے کہا۔

”پوچھنے کسی سے کچھ نہیں پوچھنا آپ اگر یہ سمجھ رہی ہیں یوں معصوم بن کر مجھے ٹیشے میں اتار لیں گی تو ٹرسٹ ہی ایسا کچھ نہیں ہے۔“ ان کے زہریلے انداز نے ثانیہ کے تن بدن میں الگ لگادی۔

”میں لعنت بھیجتی ہوں آپ پر اور آپ کی اس سوچ پر۔ مجھے نہ آپ کو شیشے میں اتارنا ہے نہ مرعوب کرنا ہے مگر یہ جھوٹے الزامات جو آپ نے لگائے ہیں، معلوم ہو گیا کہ کس قدر دوغلے ہیں آپ۔ اصولوں پر تو

خالہ، خالو یعنی روحان کے والدین کے پاس ہوتا ہے۔ اسی لیے میں زیادہ تر پاکستان کے چکر لگاتی رہتی ہوں کیونکہ روحان اور میرے ساتھ عبداللہ بہت اچھے ہیں۔“

دونوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا بولیں۔ لیکن نے ہی اس خاموشی کو توڑا۔

”بس تو پھر ڈن ہو گیا“ آپ دونوں مجھے شاپنگ کروا رہی ہیں۔

”بالکل!“ وہ دونوں خوش دلی سے بولیں۔

”امریکہ میں تو میں دوستوں کے ساتھ یا کبھی اکیلی ہی نکل جاتی تھی شاپنگ کے لیے، اس معاملے میں روحان کبھی مدد نہیں کرتا۔ امریکہ میں اس کے پاس پڑھائی کا بہانا ہوتا تھا اور یہاں کام کا۔“

دوپٹی سے اس کی باتیں سنی اقدس کو دیکھ کر مہر نے اپنے بے ساختہ اٹنے والی ہنسی کو دبایا تھا۔



اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ڈاکٹر حماد کو گولی مار دے۔ آج صبح ہی ہسپتال کے ایم ایس نے اسے بلایا تھا۔ ڈاکٹر حماد نے اس کے خلاف ایک فائل بنا کر انہیں بھیجی تھی۔ جس میں اس کی چند کوتاہیوں کے علاوہ کچھ اضافی کمسن بھی تھے جو اس پر ڈالے گئے تھے۔

”دیکھیں مس ثانیہ! میں آپ کے والد کو جانتا ہوں۔ وہ ڈاکٹر فاروق کے دوست بھی ہیں اور پرستنی بھی ملا ہوں ان سے اور پھر آپ ہمارے کالج کی اچھی اسٹوڈنٹ ہیں بلکہ ٹاپر ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کو ہاسپٹل سے نکالا جائے وہ بھی اس وقت جبکہ آپ کی ہاؤس جاب کمپلیٹ ہونے والی ہے۔

آپ کے اتنے مہینوں کی محنت اکارت جائے گی۔ آپ کو اسی لیے بلایا ہے کہ ڈاکٹر حماد سے ذاتی طور پر صلح صفائی کر لیں ورنہ یہ بات بہت دور تک جائے گی۔ اور شاید میرے ہاتھوں سے نکل جائے۔ میں نہیں چاہتا آپ کی سالوں کی محنت یوں برباد ہو۔“ ایم ایس

بس پھر کیا تھا یہ صاحبزادے پہنچ گئے دو دن بعد میرے پاس کہ مجھے امریکہ کی آرٹ یونیورسٹی سے کولمبیا کی آرٹس اور ہومل ٹیچنٹ پڑھنی ہے۔ میں نے سوچا جو کرنا چاہتا ہے کرنے دو۔ خوشی اور محنت سے کرے بس۔ دیکھ لو پھر غلط نہیں تھا میرا فیصلہ۔ خوشی ہے مجھے اس بات کی کہ میرا بیٹا ایک محنتی اور سیلف میڈ انسان ہے۔“ تیور صاحب نے فخر سے کہا۔ ”اور عزت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، جسے دے دے اس سے کوئی چھین نہیں سکتا۔“

”ہوں، کمہ تو تھیک رہے ہو۔ ہمارے ہاں اصل میں کچھ پروفیشنلز کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے بھی سن کر اچھا نہیں لگا تھا۔ مگر روحان کی مقبولیت سے خاصا متاثر ہوا ہوں۔ واقعی وہ تمہارا ہی بیٹا ہے۔“

”خیر ہماری بیٹیاں بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔ ماشاء اللہ تینوں ہی بڑی محنتی بچیاں ہیں۔ روحان بتا رہا تھا کہ اقدس بیٹی نے فوڈ فیسیٹیول کروایا تھا۔ بہت کامیاب رہا۔ اس کامیابی کا سہرا تو اقدس بیٹی کو ہی جاتا ہے۔“ پہلی بار کسی نے اقدس کی تعریف کی تھی۔ کرنل شباب کو عجیب سی خوشی محسوس ہوئی۔

”بلکہ روحان تو پارٹی دینا چاہ رہا ہے فیسیٹیول کی کامیابی کی خوشی میں۔“ وہ پر جوش سے بتا رہے تھے کہ روحان کو دیکھ کر پکارا۔

”روحان! آجا یا ر، شباب سے گپ شپ ہو رہی ہے۔“ کرنل شباب بھی اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ نکمک سے تیار وہ شاید کہیں جانے لگا تھا۔

”السلام علیکم انکل۔ سو ری بابا! فرقان صاحب نے اپنے کالج کے فنکشن میں انوائیٹ کیا ہے، میں اس وقت وہیں جا رہا تھا۔“ کف لنکس بند کرتے ہوئے اس نے معذرت کی۔

”چلو پھر رات میں ملاقات ہوتی ہے۔“ تیور صاحب خوش دلی سے بولے تھے۔

☆☆☆

جان دیتے تھے تا آپ۔ اب کیا ہوئے وہ اصول۔ آپ میرے کام کو نہیں دیکھ رہے بلکہ ان جھوٹی کمائیوں پر یقین کر رہے ہیں جن سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ جب بولنے پر آمنا تو بولتی ہی چلی گئی۔

ضبط سے ڈاکٹر حماد کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ بولے تو ان کے لہجے میں چٹانوں کی سی سختی تھی۔

”میرے اندر برائیاں ڈھونڈنے کے بجائے اپنے گریبان میں جھانکیں۔ ویسے بھی محنت اور جنگ میں سب جازز ہوتا ہے اور یہ میرے لیے کسی جنگ سے کم نہیں ہے۔“

”نہیں مانتی میں اس فلسفے کو۔ میرے نزدیک جو جازز ناجائز کا فرق بھول جائے وہ انسان کھلانے کا حق دار نہیں رہتا۔ میں آپ کو اچھا ڈاکٹر ہی نہیں ایک اچھا انسان بھی سمجھتی تھی مگر افسوس میں غلط تھی۔“

بے خوفی سے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتی وہ باہر نکل گئی۔ ایک بات تو طے تھی کہ ڈاکٹر حماد سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی نہ ڈاکٹر حماد کو اپنی صفائیاں دے گی نہ آج کے بعد ان کے دفتر میں قدم رکھے گی، چاہے ہاؤس جاب سے نکالی کیوں نہ جائے۔ مگر وہ غلط تھی۔

☆☆☆

”ایک بیٹا انجینئر اور دوسرا شیفت سمجھ میں نہیں آیا مان کیسے تھے تم روحان کے اس شوق کے لیے۔“

کرنل شباب کے ذہن میں اتنے دنوں سے جو سوال تھا آج وہ زبان پر آ گیا۔ سامنے بیٹھے تیور صاحب کے لبوں پر وہی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”کیا خوب صورت جملہ ہے شوق دا کوئی مول نہیں۔ بس یہی بات ہے میرے خیال میں بچوں کے جازز شوق کے بیچ میں رکاوٹ نہیں بنانا چاہیے۔ شروع میں جب روحان نے یہ بات کہی تو مجھے بڑا ہی عجیب لگا۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ پہلے پڑھائی کرو کیونکہ تعلیم ایسی چیز ہے جس پر میں کبھی کمپروماز نہیں کر سکتا۔“

ہے۔“ حنا نے ہاتھ میں پکڑا چپس کا پیکٹ کھولتے ہوئے کہا۔
 وہ لہجہ بیک میں ہاسپٹل کی پچھلی طرف سیڑھیوں پر بیٹھی تھیں۔ کیفے جانا انہوں نے کم کر رکھا تھا۔ فرح اور ثانیہ نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔
 ”سم کا پتہ کرا لیا میں نے۔ کسی شیردل کے نام ہے۔“ فرح کو بروقت یاد آیا۔
 ”میں نے منع کیا تھا۔“

نظرس ثانیہ پر تھیں۔
 ثانیہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”شیردل فریال کا بھائی ہے۔“
 بات سمجھ میں آتے ہی دونوں کو حیرت کا جھکاؤ لگا تھا۔



اس دن وہ روحان کے ساتھ ہی کلاسز لینے چلی گئی تھی۔ روٹین کا آغاز پھر سے ہو گیا تھا۔ اسی دوران ایک خوشگوار شام میں اس کی ملاقات تیمور انکل اور صاعقہ آئی سے ہو گئی تھی۔ ہنستے مسکراتے تیمور انکل اور دھیمابولنے والی صاعقہ انٹی اے بہت اچھی لگیں۔
 ای اور مجید چاچا کے ساتھ مل کر اقدس نے ان کے لیے دعوت کا اہتمام کیا تھا جس پر امی انہیں پہلے ہی مدعو کر چکی تھیں۔ دعوت خاصی اچھی رہی۔ سب سے زیادہ حیرت اسے کرئل شہاب کو مسلسل ہنستے مسکراتے دیکھ کر ہوئی تھی۔ اتنا خوش تو اقدس نے انہیں کبھی نہیں دیکھا تھا یا پھر وہ خوشی بھی چھپا کر رکھتے تھے کم از کم اسے دیکھ کر تو ان کا مودا کثر خراب ہی رہتا تھا۔

زندگی ایک خوب صورت ڈگر پر چل نکلی تھی۔ وہ اکثر تیمور انکل کے گھر جانے لگی تھی۔
 روحان تیمور کے ساتھ ساتھ اسے اس گھر کے ہر فرد سے محبت ہو گئی تھی۔



”آپ ڈاکٹر ثانیہ کے خلاف پینل بٹھارے ہیں۔ بھائی آپ ایسا نہیں کر سکتے۔“ گوہر کو جیسے ہی خبر ملی وہ فوراً ”ڈاکٹر حماو کے پاس آیا۔ اس وقت ان کے دفتر میں قمر بھی بیٹھا تھا۔

”تمہیں پتا ہے میں ایسا کیوں کر رہا ہوں؟ تم اس معاملے سے دور رہو۔“ ڈاکٹر حماو سنجیدہ تھے۔
 ”ایسا مت کریں بھائی۔ میں انہیں جانتا ہوں، وہ ایسی لڑکی نہیں ہیں اور اگر وہ کہہ رہی ہیں کہ انہیں بھی کچھ نہیں معلوم تو یہی سچ ہو گا۔“ گوہر نے انہیں

کیوں یہی تو بری سمجھ ہی نہیں آ رہا بلکہ میرا کزن تو کہہ رہا تھا، ہمیں سابر لاءم میں رپورٹ کرنی چاہیے۔ اس طرح کوئی نہیں مزید نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔ اچھا ہے ڈاکٹر حماو کے سامنے بھی سب کھل کر آجائے گا۔ وہ تو قابو آئیں گے نا کسی طرح۔“

”جتنا نقصان ہوتا تھا ہو گیا۔ مجھے کوئی رپورٹ نہیں کرنی۔ سب پتہ چل چکا ہے مجھے اور شیردل کا نام سامنے آنے کے بعد کوئی شک کی گنجائش بھی نہیں رہی۔“

”کون ہے یہ شیردل؟“ حنا اور فرح بری طرح چونکی تھیں۔

”خیر شیردل بے چارے کا تو کوئی قصور ہے بھی نہیں۔ اسے تو کچھ پتا بھی نہیں ہو گا۔ انگلینڈ گیا ہوا ہے پڑھنے کے لیے۔ ہاں اس کی سم ضرور استعمال ہوئی ہے۔“ ثانیہ کی بات نے ان کے تجسس کو مزید بڑھایا تھا۔

”بتاؤ بھی اب۔“ حنا کو صبر کرنا مشکل لگ رہا تھا۔

”اچھوڑو اس ذکر کو۔ میں نام نہیں لینا چاہتی۔“

ثانیہ نے ٹاننا چاہا۔
 ”کیا بات ہوئی۔ ہم تمہاری دوستیں ہیں۔“ فرح نے خفگی دکھائی۔

”اور یہ تم پچائنا کس کو چاہ رہی ہو۔“ حنا تھکی۔
 ”اچھا بھیک ہے مگر ایک بات سن لو۔ مجھے کسی کے خلاف کچھ نہیں کرنا اور تم دونوں کسی سے اس سب کا ذکر نہیں کرو گی۔“

دونوں نے بے تابی سے سر ہلایا۔ ان کی منتظر

قابل کرنا چاہا۔

ہوں۔ اس نے یہ مشورہ کر دیا ہے کہ چونکہ ہمارا بریک اپ ہو گیا ہے اسی لیے اپنی بھڑاس نکالنے کے لیے میں اس کے خلاف رپورٹ بنا رہا ہوں۔ ”صبح سے ان کو اس نئی بات پر غصہ کیا ہوا تھا۔

”ہوں لڑکی تو کافی خطرناک ہے۔“ قمر سنجیدہ ہو گیا۔

”تم اس خطرناک حسینہ کے خلاف منصوبے بناؤ۔ میں چلتا ہوں۔“ کچھ دیر بعد سرجھٹک کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔



”مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“ وہ وارڈ کے باہر کھڑی تھی جب گوہر اس کے پاس آیا۔

”میں مصروف ہوں۔“ ثانیہ نے رخ پھیرا۔

”آپ مجھے انکوار کر رہی ہیں۔ اتنے دنوں سے میں آپ کو ڈھونڈ رہا ہوں بات کرنا چاہتا ہوں آپ سے۔“ وہ تھا ہوا۔

”میرے پاس تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں ہے۔“

”میں آپ سے کوئی ایسا سوال کرنے نہیں آیا، جس کا جواب آپ نہ دے سکیں۔ پلیز مجھ سے بات کریں۔ میں سوچ سوچ کر پاگل ہو رہا ہوں۔ میرا دل نہیں مانتا کہ آپ ایسی حرکت کر سکتی ہیں۔“

ثانیہ گہرا سانس لیتے ہوئے اس کی طرف مڑی ”اما یقین ہے تمہیں۔“ اس نے گوہر کے پریشان چہرے کو دیکھا۔

”بالکل ہے اور اس پر بھی ہو گا جو آپ بتائیں گی۔“ گوہر کالجہ مضبوط تھا۔

وہ اس کے ساتھ باہر آگئی۔ ایک برسکون گولے میں وہ آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ وہ خاموشی سے اس کے بولنے کا منتظر رہا۔ ثانیہ نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ ان مسیحوز کا ذکر کرکول کر چکی اور یہ بھی کہ وہ جانتی ہے کہ سب کس نے کیا ہے۔

”میں حیران ہوں یہ سب کر کے کسی کو کیا ملے گا۔“ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ بولا۔

”گوہر اکیسوں خواہ مخواہ خود کو الجھا رہے ہو اور جاننے کیا ہو اس لڑکی کے بارے میں۔ بلاوجہ حمایت مت کرو اور تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنی پردھانی پر دھیان دو۔ میرا مسئلہ ہے میں دیکھ لوں گا۔“ ڈاکٹر حماد نے اسے ٹالا۔

”ہسپتال سے نکلوانا چاہتے ہیں انہیں۔“ گوہر اپنی جگہ جمکھڑا تھا۔

”ہاں نکلوانا چاہتا ہوں کیونکہ مجھے وہ لڑکی اس ہسپتال میں گوارا نہیں ہے۔“ اس بار ان کا لہجہ سخت تھا۔

”آپ بہت غلط کر رہے ہیں بھائی!“ اپنی بات کہہ کر پریشان سا گوہر ہار نکل گیا۔

”حماد! کیا خبر گوہر تھک کہہ رہا ہو اور پھر وہ لڑکی بھی تو بھند ہے کہ اس نے کچھ نہیں کیا۔“ اتنی دیر سے خاموش بیٹھا قمر بولا۔

”کس کی باتوں میں آرہے ہو۔ کل کا پچھ ہے یا! کیا تجربہ ہے اسے لوگوں کا لوگ اندر سے کچھ ہوتے ہیں باہر سے کچھ۔ جہاں تک اس لڑکی کی بات ہے مجرم نے بھی کبھی جرم کا اعتراف کیا ہے۔ وہ تو خود کو معصوم ہی ظاہر کرے گی نا۔“ ڈاکٹر حماد نے کوفت سے کہا۔

”ویسے لڑکی بے بڑی جوار۔ تمہارے ساتھ کوئی اپنے آپ کو خود اسکی نڈیا مار کر لے۔ ہمت کی داد تو دینی پڑے گی۔“ قمر اپنی جون میں واپس آگیا۔ ”میری مانو چھوڑو اس لڑائی جھگڑے کو۔ شادی کر لو اس سے۔ کیا خیر و افی بے چاری نے محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر تمہیں متوجہ کرنا چاہا ہو۔ ظاہر ہے تمہیں متوجہ کرنے کے لیے عام طریقہ تو کام آ نہیں سکتا تھا۔“ اس کی گھورتی نظروں کی پروا نہ کرتے ہوئے قمر نے شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی بات مکمل کی۔

”فضول مشورے اپنے پاس رکھو۔“ وہ خفگی سے بولے۔ قمر ڈھٹائی سے مسکراتا رہا۔

”بتا ہے اب اس نے کیا کیا ہے۔ جب سے سب کو معلوم ہوا ہے کہ میں اس کے خلاف پینیل بیٹھا رہا

تھے۔

”ابو! مجھے پکڑا دیں۔“ آگے بڑھ کر اس نے ان کے ہاتھ سے چیزیں لینا چاہیں۔ مگر کرئل شہاب اس کو نظر انداز کر کے مہرین سے چائے بھجوانے کا کہہ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ قریب کھڑی اقدس نے افسوس سے ثانیہ کے بچھے چہرے کو دیکھا جس کی وجہ کرئل شہاب کا سرد اور اجنبی رویہ تھا۔

اس سے پہلے کہ اقدس کچھ کہتی ثانیہ صوفے پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”آئی!“ اقدس جلدی سے اس کے پاس بیٹھی۔ چائے کا کہہ کر آتی مہرین بھی تیزی سے قریب آئی۔

”آئی۔۔۔ پلیز چپ ہو جائیں نا۔“ اقدس نے اس کے گرد بازو حاصل کیے۔

”ثنانیہ پریشان مت ہو۔ ابو ٹھیک ہو جائیں گے۔ بھلا وہ تم سے بھی ناراض رہ سکتے ہیں۔“ مہرین نے بھی اسے اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے تسلی دی۔

پکن سے نکلتی امی لاؤنج کا منظر دیکھ کر پریشانی سے قریب آئیں۔ ”اللہ خیر کیا ہو گیا۔ رویوں رہی ہو؟“

”ابو کی ناراضی کی وجہ سے رو رہی ہے۔“ مہرین نے بتایا۔ ثانیہ ابھی بھی روئے جا رہی تھی۔

”بس کرو ثانیہ! ناراض نہیں ہیں، شاک لگا ہے انہیں اور پھر الٹی سیدھی باتیں سن کر آئے ہیں وہ ڈاکٹر حماد کے متعلق۔ میں بات کروں گی۔ ذرا ٹھنڈا ہو جائے ان کا غصہ۔ ابھی تو یہ ٹاپک بھی نہیں چھیڑنے دیتے۔“ انہوں نے سمجھایا۔

ان کی بات سن کر اقدس کو سخت طیش آیا۔ ”بس کروں امی۔ آپ ہمیشہ ان کے رویے پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتی ہیں۔ کیوں سنیں انہوں نے لوگوں کی باتیں، کیوں یقین کیا۔ ایک بار بھی اپنی بیٹی سے پوچھا، کوئی سوال کیا۔ ثانیہ آپ تو ان کی نیورٹ بیٹی ہیں نا۔ پھر اعتماد کیوں نہیں کیا اپنی بیٹی پر۔ جانتے نہیں ہیں کیا آپ کی۔ میرے بارے میں کوئی کہتا اور وہ یقین کر لیتے تو ذرا افسوس نہ ہوتا مجھے۔ پہلے ہی کون سی میں ان کی بیٹی

”پتا نہیں۔ مجھے خوشی ہے ہم نے میرا یقین کیا۔“

”ہاں کو حقیقتاً“ خوشی ہوئی تھی۔

”مگر بھائی! ان کو میں کیسے روکوں وہ تو کچھ سننے کو تیار ہی نہیں ہیں۔“ وہ شرمندگی سے بولا۔

”کرنے دو جو وہ کرنا چاہتے ہیں۔ میری وجہ سے اپنا تعلق مت خراب کرو۔ وہ تمہارے بڑے بھائی ہیں گوہر۔“ ثانیہ نے اسے اس مشکل سے نکالنا چاہا۔

”آپ کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ آپ کی ساری محنت۔“

ثنانیہ نے اس کی بات کالی۔ ”کچھ نہیں ہوتا، چھ مہینے جو میں نے گائنی وارڈ میں ہاؤس چاب کی ہے اس کا سرٹیفکیٹ مل جائے گا۔ باقی چھ مہینے کسی اور ہسپتال میں کروں گی۔ تم پریشان مت ہو۔“

”آپ نے سائبر کرائم میں رپورٹ کی؟ آپ کو کئی چاہیے۔ آپ کا مزید نقصان ہو سکتا ہے۔“

”ہوں کہروں گی۔ تمہاری پڑھائی کیسی جا رہی ہے۔“ ثانیہ نے موضوع بدل دیا۔

ثنانیہ کا ہسپتال سے نکالنا جانا ان کے گھر لانے کے لیے ایک دھوکا تھا۔ وہ ہمیشہ سے محنتی رہی تھی۔ اپنے ہر کام کو اچھا کرنے کی دھن اس پر سوار رہتی تھی۔

اپنے میں اس کی اتنی کوتاہیاں سامنے آتا اور ہسپتال سے نکال دیا جاتا سب ہی کے لیے حیران کن تھا۔

کرئل شہاب کے لیے صرف یہی بات ناقابل یقین نہیں تھی بلکہ ڈاکٹر حماد کے ساتھ الفیو اور بریک اپ کے ٹکے جو ہسپتال میں مشہور تھے وہ بھی ان تک پہنچ گئے تھے۔ ثانیہ ان کے رویے سے پریشان تھی۔ دو دنوں سے انہوں نے نہ اس کی طرف دیکھا تھا نہ بات کی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ تینوں لاؤنج میں بیٹھی تھیں جب کرئل شہاب نے دروازے واپس آئے۔ ثانیہ جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھی۔ آج اس کا ارادہ تھا کہ وہ خود ان سے بات کرے گی۔ وہ اپنی نیورٹ بیٹی سے کیسے اتنے دن غماخہ کئے

کرنل شہاب کو اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑا دیکھ کر مرین کے اوپر کاسٹس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا تھا۔



تین گھنٹوں سے وہ اسٹڈی میں بند تھے۔ کھانے کے لیے بھی منع کر دیا تھا۔ ثانیہ ہمت کر کے اٹھی اور اسٹڈی کے دروازے پر جا کھڑی ہوئی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد ہلکی سی دستک دے کر اندر آگئی۔ سنبھل صوفے پر بیٹھے کرنل شہاب نے ہاتھ میں کتاب پکڑ رکھی تھی جبکہ مختصر نظریں دروازے پر تھیں۔ ثانیہ کو اندر آتے دیکھ کر انہوں نے کتاب بند کر کے سنٹر ٹیبل پر رکھ دی۔ ثانیہ ان کے قریب صوفے پر بیٹھ گئی۔ ذہن میں الفاظ کو ترتیب دے کر اس نے بولنا شروع کیا۔

”مجھے اندازہ ہے ابو! میری وجہ سے آپ کو مکی کا سامنا کرنا پڑا۔ آپ کو حق ہے۔ آپ ناراض ہو سکتے ہیں۔“

لیکن ابو اپنے دل سے پوچھیں۔ کیا وہ ساری باتیں جو میرے نام کے ساتھ جوڑی گئی ہیں وہ سچ ہو سکتی ہیں۔ میں آپ کی بیٹی ہوں۔ آپ کی ثانیہ بھلا ایسا کچھ سوچ سکتی ہے۔ وہ سچ نہیں ہے ابو! کچھ بھی سچ نہیں ہے۔“

وہ روٹی ہوئی سر جھکا کر بولے جا رہی تھی۔

”مجھے معاف کر دیں ابو! ایسے ناراض مت ہوں۔“

کرنل شہاب کا ہاتھ اس کے سر پر آکر ٹھہر گیا۔ اس نے بے اختیار نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ وہ اسے ہی دیکھ رہے تھے۔

”جب کچھ کیا ہی نہیں تو معافی کیوں مانگ رہی ہو۔“

”آپ ناراض جو ہیں۔ ہاؤس جاب سے جو نکالی گئی ہوں۔ حالانکہ ان میں سے چند غلطیوں کے علاوہ میری کوئی غلطی نہیں تھی۔“ اس نے لب کاٹتے ہوئے کہا۔

ہوں۔“

”اقدس! چپ ہو جاؤ۔ باپ ہیں تمہارے۔ تم سب سے پیار کرتے ہیں۔ زیادتی نہیں کریں گے۔“

امی نے سختی سے اسے ٹوکا۔

”نہیں امی! اب میں بچی نہیں رہی جسے آپ بہلا لیں گی۔“

ثانیہ اپنا رونا بھول کر اقدس کے سرخ چہرے کو دیکھنے لگی۔ مرین نے پریشانی سے کرنل شہاب کے کمرے کے دروازے کو دیکھا۔ اسے ڈر تھا کہیں وہ غصے میں باہر نہ آجائیں۔

”زیادتی تو وہ ہمیشہ سے کرتے آ رہے ہیں میرے ساتھ اور کوئی محبت و جنت نہیں کرتے وہ۔ تم از کم مجھ سے تو ہرگز نہیں کرتے۔ صرف اپنی لائق بیٹیوں سے محبت کی ہے انہوں نے۔“ اقدس کے اندر کی گنجی کو محسوس کر کے ثانیہ کا دل کٹا۔

”ایسی بات نہیں ہے اقدس وہ تم سے بھی بہت پیار کرتے ہیں۔“

”رہنے دیں آپلی! میں بچپن سے دیکھ رہی ہوں۔ آپ دونوں سے اگر میں متنفر نہیں ہوئی تا تو صرف امی کی وجہ سے کیونکہ امی نے ہمیشہ مجھے آپ دونوں سے محبت کرنا سکھائی ہے اور آپ مجھے بتائیں کیا صرف ان بچوں سے محبت کرنی چاہیے۔ جو ذہن اور لائق فائق ہوں۔ بڑے اور اعلیٰ گریڈز لائیں۔ جن سے والدین کا سر فخر سے بلند ہو۔ کیا کم نمبر لانے والے بچوں کا محبت پر کوئی حق نہیں ہوتا۔“

میں چاہیے کم نمبر لاتی تھی، پوزیشن نہیں لیتی تھی مگر پڑھتی تو تھی۔ ابو کے رویے نے ہمیشہ مجھے ڈی گریڈ کیا۔ اسی لیے میرا دل پڑھائی سے اچھا ہوا۔ نہیں پڑھنا چاہتی میں کیونکہ وہ مجھے ثانیہ اور مرین دیکھنا چاہتے تھے جو میں نہیں بن سکتی۔ میں اقدس ہوں۔ کسی کے جیسا نہیں بننا مجھے۔“ اقدس اپنے آنسو صاف کرتی کمرے میں بھاگ گئی۔

امی اپنا سر پکڑے بیٹھی تھیں۔ ثانیہ اپنی پریشانی بھول کر اقدس کی کئی باتوں کو سوچ رہی تھی۔ جبکہ

نکلوا ہے۔ اب شہاب انکل کو بھی پتا چلا ہو گا کیسی ہے ان کی بیٹی۔ ڈاکٹر حماد والا قصہ تو ان سے برداشت ہی نہیں ہوا ہو گا۔ اب دیں ناپارٹی اپنی بیٹی کی اتنی بڑی کامیابی پر۔“

لاؤنج کے داخلی دروازے سے اندر آتے سراج صاحب نے فریال کی پوری بات سنی تھی۔ تیز قدموں سے وہ آگے بڑھے۔ چہرے پر شدید غصہ تھا۔ ”اچھا، تو تمہارا ہاتھ ہے ثانیہ کو ہاسپٹل سے نکلوانے میں۔“

ان کی آواز پر دونوں بری طرح جو نکلس۔ فریحہ کے ہاتھ سے لیپ ٹاپ گرتے گرتے بچا تھا۔ فریال بھی سٹیٹا کر اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔ ”بجائے شرمندہ ہونے کے اپنے کارنامے پر خوش ہو رہی ہو۔“ ان کا چہرہ غصے سے سرخ تھا۔ ”یہی تربیت کی تھی، ہم نے اسی لیے بڑھایا دکھایا تھا کہ ایک دن یہ کارنامے انجام دو۔“ ان کا تڈیل آمیز لہجہ فریال کو سلگا گیا۔

”مجھے کیوں الزام دے رہے ہیں اب۔ آپ نے ہی تو بنایا ہے مجھے ایسا۔ یہ مقابلہ بازی آپ کی ہی سکھائی ہوئی ہے۔“ فریال کا گستاخ انداز انہیں اشتعال دلارہا تھا۔ مگر وہ مضبوط کیے کھڑے رہے۔

”ثانیہ نے اے پس لیا ہے۔ ثانیہ نے بورڈ میں ٹاپ کیا ہے۔ فریال! تمہیں بھی ثانیہ جیسے مار کس لینے ہیں۔ آپ کو ہمیشہ اس کے گریڈز، ٹرافیز، میڈلز نظر آئے۔ میری تیسری چوتھی پوزیشنز آپ کو کبھی اچھی نہیں لگیں۔ انکل ہمیشہ اس کی چھوٹی سے چھوٹی کامیابی کو سیلبرٹ کرتے رہے اور آپ مجھے اس سے مقابلے پر اکساتے رہے۔ کبھی اپنی کامیابی پر میں خوش نہیں ہو سکی صرف اس لیے کہ ثانیہ ہمیشہ مجھے آگے کھڑی ملی۔ اب کیوں شکوہ کر رہے ہیں آپ آج اگر میں نے اسے پیچھے دھکیلا ہے تو برا کیوں لگ رہا ہے آپ کو۔“

”میں نے تمہیں کمیشن دینا چاہا تھا تاکہ تم پہلے سے زیادہ محنت کرو۔ پہلی پوزیشن لاؤ، آگے بڑھنا

”رپورٹ غلط تھی تو اسٹینڈ کیوں نہیں لیا۔“ ”مجھیں۔ کسی کے احسان کا بدلہ پڑکا دیا۔ آپ ہی تو کہتے ہیں اپنے محسن کو ہمیشہ یاد رکھو۔ اور چھ مہینے میں کسی اور ہاسپٹل میں لگالوں گی۔“ اپنی آنکھیں پونچھتی وہ مسکرائی تھی۔ ”ایک اور بات کہوں۔“

انہوں نے سر ہلا کر جیسے اجازت دی۔ ”اقدس کو بھی معاف کر دیں۔ چھوٹی ہے۔ اس لیے آپ کی محبت کو نہیں سمجھتی۔“ ثانیہ نے جھجکے ہوئے کہا۔

انہوں نے گہرا سانس لیا۔ ”زیادتی تو اس کے ساتھ ہوئی ہے۔ جانے انجانے میں تم دونوں کو اہمیت دیتے دیتے خود سے بہت دور کر دیا اس کو۔ ناراضی تو جتنی ہے اس کی۔ ٹھیک کہتی ہے میں نے تفریق کی اور احساس بھی نہیں ہوا کہ میری ایک بیٹی کس احساس کمتری کا شکار ہو رہی ہے۔“ ان کے لہجے میں ندامت تھی۔ ”آپ پریشان مت ہوں سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ ثانیہ سے ان کی افسردگی برداشت نہیں ہوئی تھی۔



”دیکھا آپ! ایسا فٹ پلان تھا میرا۔ مانتی ہیں نا پھر میری صلاحیتوں کو۔“ فریحہ چمکی۔ لیپ ٹاپ گود میں رکھے وہ لاؤنج کے صوفے پر بیٹھی تھی۔ ساتھ ہی کچھ فاصلے پر فریال بیٹھی فیشن میگزین کے اوراق الٹ رہی تھی۔

”بالکل مانتی ہوں، جمنٹنس بھی ہو اور اچھی ہیکو بھی۔۔۔ ویسے مجھے لگتا ہے ثانیہ کو شک ہو گیا ہے کہ سب میں نے کیا ہے۔“ فریال کو اس دن والا واقعہ یاد آیا جب وہ ثانیہ کو تنگ کرنے کی غرض سے گئی تھی۔ ”ہوتا رہے، ہمیں کیا فرق پڑتا ہے۔ وہ کون سا ثابت کر سکتی ہے کچھ۔ آپ تو خوش ہیں نا، ویسا ہے جو آپ چاہتی تھیں۔“

”خوش تو بہت ہوں۔ یہی چاہتی تھی میں اور دیکھو کیسے زبردست طریقے سے میں نے اسے ہاسپٹل سے

کلوں کی خوشبو نے اس کے دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کیا تھا۔ وہ جھٹکے سے پیچھے ہوتی۔ اس سختی میں بھی اسے اپنی ہتھیالیاں پسینے میں بھیکتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔

”وہ میں جلدی میں اندر آ رہی تھی اچانک سے آپ سامنے آ گئے۔“ اقدس نے بھلی پکلوں کے ساتھ کہا۔

”کوئی بات نہیں۔ کبھی کبھی زندگی میں بہت سے حادثات اچانک ہو جاتے ہیں اور پھر ہماری فکر تو ہوتے ہوئے رہ گئی۔ بائے واوے ناس ڈریس۔“ روحان کے چہرے پر بڑی خوب صورت مسکراہٹ تھی۔ اقدس نے نظر میں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”تھینک یو۔“ اقدس مسکرائی۔

اس نے بلیک کلر کا رُؤزر، شرٹ پہن رکھا تھا۔ پوری شرٹ پر گولڈن کلر کا لپکا کام تھا۔ جبکہ دوپٹہ جو اس نے شانوں پر پھیلا رکھا تھا اس کی کنارہ پر گولڈن ڈوری لگی ہوئی تھی۔ بالوں کی مخصوص پونی ٹیل کے بجائے فرنج ٹائٹ بنا رہی تھی۔ بلیک میک اپ نے اس کے نقوش کو خوب صورت نکھار بخشا تھا۔ آج کی پارٹی کے لیے وہ بہت دل سے تیار ہوئی تھی۔ خوشی اس کی آنکھوں اور مسکراہٹ سے محسوس کی جاسکتی تھی۔

”میں تو سمجھ رہا تھا آپ چیف گیسٹ کی طرح سب سے آخر میں آئیں گی۔“ روحان کے لہجے میں شرارت تھی۔ بلیک کلر کے سوٹ میں اپنی تمام تر وجاہت کے ساتھ وہ اسے کوئی شہزادہ ہی لگتا تھا۔

”میں تو بلیک کے کمنے پر آئی۔“

”اچھا کیا۔ یہ گھر آپ کا بھی ہے۔“ روحان کے مسکراتے لہجے میں کچھ خاص تھا یا اقدس کو محسوس ہوا تھا وہ فیصلہ نہ کر سکی۔ بس اس کی بھوری آنکھوں میں دیکھ کر مسکرائی۔

کیمرے کی کلک کی آواز پر دونوں نے اپنے بائیں طرف دیکھا جہاں بلڈ ہاتھ میں کمر لایے کھڑی تھی۔

”تمہارا کیمرا تو چپک ہو گیا روحان، واقعی پکڑا چھی آتی ہے۔“ مسکرائی ہوئی وہ ان کی طرف آئی۔

سیکھو۔ اس لیے نہیں کہ تم اس سے حسد کرو۔“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی نرم پڑے تھے ورنہ فریال کا انداز انہیں سخت برا لگتا تھا۔

”مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے اس سے حسد کرنے کی۔ آپ اسے میرے مقابل لے کر آئے ہیں ورنہ اس جیسی دس بھی میرے برابر نہیں ہو سکتیں۔“

فریال کے لہجے میں اپنی خوب صورتی کا غور تھا۔

”اور پلیز مجھے سمجھانے کے بجائے انکل کو تسلی دیں۔ ویسے بھی اپنی بیٹی کے افسیروں سے وہ کافی اپ سیٹ ہوں گے۔ جس بیٹی کی وہ مثالیں دیتے تھے آج اس کا افسیر پورے ہاسپتال میں مشہور ہے۔“ فریال کے زہر میں نیچے الفاظ انہیں تپا گئے۔

”اپنی زبان کو لگام دو فریال۔“

پیٹم سراج ان کی اونچی آوازیں سن کر اپنے کمرے سے نکلیں۔ ”کیا بات ہے کیوں جوان اینٹیوں پر غصہ کر رہے ہیں۔“

”اپنی اس اولاد سے پوچھو جس کے ذہن میں اتنا زہر بھرا ہوا ہے۔“ وہ ان پر بر سے تھے۔

”اگر زہر ہے تب بھی آپ کا ہی دیا ہوا ہے۔“ فریال نے کنہ سے اچکائے۔

”فریال! بد تمیزی مت کرو، جاؤ اپنے کمرے میں۔“ اسے ڈپٹ کر ہورا تھا انہوں نے۔ فریج بھی ان کے اشارے پر فریال کے پیچھے لائن سے چلی گئی۔

”دیکھا تم نے کس قدر ڈھٹائی تھی اس کے لہجے میں۔“ سراج صاحب کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ایک دو تھپڑی فریال کو لگا دیتے۔

☆☆☆

پارٹی کا انتظام گھر کے لان میں کیا گیا تھا۔ پورا لان روشنیوں میں نمایا ہوا تھا۔ ایک حصے میں باربی کیو کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ لان کی سجاوٹ اور میز کرسیوں کی خوب صورت تھیم کو سراسیمہ وہ آگے بڑھ رہی تھی۔

کہ بے دھیانی میں سامنے سے آتے روحان سے ٹکراتے ٹکراتے بچی تھی۔ قریب سے آتی اس کے

صورت مسکراہٹ لبوں پر بکھرائے وہ اسے کوئی ساحر
 تگی۔ بہت سی توصیفی نظریں اس کی جانب اٹھی ہوئی
 تھیں۔

”لڑکی ہو کر میری نظر نہیں ہٹ رہی۔ کیا کوئی
 شخص ایسا بھی ہو سکتا ہے جو اس کی خوب صورتی کو نظر
 انداز کر سکے۔“ اقدس کی سنجیدگی سے کئی بات کو وہ
 اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔

ایک گہرا سانس لیتی وہ اقدس کی طرف مڑی۔
 ”حسین تو فریال بہت ہے، اس میں تو کوئی شک نہیں مگر
 ظاہری حسن ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ اور میرے
 نزدیک صرف صورت دیکھ کر کی جانے والی محبت، محبت
 نہیں ہوتی۔ حسین صورتیں تو بہت سی ہوتی ہیں۔
 آج ایک کی صورت سے محبت ہے تو کیا کل دوسری
 سے ہو جائے گی۔“

”اور پہلی نظر کی محبت؟ اس کے بارے میں کیا
 خیال ہے۔“ اقدس نے بحث شروع کرنا چاہی۔ مہرچڑ
 گئی۔

”مجھے نہیں پتا میں نے کوئی پی ایچ ڈی نہیں کر
 رکھی۔ ہوتی ہو گی بھی۔ تمہیں اسے تازے کی
 ضرورت نہیں ہے۔ اپنی یہ خوشگوار رات مت برباد
 کرو۔“ پھر کسی خیال پر مہر شرارت سے مسکرائی۔

”وہے اگر میں لڑکا ہوتی تو تانہ یہ آتی یا مہرن آتی
 میں سے کسی سے شادی کرتی۔ دیکھو کتنی باری لگ
 رہی ہیں۔“ مہرن نے ان کی نیل کی طرف اشارہ کیا۔
 جہاں وہ اپنی امی، صاعقہ آہنی اور مہر کی امی کے ساتھ
 بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ یلیہ بھی ان کے پاس کھڑی
 کسی بات پر مسکرا رہی تھی۔ ”اچھا میں نہ نظر آتی
 تمہیں۔“ اقدس بھی شرارت پر آمادہ تھی۔ مہرنے
 ناقدانہ نگاہوں سے اسے گھورا۔

”نہیں بھی سوری۔ میں کیوں ایسی لڑکی کے
 بارے میں سوچتی جو روحان تیور کی محبت میں گوڈے
 گوڈے ڈوبی ہو۔ تمہیں میں روحان تیور کے لیے
 چھوڑ دیتی۔“

مہر کے مزے۔ سے کہنے پر اقدس نے خفگی سے اسے

”یہ کیا۔“ ایک ہاتھ کمر پر رکھ کر اس نے دونوں کو
 گھورا۔ ”پارٹی کی تنظیم بلیک ہے۔“
 ”نہیں تو۔“ روحان نے نفی میں سر ہلایا۔

”پھر تم دونوں نے میچنگ کیوں کی ہوئی ہے۔ ویسے
 تو فینسیول کے کرتا دھرتا تم دونوں ہی ہو، میچنگ تو جتنی
 ہے۔“

”اتفاق ہے ورنہ پری پلان تو نہیں تھا۔“ اقدس
 کے سادگی سے کہنے پر یلیہ شرارتی انداز میں مسکرائی۔
 ”کچھ اتفاقات خاصے خوش گوار ہوتے ہیں۔“
 ”ان پر پھر کبھی غور کریں گے۔ اقدس کو اندر لے
 جاؤ۔ میں باہر کے انتظامات دیکھ کر آتا ہوں۔ مہمان
 آنے والے ہیں۔ دیکھ لو سب تیار ہیں یا نہیں۔“
 روحان اپنی بات کہہ کر لان کی طرف چلا گیا۔ اقدس
 یلیہ سے باتیں کرتی ہوئی اندر کی طرف بڑھ گئی۔



لان مہمانوں سے بھر چکا تھا۔ کھانے کی اشتہا انگیز
 خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ سب ہی خوش
 گہیوں میں مصروف ساتھ ساتھ کھانا انجوائے کر رہے
 تھے۔ آس پڑوس کے لوگوں کے علاوہ انشسی ٹیوٹ کا
 اسٹاف، روحان کے اسٹوڈنٹس کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔
 ایک میز کے گرد اقدس، مہر، یلیہ اور منتاشا بیٹھی
 تھیں۔

”دعا یاد ہے، ہماری کلاس فیلو تھی نانٹھ میں۔ کل
 ملاقات ہوئی اس سے۔ شادی ہو گئی ہے اس کی، ادھر
 ہی شفٹ ہوئی ہے۔ سن رہی ہو۔“ کہاب منہ میں
 رکھتے ہوئے مہرنے اس کی بے توجہی نوٹ کی۔
 یلیہ اور منتاشا کھانا لینے کے لیے اٹھ کر گئی تھیں۔
 ”ہوں۔ مہر کتنی خوب صورت ہے نا۔“

مہرنے اقدس کی نظروں کے تقاب میں دیکھا
 فریال راگل بلو لکڑی ڈبل شرٹ اور کپڑی میں ملبوس
 تھی۔ شرٹ پر سلور اور بلو اسٹونز کا کام تھا۔ خوب
 صورت لے بے بال پوری پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔
 پیروں میں سلور، ہائی ہیلز پہن رکھی تھیں۔ خوب

فائدہ نہیں ہو گا۔“ اقدس نے نا سمجھی سے اسے دیکھا۔ آخر وہ کہنا کیا چاہ رہی تھی۔
”محض سراب ہے جس کا پیچھا تم کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔“ اس کے متذبذب تاثرات دیکھ کر وہ طنزیہ انداز میں ہنسی۔

”اوہو آئم سوری۔ میں تو بھول ہی گئی۔ اتنی مشکل گفتگو اقدس شباب جیسی لوزر کی تو سمجھ میں آتی نہیں سکتی۔“ اقدس کا چہرہ اہانت کے احساس سے سرخ پڑ گیا۔

”چلو آسان لفظوں میں بات کر لیتے ہیں۔ یہ جو روحان تیور کے ساتھ کا خواب تمہاری آنکھوں میں ہے نا۔ یہ کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔ فریال سراج کے ہوتے ہوئے وہ کبھی تمہیں اہمیت نہیں دے سکتا۔ ویسے بھی وہ مجھ میں انٹرنلڈ ہے۔ ان فیکٹ محبت کرتا ہے مجھ سے اور اگر میں نہ بھی ہوتی تب بھی تم میں کچھ ایسا نہیں ہے کہ روحان جیسا بندہ تمہیں پسند کرے۔ جس لڑکی کو گھر والے کچھ نہیں سمجھتے ہوں باہر والے اسے کیوں اہمیت دینے لگے۔“ اس کا چبھتا ہوا الجھ اقدس کے دل کو چھلنی کر رہا تھا۔ نظریں زمین پر گاڑے وہ حوصلے سے کھڑی تھی۔

”بائے داوے مشورہ ہے تمہارے لیے ٹھیک ٹھاک ہی ہو اگر اپنے جیسا کوئی دھونڈ لو۔ کیونکہ تم جیسی عالم لڑکی کے لیے روحان تو نہیں ہو سکتا۔“ جاتے جاتے بھی وہ اسے ذلیل کر گئی۔

اپنی آنکھوں سے بہہ نکلنے والے آنسوؤں کو اس نے نہیں روکا۔ وہ بھول گئی تھی کہ اسے صاعقہ آئنٹی کا موبائل لانا تھا۔ تیزی سے گھر کا بیرونی گیٹ پار کرتے اسے یاد تھا تو صرف اتنا کہ روحان تیور کی جگہ اس کی زندگی میں کہیں نہیں تھی۔ ٹھیک ہی تو کہا تھا فریال نے، وہ ایک لوزر تھی اور اس بات کا احساس اسے بچپن سے دلایا گیا تھا۔ ہمیشہ زندگی کے میدان میں پیچھے رہ جانے والی اقدس شباب بھلا محبت میں کیسے جیت سکتی تھی؟

گھورا۔ یہ وہ سچ تھا جس کا اعتراف وہ خود سے کرتے بھی گھبراتی تھی اور ہر کتنی روائی سے بول گئی تھی۔ وہ دونوں تو کوئی اور موضوع چھیڑ چکی تھیں مگر ان کے قریب سے گزرتی فریال انکا قدم اٹھانا بھول گئی۔



وہ دونوں بھی کرسیاں کھینچ کر ان کی میز پر آ گئیں۔ بلچہ اور نتاشا پہلے ہی ادھر بیٹھی ٹائیہ اور مہرن سے گپ شپ کر رہی تھیں۔ ہلکی ٹھنڈی ہوا چل پڑی تھی۔ فضا میں چار سورات کی رائی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ عبداللہ ان کے قریب آیا۔
”کسی کو کچھ چاہیے۔“ اس نے گویا اپنی خدمات پیش کیں۔ سب ہی کے ہاتھوں میں گرین فی سے بھرے کپ تھے۔

”عبداللہ! گرین فی لا دو۔“ مہرن نے جھٹ سے فرمائش کی کیونکہ وہی دونوں تھیں جن کے ہاتھ خالی تھے۔ سوٹ کھا کر وہ سیدھی ادھر آئی تھیں۔
”میں لا دیتا ہوں اقدس آئی آپ لیں گی۔“
”ضرور۔“ اقدس نے مسکرا کر کہا۔ وہ سر ہلاتا چلا گیا۔

”اقدس بیٹا میرا موبائل کمال رکھا تھا۔“ صاعقہ آئنٹی نے اس سے پوچھا۔
”آئنٹی لاؤنج میں آئیڈیٹھی پر رکھا تھا۔ چاہیے تو لا دوں۔“

”لا دو۔ اصل میں میری بہن کال کر رہی ہوں گی۔“ اقدس سر ہلاتی اٹھ گئی۔

ابھی وہ داخلی دروازے کی طرف جاتی سیڑھیوں کا پہلا اسٹیپ ہی چڑھی تھی کہ پیچھے سے آکر فریال اس کے سامنے دوسرے اسٹیپ پر کھڑی ہو گئی۔ اقدس کو رکنا پڑا۔ فریال کی سلگتی نظریں اقدس کے سراپے پر تھیں۔

”خاصی تیزی میں ہو۔“
”اندھا دھند چلنے والے اکثر منہ کے بل گرتے ہیں۔ یہ جو تم غلط سمت کا تعین کر بیٹھی ہو نا، اس کا کوئی



”سربراہ کر دیا روحان لُچ پر انوائٹ کر کے۔“ وہ سیدھی ہسپتال سے آرہی تھی۔ لُچ ٹائم سے پہلے ہی روحان نے اسے فون کر کے لُچ ساتھ کرنے کی دعوت دے ڈالی تھی۔

”میں نے سوچا آج میں لُچ پر بلاؤں۔ ہمیشہ آپ خود ہی آتی ہیں۔“ روحان نے اپنی مخصوص نرم مسکراہٹ کے ساتھ کہا جو اس کے مزاج کا خاصا تھی۔

”کیا پلان ہے، کہاں لُچ کرنا ہے۔“ فریال شانت سی اپنے خوب صورت بالوں میں ہاتھ پھیرتی ہوئی بولی۔

”ہیں کرتے ہیں، میں نے کہہ دیا ہے، تھوڑی دیر میں تیار ہو جائے گا۔“ وہ اس وقت انسٹی ٹیوٹ میں موجود تھی۔

”اس دن پارٹی بہت اچھی تھی اور تمہارے ریسٹورنٹ کا کھانا، اس کی تو کیا بات ہے امیزنگ۔“ اریجنٹس بھی بہت اے ون تھی۔ ”فریال نے کھلے دل سے تعریف کی۔

”تھینک یو۔ کیا پلانز ہیں آگے زندگی میں۔“ ”امپشلا نریشن کرنے کا ارادہ ہے۔“

”اور شادی اس کے بارے میں کیا خیال ہے۔“ روحان کے سوال پر وہ بھرپور انداز میں مسکرائی۔ ”ہوں، شادی کا پلان پہلے تو نہیں تھا۔ می تو کب سے چاہتی ہیں کسی پروپوزل پر ہاں کر دوں میں ہی ثالثی رہی۔ مگر اب سوچ رہی ہوں کوئی اچھا لگے تو کر ہی لوں۔“

”مجھے بھی پہلے کبھی سوچنے کا موقع نہیں ملا اس بارے میں۔“ اسٹیبلش بھی ہو چکا ہوں پر کچھ سالوں تک شادی کا پلان نہیں تھا۔ اب اسی ابو کی بھی خواہش ہے اور پھر لُچ کی شادی ہونے والی ہے۔ اس کے چکر بھی کم ہو جائیں گے۔ مصروف ہو جائے گی اپنی زندگی میں۔“

”اس لیے تم شادی کا سوچ رہے ہو۔“ فریال نے کہا۔

روحان کے لبوں پر خوب صورت مسکراہٹ آ گئی۔ دونوں بازو نیپل پر رکھے وہ ایک ہاتھ سے پیپر ویٹ گھما رہا تھا۔ نظریں بھی اسی پر تھیں۔

”صرف یہ وجہ نہیں ہے۔ ایک بڑی وجہ محبت کا وہ خوب صورت احساس ہے جو میں نے پہلے کبھی کسی کے لیے محسوس نہیں کیا۔“

”اور کون ہے وہ خوش قسمت لڑکی۔“ فریال نے بے اختیار پوچھا۔

”تم ہی ہو فریال۔ محبت کرنے لگا ہوں تم سے۔“ وہ یہی سننا چاہتی تھی۔ اس کے خوب صورت چہرے پر خوشی روشنی بن کر اتر رہی تھی۔ مگر روحان تو کچھ اور کہہ رہا تھا۔ فریال کو لگا دفتری چھت اس پر آن گری ہو۔

☆ ☆ ☆

”کیا سوچ رہے ہیں۔“ کرنل شہاب کو سوچوں میں غرق دیکھ کر ان کی ٹیم نے اپنی جانب متوجہ کیا۔

”مشکل میں ڈال دیا ہے تیمور نے۔“ انہوں نے متفکر لہجے میں کہا۔

کپڑے تہ کرتے ان کے ہاتھ رکے۔ ”مشکل کیا ہے، اچھا، شریف، رکھ رکھاؤ والا بچہ ہے اور پھر تیمور بھائی کی فیملی کو ہم ایک عرصے سے جانتے ہیں۔ آپ کہیں ثانیہ کی وجہ سے تو نہیں پریشان ہو رہے۔ اس کے بھی کچھ پروپوزلز آئے ہوئے ہیں۔ میرا تو خیال ہے دونوں کے رشتے ساتھ ہی طے کر دیں گے۔“

”آپ بات کو سمجھ نہیں رہیں۔“ انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ قریب آ کر بیٹھ گئیں۔ منتظر نظریں شوہر کے چہرے پر تھیں۔

”ٹھیک ہے روحان ہر لحاظ سے اچھا ہے۔ اس کا مزاج، اخلاق، شرافت سب اپنی جگہ۔ مگر بیٹی کا رشتہ کرتے وقت بہت کچھ دیکھنا پڑتا ہے۔ خاندان والوں کو اور دوسرے ملنے والوں کو میں کیا بتاؤں گا کہ میرا داماد بادرچی ہے، کتنی سبکی ہوگی خاندان میں۔“

”حد کرتے ہیں آپ بھی۔ ایسے کہہ رہے ہیں جیسے

دار دھکا کا ہوا تھا۔ سامنے سے آتے ٹرک سے اس کی گاڑی ٹکرائی اور الٹ گئی۔ آس پاس بہت سی آوازیں تھیں، شور تھا۔ مگر اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔



رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ ثانیہ دستک دے کر اس کے کمرے میں آئی۔

”کیا کر رہی ہو۔“

”ناؤل بڑھ رہی تھی۔ آپ آئیں نا۔“ اقدس نے ناؤل بند کر کے رکھ دیا۔

”سوئے کا موڈ نہیں ہو رہا تھا۔ مہرین تو کب کی سو گئی۔ سوچا تمہیں دیکھ لوں۔“ ثانیہ بھی بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”مہرین آہلی جلدی نہیں سو گئیں۔“

”ہوں۔ اس کے فائنل قریب ہیں۔ صبح فجر کے وقت اٹھ کر پڑھتی ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کیوں نہیں جا رہیں اتنے دنوں سے۔“ ثانیہ نے اقدس کو بغور دیکھا۔

”اچھی خاصی شیفت بن چکی ہوں۔ اب جا کر کیا کروں گی۔“ ثانیہ کی بات ہنسی میں اڑاتی، اس کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔

پارٹی کے بعد سے وہ نہ تو انسٹی ٹیوٹ جا رہی تھی نہ ہی اس نے انکل تیور کے گھر کا رخ کیا تھا۔ وہ خواب جو اس نے اپنی آنکھوں میں بسائے تھے انہیں نوچ کر پھینک دینا چاہتی تھی۔ سوچ لیا تھا اس نے کہ بھی

روحان تیور کا سامنا نہیں کرے گی۔ اس کے دل میں اگر فریال ہے تو اقدس بھی اسے دل سے نکال دے گی۔ اپنی ذات کا تماشہ بنانا اسے گوارا نہیں تھا۔

”جی ہاں، یہ جو اتنے دنوں سے اداس پھر رہی ہو، کیا وجہ ہے اس کی اور اس دن اچانک پارٹی چھوڑ کر کیوں چلی گئی تھی۔“

”بتایا تو تھا، طبیعت خراب ہو گئی تھی۔“

”فریال سے کیا بات ہوئی تھی وہاں سیڑھیوں پر جب تم دونوں کھڑی تھیں۔“

کوئی چور اچکا ہے۔ بڑھا لکھا محنتی بچہ ہے۔ اپنا ریسٹورنٹ چلاتا ہے۔ آپ اپنی اسی پرانی سوچ کی وجہ سے یہ رشتہ گنوا دیں گے۔ اس قدر محبت کرنے والے لوگ ہیں سر آنکھوں پر بیٹھائیں گے۔“ ان کا موڈ خراب ہوا۔

”میں نے کون سا انکار کر دیا ہے۔ فیصلہ تو سوچ سمجھ کر ہی کرنا پڑتا ہے۔“

”انکار نہیں کیا مگر تیور آپ کے پی پی ہیں۔ دو دلاؤ آپ بے شک ڈاکٹر، انجینئر، ڈھونڈ لیں مگر خدا کے لیے

اس بے کاری سوچ کے پیچھے روحان کے رشتے سے انکار مت کریں۔“ وہ تپ کر کتنی اٹھ گئی تھیں۔

کرل شہاب کے چہرے پر پراسوج لکیریں تھیں۔



روحان تیور اس سے محبت نہیں کرتا۔ بلکہ کسی اور سے محبت کرتا ہے۔ فریال سراج کو چھوڑ کر وہ کیسے پسند آگئی اسے؟ کیوں نظر انداز کر دیا اس نے فریال جیسی حسین لڑکی کو؟ کیا خاص تھا اس لڑکی میں کہ

روحان کی نگاہ اس پر سے نہیں ہٹیں۔ اس کے دل میں محبت کا احساس فریال کے لیے کیوں نہیں جاگتا۔

بہت سی سوچوں نے اس کا ذہن منتشر کر رکھا تھا۔ اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر مسل دیا تھا۔

گاڑی کے اسٹیرنگ پر اس کے ہاتھوں کی گرفت سخت تھی۔ گلابی لب میچے ہوئے تھے اور گاڑی فل اسپید سے بھاگ رہی تھی۔

”محبت کا وہ خوب صورت احساس جو میں نے پہلے کبھی کسی کے لیے محسوس نہیں کیا۔“

”بہت شاندار شخصیت کا مالک ہو گا وہ جسے میں منتخب کروں گی۔“

”تمہارا گوہر تاباں بھی دیکھ لیں گے۔“

”اس کے علاوہ کبھی کوئی اچھا ہی نہیں لگا۔“

بہت سی آوازیں آپس میں گڈٹ ہو رہی تھیں۔ سامنے کا منظر اسے تھیک سے نظر نہیں آ رہا تھا۔ دھند تھی جو اس کی آنکھوں کے سامنے آگئی تھی۔ ایک زور

بایاں بازو اور دونوں ٹانگیں زخمی ہوئی تھیں۔ اس کا ایکسپینڈنٹ خطرناک تھا اور اسے بتایا گیا تھا کہ وہ کوئے میں جاتے جاتے پتی تھی۔

گہری خاموشی تھی جو اس کے وجود پر چھائی ہوئی تھی۔ اس کے آس پاس اس کی فیملی تھی۔ اس کے کولیکز بھی ملنے آ رہے تھے۔ مگر اس کے پاس جیسے بات کرنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ اکثر کووہ نظر انداز کرنے کے لیے سوتی بن جاتی تاکہ کوئی بات چیت کرنی ہی نہ پڑے۔ یہ اس کے کالج کا اسپتال نہیں تھا جہاں اسے لایا گیا تھا اور یہ ایک بات اسے اچھی لگی تھی۔

سارے دن وہ جیت لیٹی چھت کو دیکھتی رہتی۔ ذہن میں پچھلی باتوں کی بازگشت سنائی دیتی۔ روحان کے الفاظ جیسے اس کے اندر گھب گئے تھے۔ اس کے چہرے پر خراشیں آئی تھیں۔ جن پر وہ بار بار ہاتھ پھیرتی تھی۔ ایک دن نرس اسے ایسا کرتے دیکھ کر مسکرائی۔

”آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں۔ ٹھیک ہو جائیں گی یہ۔ آپ کی خوب صورتی میں کمی نہیں آئے گی۔“

اور وہ جواباً ”مسکرا بھی نہیں سکی۔ کیا بتاتی کہ خوب صورتی میں کمی تو شاید پہلے ہی آچکی تھی۔ یا اس خوب صورتی کا کوئی فائدہ تھا ہی نہیں جس پر وہ اترا تھی۔ بچپن میں اپنی تعریفوں پر وہ شرمایا کرتی تھی۔ پھر جب ثانیه سے اس کی سرورجنگ شروع ہوئی۔ تب اسے اپنی تعریف اچھی لگتی۔ اسے لگتا ایک ہی چیز ہے جس میں ثانیه اس سے آگے نہیں جاسکتی تھی۔ تب اس کی شخصیت میں اپنے حسن کا غور جھلکنے لگا تھا۔ آس پاس والوں کی توصیفی نظروں کو وہ اپنا حق سمجھ کر وصول کرتی تھی۔“

ثانیه آئی تھی اس سے ملنے مگر وہ سوتی بنی رہی۔ مئی سے اس کے بارے میں پوچھتی ہوئی وہ ہمیشہ کی طرح تھی پرسکون سی۔ پتا نہیں وہ اتنی پرسکون، مطمئن کیسے رہتی تھی۔ سونے کا ڈر اما کرتی ہوئی فریال نے سوچا تھا۔

”ایسے ہی حال احوال پوچھ رہی تھیں وہ۔“ اقدس بشکل بول پالی۔ وہ منظر اسے یاد آ گیا تھا۔

”روحان کو پسند کرتی ہونا تم۔“ اقدس ایک جھٹکے سے سیدھی ہوئی۔ اس سے پہلے کہ وہ منہ کھولتی ثانیه نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔

”ہر بات سے انکار کر رہی ہو۔ اس بات سے مت کرنا۔ بڑی بہن ہوں تمہاری۔ تمہیں جانتی بھی ہوں اور دیکھنے کے لیے وہ آنکھیں بھی ہیں میرے پاس۔“ اقدس سٹٹائی اس کی نظریں جھک گئیں۔ ”آپ کو کیسے پتا چلا۔“

ثانیه کو اس کا لال چہرہ دیکھ کر ہنسی آئی۔ ”یہ جو روحان کو دیکھتے ہی تمہاری آنکھیں چمکنے لگتی ہیں نا۔ بہت پہلے ہی سمجھ گئی تھی میں۔“

”ہاں مگر میرے پسند کرنے سے کیا ہوتا ہے وہ مجھے پسند نہیں کرتے۔“

”انکل تیمور نے روحان کے لیے تمہارا رشتہ مانگا ہے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ اقدس بے یقین تھی۔

”کیوں نہیں ہو سکتا؟“

میرا اور ان کا کوئی میچ نہیں ہے۔ وہ پرفیکٹ ہیں اور۔۔۔“

ثانیه نے اس کی بات کاٹی۔ ”کوئی پرفیکٹ نہیں ہوتا۔ صرف وہی پرفیکٹ نظر آتا ہے جس میں وہ خوبیاں ہوں جو آپ کسی میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ ورنہ پرفیکشن تک کوئی نہیں پہنچ سکتا اور تم میں کوئی کمی نہیں ہے اقدس۔ اپنے آپ کو ذمی گریڈ مت کرو۔ اس احساس کتری سے نکلو۔ تم بہت اچھی ہو۔“

کافی دیر سے باہر کھڑے کرنل شہاب چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ وہ بھول گئے تھے کہ انہیں اسٹڈی میں کتابیں رکھنے جانا تھا۔



اسے ہوش آیا تو وہ اسپتال میں تھی۔ اس کا سر،

سیدھے ہوئے۔

”چلتا ہوں، تمہارا تو لمبا پروگرام لگتا ہے ہاسپٹل میں رہنے کا۔“ وہ جاتے جاتے مڑے۔
 ”کوئی بھی بات ہو فریال، تم مجھ سے کر سکتی ہو۔ میں کبھی تمہارا برا نہیں چاہوں گا۔“
 نرمی سے کہتے وہ باہر نکل گئے۔ فریال گم صم سی دروازے کو دیکھتی رہی۔



روحان اس سے ملنے آیا تھا یہ بات اسے می سے پتا چلی کیونکہ وہ اس وقت سو رہی تھی۔ اس نے شکر ادا کیا تھا کہ اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ آج کل اتنی ڈپرہسڈ تھی کہ کسی سے بھی بات کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا اور روحان سے تو کسی صورت بھی نہیں۔ جو کچھ وہ اس سے سن چکی تھی اس کے بعد اس کے سامنے فی الحال وہ نارمل انداز اختیار نہیں کر سکتی تھی۔ وہ صرف ہوں ہاں میں ہی جواب دے رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا اگر وہ لمبی بات کرے گی تو اس کے اندر کی تنگی ضرور زبان پر آجائے گی۔ وہ بس خاموش رہنا چاہتی تھی۔ ہاسپٹل سے ڈسچارج ہوتے ہی وہ اگلے دن ڈیوٹی پر جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ سب ہی اسے دیکھ کر حیران ہوئے تھے۔ ابھی اس کی چھٹیاں باقی تھیں اور اسے آرام کی ضرورت بھی تھی۔ اور می نے روکا بھی تھا مگر ضد کر کے وہ آٹو گئی تھی مگر زیادہ دیر اس سے وارڈ میں کھڑا نہیں رہا گیا۔ زخموں کی تکلیف سے مجبور ہو کر وہ ہاؤس آفیسرز روم کی طرف آئی تھی۔ اپنا نام سن کر وہ دروازے پر ہی ٹھک کر رک گئی۔

”ثانیہ کے ساتھ اس نے جو کیا ہے نا۔ مجھے تو لگتا ہے اسی کی سزا ملی ہے اسے۔“ سنا کی تپی ہوئی آواز آئی۔

”برے کام کا انجام بھی برا ہی ہوتا ہے۔ صلہ تو اسے ملے گا ہی اگر ابھی نہیں بھی ملا۔ مگر ثانیہ کو یوں خاموش نہیں رہنا چاہیے تھا۔ میری مانتی، سابر کراٹم میں رپورٹ کرتے۔ سب کچھ کھول کر ڈاکٹر حماد کے



اس کی آنکھیں بند تھیں جب کوئی کمرے میں آیا تھا۔ اس نے آنے والے کو پہچان لیا مگر ہمیشہ کی طرح وہ سوتی بن گئی۔
 ”فریال! مجھے معلوم ہے تم جاگ رہی ہو۔“ ان کی نرم آواز پر فریال نے گہرا سانس لیتے ہوئے پٹ سے آنکھیں کھولی تھیں۔ پتا نہیں کیسے وہ اس کی ہر بات جان لیتے تھے۔

”آپ کیوں آئے ہیں؟ میں آپ کی سائیکو پشمنٹ (پاگل مریض) نہیں ہوں۔“

ڈاکٹر جنید کے چہرے پر بڑی خوب صورت مسکراہٹ آئی تھی۔ ”مانا کہ سائیکازسٹ ہوں۔ مگر یہاں صرف تمہاری عیادت کے لیے آیا ہوں۔ میں پہلے بھی آیا تھا جب تم جج کی بے ہوش تھیں۔“
 ”ہو گئی عیادت، دیکھ لیے کتنے زخم آئے ہیں۔ خوش ہو جائیں فریال بھی کبھی بے بس سی بستر پر پڑی نظر آئی۔“ فریال کے لہجے میں تسخنی تھی۔ اپنے دونوں ہاتھ بیڑ پر رکھتے وہ تھوڑا سا جھکے تھے۔

”تم جانتی ہو تمہارے نقصان پر میں کبھی خوش نہیں ہو سکتا۔۔۔ فرسٹ ہینڈ ہو۔ کیا صرف اس ایک سیسٹنٹ کی وجہ سے۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ آہستہ آواز میں کہتے اس نے نظریں چرائیں۔ ان کی جاچتی نظریں وہ اپنے اوپر اچھی طرح محسوس کر رہی تھی۔

”فریال!“ ان کی دھیمی آواز پر وہ ان کی طرف دیکھنے پر مجبور ہوئی۔ ان کی گہری آنکھوں میں ہمیشہ کی طرح نرمی تھی۔

”کچھ بوجھ دلوں پر پتھر کی مانند ہوتے ہیں۔ اتار لیے جائیں تو وجود کو ہلکا پھلکا کر دیتے ہیں۔ اور اگر نہ اتارے جائیں تو ان کی چھین ساری زندگی محسوس ہوتی رہتی ہے۔“

وہ کیا کہنا چاہتے تھے۔ کیا جانتے تھے وہ فریال ان کی گہری آنکھوں میں زیادہ دیر دیکھ نہیں سکی تھی۔ وہ

نظریں جھکائے وہ انہیں سب بتاتی چلی گئی۔ اس دوران وہ خاموش رہے تھے۔ انہوں نے فریال کو ٹوکا نہیں تھا۔ اپنی بات مکمل کر کے فریال نے ان کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ سوچ رہے تھے شاید چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔

”آپ کو مجھ سے نفرت محسوس ہو رہی ہوگی۔“ فریال نے اس خاموشی کو توڑا جو کچھ دیر کے لیے ان کے درمیان ٹھہر گئی تھی۔

دونوں کہنیاں ٹیل پر رکھتے وہ آگے ہوئے۔ ”میں تم سے نفرت نہیں کر سکتا فریال۔ تم جانتی ہو یا محبت ہوتی ہے یا نفرت دونوں ایک جگہ اکٹھی نہیں ہو سکتیں۔“ وہ سر جھکا گئی۔

”دیکھو فریال! جب میں نے یہ سب سنا تھا تب ہی مجھے لگا تھا کہ ہونہ ہو تمہاری اس میں انوالومنٹ نہیں نہ کہیں ہوگی۔ تم ثانیہ کو پسند نہیں کرتیں یہ بات میں کالج کے وقت سے جانتا ہوں۔ اس وقت بھی تم ثانیہ کو تنگ کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی مسئلہ اس کے لیے کھڑا کر دیتی تھیں۔ مجھ سے بھی تمہارا یہی جھگڑا رہتا تھا کہ تمہارے ساتھ ساتھ میں اسے کیوں بڑھا دیتا ہوں۔ میں یہ نہیں جانتا کہ تمہیں اپنی غلطی کا احساس کس چیز نے دلایا ہے۔ تم میرے پاس آئی ہو تو میں تو یہی مشورہ دوں گا کہ تم جا کر ثانیہ سے معافی مانگو۔ اپنے دل کو اس بوجھ سے آزاد کرو اور اس کے لیے وہ کرو جو تم کر سکتی ہو۔“

”اسے مجھے معاف نہیں کرنا چاہیے۔“ فریال نے نیپیل کی سطح کو دیکھتے ہوئے افسردگی سے کہا۔

”میں تمہارا اسٹیٹ آف مائنڈ سمجھ رہا ہوں۔ انسان کے اندر اچھائی اور برائی دونوں ہوتی ہیں۔ کوئی بھی مکمل بریا یا اچھا نہیں ہوتا۔ ہاں کمال یہ ہے کہ آپ اپنے اندر اچھائی کی روشنی کو تلاش کریں، خود اپنا محاسبہ کریں اور اپنے محاسبے کے لیے اپنے اندر اترنا پڑتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ سب صاف نظر آنا شروع ہو جاتا ہے۔“ ان کے سمجھانے کا انداز بہت خوب

سامنے رکھتے فریال کو بھی اچھا سبق ملتا۔ لیکن ثانیہ ہمیشہ اسے صاف پہچانتی ہے۔ ”فرح بولی تھی۔“ تب ہی تو اسے شہر ملی ہے ویسے جتنی حسین فریال کی صورت ہے نانتا ہی سیاہ دل ہے۔ اسی لیے تو کہتے ہیں شکل بھلے واجبی ہو انسان کی پر سیرت اچھی ہونی چاہیے۔“

”بھی بھی انسان کے اعمال کی سیاہی صورت پر بھی نظر آنے لگتی ہے۔“ فرح نے ہنسنے لگا۔

تو کیا اس کا دل واقعی سیاہ ہو گیا تھا۔ یا پھر اتنا سخت کہ کسی کو نقصان پہنچا کر بھی وہ سکون سے تھی اور کیوں تھی ثانیہ اتنی اچھی کہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی خاموشی سے قبول کر لیا تھا۔ اسے پیچھے دھکیلنے کی کوشش میں وہ خود کیس پیچھے رہ گئی تھی۔

اسپتال سے باہر آتے ہوئے وہ ان ہی سوچوں میں غرق تھی۔ کچھ خبر نہیں تھی کہ کس طرف جانا چاہتی تھی اور کس طرف پاؤں پڑ رہے تھے۔ بس سوچیں اور آوازیں تھیں جن کی بازگشت اسے بے چین کر رہی تھی۔



اپنے دفتر میں اسے دیکھ کر وہ حیران ہوئے۔ یہ وہ فریال نہیں تھی جو ہر وقت شاہانہ موڈ میں رہتی تھی۔ اور اس دوران سی ٹی وی بکھری سی یہ تو کوئی نئی فریال تھی۔ ”بیٹھو فریال“ وہ چپ چاپ سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

”میں یہاں سے گزر رہی تھی تو سوچا آپ سے مل لوں۔“

”تم کتنی ہو تو مان لیتا ہوں۔ پر سچ یہ ہے کہ اگر تم صرف یہاں سے گزر رہی ہو تیں تو کبھی میرے دفتر نہ آئیں۔“ ڈائریجنڈ کا لہجہ متبسم تھا۔ ان کی گہری نظریں لب کاٹتی فریال پر تھیں۔

”کیا کہنے آئی ہو فریال۔“ انہوں نے نرمی سے اسے بولنے پر اکسایا۔

”ثانیہ کو ہسپتال سے میں نے نکلوایا ہے۔“

صورت تھا۔ فریال کو اپنی افسردگی کچھ کم ہوتی محسوس ہوئی۔

”اور دل کی سیاہی کے بارے میں کیا کہیں گے۔“ اس بار فریال نے ان کی آنکھوں میں دیکھا۔

وہ مسکرائے۔ ”تمہیں لگتا ہے تمہارا دل سیاہ پڑ گیا ہے۔ سو سہل وہ کام نہ کرو جو دوسروں کو بے سکون کر دے۔ برا کرو اپنے دل کو سب کے لیے۔“

”چلتی ہوں بہت وقت لے لیا آپ کا۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔

”فریال۔“ وہ جاتے جاتے مڑی۔

”کچھ اور بھی کہنا چاہتی ہو۔ کوئی اور مسئلہ ہے تو ڈسکس کرلو۔“ وہ اپنی جگہ سے مڑی تھی۔

”اوکے پھر کبھی سنی۔“ وہ اس کی خاموش نظروں کا مفہوم سمجھ گئے تھے۔ اس کے دفتر سے نکلے ہی ڈاکٹر

جنید نے موبائل اٹھا کر کال ملائی۔ سلام کا جواب دیتے ہی وہ بولے۔ ”ثانیہ مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔“



آج ایک بار پھر اسے وہاں آنا پڑا جہاں دوبارہ نہ آنے کا اس نے خود سے عہد کیا تھا۔ دفتر کے دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی سامنے بیٹھے ڈاکٹر حماد پر نظر

پڑی جن کے چہرے پر ثانیہ کو دیکھ کر حیرت پھیل گئی۔

”فریال آئی تھی آپ کے پاس۔“ ان کے بالکل سامنے کھڑے ہو کر وہ پوچھ رہی تھی۔

”جی آئی تھیں ابھی ابھی اور کچھ انکشافات کر کے گئی ہیں۔“ سامنے رکھی فائل پر کچھ لکھتے ہوئے وہ

بلے حد سنجیدہ تھے۔

”آپ اس کے خلاف کچھ نہیں کریں گے۔“

ہاتھ روک کر انہوں نے بغور اپنے سامنے کھڑی پُر اعتمادی ثانیہ کو دیکھا۔ ”میں سمجھ نہیں پا رہا آپ

دونوں کو۔ آپ خاموشی سے ہاسپٹل سے چلی گئیں۔ اب وہ آکر سارا معاملہ اپنے سر لے رہی ہیں بلکہ اپنی طرف سے سارے ثبوت بھی ساتھ لائی تھیں۔ آپ

کی آئی ڈی کھول رہی تھیں۔ میری طرف سے آپ کو کیے گئے مہسجوز دکھارہی تھیں اور اب آپ ان کی حمایتی بن کر آگئی ہیں۔ کیا مجھوں میں اس سب کو۔“

”آپ وہ ہی سمجھیں جو پہلے سمجھ رہے تھے۔ مجھے ہاسپٹل سے نکلا تھا میں نکل گئی۔ اب مزید آپ

فریال کے خلاف کچھ نہیں کریں گے۔“ ثانیہ نے بات ختم کرنی چاہی۔ دائیں ہاتھ کام کا اپنی ٹھوڑی کے نیچے رکھتے وہ پیچھے ہوئے گرے آنکھیں ثانیہ کے

سرخ پتے ہوئے چہرے پر تھیں۔

”آپ مجھے ڈکھٹ نہیں کر سکتیں۔“ ثانیہ نے سلگ کر اس الٹی کھوپڑی والے بندے کو دیکھا۔

”اور پھر جو اعتراف فریال کر رہی ہیں، اس کے بعد آپ تو بے قصور ہو میں۔ سزا فریال کو ملنی چاہیے تھی نہ کہ آپ کو۔“

”مجھے کوئی شوق نہیں ہے آپ کو ڈکھٹ کرنے کا۔ جو معاملہ دب گیا ہے۔ اسے دوبارہ نہ دیے

بھی یہ میرا اور فریال کا ذاتی معاملہ ہے اور مجھے اسے کوئی سزا نہیں دلوانی۔“ سنجیدگی سے کہتی وہ جانے کے لیے مڑ گئی۔

ڈاکٹر حماد کے چہرے پر پُرسوج لکیریں تھیں اور نظریں ثانیہ پر تھیں۔ جو دروازے کے پاس رکی اور بغیر مڑے بولی۔

”آپ کے لیے مشورہ ہے، سزائیں دینے کے بجائے معاف کرنا سیکھیں۔ خود بھی سکون سے رہیں اور دوسروں کو بھی رہنے دیں۔“

کھٹاک سے دروازہ بند کرتی وہ غائب ہو چکی تھی مگر ڈاکٹر حماد کی سوچتی نگاہیں دروازے پر ہی تھیں۔



”تمہارے بھائی کو سمجھانا ناممکنات میں سے ہے۔ پھر بھی تم ان کو سمجھاؤ پلیز۔ ان پر ذرا بھی اعتبار نہیں ہے مجھے کہ وہ میری بات پر غور بھی کریں گے۔“ وہ

دونوں اس وقت کالج کے کیفے ٹیرا میں بیٹھے تھے۔ ہاسپٹل سے نکلے ہی وہ اس کے ساتھ بنے کالج میں آ

گئی تھی۔

”اچھا ریلیکس کریں۔ میں بھائی سے بات کروں گا۔ اتنے برے نہیں ہیں جتنا آپ انہیں سمجھ رہی ہیں۔“ جوس کا گھونٹ بھرا ہوا گلوہر بولا۔

”سوری لیکن اتنے اچھے بھی نہیں ہیں۔ اپنے آگے دوسرے کو کچھ سمجھتے ہی نہیں ہیں۔“ ٹامیہ گے تپ کر کہنے پر گلوہر کے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ چھلکی تھی۔ اسے یاد آیا کیسے وہ دونوں کی شادی پلان کر رہے تھے۔

”اچھا چھوڑیں، مجھے یہ بتائیں ڈاکٹر فریال نے آپ کے ساتھ اتنا برا کیا پھر آپ ان کے لیے اچھا کیوں سوچ رہی ہیں بلکہ پہلے بھی آپ جانتی تھیں۔ تب بھی خاموشی سے اپنا نقصان کو الیا۔ کیوں؟“

”میں بھی اگر اس کے ساتھ وہی کرتی ہوں اس نے کیا تو ہم دونوں میں کیا فرق رہ جاتا اور اصل وجہ کچھ اور ہے۔ ہمارے فادر زہست اچھے دوست ہیں اور یہ دوستی بہت پرانی ہے۔ تب شروع ہوئی تھی جب انکل سراج نے میرے ابو کی جان بچائی تھی۔ ابو کسی سرچ آریشن پر تھے اور وہ انکل کا علاقائی گاؤں تھا۔ بھاری علاقہ تھا۔ وہاں لڑائی کے دوران ابو کو گولیاں لگی تھیں۔ انکل کو وہ ایک چھوٹی سی کھائی میں نیم مرہہ حالت میں ملے تھے۔ چھوٹا سا علاقہ تھا، اسپتال میں سہولیات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ طبی امداد کے بعد وہ ابو کو قریبی شہر لے گئے۔ وہاں کتنے ہی دن ان کے ساتھ رہے۔ بس تب سے چلی آ رہی ہے یہ دوستی۔ اور فریال کو معاف کرنے کی بڑی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ ہمارے محسن کی بیٹی ہے۔“

”ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر دونوں انکلز کی دوستی اتنی گہری ہے تو فریال صاحبہ کو آپ سے کیا پر خاش ہے؟“ گلوہر متذبذب تھا۔ ٹامیہ نے گہرا سانس لیا۔

”یوں سمجھ لو کہ اس میں ہمارے بیوں کی غلطی ہے۔ بچپن میں میری اور فریال کی اچھی دوستی رہ چکی ہے مگر آہستہ آہستہ جب بیوں نے ہمارا تقابل شروع

کیا تو یہ ختم ہی ہو گئی۔ شاید فریال کی بدگمانی اپنی جگہ صحیح ہے کیونکہ میری کامیابیوں کو ابو نے ہمیشہ سبیل رویت کیا جبکہ فریال کو انکل نے مجھ سے کمپیر کیا۔ میرے جیسا بننے پر اکسلیا۔ حالانکہ وہ کوئی تالافق اسٹوڈنٹ نہیں تھی۔

بچوں کے ذہن بہت نازک ہوتے ہیں۔ اپنے ارد گرد ہونے والی ہر بات وہ نوٹ کرتے ہیں۔ مجھے زیادہ اہمیت دینا اسے مجھ سے بدگمان کر گیا۔ انکل اسے کمپیشن دے کر زیادہ اچھی پرفارمنس کی توقع کرتے رہے جبکہ اس کا ذہن ان باتوں کو ٹکھنٹھولیتا رہا۔ میرے خیال میں تو اس کے ساتھ بھی زیادتی ہوئی ہے۔“

”بچوں کو آپس میں کمپیر نہیں کرنا چاہیے۔“ گلوہر متفق ہوا۔ ”آپ کی سوچ بہت پوزیٹو ہے۔“

”بقول میری امی کے ٹامیہ نے ساری زندگی کتابوں میں منہ دے رکھا ہے چاہے کورس کی ہوں یا دوسری۔“ وہ ہنسی۔

”مگر میرے نزدیک کتابیں سب سے اچھی ساتھی ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی دوسروں کے تجربات آپ کو وہ کچھ سکھا دیتے ہیں جو خود سے سیکھنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔“

”پارٹ ون چھوڑیں، اسکا لرن جائیں۔“ گلوہر نے شرارتی انداز میں کہا۔

”مشورے کا شکریہ۔۔۔ میں چلتی ہوں۔ تم اپنے ہٹلر بھائی سے بات کر لیتا۔“ اپنا ہینڈ بیگ پکڑے وہ اٹھ گئی۔

”اوکے۔“ گلوہر مسکراتا ہوا اپنی جگہ سے اٹھا۔



”یہ آر ٹیکل پڑھنا، بڑا دلچسپ ہے۔“ کرئل شہاب نے ٹامیہ کو مخاطب کیا۔ وہ دونوں اس وقت اسٹڈی میں بیٹھے اپنے اپنے مشغلے میں مصروف تھے۔

”جی۔“ ٹامیہ نے اپنی کتابوں سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ کچھ دیر ان کا خوشگوار موڈ دیکھتے رہنے کے بعد

اس نے جھجکے ہوئے بات شروع کی۔
 ”ابو! روحان کے رشتے کے متعلق کیا سوچا آپ نے؟“ کرنل شہاب نے گہرا سانس لیتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا اخبار یہ کیا۔

”کوئی فیصلہ نہیں کر پایا۔“ وہ سنجیدہ تھے۔
 ”جواب تو دینا ہو گا نا۔ صاعقہ آئی کا فون آیا تھا۔ ابھی تو امی نے ٹال دیا پر کب تک اور جہاں تک روحان کی بات ہے وہ بہت اچھا ہے۔ تب ہی تو آپ صاف انکار نہیں کر رہے۔“

”مجھے اس کی خوبیوں سے انکار نہیں ہے مگر ہے تو وہ ایک باورچی اور یہ ہمارے ہاں کوئی اتنا عزت دار پیشہ نہیں ہے۔ خاندان والے سب ہی سوال کریں گے کہ باورچی سے بٹی کیوں بیاہ دی۔“

”مانیہ نے اپنی کتاب بند کر کے ان کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی سوچ لیا تھا کہ اب یہ ٹاپک چھیڑا تو پوری بات کر کے رہے گی۔“

”تو باورچی ہونے میں کیا برائی ہے ابو۔ پہلی ترجیح آپ تعلیم کو دیتے ہیں اور وہ تعلیم یافتہ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس نے تعلیم ہی اس نتیجے میں حاصل کی ہے۔“

”جینشیت قوم ہم کھانے کے شوقین ہیں۔ سب کی بھئی کو شش ہوتی ہے کہ اچھے سے اچھا کھانا کھائیں۔ منٹے سے منٹے ریسٹورانٹ میں جا کر کھاتے ہیں اسی شوق کے پیچھے۔“

”اوہی سے زیادہ زندگی تو ہماری کھانے کے گرد گھومتی ہے۔ جب کھانے سے اتنی محبت ہے تو پکانے والے کو عزت کیوں نہیں دے سکتے۔ کیوں اس سے رشتہ داری جوڑنا ہمارے لیے باعث شرم ہے۔“

”یاقی تو گھر کی عورتیں بھی ہیں تو اگر یہ کام اتنا ہی برا ہے تو کیا وہ عزت کے قابل نہیں ہیں؟“

”کھانا پکانا عورتوں کا ہی کام ہے۔ وہ نہیں بنائیں گی تو کون بنائے گا۔“ انہوں نے بے اختیار کہا۔

”مانیہ مسکرائی۔“ ”یہی تو بات ہے نا ابو۔ یہ کہاں لکھا ہے کہ یہ کام عورتیں ہی کریں گی۔“ مرد نہ کریں۔ عورتیں بھی تو مردوں کی طرح ڈاکٹر، جینریشن ہیں تو پھر وہ بھی یہ چھوڑ دیں۔ یہ کوئی ایسا کام نہیں جس سے منع

کیا گیا ہو۔ یہ ایک حلال طریقہ ہے روزی کمانے کا اور اس سے بڑی بات کیا ہوگی۔ آج آپ اپنی سوچ بدلیں گے تو کل کو دوسرے بھی اس سوچ کو اپنانے لگیں گے۔“ مانیہ کی نظریں ان کے چہرے پر تھیں۔ جو کچھ تذبذب کا شکار تھے۔

”روحان بہت محنتی ہے ابو۔ اس نے اپنے شوق پر بہت محنت کی ہے اسی لیے تو آج اتنا کامیاب ہے۔“ مانیہ نے ایک اور پوائنٹ سے انہیں قائل کرنا چاہا۔ مگر وہ خاموش ہی رہے۔

”آپ سمجھتے ہیں ناکہ اقدس کے معاملے میں آپ سے زیادتی ہوئی ہے تو اگر۔۔۔ آپ اس زیادتی کا ازالہ کرنا چاہتے ہیں تو روحان کے رشتے سے انکار مت کریں۔ اس کی خوشی اسی میں ہے۔“ بہت کر کے اس نے ڈھکے چھپے لفظوں میں کہہ ہی دیا۔

”انہوں نے نظریں جھکائے بیٹھی مانیہ کو دیکھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ ان دونوں کی باتیں سن چکے ہیں۔“

”جاؤ اپنی امی سے کہو صاعقہ بھابھی کو فون کر دیں۔ ہمیں روحان کا رشتہ منظور ہے۔“ خوشگوار انداز میں کہتے وہ اخبار اٹھا چکے تھے۔

”مانیہ کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔“ ”تھینک یو ابو۔“ ”وہ مزہ خوش ہو کر باہر بھاگی۔ جلدی میں اپنی کتابیں سینٹنا بھی بھول گئی۔ وہ مسکرا کر مطالعے میں مشغول ہو گئے۔“



”میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔“ ڈاکٹر حماد کا فون اس کے لیے حیران کن تھا۔

”مگر میں آپ سے ملنا نہیں چاہتی۔“ مانیہ بھی جلدی سے بولی۔

”آپ سے فریال کے متعلق بات کرنی ہے۔“

”تو کریں بات۔“ مانیہ جڑبڑہوئی۔

”فون پر نہیں ہو سکتی۔ میں آپ کا انتظار کروں گا شام چار بجے مون لائٹ کیفے میں۔“ خدا حافظ کہہ کر انہوں نے فون رکھ دیا۔ مانیہ کو بولنے کا بھی موقع

نہیں دیا۔ اس نے حیرت سے فون کو گھورا۔

”ارے واہ میں کیوں جاؤں۔ آرڈر ایسے دے رہے ہیں جیسے میں ان کی ماتحت ہوں۔“ ثانیہ کو تاؤ آیا۔

تین بجے تک اس کا جانے کا بالکل بھی ارادہ نہیں تھا۔ اپنی کتابیں لے کر وہ اسٹڈی میں پڑھنے کے لیے بیٹھ گئی۔ بیس منٹ بھی جب سر کھپانے کے باوجود ایک لفظ بھی سمجھ نہیں آیا تو کتابیں بند کرتی وہ اٹھ گئی۔ بے چینی سی تھی کہ جانے ڈاکٹر حماد کیا بات کرنا چاہتے ہیں۔

چار بج کر تین منٹ پر وہ کیفے پہنچی تھی۔ کیفے کے اندر داخل ہوتے ہی ایک کونے والی ٹیبل پر اسے وہ بیٹھے نظر آ گئے۔ ثانیہ کے قریب پہنچتے ہی وہ اپنی کرسی سے کھڑے ہو گئے۔ سلام کا جواب دیتی وہ ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”بتائیے کیا بات کرنی ہے فریال کے بارے میں۔“ بیٹھتے ہی اس نے پوچھا۔

”فریال کے خلاف میں کوئی ایکشن نہیں لوں گا۔“ یہ بات کرنے کے لیے بلایا ہے۔“ ثانیہ نے حیرت سے ان کے سنجیدہ چہرے کو دیکھا۔

”اصل بات تو کچھ اور ہے اگر فریال کا نام نہ لیتا تو آپ کبھی نہ آتیں۔“

”دھوکے سے بلایا ہے آپ نے مجھے۔“ ثانیہ تپ کر کھڑی ہوئی۔

”ثانیہ پلیز بیٹھیں۔۔۔ اوکے آئی ایم سوری۔“ ان کے مصالحت آمیز لہجے پر وہ بیٹھ گئی۔

”مجھے احساس ہے میری وجہ سے آپ کا بہت نقصان ہوا ہے۔ لیکن آپ چوہدری دیکھیں تو اس میں میرا غصہ بنا تھا۔ میرے لیے کسی کے ساتھ اسکینڈل مٹانے پر ہونا چھوٹی بات نہیں تھی۔ جبکہ خود کسی نے جان بوجھ کر یہ سب کیا ہو۔ یہاں آپ کے خلاف جو غلط رپورٹ بنائی تھی وہ زیادتی تھی، نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کیا آپ میری طرف سے اپنا دل صاف کر سکتی ہیں۔“

”میرے خیال میں اب اس بات کو ختم کر دینا چاہیے۔“

”آپ کا دل بہت بڑا ہے۔“ ان کی بھوری آنکھیں اس کے روشن چہرے پر تھیں۔

”دل میں نفرت اور عناد پالنے سے اپنا ہی نقصان ہوتا ہے اور دل کی سختی انسان کو بے حس بنادیتی ہے۔“ سادگی سے کہتی وہ انہیں بہت اچھی لگی۔ وہ ہولے سے مسکرائے۔

”ہوں ویسے بھی کسی نے مجھ سے کہا ہے معاف کرنے میں ہی سکون ہے۔“ وہ بہت کم مسکراتے تھے۔ ثانیہ کو ان کی مسکراہٹ بھلی لگی۔ مگر دوسرے ہی بل وہ سنجیدہ ہو چکے تھے۔

”آپ دونوں میں ڈیوٹی پر موجود ہوں گی اور میرا آپ سے وعدہ ہے۔“

”تھینک یو میں اب چلتی ہوں۔“ وہ ہینڈ بیگ اٹھا رہی تھی جب وہ سنبھلکے ہوئے نکلے۔

”ثانیہ! میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ مجھ سے شادی کریں گی۔“

”یہ خیال آپ کو کیوں آیا۔“ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اور کیا کہے۔ ان کی بات بہت ہی غیر متوقع تھی۔

”کیونکہ آپ مجھے بہت اچھی لگیں۔ میں نے کبھی کسی کے بارے میں ایسا نہیں سوچا۔ صرف آپ ہی ہیں جس کے لیے میرے دل میں یہ خیال آیا ہے۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے۔ یہاں آپ اچھی ضرور لگنے لگی ہیں۔ بہت سوں کو کہتے سنا ہے کہ محبت کے بغیر شادی نہیں کرنی چاہیے مگر میرے خیال میں نکاح ایک ایسا رشتہ ہے جو آہستہ آہستہ دونوں فریق کے دلوں میں محبت کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔ بس دلوں میں گنجائش ہونی چاہیے۔“ اپنی بات مکمل کر کے وہ منتظر نظروں سے اسے دیکھتے رہے لیکن وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔

”آپ کچھ کہیں گی نہیں میرے پروپوزل کے بارے میں۔“ وہ کھنکھارے۔

ضرور۔ چلو وارڈ کا چکر لگائیں۔“ بلکہ جھلکے انداز میں کہتی وہ وارڈ میں داخل ہو گئی۔ فریال بھی اس کے ساتھ تھی۔



”فریال ملی تھی۔ شرمندہ تھی سوری کر رہی تھی تم سے۔ جو بھی اس نے تم سے کہا اس سب کے لیے۔“ وہ دونوں لاؤنج میں بیٹھی تھیں جب ثانیہ نے اقدس سے کہا۔

”وہ بہت بدل گئی ہے۔ نئی فریال دیکھی ہے آج میں نے؟ ابھی ابھی، ادا اس سی۔ تم بھی اسے معاف کر دو۔“

اقدس خوش دلی سے مسکرائی۔ ”آپ نے کہہ دیا میں نے معاف کر دیا۔“ اسی وقت مہرین تیز بوتلی ان کے پاس آئی۔

”ہفتہ رہ گیا ہے تم دونوں کے نکاح میں اور میرے پاس کوئی ڈھنگ کا جوڑا نہیں ہے۔ تم لوگوں کے تو سرال سے آجائیں گے۔ میرا کیا بنے گا۔“

”اقدس کا تو جوڑا آجائے گا مگر میرے سرال میں کوئی خاتون نہیں ہے۔ انکل نے پیسے دیے ہیں کہ میں اپنی مرضی سے شاپنگ کر لوں۔“ ثانیہ کو بھی فکر ستانی۔

دن تو واقعی کم تھے۔ وہی دن ہوئے تھے رشتہ طے ہوئے شادی تو تین مہینے بعد ہونی طے پائی تھی مگر انکل تیمور کی خواہش تھی کہ ابھی نکاح کر دیا جائے۔ کرنل شہاب نے اقدس اور روحان کے نکاح کے ساتھ ہی ڈاکٹر حماد اور ثانیہ کے نکاح کی تجویز سامنے رکھی جو میر صاحب نے بخوشی مان لی تھی۔



کرنل شہاب کا گھر روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ خاص کر لان میں سب سے زیادہ رونق تھی جہاں نکاح کی تقریب رکھی گئی تھی۔ سروایاں شروع ہو چکی تھیں جس کے باعث ماحول میں ٹھنڈ تھی۔ نکاح کے بعد اب دونوں میل اینچ پر ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔

”میں آپ کو کوئی جواب نہیں دے سکتی۔ یہ فیصلہ میرے ماں باپ کریں گے۔“ اس کے اندر کی خود اعتمادی کی بیدار ہوئی۔

”میں اپنے والد کو بھیجوں گا۔“ بنیدگی سے کہتے ہوئے وہ اس کے ساتھ ہی اٹھ گئے تھے۔



اسے دوبارہ سے اسپتال جوائن کیے آج دوسرا دن تھا۔ وارڈ کی طرف جاتے فریال نے اسے روکا۔

”ثانیہ! ائی ایم سوری۔“ نظریں جھکائے وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ ”مجھے معلوم ہے صرف سوری اس سب کے لیے کافی نہیں ہے جو میں تمہارے ساتھ کرتی آئی ہوں۔ اب سوچتی ہوں تو لگتا ہے ہم اچھے دوست رہ سکتے تھے اگر میں اپنے دل میں تمہارے لیے نفرت نہ بھرتی۔ غلطی میری ہی ہے اس لیے میں تم سے معافی مانگنے آئی ہوں۔“

ثانیہ نے مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ تھامے۔ ”دوستی میں نو سوری نو تھینک ہو۔ ہم پہلے بھی دوست تھے آج بھی دوست ہیں۔ اب تو بدگمانیاں ختم ہو گئیں نا تو بس پھر کوئی بری بات ہم یا وہ نہیں کریں گے۔“

فریال دھیرے سے مسکرائی۔ اتنا تو وہ جانتی تھی کہ ثانیہ اسے کھلے دل سے معاف کر دے گی۔

”اس دن اقدس سے بہت کچھ غلط کہہ دیا میں نے۔ شرمندگی ہو رہی اب۔ میرا سوری اس تک پہنچا دینا۔ اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہے۔“ لب کاٹتے ہوئے وہ اداسی سے بولی تھی۔

”میں اس سے بات کروں گی۔“ ثانیہ نے اس کا ہاتھ ہلکا سا دبا کر تسلی دی۔

”ایک بات کہوں۔“ ثانیہ جھجکی۔ فریال نے سر ہلا کر جیسے اجازت دی۔ ”ڈاکٹر جنید بہت اچھے ہیں۔“

”مگر میں اچھی نہیں ہوں۔“ اس نے محض سوچا اور ثانیہ سے کہا۔ ”ہوں جانتی ہوں۔“

”زندگی میں ایک اچھے محبت بھرے ساتھ کی ضرورت سب کو ہوتی ہے اس بارے میں سوچنا

ثانیہ نے ہلکے گرے رنگ کی شرٹ اور لنگاپن رکھا تھا۔ جس پر سلور رنگ کا خوب صورت کام تھا۔ سر پر شاکلنگ پنک دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ لائٹ سے میک اپ میں وہ عام دنوں سے زیادہ پیاری لگ رہی تھی۔ ساتھ بلیک سوٹ اور گرے ٹائی میں ڈاکٹر حماد بیٹھے تھے۔ ثانیہ، حماد اور فرح کی کسی بات پر مسکرا رہی تھی۔ جبکہ ڈاکٹر حماد دوسرے صوفے پر بیٹھے روحان سے کوئی بات کر رہے تھے۔ روحان بلیک سوٹ اور اسکن کلر کی ٹائی میں ملبوس تھا۔ اس کے ساتھ کنفیوژ سی انڈس بیٹھی تھی۔ اسکن شرٹ اور لنگ کے ساتھ میروں دوپٹہ اس پر بہت سوٹ کر رہا تھا۔ خوب صورت میک اپ نے اس کے نقوش کو اور جاذب نظر بنا دیا تھا۔ پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور دل کی دھڑکن معمول سے ہٹ کر تیز تھی۔ وہ رہ کر مہر پر بھی غصہ آ رہا تھا جو کافی دیر سے اسٹیج سے غائب تھی۔

اسٹیج سے کچھ فاصلے پر اپنی نشست پر بیٹھے کرنل شہاب نے اپنی بیٹیوں کی طرف دیکھا۔ ایک ان کی ذہین بنی تھی جس نے اپنی ذہانت کی وجہ سے سب سے زیادہ پیار اور توجہ سمیٹی تھی۔ دوسری ان کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی جو ان کے رویے کی وجہ سے ہمیشہ بدظن رہی تھی۔ اب انہیں احساس ہو رہا تھا کہ اسے خود سے دور کر کے انہوں نے بہت زیادتی کر دی تھی۔ صرف ذہین بچے ہی ہماری توجہ کے مستحق نہیں ہوتے بلکہ وہ بچے جو قابلیت میں کچھ پیچھے رہ جاتے ہیں وہ بھی ہماری توجہ کے استحقاق دار ہوتے ہیں۔

ثانیہ اپنی ذہانت کے ساتھ ساتھ محنت کی وجہ سے یہاں تک پہنچی تھی۔ اگر وہ اقدس کو بھی محنت کا سبق دیتے اور اسے ڈی گریڈ کرنے کے بجائے اس کی قابلیت کو سراہتے تو وہ آج یوں تعلیم ادھوری چھوڑے نہ بیٹھی ہوتی۔ لیکن آج وہ کسی قدر مطمئن تھے کیونکہ اس کا ہاتھ انہوں نے ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں دیا تھا جس کے بارے میں یقین تھا کہ اس کے سبک چلتے ہوئے ان کی یہ بیٹی زندگی میں محنت سے آگے بڑھنا سیکھ لے گی۔



لان کے قدرے تاریک گوشے میں وہ الگ تھلک کی بیٹھی نظر آ گئی تھی۔ یہ پہلی بار تھی کہ وہ یوں اکیلی بیٹھی تھی ورنہ وہ تو دوستوں کے جھرمٹ میں اپنے خوشگوار مڑوے کے ساتھ ہر تقریب کو انجوائے کرتی تھی۔ سفید رنگ کی لمبی فراک اس نے پن رکھی تھی۔ ساتھ ہم رنگ تنک پاجامہ تھا۔ سفید ہی دوپٹہ ایک کندھے پر ڈال رکھا تھا۔ فراک اور دوپٹے پر سلور رنگ کا خوب صورت کام تھا۔ لمبے چمک دار بال پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ اپنی دودھیار نکت کے باعث سفید رنگ کے جوڑے میں وہ کوئی حوری معلوم ہوتی تھی۔ یا پھر موم کی نازک سی گریبا جس کو ہاتھ لگانے پر اس کے میلے ہو جانے کا خطرہ ہو۔

کچھ دیر اس کو خاموشی سے دیکھتے رہنے کے بعد وہ اس کی طرف قدم بڑھانے لگی۔ آج بھی انہیں وہ دن یاد تھا جب وہ پہلی بار کالج کی لائبریری میں انہیں ڈھونڈتی ہوئی آئی تھی۔

”آپ جنید ہیں، نور تھ ایئر کے ٹاپر؟“ اپنی کتاب پر سے سر اٹھا کر انہوں نے اس پر اعتمادی لڑکی کو دیکھا تھا۔ ان کے سر ہلانے پر وہ بلا جھجک سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

”میں فریال سران ہوں، فرسٹ ایئر کی اسٹوڈنٹ۔ ایک ٹاپک سمجھ میں نہیں آ رہا۔ سمجھا دیں پلیز۔“ اور یوں وہ اکثر ان سے کوئی نہ کوئی ٹاپک سمجھنے کے لیے آنے لگی تھی۔

بلاشبہ وہ بے حد خوب صورت تھی۔ لیکن اس کا کسی کے ساتھ کبھی کوئی افینو نہیں رہا تھا۔ وہ سب کو جد میں رکھنا جانتی تھی۔ یہ اس مغرور لڑکی کی وہ خوبی تھی جس نے انہیں اس کا مزید ایسہ بنایا تھا اور یہ ہی وجہ تھی کہ جب اس نے اپنے لیے ان کی محبت محسوس کی تو وہ ان سے کھڑے نہ ہوئی تھی۔ اپنی مخدو ملی انگلیاں آپس میں پھنسائے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھی وہ انہماک سے سامنے دیکھ رہی تھی۔ آج میک اپ کے نام پر اس نے

ہلکی سی پنک لپ اسٹک اور آنکھوں میں کاجل لگا رکھا تھا۔ اس کے باوجود اس کے چہرے کے دلکش نقوش سامنے والے کو مبہوت کر دینے کے لیے کافی تھے۔ اس کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے وہ کھارے۔ وہ چونک کر ان کی طرف متوجہ ہوئی۔

”کسی ہو؟“ سامنے دیکھتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔ وہ ڈاکٹر چند کو دیکھ کر حیران تھی۔ ”ٹھیک ہوں۔“ ”لگ تو نہیں رہیں۔“ کچھ ہے فریال جو بدل گیا ہے۔ ”اب کی بار انہوں نے اس کی اداس آنکھوں میں جھانکا تھا۔ ان کی گہری آنکھیں اسے اپنے اندر تک اترتی محسوس ہوئی تھیں۔

”آپ یہاں کیسے۔ ثانیہ نے بلایا ہے؟“ فریال نے نظریں چڑائیں۔ وہ پھر سے سامنے دیکھنے لگی تھی۔ ”ہوں۔۔۔ ثانیہ نے بھی اور حماد نے بھی۔ ایک سیسی نار میں اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ میرے دوست سے کافی دوستی ہے اس کی۔ ہم دونوں کو ہی انوائٹ کر لیا۔“ کچھ بل خاموشی سے گزر گئے، پھر انہوں نے ہی بات کا آغاز کیا۔

”میرے سوال کا جواب نہیں دیا تمہارے۔“ فریال نے ایک گہرا سانس لیا۔ ”کچھ سوالوں کے جواب بہت مشکل ہوتے ہیں اور آپ تو مجھے جاننے کا دعوہ کرتے ہیں نا۔ بتائیں اس تبدیلی کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔“

”کوئی ایسی بات ہے جو تمہارے ذہن سے ڈرتی ہو۔“ فریال اپنی جگہ سے ہل نہیں سکی تھی۔ اس ٹھنڈ میں اسے اپنے ہاتھ مزید سرد ہوتے محسوس ہوئے۔ ”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ اس نے تردید کرنا ضروری سمجھا۔

”وہ بات کیا تھی جو اس دن بھی تم چھپا گئی تھیں۔ میں نے۔۔۔“

”مجھے کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں اس دن موقع نہیں ملا، لیکن آج بتا سکتی ہوں۔“ ان کی بات کا نتیجہ، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی وہ انہیں پہلے والی فریال لگتی تھی۔ بے خوف اور نڈر۔ سامنے

والے کے جذبات کی پروا نہ کرنے والی۔ ”روحان بیور کو پسند کرنے لگی تھی۔ شادی کرنا چاہتی تھی اس سے، مگر اس نے مجھے شکر ادا کیا۔ مجھ میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اسے۔ یہ ہی بات اس دن میں کہتے کہتے رہ گئی تھی۔“ بات کرتے ہوئے وہ دوسری طرف دیکھنے لگی تھی۔ وہ دھیان رنگت میں سرخی گھل گئی۔ لب کا نتیجہ وہ ان کے بولنے کی منتظر تھی۔ مگر وہ خاموشی سے اٹھ گئے۔

وہ چونک کر مڑی تھی۔ دور جاتے وہ صاف نظر آرہے تھے۔ جانے روئشیاں بجھنا شروع ہو گئی تھیں یا اسے ہی آس پاس تاریکی بڑھتی محسوس ہو رہی تھی۔ آج وہ اس کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل گئے تھے۔



”مسز حماد خاصی جلدی میں لگ رہی ہیں۔“ اس آواز پر وہ بے اختیار مڑی تھی۔ ڈاکٹر حماد اپنی گاڑی سے نیک لگائے پارکنگ ایریا میں کھڑے تھے۔ ”آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟“ ثانیہ حیران سی ان کے قریب آئی۔ ”آپ کا انتظار۔“

”اچھا اس لیے رات کو آپ مجھے جلدی آنے کا کہہ رہے تھے کہ صبح کچھ خاص ہونا ہے اسپتال میں۔“ ان کے سنجیدہ چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”کیا ہمارا ملنا خاص نہیں ہے۔“

اپنی مسکراہٹ چھپاتے ہوئے ثانیہ نے خالی پارکنگ کا جائزہ لیا۔ ”ہم تو روزی ملتے ہیں۔“ انہوں نے گہرا سانس لیا۔ ”ہوں۔۔۔ دور دور سے، وارڈ میں سب کے درمیان۔ آج میرے دل نے کہا کہ اس خوب صورت صبح کا آغاز اپنی بیوی کے خوب صورت چہرے کو دیکھ کر کیا جائے۔“ ثانیہ نے خوش گوار احساس میں گھر کر ان کے سنجیدہ چہرے پر پھیلی بھرپور مسکراہٹ کو دیکھا۔

”اتنے کنبوس کیوں ہیں آپ۔“ ”کنبوس۔۔۔ مگر میں نے تو ابھی تک تمہیں کوئی شاپنگ نہیں کروائی۔ اس کا فیصلہ کیسے کر لیا تم نے۔“

ان کے لمبے میں حیرت در آئی۔
 ”مسکرانے کے معاملے میں تو خاصے سنجوس
 ہیں۔“ دھیمی مسکراہٹ ثانیہ کے لبوں پر پھیلی۔
 ”آج کل تو بہت خوش ہوں اس لیے میرے خیال
 میں فیاضی سے مسکرا بھی رہا ہوں۔ قمر تو یا قاعدہ مذاق
 اڑاتا ہے میری خوش مزاجی کا نشانہ کیا تم نے؟“

☆☆☆

”جی۔ میں تو کر کے آئی ہوں۔ آپ نے نہیں
 کیا۔“ ثانیہ کو خیال آیا۔
 ”مگر نہ کیا ہوتا تو کرتیں؟“
 ان کے سوال پر ثانیہ شرارت سے مسکرائی۔
 ”بالکل، فوراً“ کہنے لے جاتی آپ کو۔ دیکھیں، کتنا
 خیال ہے مجھے آپ کا۔“
 ”ہوں“ وہ تو میں دیکھ ہی رہا ہوں۔ ویسے پراٹھے
 بنانے آتے ہیں۔“
 ”آلہ۔ پراٹھے، نہیں تو مجھے تو کچھ بھی بتانا نہیں
 آتا۔“ ثانیہ کے جھج کر کہنے پر وہ ہنستے تھے۔
 ”آپ ہنستے بھی ہیں۔“
 ”جناب! ہم بھی انسان ہی ہیں۔“ انہوں نے اپنی
 ہنسی دبائی۔

”اور ہنسے کیوں تھے؟“
 بھی گوبر کو اپنی بھابھی کے ہاتھ کے بل دار پراٹھے
 کھانے کا شوق تھا۔ اسی کی شکل سوچ کر ہنس رہا ہوں،
 جب اسے معلوم ہو گا کہ اس کی فیورٹ بھابھی کو کچھ
 بنانا نہیں آتا۔“ ان کے مذاق اڑانے پر وہ چڑھ گئی۔
 ”ابھی دو مہینے ہیں شادی میں، سب سیکھ لوں گی۔
 ویسے بھی میری بہن بہت اچھی لک ہے اور بہنوں کی بھی
 توشیف ہیں کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔“
 ”طیث سی۔“ آج کا ڈنر ہم ساتھ کریں گے۔“ ثانیہ
 کو منہ کھولتے دیکھ کر انہوں نے اسے روکنے کے لیے
 ہاتھ اٹھائے۔

”تم منع نہیں کرو گی، کیونکہ میں آنٹی سے اجازت
 لے چکا ہوں۔ کسی اچھی سی جگہ پر اچھا سا ڈنر کروانا
 چاہتا ہوں۔ بہت سی باتیں کرنا اور سننا چاہتا ہوں۔“
 مسکرا کر سر ہلاتی وہ ان کے دل کو شاد کر گئی۔

”تم منع نہیں کرو گی، کیونکہ میں آنٹی سے اجازت
 لے چکا ہوں۔ کسی اچھی سی جگہ پر اچھا سا ڈنر کروانا
 چاہتا ہوں۔ بہت سی باتیں کرنا اور سننا چاہتا ہوں۔“
 مسکرا کر سر ہلاتی وہ ان کے دل کو شاد کر گئی۔

”میں“ پاپا کو لڑکا پسند ہے تو کر لینے دیں مجھے ان کی

”کچھ کہو گی نہیں۔“ اس کی کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے انہوں نے اسے بولنے پر اکسایا۔

”آپسے آپ کب سے جانتے تھے یہ سب۔“ ہوا کے دوش پر اڑتے بالوں کو دائیں ہاتھ سے پیچھے ہٹاتی وہ بمشکل بول پائی۔

انہوں نے گہرا سانس لیتے ہوئے سورج کی مدد سے ہوتی شعاعوں کو دیکھا۔

”پہلے دن سے“ انکل نے ابو سے ذکر کیا تھا کہ تم میڈیکل کالج میں ایڈمیشن لے رہی ہو۔ پھر تم آئیں اور کچھ ہی دنوں میں مجھے معلوم ہو گیا کہ تم میرے کالج میں آئی ہو۔ بعد میں تم خود مجھ سے پوچھنے کے لیے آئیں۔ میں جب بھاول پور سے آیا تب میں نے ابو کو منع کیا تھا کہ انکل کو نہ بتائیں، کیونکہ وقت سے پہلے میں اس رشتے کو حوالہ بنا کر تم سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔ پھر پھر شروع سے ہمیں پسند نہیں کرتی تھیں، اسی لیے مجھے یقین تھا کہ ان کی بیٹی بھی ہرگز اس رشتے کو اتنی جلدی قبول نہیں کپائے گی، لیکن تقدیر نے ہمیں پہلے ہی ملوا دیا۔“ ایک نظر اس کی خاموش منتظری آنکھوں پر ڈال کر وہ پھر سے گویا ہوئے۔

”تم نے جس رشتے کی ہابی اب بھری ہے۔ میرے لیے یہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ دادا جی نے جوڑا تھا یہ رشتہ بہت محبت کرتے تھے وہ مجھ سے، تم سے۔“ زیر لب مسکراتے جیسے کچھ یاد آیا تھا انہیں۔

”جب انہوں نے ہمارا رشتہ جوڑا تو پھر پھر خوش نہیں تھیں، بس خاموش ہو گئیں۔“ آنا جانا انہوں نے پہلے سے بھی کم کر دیا تھا۔ پھر تم لوگ سعودی عرب چلے گئے۔ میں میٹرک میں تھا اس وقت، دادا جی کے سب سے زیادہ قریب تھا۔ انہوں نے کبھی مجھے تمہیں بھلانے نہیں دیا۔ اس نوعمری میں تمہارا احساس میرے اندر بس گیا تھا اور یہ سب ان ہی کی وجہ سے ہوا تھا۔ ان کی شدید خواہش تھی اپنے پوتے اور نواسی کو اکٹھے دیکھنے کی۔ تم لوگوں کی واپسی سے پہلے ہی وہ اس دنیا سے چلے گئے، مگر جاتے جاتے مجھے پابند کر گئے کہ صرف فریال سراج ہی میری زندگی کی سہا تھی بنے گی۔

مرضی سے شادی۔ آپ فریہ کے لیے کوئی شان دار پروپوزل ڈھونڈ لیجیے گا جو آپ کے معیار پر پورا اترتا ہو۔“ سنجیدگی سے کہتی وہ چلی گئی۔

”ہو کیا گیا ہے اس کو؟“ ممی نے اچھے سے فریہ کو دیکھا۔

”رہنے دیں ممی! امت اپنی انرجی ویسٹ کریں۔ ان کا داغ الٹ گیا ہے۔ عجیب و غریب حرکتیں کرنے لگی ہیں۔ کل تک معافیوں مانگتی پھر رہی تھیں اور آج اچانک سے ایک ان دیکھے لڑکے سے شادی کی ہابی بھری۔ چھوڑ دیں ان کو ان کے حال پر۔“ تیزی سے ٹیسٹ کرتی فریہ نے تبصرہ کرنے والے انداز میں کہا۔ اپنے کمرے کا دروازہ کھولتی فریال اس کی بات سن چکی تھی۔ گہرا سانس لیتی اندر چلی گئی۔

اس کے بعد ممی نے خاموشی اختیار کر لی تھی اور وہ جانتی تھی کہ بیباکی وجہ سے ہی سہی، ممی ماموں کی فیملی کو اچھے سے آئینہ کر لیں گی، آخر ان کی بیٹی کا مستقبل بھی تو اس گھر سے جڑنے والا تھا۔ وہ اس رشتے کے لیے مان تو گئی تھی، مگر ایک بے کلی سی وجود پر چھا گئی تھی۔ ڈیوٹی نام ختم ہونے سے دس منٹ پہلے ہی وہ باہر نکل آئی۔ موبائل بیگ میں ڈالتی وہ آگے بڑھ رہی تھی۔ سامنے کا منظر اسے اپنی نظموں کا دھوکا لگا۔ بڑے بڑے قدم اٹھاتے وہ ڈاکٹر جنید ہی تھے جو اس کی طرف آرہے تھے۔ وہ ٹھنک کر اپنی جگہ ٹھہر گئی۔

”آپسے؟“ فریال اتنی بے یقین تھی کہ قریب آنے پر ان کے سلام کا جواب بھی نہ دے سکی۔

”آج ایک اور حیثیت سے تم سے ملنے آیا ہوں۔“ دونوں ہاتھ پینٹ کی جیب میں ڈالے وہ اطمینان سے کپڑے تھے فریال خاموشی سے ان کے بولنے کی منتظر تھی۔

”انکل چاہتے تھے میں تم سے مل لوں۔ تمہارے غمی ماموں کا بیٹا ہوں، جدید غمی۔“ ایک دھچکا تھا جو ان کے الفاظ نے فریال کو پہنچایا تھا۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کئے تو کیا کئے۔ بس ہکا بکا سی انہیں دیکھ گئی۔

اسی لیے میں کسی قابل بن کر تمہارے سامنے آنا چاہتا تھا۔“

سبحیدگی سے انہیں دیکھتی فریال ان کے خاموش ہوتے ہی بولی۔ ”ایک ان دیکھی لڑکی سے محبت کر لی آپ نے۔ کیسے مان لوں میں۔ اگر میں ایسی نہ ہوتی ہمیں ہوں تو۔“

”میں نے تمہاری صورت سے محبت نہیں کی فریال! تمہاری محبت میرے اندر گھولی گئی ہے، اسی لیے تمہاری خامیوں سمیت تمہیں چاہا ہے۔“

ڈاکٹر جنید نے گویا اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھا تھا۔ ان کی گہری آنکھوں سے نظریں چراتی فریال کا دل بے ترتیبی سے دھڑکا تھا۔

”اس دن تم نے کہا، تم روحان کو پسند کرتی ہو۔ اگر اس سے محبت کرتی ناں تو میری ناراضی کی فکر نہ ہوتی تھیں۔ میری محبت اور میرے رشتے تو میرے لیے سے تم ہمیشہ جڑتی رہیں، لیکن مجھے تاپسند بھی نہیں کیا اور اب تو لگتا ہے کچھ کچھ محبت بھی کرنے لگی ہو مجھ سے۔“

فریال نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ بھرپور انداز میں مسکراتے ہوئے اپنے اپنے لگے۔

”میں تمہارے اندر اڑا ہوں فریال۔ سب سے زیادہ جانتا ہوں تمہیں۔“ شوخی سے سرگوشی کرتے وہ اسے نظریں جھکانے پر مجبور کر گئے تھے۔

”آج بھی اگر میں ویسی ہی مغرور سی فریال ہوتی، پھر کیا کر لیتے آپ۔“ اپنے چہرے پر پھیلی سرخی کو زائل کرنے کے لیے وہ بولی۔

سر پر ہاتھ پھیرتے وہ بڑے دلکش انداز میں بنے۔

”آخر سائیکالرسٹ کس دن کے لیے بنا ہوں۔ کھوڑا بہت تو تمہیں سیٹ کر ہی لیتا۔“

”جی نہیں، ایسے نہیں ہوتا۔“ فریال نے اپنی ہنسی چھپائی۔

”مجھے یقین تھا فریال، اپنی محبت پر اور اپنے رب کی مہربانی پر بھی کہ تم پلٹ کر میرے پاس ہی آؤ گی۔“

محبت بھری سرشاری سے کہتے وہ اس کے دل کے تار ہلا گئے۔ واقعی یہ رب کی مہربانی ہی تو تھی کہ اتنی

کو تائیوں کے باوجود وہ نوازی گئی تھی۔ ایسا شخص اس کا مقدر بنا دیا گیا تھا جس کے دل میں اس کے لیے بے لوث محبت تھی۔ وہ پر غم آنکھوں سے مسکرا دی۔



ساری خوشی اور جوش نکاح کے بعد کچھ ہی دنوں میں جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔

نکاح کی تقریب میں روحان نے اسے ایک بار بھی مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے ساتھ بیٹھا وہ سارے وقت ڈاکٹر حماد اور ان کے دوست قمر سے باتیں کرتا رہا تھا۔ اس کے بعد بھی وہ کئی دن تک منتظر رہی کہ شاید روحان اسے کل کرے یا اسٹی ٹیوٹ سے غیر حاضری کے متعلق ہی کچھ پوچھ لے اور کھٹک تو وہ تب گئی تھی جب ایک دن یلیہ اسے زبردستی اپنے ساتھ گھر لے گئی۔ وہ یلیہ کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ روحان کو لاؤنج میں آتے دیکھ کر یلیہ شرارت سے بولی تھی۔

”دیکھو روحان! آج کون آیا ہے اس گھر کی رونق بڑھانے۔ تم بھی بیٹھو ہمارے ساتھ۔“

”سوری ٹائم نہیں ہے اسامہ کی کالز آرہی ہیں مجھے جانا ہے۔“

اپنے کف لنکس بند کرتا وہ چلا گیا تھا۔ اقدس کو مخاطب کرنا بھی اس نے ضروری نہیں سمجھا تھا اور عجیب تو یلیہ کو بھی لگا تھا۔ وہ روحان کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھی، چاہے کتنی ہی غلط میں کیوں نہ ہوتا، یوں سامنے والے کو نظر انداز نہیں کرتا تھا۔ اقدس کے سامنے شرمندہ ہوتی وہ روحان کی مصروفیت کا ذکر کرنے لگ گئی تھی۔

روحان اس رشتے سے خوش نہیں تھا، یہ خیال اقدس کے ذہن میں کھب گیا تھا۔ اگلے ہی دن روحان کسی کام سے گھر آیا تھا۔ لان میں کھڑی اقدس کو وہ صاف نظر انداز کر گیا تھا۔ حالانکہ وہ گیٹ سے اندر آتے ہوئے اس پر ایک سنجیدہ سی نظر ڈال چکا تھا۔ اقدس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا رویہ اس قدر

”بینیس۔“ میری دو سری طرف پڑی کریسوں کی طرف اس نے قدم بڑھائے، مگر وہ ہاتھ سے اشارہ کر اس کی طرف آیا۔

”میں بیٹھ جائیں۔“ اس کو قریب آنا دیکھ کر اقدس جڑبڑہوتی بیٹھ گئی۔ اب تو رہ کر مہر کے ساتھ ساتھ اپنے اوپر بھی غصہ آ رہا تھا کہ کیوں بلا سونے سمجھے منہ اٹھائے اس سے بات کرنے کی چل پڑی۔

روحان اس کے سامنے ہی بیٹھ گیا۔ اقدس کو اپنے باقی ماندہ حواس بھی سلب ہوتے محسوس ہوئے۔ اس کی جیکٹ سے اٹھتی اس کے گلون کی ممک نے اقدس کے دل کی دھڑکنوں کو بڑھایا تھا۔

”کیا بات کرنی ہے۔“ اس کو خاموش دیکھ کر روحان نے ہی پہل کی۔

”آں۔ پھر کبھی کر لیں گے۔ آپ مصروف ہوں گے۔“ جلدی سے کہتی ہوئی وہ اٹھی تھی۔

”اقدس واپس بینیس۔“ روحان کا سختی سے کہنا باتیں بھی اسے یاد آ گئیں۔ وہ خفا خفا ہی بیٹھ گئی۔

”آپ مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتے تھے تو نہ کرتے۔ جس سے مرضی کر لیتے، لیکن اب اس طرح کے رویے کا مطلب؟ آپ میری انسٹلٹ نہیں کر سکتے۔“

”میں نے کوئی انسٹلٹ نہیں کی۔“

”مجھے یوں اگنور کرنا انسٹلٹ نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ شادی نہیں کرنی تھی تو نہ کرتے۔“ وہ مزید تپ گئی۔

”یہ بار بار ایک ہی بات کا مطلب؟ مثلاً، ”کون ہے جس سے شادی کر لیتا۔“

”کوئی تو ہوگی۔“

”ہوں۔۔۔ ہے تو سہی ایک لڑکی۔ میری اسٹوڈنٹ ہے۔“

”مجھ سے بہت کرتی ہے۔ سوچ رہا ہوں اگر تم اجازت دو تو اس سے دو سری کر لوں۔“ اس کے

سنجیدگی سے کہنے پر اقدس کا خون کھول اٹھا۔

”آپ۔۔۔ میں آپ کی بیوی ہوں اور آپ مجھ سے

اجنبی اور عجیب کیوں ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی وہ فون پر مہر سے یہ ہی ڈسکس کر رہی تھی۔ جب وہ تپ گئی۔

”تم خود کیوں نہیں بات کر لیتیں ان سے۔ پوچھو آخر مسئلہ کیا ہے۔ بیوی ہو تم ان کی۔“ مہر نے اسے اچھا خاصا جوش دلا دیا تھا۔ موبائل بند کرتی وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔

”ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے مہر۔ سمجھتے کیا ہیں آخر اپنے آپ کو اور اب میں ان کی بیوی ہوں اسٹوڈنٹ نہیں ہوں کہ انہیں کچھ کہہ نہ سکوں۔“

بلک کلر کالانگ کوٹ کپڑوں کے اوپر پن کر گردن کے گرد اسکارف لپیٹتی وہ اسٹی ٹیوٹ جانے کے ارادے سے کمرے سے نکلی تھی۔ اور سیدھا روحان کے آفس آئی تھی۔ آفس کو خالی پا کر اس نے گھڑی دیکھی۔ آفس کھلا چھوڑ کر وہ پتا نہیں کہاں غائب تھا۔

شاید لاک کرنا بھول گیا ہو۔ یہ سب سوچتے اقدس نے ایک نظر پورے آفس پر ڈالی۔

ہر چیز اپنی جگہ پر ویسے ہی موجود تھی۔ وہ نیبل کی طرف آئی۔ لیپ ٹاپ بند رہا تھا۔ ساتھ ہی کچھ پیپر ویٹس اور میگزین پڑا تھا۔ وہ میگزین کھول کر صفحے الٹ پلٹ کرنے لگی۔ روحان کے آر نیکل ”فٹو کارنز“

والے صفحے پر اس کا ہاتھ رک گیا۔ اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ روحان تیمور جیسے سامنے ہی تھا۔

پورے انہماک سے اس کی تصویر کو تنقیدی نگاہوں سے دیکھتی تھی کہ کہاں بیٹھی ہے۔ چونکی تو تب جب کسی نے کھنکھارے ہوئے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

سامنے کھڑے روحان کو دیکھ کر وہ گڑبڑا کر اس کی کرسی سے اٹھی تھی۔

”وہ۔۔۔ میں آپ کا انتظار کر رہی تھی۔“ نظریں جھکائے وہ بمشکل بول پائی۔ اس کی سنجیدہ نظروں کو وہ اپنے اوپر محسوس کر رہی تھی۔

”خیریت۔“ ہاتھ میں پکڑے صفحے پیپر ویٹ کے نیچے رکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”بات کرنی تھی آپ سے۔“ وہ ابھی تک کھڑی تھی۔

ایک دم چلے جانا بیمار پڑ جانا۔ سچ پوچھو تو تمہارا ہرٹ ہونا مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔ تب احساس ہوا کہ تم میرے لیے خاص ہو اور تمہیں فریال کے لیے میری محبت نظر آگئی، اپنے لیے میری محبت محسوس نہیں ہوئی۔“

”آپ نے بھی تو نہیں کہا کچھ۔“ وہ دھیرے سے بولی۔ اپنی اسٹوڈنٹ سے رومانس کرتا اور چھچھوڑے ڈانٹا کر بولتا اچھا لگتا اور اتنی گرینڈ پائی جو دی تمہارے اعزاز میں، صرف تمہیں خوش کرنے کے لیے۔“

”اپنی پائی میرے نام مت لگائیں۔“ مسکراہٹ دہاتی وہ مصنوعی خفگی سے بولی ورنہ دل کی کلی تو اس کے اظہار سے ہی کھل اٹھی تھی۔

”بیوی کو خوش کرنا بہت ہی مشکل ہے۔“ جس نے بھی کہا ہے ٹھیک ہی کہا ہے ویسے تمہیں خوش کرنے کے لیے میرے پاس کچھ اور بھی ہے۔“ مسکرا کر کہتے ہوئے اس نے فریال دروازے سے بلیک کلر کارنگ کیس نکالا۔ اس میں سے ڈائمنڈ کی خوب صورت انگوٹھی نکالتا ہوا وہ اقدس کو حیران کر گیا۔

”اجازت!“ خوب صورت لمبے میں پوچھتے ہوئے روحان نے اپنا ہاتھ اس کے سامنے پھیلایا۔

جھجک کر ہاتھ آگے بڑھاتے اقدس کے لبوں پر دھیمی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کا ہاتھ نرمی سے تمام کر ڈائمنڈ رنگ پہناتے ہوئے روحان کی بھوری آنکھوں میں اقدس کے لیے محبت اور اپنائیت تھی۔

”تھینکس فار کمنگ ان مائے لائف (میری زندگی میں آنے کا شکر ہے) محبت سے کہتے ہوئے وہ شرارت سے اس کی پونی ٹیل ہلا گیا۔ وہ بس سرخ چہرے کے ساتھ مسکراتی رہی۔ وجہ صرف روحان کی محبت نہیں تھی۔ یہ وہ شخص تھا جس نے اسے اس احساس کمتری سے نکالا تھا جو بچپن سے اس کے ساتھ رہا تھا۔ روحان کا اسے اہمیت دینا اور یہ احساس دلانا کہ وہ بھی زندگی میں کچھ کر سکتی ہے، اس کی روح کو سرشار کر گیا تھا۔ ☆

ایسی باتیں کر رہے ہیں۔“ اس کے غصیلے انداز پر روحان نے اختیار نہیں پڑا تھا۔ وہ نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھتی رہی۔

”حد ہے“ ویسے ناراض تو میں تھا تم سے اور اپنی ناراضی جتانے کے لیے ہی تو ایسا رویہ روا رکھا۔“

”میں نے کیا کیا ہے۔“ اقدس حیران سی اسے دیکھ گئی۔

”پائی والی رات فریال تم سے اتنا کچھ کہہ گئی اور تم خاموش کھڑی سنتی رہیں۔ ویسے تو ہر ایک سے بحث کرنے کھڑی ہو جاتی ہو۔ بجائے کچھ کہنے کے تم نے یقین کر لیا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں اور خود سے یہ فرض کر کے غائب ہو گئیں۔ نہ مجھ سے بات کی نہ اسٹی ٹیوٹ آئیں بہت غصہ آیا تھا مجھے تم پر۔“

”آپ کو کیسے پتا چلا۔“

”میں دروازے کے پاس کھڑا تھا جب تم اندر آ رہی تھیں۔ تم بتاؤ کب تمہیں لگا کہ میں فریال میں انٹرسٹڈ ہوں میں تو سب سے ایسے ہی ملتا ہوں۔“

”مجھے تو ایسا ہی لگا اور وہ دوسری لڑکی کون ہے۔“

نام ہوتی اقدس کو ایک دم خیال آیا۔

”تم ہی ہو۔“ مزے سے کہتا وہ اس کے تیزی سے سرخ ہوتے چہرے کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

”جی نہیں میں کوئی محبت و جنت نہیں کرتی کسی سے۔“ تھوک نکلتے اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”میں تمہیں اتنا سادہ لگتا ہوں کہ ایک لڑکی مجھ سے محبت کرتی رہے۔“ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں چمک آجائے میری ہر بات کو اہمیت دے اور مجھے

اس کی محبت کی خبر ہی نہ ہو اور تو اور میری تصویر کو بھی سکتی رہے۔“ خوب صورت لمبے میں بولتا وہ اسے

کنفیو ز کر رہا تھا۔ نظریں جھکانے وہ اپنی گود میں رکھے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔

”پہلے مجھے لگا تم محض میری شخصیت سے متاثر ہو رہی ہو۔“ میرا تمہیں اہمیت دینا اچھا لگ رہا ہے۔

لیکن فریال کے آنے پر جس طرح تم نے ری ایکٹ کیا، میں شکاں نہ ہو گیا تھا اور پھر لمحہ کے آنے پر تمہارا

سحر

شہر زاد غیر معمولی حسن کی مالک نہیں تھی لیکن حالات کی تلخیوں نے اس کی شخصیت کو مضبوط بنا دیا تھا۔ اس کے اعتماد نے اس کی شخصیت کو دل نشی عطا کی تھی۔

ٹرین میں ایک عورت اور مرد سفر کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔ عورت اور مرد کو احساس تھا کہ موت ان کے تعاقب میں ہے ان کے تمام گھر والوں کو مار دیا گیا تھا۔ گاڑی ایک اسٹیشن پر کی تو ماں نے فیصلہ کیا کہ بچے کو کسی جگہ چھوڑ دے، تاکہ اس کی جان بچ سکے۔ اس نے بچے کو ایک بیچ کے نیچے رکھ دیا اور خود ٹرین کی چڑی پار کرتے ہوئے حادثہ کا شکار ہو گئی۔

میرپاؤس میں مختتم علی اور خاقان علی کا خاندان آباد ہے۔ مختتم علی خان ایم این اے ہیں، ان کے تین بیٹے دہاج، برہان اور شاہ میر ہیں۔ بیٹی ایک ہی ہے جس کا نام در شہوار ہے۔ خاقان علی نے دو شادیاں کی ہیں، پہلی بیوی شارقہ بیگم سے دو بیٹیاں انابیہ اور طوبی ہیں۔ بیٹے کے لیے انہوں نے ندرت بیگم سے دوسری شادی کی، لیکن ان سے کوئی اولاد نہ ہو سکی۔



خاقان علی کی بہن فوزیہ اور ان کے شوہر ایک فضائی حادثے میں چل بسے تو، تو ان کے دونوں بچے نمبرہ اور ارسل کی پرورش ندرت بیگم نے کی ہے۔ نمبرہ کو لگائی بھائی کی عادت ہے۔

ان کے گھر کے سامنے جنگل ہے جہاں طوطی اور در شموار امتحان میں کامیابی کے لیے برگد کے درخت پر دھاگا باندھنے رات کو جاتی ہیں اور شاہ میرا نہیں پکڑ لیتا ہے۔ شاہ میر گھر والوں کے سامنے ان کا بھانڈا اچھوڑ دیتا ہے جس کی بنا پر ان کو گھر والوں سے بہت ڈانٹ پڑتی ہے۔

انابہ کا نکاح برہان سے ہو چکا ہے، لیکن برہان کا سر دروہ اسے افسردہ کرتا ہے۔ نینا بیگم فیشن انڈسٹری کی ایک معروف شخصیت تھیں۔ در شادیاں ناکام ہو چکی تھیں۔ آج کل وہ تیسرے شوہر سے جان چھڑانے کے چکر میں تھیں۔ معروف بیوروکریٹ سیف الرحمن کے ساتھ ان کا نام لیا جا رہا تھا۔

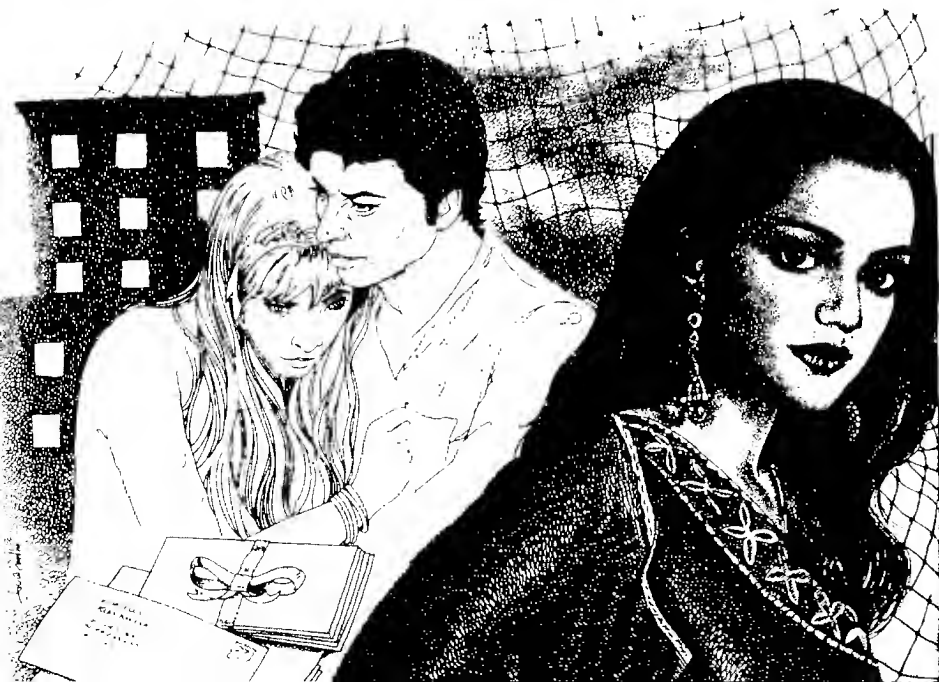
پہلے شوہر سے ان کی دو بیٹیاں تھیں، بڑی شہر زاد نے اعلیٰ تعلیم کے لیے انہوں نے باہر بھیجا دیا تھا۔ رومیہ صہ چھوٹی تھی اور اس کی اپنی ماں سے بالکل نہیں بنتی تھی۔ ان کے آئے دن کے اسکیڈنل اس کے لیے مسئلہ بنتے تھے۔

اس نے خود کشی کی دھمکی دے کر شہر زاد کو پاکستان آنے پر مجبور کر دیا۔ شہر زاد کی آمد نینا بیگم کو شدید ناگوار گزری۔ شہر زاد پاکستان آئی تو ایک رانی فون کال نے اسے ڈسٹرب کر دیا۔ طوطی اور در شموار غلطی سے برابر والے گھر میں داخل ہو گئیں تو پتا چلا کہ جو گھر پچھلے ایک ماہ سے خالی پڑا تھا۔ وہاں محمد ہادی آچکا ہے۔ محمد ہادی فارسٹ آفیسر ہے۔ تعلق ایک امیر اور اعلیٰ تعلیم یافتہ گھرانے سے ہے۔ وہ اپنے دوست سعد کو بھی اپنے جنگلے میں لے آیا ہے۔

محمد شمس علی کا بیٹا ہاج شادی شدہ ہے، لیکن گھر کی ملازمہ صندل پر بری نظر رکھتا ہے۔ رومیہ صہ نے گھر میں شدید توڑ پھوڑ کی اور نینا بیگم سے شدید نفرت کا اظہار کیا۔ شہر زاد اسے ماہر نفسیات کو دکھانے کا مشورہ دیتی ہے۔

در شموار اور طوطی محمد ہادی کے جنگلے میں جاتی ہیں اور درخت پر چڑھ کر خوبائیاں توڑتی ہیں۔ محمد ہادی سختی سے پیش آتا ہے تو در شموار اسے دھمکی دیتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان ٹھن جاتی ہے۔

یہ جان کر کہ منابل ہادی کی بہن ہے۔ در شموار کا رویہ اس سے بدل جاتا ہے۔ منابل اور برہان کی بے تکلفی سے اسے



انا بیہ کے مستقبل کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ وقار درانی، شہزاد کے پاس سمجھوتے کے لیے آتے ہیں۔ ہارون رضا، سمیٹی کے فون سے مشغول ہو کر یٹا بیگم کو طلاق دے دیتے ہیں۔ شجاع غنی کیس واپس لے لیتا ہے۔ اس بات پر ہادی اور شہزاد بہت چراغ پا ہوتے ہیں مگر کچھ کر نہیں پاتے۔ رومیہ صہ اور وہ ایک گھر میں جا کر چھپتے ہیں جہاں رومیہ صہ اسے اپنے حالات و واقعات سے آگاہ کرتی ہے۔ دونوں کو نیا رشتہ قریب لے آتا ہے۔ یہ جان کر کہ شاہ میر طوبی کو پسند کرتا ہے تاجدار بیگم کا غصہ گھر میں سب پر اترتا ہے۔ صندل کی بہن سندس کو طوبی کی پرانی کتابوں سے اپنی بہن کا آخری خط ملتا ہے اور وہ حقیقت جان لیتی ہے۔

مونیکا، ڈاکٹر لکھل کو مارکیٹ کی آمد سے آگاہ کرتی ہے۔ وہ اسے لاہور آنے کا مشورہ دیتا ہے۔ صندل کے گھر والے اس کی موت کی وجہ جان کر راتوں رات حویلی چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ رومیہ صہ کو اسل بحفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے۔ شجاع غنی میر حاکم کی دھمکیوں کی وجہ سے کیس واپس لے لیتا ہے۔ شہزاد کو یہ جان کر صدمہ ہوتا ہے۔ ہادی کو بھی غصہ آتا ہے اور اسی وجہ سے اسے درسموار مزید بری لگتی ہے۔ انا بیہ، درسموار اور منال کی بے تکلف گفتگو سن کر صدمہ کا شکار ہو جاتی ہے اور درسموار اور برہان کے ساتھ بے رخی سے پیش آتی ہے نئے وہ دونوں بہت محسوس کرتے ہیں۔

مجد کے برابر میں گھر لینے پر مونیکا شدید غصے کا اظہار کرتی ہے۔ ہم زاد کو شہزاد اور ارتضیٰ کا ساتھ بہت برا لگتا ہے۔ صندل کے گھر والے، شہزاد کے چوکیدار کے رشتے دار ہیں اور اسی حوالے سے وہ شہزاد کے گھر ملازمت کے لیے پہنچ جاتے ہیں۔

دسویں قسط

میز پر رکھی سرد چائے خشک ہونٹوں کا انتظار کرتی اب بد مزہ ہو چکی تھی۔۔۔ یٹا بیگم کے چہرے پر بی زاری، کوفت اور جھنجھلاہٹ کا تاثر بہت گہرا تھا انہیں پتا چل گیا تھا کہ شہزاد نے بہادر علی اور رشیدہ کے خاندان کو گھر میں نوکری دے دی ہے اور اسی وجہ سے وہ تہی ہوئی تھیں۔۔۔ شہزاد اپنے ازلی بر سکون انداز میں کھڑی ان کے صبر کا امتحان لے رہی تھی۔ ”گھر میں سروس کا مینا بازار لگاتا ہے شیری“ وہ بے زاری سے گویا ہوئیں۔ ”مام، کیا فرق پڑتا ہے۔۔۔“ وہ مسکرا کر مزید گویا ہوئی۔ ”ان لوگوں کو ضرورت ہے۔۔۔“ ”میرا گھر ہے یہ کوئی رفاهی ادارہ نہیں۔۔۔“ وہ جل کر بولیں۔ ”ویسے آپ کو اس پوائنٹ پر بھی کچھ سوچنا چاہیے، آپ انور ڈر کر سکتی ہیں، ہو سکے تو بے سہارا اور غریب لوگوں کے لیے ایسا ادارہ ضرور بنائیں۔“ شہزاد نے معصومیت سے مشورہ دیا۔ ”شٹ اپ شیری۔۔۔“ وہ جھنجھلا گئیں۔

”کول ڈاؤن مام، آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ یہ فیملی فیوچر میں ہمارے کتنے کام آنے والی ہے۔۔۔“ ”آخر ہیں یہ کون لوگ۔۔۔؟“ وہ چونک کر بولیں۔ ”قدرت کا اتمام۔۔۔“ اس کے معنی خیر انداز پر وہ چونکیں۔ ”مطلب۔۔۔؟؟؟“

”آپ مطلب وطلب چھوڑیں، اور ریلیکس رہیں۔“ ”دیکھو شیری! جو بات ہے صاف صاف بتاؤ۔۔۔“

”مام ایسا کچھ نہیں ہے، ضرورت مند لوگ ہیں، اور ان کی بیٹی کو آپ اپنے سیلون میں بھی لگا سکتی ہیں۔۔۔“

”پتا نہیں کیا کرتی پھر رہی ہوں۔۔۔۔۔“ وہ مطمئن نہیں تھیں۔

”ساری باتوں کو چھوڑیں، لگتا ہے بہت دنوں سے آپ نے کوئی اچھا فیصلہ نہیں لیا، آج سنا بھی جائیں اور پلیز یوگا کی کلاسز بھی ریگولر لین شروع کریں۔۔۔“

”شہزادہ بیڑی ذہانت سے ان کی توجہ دوسری جانب مبذول کروا چکی تھی۔

”کیا اسکن بہت ڈل لگ رہی ہے میری۔۔۔“ وہ فکر مند انداز میں ڈرینک کے شیشے کے سامنے جا کھڑی ہوئیں، شہزادہ کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

وہ جانتی تھی کہ اب بیٹنا بیگم کے اگلے کئی گھنٹے اپنی ڈیننگ پیننگ میں گزرے والے تھے، وہ اپنے معاملے میں حد درجہ حساس تھیں اور گھنٹوں آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود کو ہر زاویے سے دیکھتیں اور اس معاملے پر کوئی کمزور ہانز کرنے کو تیار نہیں ہوتی تھیں۔

”چھلے دنوں ٹینشن بھی تو بہت رہی ہے رومی کی۔۔۔“ انہوں نے اپنے چہرے کو ہاتھ سے چھوتے ہوئے خود کو تسلی دی، آنکھوں میں فکر مندی کا تاثر خاصا گہرا تھا۔

”رومی سے یاد آیا، کیا کر رہی ہے وہ۔۔۔؟“ شہزادہ بہن کے ذکر پر بے چین ہوئی۔

”سورہی ہے وہ۔۔۔۔۔“

”لیکن مجھے بات کرنی ہے اس سے۔۔۔“

”پلیز شیریں، صبح تک ڈسٹرب مت کرنا اسے، پتا نہیں کتنی راتوں کی جاگی ہوئی ہے وہ۔۔۔“ بیٹنا بیگم کے

لہجے سے چھلکتی ممتا اسے اچھی لگی۔

”ڈنٹ دوری، میں ایسا کچھ نہیں کرنے والی۔۔۔“ اس نے بھی ہتھیار ڈال دیے، ورنہ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ رومی کو اٹھا کر اس سے گزشتہ دنوں کے ایک ایک منٹ کی تفصیل پوچھ لے۔ یہ سارا عرصہ ان ماں بیٹی نے کانٹوں پر گزارا تھا۔

”اوکے مام، پھر ملاقات ہوتی ہے، مجھے ایک کس پر درک کرنا ہے۔“

”ریشماں سے کہو، ان نئے آنے والے سرفیس کو میرے پاس بھیجے۔ اب آہی گئے ہیں تو تھوڑا کام تو ذمے لگاؤں ان کے۔۔۔“ ان کے انداز میں اگرچہ بے زاری تھی لیکن شہزادہ کا کافی حد تک پرسکون ہو گئی۔

اس نے رشیدہ بوا کو اچھی طرح سے سمجھا دیا تھا کہ وہ کسی بھی قیمت پر بیٹنا بیگم کے سامنے میر جاگم کے خاندان کا نام نہ لے، کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس خاندان کا نام سننے ہی وہ دھک جائیں گی اور ان کو کبھی بھی ملازمت پر نہیں رکھیں گی۔ شہزادہ پر فائزنگ والے واقعے نے انہیں میر جاگم کی فیملی سے اچھا خاصا خوف زدہ کر دیا تھا، اگرچہ بعد میں شہزادہ نے بہت دفعہ ان کو سمجھانے کی کوشش کی، لیکن وہ ان کے متعلق بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی تھیں۔

☆☆☆

سرد موسم نے انگڑائی لی۔۔۔
اور ملکہ کو ہسار مری نے دیکھتے دیکھتے ہی برف کی چادر اوڑھ لی۔۔۔۔۔

برف کے سفید گالوں نے ہر چیز کو ڈھک دیا، ایسا لگتا تھا جیسے درختوں، عمارتوں اور سڑکوں پر کسی نے سفید ریگ پھیر دیا ہو اور برقی ٹھنڈی بجھ ہو گئی ہو۔ وہ لوگ اس موسم کی سختیوں کے کافی حد تک عادی ہو چکے تھے۔

طوبی گرما گرم سوپ کا پیالہ لیے پچن سے نکلی تو ٹھنڈ سے اس کا بُرا حال تھا۔ اگرچہ اس نے خود کو اچھی طرح سے لپیٹا ہوا تھا لیکن مری کی ہواؤں کو برداشت کرنا طوبی کے لیے خاصا دشوار کن مرحلہ ہوتا تھا اور وہ اس موسم میں زیادہ تر اپنے مبل میں ہی دبی رہتی اور بانی لوگ اس کا اچھا خاصا مذاق اڑاتے تھے۔

”آف سردی۔۔۔ لگتا ہے ہڈیوں میں ہی ہسٹری جا رہی ہے۔۔۔“

وہ شور مچاتے ہوئے اپنے کمرے میں داخل ہوئی، سوپ کا پیالہ سائڈ میز پر رکھا اور اپنے ہاتھوں کو رگڑ کر سردی کا احساس کم کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

”خدا کا خوف کرو بیا، ہیٹر تک نہیں چلایا تم نے۔۔۔“ طوبی نے بے زاری سے انا بیہ کی طرف دیکھا۔

انا بیہ بغیر کسی گرم شال اور سویٹر کے کسی بت کی طرح ساکت و جامد بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے نیم دراز تھی، اس کے بال کندھوں پر بکھرے ہوئے اور آنکھیں کسی غیر مرئی نقطے پر جمی ہوئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے اس پر کوئی اسم پھونک دیا ہو۔

”پتا نہیں کس مٹی کی بنی ہوئی ہو تم۔۔۔ ادھر میری جان نکلی جا رہی ہے ٹھنڈ سے۔۔۔“ اس نے فوراً ہیٹر آن کیا۔

ہیٹر آن کرنے کے بعد اب وہ کمرے کی کھڑکیوں کے پردے برابر کر رہی تھی، سرد ہوا جس اللہ جانے کہاں سے اندر کھسی آ رہی تھیں۔ طوبی نے اس وقت بھاری بھر کم قسم کے کوٹ کے ساتھ ادنیٰ مقدار ڈھک رکھا تھا لیکن اس کے باوجود ٹھنڈ کا احساس کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

”کیا ہوا ہے تمہیں، ایسے قسم قسم ہو کر کیوں بیٹھی ہو، اٹھو یہ شال اوڑھو۔۔۔“

طوبی نے ایک گرم شال واڈروب سے نکال کر اس کے سامنے پھینکی، انا بیہ نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ہیٹر جلنے سے کمرے کا ٹمپرچر تھوڑا بہتر ہو گیا تھا اور طوبی کو بھی اپنا سانس بحال ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ طوبی نے ڈرائی فروٹ کا جارا اٹھایا اور مبل میں گھس گئی۔۔۔

”محکمہ موسمیات نے پیش گوئی کی ہے۔ اگلا پورا ہفتہ مری میں برف باری ہوگی۔۔۔“ اس نے خاموش بیٹھی انا بیہ کی معلومات میں اضافہ کیا۔۔۔

”ہوں۔۔۔“ انا بیہ نے ہلکا سا ہکا را بھرا۔

”کیا گوگلے کا گڑ کھا کر بیٹھی ہو، کیا ہوا ہے تمہیں۔۔۔؟ طوبی اس کی مسلسل خاموشی سے اچھا خاصا چڑ گئی۔

”کچھ نہیں ہوا، اور تم نے عشاء کی نماز نہیں پڑھنی۔۔۔“ انا بیہ نے اسے بستر میں گھستے دیکھ کر سنجیدگی سے پوچھا۔

”یار بیا! ٹھنڈ بہت ہے۔۔۔“ وہ شرمندگی سے گویا ہوئی، بیا نے ایک سرد نگاہ اس پر ڈالی اور بیڈ سے اترتی۔

”بہت افسوس کی بات ہے۔۔۔“

”اچھا ناں پڑھتی ہوں۔۔۔“ اس نے سستی سے جہائی لیتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم کہاں جا رہی ہو اس وقت۔۔۔؟“

”وضو کرنے۔۔۔۔۔“ انا بیہ نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔
 ”اچھا یار! میں بھی بڑھ لوں۔“

طوبی نے بھی لمبل جھٹکے سے اتارا اور گرم پانی سے وضو کر کے واپس کمرے میں آئی تو انا بیہ نماز پڑھنے میں مصروف تھی، اس نے غور سے اپنی بہن کا چہرہ جانچا، اس پر محسوس کی جانے والی رنجیدگی کی ایک گہری سی۔
 ”طوبی کے دل کو کچھ ہوا۔۔۔۔۔“

”کیا بیا اور در شہوار کے درمیان کوئی جھگڑا ہوا ہے۔۔۔؟“ اس نے جائے نماز بچھاتے ہوئے دل ہی دل میں سوچا اور پھر سر جھٹک کر نماز کی طرف متوجہ ہو گئی، سلام پھیرتے ہوئے اس کی نظریں ایک دفعہ پھر بیا کے چہرے پر انگ لگیں۔ وہ اس وقت آنکھیں بند کیے دعا مانگنے میں مصروف تھی اور دعا کا دورانیہ طویل سے طویل تر ہوتا جا رہا تھا۔

”کیا ہوا ہے بیا کو، لگتا ہے در شہوار کو ہی کھگانا پڑے گا، پھر ہی اصل بات پتا چلے گی۔“ وہ کمرے سے نکلی اس کے قدم در شہوار کے کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے، سامنے سے آتا شاہ میر اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور طوبی کا دل بھی یکبارگی دھڑکا۔ دونوں کے تعلقات کچھ بہتر ہو چکے تھے۔ شاہ میر نے شرارت سے اسے سلیوٹ کیا، وہ گھبرا کر دائیں بائیں دیکھنے لگی، اس وقت میر ہاؤس کے سب ہی مکین اپنے اپنے کمروں میں دبکے بیٹھے تھے۔۔۔

”یہ تم کیا بھالو بی گھوم رہی ہو۔۔۔؟“ اس نے شرارتی انداز سے اس کے بھاری بھر کم وزنی کوٹ اور شال پر تبصرہ کیا۔

”کیا واقعی بھالو لگ رہی ہوں۔۔۔۔۔“ اس کے ایک دم پریشان ہونے پر وہ ہنسا۔

”یار! تم لڑکیاں کتنی کوشش ہوتی ہو اپنی لک کے بارے میں، بس کر دو، تم ہر حال میں ہی اچھی لگتی ہو مجھے۔۔۔“

”تو پھر کیا ضرورت ہے ایسی فضول باتیں کرنے کی، پہلے ہی سردی نے مت مار رکھی ہے۔۔۔“
 ”اگر زیادہ ٹھنڈ لگ رہی ہے تو یہ بھی پہن لو۔۔۔۔۔“ اس نے اپنے ہاتھوں سے لیدر کے دستانے اتار کر طوبی کی طرف بڑھائے۔

”ٹھینک یو۔۔۔۔۔ میرے پاس ہیں کمرے میں۔۔۔۔۔“ وہ اس کی گہری نظروں کے ارتکاز سے ہلکا سا گھبرائی۔
 ”لیکن ان میں میرے ہاتھوں کی حدت تو نہیں ہوگی۔۔۔۔۔“ شاہ میر کا ذمہ معنی انداز طوبی کے چپکے چھڑا گیا۔

”فضول باتیں کر دو الو جتنی مرضی۔۔۔۔۔“

”اچھا پھر سنجیدہ اور اخلاقی باتیں تم کر لو، میں خاموش ہو کر سن لیتا ہوں۔۔۔۔۔“ وہ شرارت سے مسکرایا۔
 ”یہ بتاؤ شاہ میر، کل بڑی امی نے کچھ کہا تو نہیں تھا جب۔۔۔۔۔؟“ وہ ہلکا سا جھج کر رک گئی، وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کا اشارہ اس واقعے کی طرف ہے جب تاج دار بیگم نے دونوں کو ایک ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑا تھا۔

”کیا۔۔۔؟ کس چیز کے بارے میں پوچھ رہی ہو۔۔۔۔۔“ وہ انجان بن کر مسکرایا اور دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر اسے گہری نظروں سے دیکھنے لگا، اس لڑکی کا لڑنا، جھگڑنا، رونا ہنسا، ہر چیز ہی اسے ایک خوبصورت

ادالگ تھی۔

”جیسے تمہیں تو پتا ہی نہیں ہے کہ میں کیا پوچھ رہی ہوں۔۔۔“ وہ اپنے ازلی مخصوص انداز میں چڑکربولی

”پوچھ رہی تھیں تمہارے اور طوبیٰ کے درمیان کیا چل رہا ہے۔۔۔“ وہ شوخ لہجے میں گویا ہوا، طوبیٰ نے بوکھلا کر اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”تو تم نے کیا کہا ان سے۔۔۔؟“ وہ پریشان ہوئی۔۔۔

”میں نے کہا پیاری ماں، ہم دونوں کے درمیان ”پیار“ کا سلسلہ چل رہا ہے۔۔۔۔۔“ اس کے لہجے میں شرارت تھی۔

”اور اس کے بعد انہوں نے لعن طعن کا سلسلہ شروع نہیں کیا۔۔۔؟“ طوبیٰ نے طنز کیا۔

”نہیں، انہوں نے تو کہا بیٹا، شاباش لگے رہو، ابھی نہ کبھی تو خشک پتھروں سے چشمہ پھوٹ ہی جائے گا۔۔۔“ وہ غیر سنجیدگی سے گویا ہوا۔

”تم سے تو بات کرتا ہی فضول ہے۔۔۔“ وہ جھنجھلا کر درشہوار کے کمرے کی طرف بڑھی، شاہ میر نے ایک دم جھٹکے سے اس کا بازو پکڑ لیا، وہ بوکھلا گئی۔

”یہ کیا کر رہے ہو شاہ میر، کوئی آجائے گا۔۔۔“ وہ گھبرائی۔۔۔

”میں کسی سے ڈرتا پھوڑی ہوں۔۔۔“ اس کی بوکھلاہٹ شاہ میر کو لطف دے رہی تھی۔

”پاگل ہو گئے ہو کیا۔۔۔“ طوبیٰ نے جھٹکے سے اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کی۔

اسی لمحے ارسل کے کمرے کا دروازہ کھلا اور اس نے باہر جھانکا، وہ سیانے کا منظر دیکھ چکا تھا۔ شاہ میر نے مسکرا کر طوبیٰ کا بازو چھوڑ دیا اسے ارسل کی طرف سے کوئی ٹینشن نہیں تھی کیونکہ وہ طوبیٰ کے بارے میں

اس کے جذبات سے اچھی طرح آگاہ تھا اور دونوں میں خاصی دوستی تھی۔

”ہاں، ابھی ارسل کیسے ہو، میں نے تو سنا تھا کہ کہیں گوشت نشین ہو گئے ہوتے۔۔۔“ شاہ میر نے اس کے غائب ہونے پر طنز کرتے ہوئے اسے آگے بڑھ کر گلے لگایا، وہ دونوں آپس میں کزن ہونے کے ساتھ

ساتھ بہت اچھے دوست بھی تھے۔

”گوشت نشین نہیں ہوا بلکہ بیٹھا، چلہ کاٹ رہا تھا طوبیٰ کی فرمائش پر۔۔۔“ ارسل بھی کون سا کسی سے کم تھا۔۔۔

”چلہ۔۔۔؟؟؟ کس چیز کا۔۔۔؟؟؟“ شاہ میر حیران ہوا۔

”تمہارے سدھرنے کا۔۔۔“ ارسل کے بے ساختہ انداز پر شاہ میر تھکے لگا کر ہنسا۔

”بہت خبیث ہوتے، میں ذرا چیخ کر کے آتا ہوں، پھر مال روڈ چلتے ہیں کافی مینے۔۔۔“

شاہ میر مسکراتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا، تو ارسل بھی اپنے جیکٹ اور مفلر اٹھانے کے لیے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

رات کا نہ جانے کون سا پہ تھا۔۔۔

تیز طوفانی بارش کے ساتھ آنے والی منہ زور ہواؤں کے زور سے شہر زاد کے کمرے کی کھڑکیوں کے پٹ جھٹکے سے کھلے۔۔۔

کمرے میں ہلکا سا دھماکا ہوا اور شہر زاد ایک دم ہڑبڑا کر جا گی۔۔۔ اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوئیں۔ زیر و واٹ کے بلب کی روشنی میں سامنے کا منظر دیکھ کر وہ تھوڑا پرسکون ہوئی۔ کھڑکیوں کے پٹ ٹھنکنے کی وجہ سے ٹھنڈا ایک طوفان کمرے میں ٹھس آیا تھا۔۔۔ وہ ایک لمبی سی جمائی لے کر سستی سے اٹھی اور جیسے ہی کھڑکیوں کے پاس پہنچی، بارش کی ہلکی سی بو چھاڑنے اس پر لچکی طاری کر دی، اس نے سرعت سے کھڑکیاں بند کر کے محل کے بھاری پردے آگے کیے۔ اس ساری مشقت میں اس کی آنکھوں کی نیند بالکل غائب ہو چکی تھی۔

ست انداز میں وہ بیڈ پر آ کر بیٹھ گئی۔ بلا ارادہ ہی اس کی نظر میز پر رکھے لیپ ٹاپ اور فائلوں کے ڈھیر پر پڑی جو وہ آٹس سے گھر کام کرنے کے لیے لائی تھی اور ساری شام اس نے اسی پر ہی صرف کی تھی۔ وہ آج کل مسز قریشی کی خصوصی فرمائش پر کسی مشہور سیاستدان محل حسین کی کسی حکومتی ٹیم کے میں کی جانے والی کرپشن پر کام کر رہی تھی، اور کل اس کیس کی فائل ہیرنگ تھی اور وہ مکمل تیاری کے ساتھ جانا چاہ رہی تھی۔ ”مجھے ایک دفعہ پھر اپنے فائل نوٹس دیکھ لینے چاہئیں۔۔۔۔“ اس سوچ نے اس کے اندر جستی کا احساس پیدا کیا۔

وہ منہ ہاتھ دھو کر فریش ہوئی اور کافی بنانے کے لیے اپنے کمرے سے نکل آئی، رومی کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کے قدم کچھ مست ہوئے، اس نے کچھ سوچ کر اس کے کمرے کا ہینڈل گھمایا، دروازہ اندر سے لاک نہیں تھا اس لیے فوراً کھل گیا۔۔۔

شہر زاد دے قدموں اندر داخل ہوئی، سامنے رومیہ اپنے بیڈ پر بے ترتیب انداز میں سکر لی ہوئی بگہری نیند سو رہی تھی اور اس نے اپنا ایک تکیہ بازوؤں میں مضبوطی سے جکڑا ہوا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے تھے۔۔۔

شہر زاد کے دل پر گھونسا سا پڑا۔ وہ آہستہ سے چلتی ہوئی رومی کے بالکل پاس آ کر بیٹھ گئی اور اس کا دل دکھ کے گہرے احساس سے بھر گیا، وہ جانتی تھی کہ اس کی بہن ان چند دنوں میں اپنے ساتھ صدیوں کی ٹھکن سمیٹ لائی تھی۔

اسے پہلی دفعہ احساس ہوا کہ بروکن فیملیز کے بچوں کا دکھ وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس نے خود بچے پاؤں اس مسافت کو طے کیا ہو۔ جس نے ماں باپ کے ہوتے ہوئے بھی قطرہ قطرہ تنہائی کا زہر پیا ہو، جس کے دامن میں صرف محرومیاں ہوں۔ وہ جان گئی تھی کہ جن کے حصے میں ہمیشہ آدھا سورج آیا ہو ان کا پورا دکھ کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا۔۔۔۔

شہر زاد نے ہلکا سا جبک کر اس کے بے رونق چہرے سے بال ہٹانے کی کوشش کی، اس کے لمس کو محسوس کر کے رومیہ ایک دم ہڑبڑا کر اٹھی، اس کا چہرہ خوف کے احساس سے زرد ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں اس قدر وحشت تھی کہ ایک لمحے کو شہر زاد کو بھی اپنا دل سکڑتا ہوا محسوس ہوا۔

”رومی، میری جان، یہ میں ہوں شیریں، تمہاری بہن۔۔۔۔!!“

”شیریں۔۔۔۔؟؟؟“ رومیہ کا نفس بحال ہوا اور اس کی آنکھوں میں شناسائی کے رنگ ابھرے اور اگلے ہی پل وہ شیریں کے ساتھ لپٹ گئی اور دھواں دھارا انداز میں رونے لگی، اس کا سارا وجود ہچکیوں کی زد میں تھا، وہ اس قدر شدت سے رو رہی تھی کہ شہر زاد کو لگا جیسے اس کا کیچ پھٹ جائے گا۔

☆☆☆

درشہوار کے کمرے کا ماحول خاصا گرم تھا۔
 آتش دان سلگ رہا تھا اور وہ کارپٹ پر رکھے فلور کشن پر بیٹھی ہوئی تھی، اس نے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا رکھی تھی۔ اس کے قدموں میں — لمبل بڑا ہوا تھا اور وہ اس وقت گود میں رکھے ہوئے لیپ ٹاپ پر اپنی اور منائل کی کنسرٹ کی تصویریں دیکھنے میں مگن تھی۔
 اچانک اس کے کمرے کا دروازہ دھڑک کر کھلا اور درشہوار کا دل دھک سے رہ گیا سائے طوبی کو دیکھ کر اس کا سانس بجال ہوا۔

”تم انسانوں کی طرح اندر نہیں آسکتیں کیا۔۔۔؟“ درشہوار نے بے زاری سے لیپ ٹاپ بند کیا۔
 ”نہیں۔۔۔۔۔“ وہ دھپ کر کے اس کے برابر میں رکھے کشن پر بیٹھ گئی اور اپنا غیر ہموار سائلس درست کرنے لگی۔

”میرا تھن ریس میں حصہ لے کر آ رہی ہو کیا؟“

”ہاں، تمہارے بغیر مزا نہیں آ رہا تھا، سوچا تمہیں بھی انوائیٹ کر لوں“ طوٹی نے بھی جوانی وار کیا۔

”موری، میں کسی لڑکے ساتھ گھر سے تو بھاگ سکتی ہوں لیکن کسی ریس میں حصہ نہیں لے سکتی۔۔۔“ درشہوار نے سائیڈ پر رہی موگ پھیلیوں سے بھری ہوئی پلیٹ اٹھا کر اپنی گود میں رکھی۔

”تم سے مجھے ایسے واہیات کام کی توقع تھی“ طوٹی نے منہ بنا کر کہا۔

”الو اب بندہ اکیلے سڑکوں پر بھاگتا ہوا اچھا لگتا ہے کیا۔ ذرا تصور کرو۔۔۔“ درشہوار شوخی کے موڈ میں تھی۔

”سب باتوں کو چھوڑو، یہ بتاؤ، یہاں سے تمہارا کوئی جھگڑا ہوا ہے کیا؟“
 ”میں نے تو ان کی شکل ہی آج دیکھی ہے اتنے دنوں کے بعد۔“

”لیکن تم پر کس بات کا غصہ ہے انہیں۔۔۔“ طوبی نے الجھ کر اس کا چہرہ دیکھا۔
 ”بھئی نندا اور بھائی بھی والی ازلی رقابت ہوگی۔۔۔“ درشہوار نے بات کو چٹکیوں میں اڑایا۔
 ”سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بیا کا مزاج ہے ہی نہیں ایسا۔۔۔“ طوبی نے فوراً بہن کا دفاع کیا۔
 ”پھر تم خود بتاؤ، کتنے رف انداز میں انہوں نے تمہارے سامنے مجھ سے بات کی تھی، حالانکہ میں نے تو انہیں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔۔۔“

”لیکن کچھ نہ کچھ تو ہوا ہے، وہ اتنا زیادہ ڈسٹرب کسی عام بات پر نہیں ہوسکتیں۔“

”اب مجھے کیا پتا ان کے دل و دماغ میں کیا چل رہا ہے۔۔۔“ درشہوار بے زاری سے گویا ہوئی۔

”کہیں برہان بھائی کے ساتھ تو کوئی جھگڑا نہیں ہوا ان کا۔۔۔“ طوبی کی بات پر درشہوار اچھلی، اسے

شام کا منظر یاد آیا۔

”اوہ ہاں، آج شام میں جب میں اور ہانی بھیا واپس آئے تھے تو ان دونوں کی ٹی وی لاؤنج میں ایک ہلکی سی جھڑپ ہوئی تھی۔“

”اوہ آئی سی۔ تو پھر یہ بتاؤ ناں، خواہ مخواہ رنگ برنگی باتیں کیے جا رہی ہو۔۔۔“ طوبی کے ساتھ ساتھ درشہوار خود بھی کچھ برسکون ہوئی۔

”گلتا ہے اسی بات کا غصہ اتارا ہے انہوں نے مجھ پر۔۔“
 ”ہاں اب تو مجھے بھی یہی لگ رہا ہے۔۔۔“ طوبی تھوڑی مطمئن ہوئی۔

”اب بندہ پوچھے بھلا اس میں میرا کیا قصور ہے۔؟“ درشہوار نے معصومیت کی انتہا کر دی۔

”ویسے تو اس گھر کے ہر معاملے میں تمہارا ہی کوئی نہ کوئی قصور ہوتا ہے، لیکن۔ طوبی شرارت سے رکی۔ لیکن کیا۔۔۔“ درشہوار نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

”اس دفعہ تمہاری مظلومیت مجھے بھی کسی شک و شبہ سے بالاتر ہی لگ رہی ہے۔“ طوبی کے شرارتی انداز پر درشہوار نے ایک زوردار جھانپڑا اس کے کندھے پر رسید کیا اور ڈھٹائی سے ہنسنے لگی۔۔۔

”کیسا رہا تمہارا اسلام آباد کا ٹرپ۔۔۔؟“ طوبی نے اپنا کندھا سہلاتے ہوئے منہ بنا کر پوچھا۔

”ٹرپ تو زبردست تھا، فارحہ بھابھی نے کافی شاپنگ کروائی مجھے۔۔۔“ درشہوار کی آنکھیں چمکیں۔

”میرے لیے کیا لائی ہو۔۔۔؟“ طوبی بے تاب ہوئی۔۔۔

”بہت قیمتی تحفہ۔۔۔“ درشہوار نے شرارت سے آنکھیں میکانیں۔۔۔

”اچھا۔۔۔ وہ کیا۔۔۔؟؟؟“ اس نے بے تاب لہجے میں پوچھا۔

”دعائیں۔۔۔“ درشہوار نے اس کے ارا مانوں پر اس ڈالی۔

”سنبھال کر رکھو اپنی دعائیں۔۔۔“ وہ ٹرپ کر مزید بولی۔ ”جب میں جاؤں گی ناں کہیں، تو نکلے کی بھی چیز نہیں لاؤں گی تمہارے لیے۔“

طوبی سچ سچ اس سے خفا ہو گئی اور وہ مسکراتے ہوئے اپنی واڈروپ سے ساری شاپنگ نکالنے لگی کیونکہ اسے علم تھا کہ وہ خواہ کتنی ہی ناراض کیوں نہ ہو لیکن اس سب چیزوں کا پورسٹ مارٹم کیے بغیر کمرے سے نہیں ہلے گی۔

☆☆☆

دہاج میر کو آج نور محل میں سخت ٹھٹھن کا احساس ہو رہا تھا۔۔۔

آج شام ہی ان کی داجی کے ساتھ میر ہاؤس سے واپسی ہوئی تھی اور چونکہ وہ الرجی اور سانس کے مریض تھے اور سردیوں میں ان کی تکلیف میں مزید اضافہ ہو جاتا، مری سے واپسی پر ہی پھینکوں کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ ابھی تک جاری تھا۔

ان کی آنکھوں سے مسلسل پانی بہہ رہا تھا اور گلے میں بھی اچھی خاصی خراش محسوس ہو رہی تھی۔

”آپ کو جانا ہی نہیں چاہیے تھا مری۔۔۔“ فارحہ نے گرین نی کا کپ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے محتاط انداز میں کہا۔

”ماں باپ ہیں وہاں میرے اور اتفاق سے زندہ بھی ہیں۔۔۔“ ان کی طرف سے حسب معمول جلاکٹا ہی جواب آیا۔

”میرا یہ مطلب نہیں تھا۔۔۔“ فارحہ گھبرا گئیں، میر دہاج کی شعلہ صفت طبیعت ان کے ہاتھ پیر پھلائے رکھتی تھی۔ ”میں تو آپ کی طبیعت کی وجہ سے کہہ۔۔۔“

”تم میری حالت کو چھوڑو اور یہ کھڑکیاں کھول کر پردے ہٹاؤ۔“ دہاج کی اگلی فرمائش نے انہیں ہکا بکا کیا۔

”باہر شدید سردی ہے دہاج۔۔۔“ وہ پریشان ہوئیں۔

”اور مجھے اندر ٹھٹھن کا احساس ہو رہا ہے۔۔۔“ انہوں نے بے زاری سے اپنا سینہ مسلا۔

فارحہ فکر مند انداز میں ان کی طرف بڑھیں، جلدی سے ان کا ہاتھ چھو کر دیکھا تو وہ خاصا سرد تھا۔ ان

کے ہاتھ کے لمس کو محسوس کر کے وہاں نے آنکھیں کھولیں۔
تو ان میں موجود سہمی اور وحشت دیکھ کر وہ کھبرا گئیں۔
”شکر ہے بخار تو نہیں ہے آپ کو۔۔۔“

”تم اپنی ڈاکٹری جھاڑنا بند کرو اور کمرے کی کھڑکیاں کھولو۔۔۔“
”وہاں! آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی، باہر بہت ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔“
”جابل عورت، میں کہہ رہا ہوں کہ مجھے ٹھن کا احساس ہو رہا ہے، اور تم مجھے موسم کا حال سنار ہی
ہو۔۔۔“ وہ اپنا ضبط کھو بیٹھے۔۔۔

”اچھا، اچھا میں کھول دیتی ہوں۔۔۔“ انہوں نے جیسے ہی کھڑکی کھولی، سرد ہواؤں کا طوفان کمرے
میں گھس آیا، اور ان پر کپڑی سی طاری ہو گئی۔
”اُف۔۔۔۔!!!!“ وہاں نے منہ کھول کر ایک لمبا سانس لیا اور تازہ ہوا کو پھیپھڑوں میں بھرنے کی
کوشش کی جو انہیں خاصی مہنگی پڑی۔ ان کا کچھ دیر پہلے رکی ہوئی پھینکوں کا سلسلہ دوبارہ شروع ہوا اور اس
کے ساتھ ہی انہیں کھانسی کا ایک طویل دورہ پڑا۔

”اوہ میرے خدایا۔۔۔۔“ فارحہ نے گھبرا کر ان کی کمر کو سہلایا۔۔۔۔
وہاں کی حالت ایک دم ہی بگڑ گئی، ان کی ناک میں خراش بڑھ گئی اور اس کے ساتھ ہی سانس لینے میں
بھی دقت کا سامنا ہونے لگا، دیکھتے ہی دیکھتے ان کا نظام تنفس بگڑ کر رہ گیا۔
”میرا ان ہیلر لاؤ۔۔۔“ وہ کھانسی کے درمیان بمشکل بولے تو فارحہ نے سائیڈ میز پر رکھا ان کا ان
ہیلر نکال کر ان کی طرف بڑھا یا اور وہ جلدی سے اپنی ناک اور منہ سے لگا کر لمبے لمبے سانس لینے لگے۔
کچھ لمحوں کی مشقت کے بعد ان کی طبیعت کچھ بحال ہوئی۔۔۔

”کھڑکی بند کر دو پلیز۔۔۔۔“ ان کا دماغ ٹھکانے آچکا تھا، فارحہ نے خاموشی سے جا کر کھڑکی بند کر
کے پردہ آگے کر دیا۔
”تو یہ ہے، سانس لینا ہی محال ہو گیا تھا۔۔۔۔“ وہ اب اپنی اینٹی الرجی میڈیسن کھا رہے تھے۔۔۔۔
”جانتا تو ہے آپ کو سردی کا موسم راس نہیں ہے۔۔۔۔“
”مجھے تو لگتا ہے کوئی بھی چیز راس نہیں ہے، نہ جانے کس کی بددعا کے اثر میں ہوں۔۔۔۔“ وہ ڈپریشن
کی انتہا پر تھے۔۔۔۔

”آپ کو کوئی کیوں دے گا بددعا میں، آپ نے کس کے ساتھ بُرا کیا ہے۔۔۔۔“ فارحہ ان کے پاس
بیٹھ کر نرمی سے ان کا ہاتھ پکڑ کر سہلانا لگیں۔
”سب سے زیادہ تو تم ہی دیتی ہو گی۔۔۔۔“ ان کے انداز میں تلخی تھی یا سادگی، فارحہ سمجھ نہیں پائیں۔
”اللہ نہ کرے، میں کیوں کروں گی ایسا، میرا آپ کے علاوہ ہے ہی کون۔۔۔۔؟“
”جانتا ہوں میں، اگر تمہارا بھی کوئی والی وارث ہوتا تو کب کی مجھے چھوڑ کر جا چکی ہوتیں۔۔۔۔“ انہوں
نے بیڈ کی پشت سے ٹپک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

”جانتا نہیں آپ مجھ سے اتنا بدگمان کیوں رہتے ہیں۔۔۔۔؟“ وہ اداس ہوئیں۔
”میری تو خود سمجھ میں نہیں آتا کہ زندگی سے سکھ اور چین کیوں ختم ہو گیا ہے، ہر وقت کوئی نہ کوئی دھڑکا لگا
رہتا ہے، ایسا لگتا ہے کوئی آسب میرے تعاقب میں ہے۔“

وہ تھکے تھکے انداز میں بولتے ہوئے اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہے تھے۔

”آپ صدقہ کیوں نہیں دیتے اپنا؟“ فارحہ نے خلوص نیت سے مشورہ دیا۔

”اس سے کیا ہوگا۔۔۔؟“ انہوں نے استہزاء انداز میں پوچھا۔

”صدقہ سبلاؤں کو ملتا ہے۔“ فارحہ نے سادگی سے کہا۔

”کیوں نہیں کیا لگتا ہے کہ میں نے کوئی گناہ کیا ہے۔۔۔“ ان کے اندر کا چور پھل کر باہر نکل آیا۔

”استغفر اللہ، میں نے ایسا کب کہا، صدقہ اور خیرات کسی گناہ کا اثر زائل کرنے کے لیے کیے جاتے

ہیں؟“ فارحہ بھی نرم امان لگیں۔

”اچھا، اچھا ٹھیک ہے جو بہتر لگے کر لو، بلکہ کوئی خیرات شیرات ہی کروالو نور محل میں۔۔۔“ خلاف

توقع وہ مان گئے۔

”خیرات کے لیے تو خاصے انتظامات کرنے ہوں گے۔۔۔“

”پیسوں کی کمی تھوڑی ہے میرا دوس کے مکیوں کو۔۔۔“ وہاج کی طرف سے حسب عادت الٹا ہی

جواب آیا۔

”بات پیسوں کی نہیں ملازمین کی ہے، یہاں سے بھی شفیق بچا کے گھر والوں کو بلوا لیا گیا ہے مری

میں۔۔۔“ فارحہ کو اپنا تازہ ترین دکھ یاد آیا۔

”وہاں بھی تو خاصا مسئلہ ہو رہا تھا۔“ انہوں نے سرسری انداز میں جواب دیا۔

”کچھ پتا چلا بہادر علی اور صندل کا خاندان کیوں گھر چھوڑ کر گیا ہے۔“ فارحہ نے ان کی دکھتی ہوئی رگ

پر ان جانے میں ہاتھ رکھ دیا۔

”مجھے کیا پتا، میں ان کا پرسنل اسسٹنٹ لگا ہوا ہوں یا مجھ سے مشورہ کر کے گئے ہیں وہ لوگ؟“

وہاج کا حلق تنک کر ڈواہو گیا۔

”میں نے تو یونہی ایک بات کی تھی۔۔۔“ فارحہ نے گھبرا کر وضاحت کی۔

”جتنی عقل ہوگی، ویسی ہی بات کرو گی ناں۔“ ان کا موڈ ابھی تک خراب تھا۔۔۔ ”ملازم چاہئیں ناں“

مل جائیں گے تمہیں بھی، اب جا کر مجھے سوپ بنا کر دو بھوک لگ رہی ہے۔۔۔“

”ساتھ ایک دوائے بھی بواکل کر دوں۔۔۔“ فارحہ نے اٹھتے ہوئے پوچھا تو وہاج نے بے زاری

سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

صبح ساڑھے چھ بجے کے قریب شہر زاد کی آنکھ کھلی۔

اس نے اٹھتے ہی اپنے کمرے کی دیوار گیر کھڑکی کا پردہ ہٹایا تو سامنے کا منظر دیکھ کر مبہوت رہ گئی۔ ملکی

سی روشنی میں ہوا کی سرسراہٹ کے ساتھ زرد اور نارنجی پتے ٹیسر پر یوں گر رہے تھے جیسے کوئی دیہے سروں

میں سرگوشی کر رہا ہو۔۔۔

رات والی بارش رک چکی تھی اور فضاؤں میں چاروں طرف گہری دھند کا راج تھا۔ وہ واش روم سے

فریش ہو کر نکلی اپنا تولیہ کرسی پر پھیکا۔ اس کی بیڈی ملازمہ نہ جانے کب سائیڈ میز پر رکھ کر چلی گئی تھی۔

اس پر جی سیاہ رنگ کی ملائی کی تہ سے نظریں چڑا کر وہ چوگرز کے تسمے باندھنے لگی۔ جو نگ اور ایکسٹرنل

دوائی چیزیں تھیں جن کے بغیر شہر زاد کی زندگی ادھوری تھی۔ بہت کم اس کے اس معمول میں تعطل آتا

تھا۔

گزشتہ رات اس نے کئی گھنٹے رومیصہ کے ساتھ جاگ کر گزارے تھے، وہ اسے فارم ہاؤس میں گزرے ہوئے دنوں کی روداد سنارہی تھی جسے سن کر شہزاد کو کم از کم یہ احساس ہو گیا تھا کہ اسے اغوا کرنے والے لوگوں میں کچھ نہ کچھ انسانیت ضرور تھی۔

رات تین ساڑھے بجے کے قریب وہ اپنے کمرے میں آکر سو گئی تھی اور اب چند گھنٹوں کی نیند نے اسے خاصا فریش کر دیا تھا۔

وہ اپنا ٹریک سوٹ پہنے تیزی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی تو سامنے نئی ملازمہ رشیدہ پیڈیٹلی کا خالی کپ لیے بیٹا بیگم کے کمرے سے نکل رہی تھی، اس نے صبح ہوتے ہی اپنی ذمے داریاں سنبھال لی تھیں۔

”السلام علیکم۔۔۔“ رشیدہ، نے اسے دیکھتے ہی سلام جھاڑا۔
”وعلیکم السلام، رات نیند آگئی تھی آپ کوئی جگہ پر۔۔۔؟“ شہزاد کا اپنائیت بھر انداز رشیدہ کو اچھا لگا۔
”جی جی بی جی۔۔۔“

”آپ اکل صوفی سے کہہ دیں، میرا فریش جوس ایک گھنٹے تک ریڈی رکھیں، میں جو گنگ کر کے آرہی ہوں۔“ وہ دروازے کی طرف بڑھی۔

”بیٹا! دھند بہت ہے باہر، کیسے جائیں گی۔۔۔۔۔“ رشیدہ۔۔۔ کے لہجے کی تشویش پر وہ مسکرائی۔
”ڈونٹ وری، عادت ہے مجھے۔۔۔۔۔“ وہ مسکرا کر پورچ میں نکل آئی۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی اس کی ہیڈ لائٹس آن کیں اور محتاط انداز میں ڈرائیونگ کرتی ہوئی وہ شالیمار کلب پہنچ گئی، جہاں آنا اس کی معمول تھا۔

صبح کے اس پہر وہاں اس کے جیسے ہی چند سر پھرے لوگ موجود تھے۔ شدید سرد موسم میں اپنے گرم بستروں سے نکل کر جو گنگ کے لیے آنا دیوانوں کا ہی کام تھا اور شہزاد اس معاملے میں ان سے کم نہیں تھی۔

اس نے جیسے ہی جو گنگ ٹریک پر پہلا قدم رکھا، سیل فون کی منترم گھنٹی گونج اٹھی۔ یہ مخصوص ٹون اس نے صرف ہم زاد کے نمبر پر سیٹ کر رکھی تھی۔

ہینڈ فری کانوں میں لگا کر سیل فون جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ وہ اب تیز تیز چل رہی تھی۔۔۔
”زرد پتوں کو اپنے پاؤں تلے روندنا اچھا لگتا ہے آپ کو۔۔۔؟“ ہم زاد کے معنی خیز انداز پر وہ ہلکا سا

ہنسی۔۔۔

”جی بہت زیادہ۔۔۔۔۔“ اس کے لہجے میں چھلکنے والی شوخی رومیصہ کی واپسی پر اس کے پرسکون ہونے کی گواہ تھی۔

”بہت ظالم ہیں آپ۔۔۔؟“ اس نے شکوہ کیا۔
”صبح صبح یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے آپ نے تو یہ بات دوپہر کو آرام اور سکون سے بھی بتائی جاسکتی

تھی۔۔۔“ جو گنگ ٹریک پر وہ احتیاط سے بھاگنے لگی۔
کیونکہ دھند کی وجہ سے راستہ بالکل دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

”ذرا سوچیں محترمہ، کتنے خزاں رسیدہ زرد پتے، آپ کے پیروں کے نیچے آکر مسلے جائیں گے“
اس کے لہجے میں شرارت تھی۔

”آپ کو صبح خزاں رسیدہ پتوں کا دکھ کیوں بتا رہا ہے۔۔۔؟“ اس نے اپنی رفتار تیز کی۔

”اس لیے کہ ان میں اور مجھ میں ایک چیز مشترک ہے۔۔۔۔۔“ اس کا معنی خیز لہجہ شہر زاد کی سماعتوں سے ٹکرایا

”وہ کیا۔۔۔؟“ وہ ہلکا سا مسکرائی

”جب انہیں کوئی اپنے پیروں تلے مسلتا ہوگا تو سوچیں کیا قیامت گزرتی ہوگی ان پر۔۔۔“

”آپ پتوں کو چھوڑیں، اپنا حال بتائیں۔۔۔“ وہ بھی غیر سنجیدہ تھی۔

”خزاں کے موسم میں زرد پتوں کے چننے کی آواز سنو تو سمجھنا میرا دل بھی تمہارے قدموں تلے آ کر رونا گیا۔“ چلتے چلتے شہر زاد کے دل کی دھڑکن ایک لمحے کو کھچی۔ زمین نے اس کے پیر جلنے لیے، یہ تو طے تھا کہ اس شخص سے باتوں میں جیتنا ناممکن تھا۔۔۔

اس نے بلا ارادہ زمین پر پھیلے سینکڑوں زرد پتوں کو دیکھا، اسے لمحے بھر کو یہی محسوس ہوا جیسے واقعی اس کا دل اس کے پیروں کے نیچے آ کر رونا گیا ہو۔ شہر زاد نے ایک لمبی سانس بھر کر سرد ہوا کو اپنے پیچھے دوں میں منتقل کیا۔

”پھر صاف صاف کہیں ناں، اس موسم میں جو گنگ کرنا چھوڑ دوں میں۔“ وہ جل کر بولی اور ہم زاد کا قہقہہ اس کی سماعتوں میں گونجا۔

”ارے ہم کون ہوتے ہیں آپ کو، آپ کے فیورٹ کام سے روکنے والے۔۔۔۔۔“

”یہ کام تو شاید آپ کو بھی بہت پسند تھا۔۔۔۔۔“ شہر زاد کو اس کی کبھی ہوئی اکثر باتیں یاد تھیں۔

”قسم لے لیں، اس وقت میں بھی کسی ٹریک کی خاک چھان رہا ہوں۔۔۔۔۔“ اس کے لہجے کی سچائی پر شہر زاد کو یقین آ گیا۔۔۔۔۔

”اس ٹریک پر کیا ریڈ کارپٹ بچھا ہوا ہے، جو کسی اور کے دل کے چننے کی آوازیں آپ کو نہیں آ رہیں۔۔۔۔۔“ شہر زاد نے بھی اس پر بھرپور حملہ کیا اور وہ اس کی حاضر جوابی پر ایک دفعہ پھر قہقہہ لگا کر ہنسا۔

”آپ کہیں تو سہی کہ ان پتوں کے ساتھ آپ کا دل ہے، ایک قدم بھی اٹھا جاؤں تو نام بدل دیجیے گا میرا۔۔۔۔۔“

”سوری میں چیزوں کو ان کے درست مقام پر ہی رکھتی ہوں۔۔۔۔۔“ شہر زاد مسکرائی۔

”اچھا کرنی ہیں، مجھے بھی میری ہی اوقات میں رکھا ہوا ہے، چلیں پھر ملتے ہیں ایک بریک کے بعد۔“ اس نے فون بند کر کے ہاتھ میں پکڑ لیا۔

وہ اس کی سوچوں میں گم گہری دھند میں لپٹے جو گنگ ٹریک پر تیزی سے بھاگتے ہوئے ایک شخص سے بُری طرح ٹکرائی۔ جو مخالف سمت سے آ رہا تھا۔

”دھیان سے۔۔۔۔۔“ اس شخص نے بے ساختہ تمام کر اسے گرنے سے بچایا۔ ایک مانوس سے پرفیوم کی خوشبو چاروں طرف پھیلی۔

”اُوہ۔۔۔۔۔ آئی ایم سوری۔۔۔۔۔“ شہر زاد ایک دم بوکھلا گئی۔

اس شخص کی گرم انگلیاں اس کے سرد ہاتھوں سے ٹکرائیں اور ہاتھ میں پکڑا سیل فون چھوٹ کر زمیں پر جا گرا۔

”اُوہ نو۔۔۔۔۔“ اس نے فوراً۔۔۔ سیل فون زمین سے اٹھا کر اپنے ٹراؤزر کی جیب سے رگڑ کر صاف کیا اور اس کے طرف بڑھایا۔

”تھینک یو۔۔۔“ شہر زاد نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔
 سرد موسم میں اس شخص نے آسمانی رنگ کے ٹریک سوٹ پر نیوی بلیو جیکٹ پہن رکھی تھی اور سرخ رنگ کے اوئی منظر سے سارا منہ ڈھانپ رکھا تھا۔
 اس سے پہلے کہ وہ اس پر غور و فکر کرتی وہ شخص اسی دھند میں کسی چھلاوے کی طرح غائب ہو گیا۔
 ”کون تھا یہ۔۔۔“ وہ اس کی شفاف شہدرنگ آنکھوں کی چمک پر الجھی۔
 اس کے چہرے کے باقی نقوش وہ اوئی منظر میں چھپے ہونے کی وجہ سے نہیں دیکھ پائی تھی۔
 لیکن کچھ تھا، جس نے اسے چونکا دیا تھا، اس شخص کا لمس بہت اپنائیت بھرا تھا۔۔۔۔۔
 شہر زاد کو عجیب سا احساس ہوا۔۔۔ وہ جو گنگ ٹریک کی سائیڈ پر رکھے سنگ مرمر کے بیچ پر بیٹھ گئی۔ اس کے دل کی دھڑکن ایک دم ہی بے قابو ہوئی، اس کے ہاتھ میں پکڑے سیل فون پر اب ہم زاد کا نمبر بلنک کر رہا تھا۔ اس نے سرد ہاتھوں کے ساتھ کال انیڈ کی۔

”خوشبو اچھی لگاتی ہیں آپ۔۔۔“ اس کا شوخی سے بھرپور لہجہ شہر زاد کی دھڑکنیں منجمد کر گیا۔
 ”لڑکیوں کو ایسی ہی دھیمی اور محسوس خوشبو کا استعمال کرنا چاہیے جو وہی شخص محسوس کر سکے جو دل کے پاس ہو۔“ ہم زاد بول رہا تھا اور شہر زاد کی تو گویا۔
 قوت گویا یہی سلب ہو گئی، اس کے ذہن کے پردے پر دو شفاف شہدرنگ آنکھیں ابھریں۔۔۔
 ”یہ آپ تھے نا، جو تھوڑی دیر پہلے مجھ سے ٹکرائے تھے۔؟“ شہر زاد نے اپنا حلق تر کرتے ہوئے پوچھا۔

”اب تو گلہ نہیں کریں گی کہ سامنے نہیں آیا میں۔۔۔“ دھند کے اس پار ایک زوردار قہقہہ اس کی سماعتوں میں گونجا۔

”اتنے ہی بہادر تھے تو جم کر کھڑے ہوتے۔۔۔“ شہر زاد ہلکا سا چڑ کر گویا ہوئی۔
 ”میں نہ صرف جم کر کھڑا ہوا، آپ کو گرنے سے بچایا اور گندی مٹی سے بھرا سیل فون صاف کر کے آپ کے سرد ہاتھوں میں بھی تھمایا، اب کیا جان لیں گی میری۔۔۔۔۔؟“ وہ اب شخص اسے چڑا رہا تھا۔
 ”کسی لڑکی کا سیل فون ٹشو پیپر کے بجائے ٹراؤز کی جیب سے رکڑ کر صاف کرنا، بدتہذیبی ہے۔۔۔“ شہر زاد کے طنز پر لہجہ بروہ پھر ہنسا۔

”کچھ بھی کہیں لیکن مجھے معلوم ہے آپ اس سیل فون کی اسکرین اب کبھی صاف نہیں کریں گی۔۔۔“ شوخی اس کے ایک ایک لفظ سے ٹپک رہی تھی۔
 ”کیوں۔۔۔“ شہر زاد اب پارکنگ کی طرف بڑھنے لگی۔

”میرے ہاتھوں کا لمس ہے اس پر۔۔۔۔۔“
 ”ہاں فکر پر نش بھجوانی ہوں نادرا کے آفس۔۔۔ دو منٹ میں سارا بایو ڈیٹا نکل کر آجائے گا سامنے۔۔۔“ شہر زاد کو اس کی ہسی زہر لگ رہی تھی۔
 ”یہ بھی کر کے دیکھ لیں، پھر آپ کی کامیابی کو کسی اچھی جگہ پر کینڈل لائٹ ڈنر کے ساتھ سلیم ریٹ کریں گے۔“ وہ سر اسر اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔

شہر زاد نے چڑ کر سیل فون ہی پاور ڈ آف کر دیا اور جیسے ہی وہ پارکنگ میں پہنچی، اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی، سامنے اس کی گاڑی کے بونٹ پر ایک گلزار کھایا ہوا تھا جس پر لگے پودے پر چند پھول کھلے

ہوئے تھے۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ یہ اسی کی شرارت ہے۔

☆☆☆

موزیکا کے پورے گھرانے کی نظریں والی کلاک برجی ہوئی تھیں۔
جیسے جیسے گھڑی کی سوئیاں گردش کر رہی تھیں انہیں اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا تھا، جارج اپنی میوزک اکیڈمی سے شام پانچ بجے تک لوٹ آتا تھا اور اس وقت رات کے دس بج رہے تھے۔۔۔
”دوبارہ کال ملاؤ اپنے باپ کو۔۔“ مارتھا کادل کی کھائی میں ڈوبا۔
”نمبر ابھی بھی پاور ڈ آف جا رہا ہے ان کا۔۔۔“ موزیکا نے پریشانی سے جواب دیا۔
”خداوند، رحم کر، ہم پر۔۔۔“ مارتھا گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بمشکل گھڑی ہوئیں، ان کے تینوں بچوں کے چہروں پر تشویش، پریشانی اور فکر مندی کے تاثرات نمایاں تھے، جارج کے چند گنے چنے دوست تھے اور موزیکا ان سب کے ہاں فون کر کے پوچھ چکی تھی۔
”انکل جوزف کو کال کر کے پوچھو موزیکا! ان کو یقیناً کچھ نہ کچھ پتا ہوگا۔“ موزیکا کی چھوٹی بہن نے اسے مشورہ دیا۔

”ہاں ہاں، فوراً ان کو کال کرو، وہ بھی تو ان ہی کی اکیڈمی میں نوکری کرتے ہیں۔۔۔“ مارتھا دروازے کی طرف جاتے ہوئے پلٹیں۔

”لیکن میرے پاس نمبر نہیں ہے ان کا۔۔۔“ موزیکا نے مایوسی سے جواب دیا۔
”تمہارے باپ کی ڈائری میں سارے نمبر لکھے ہوئے ہیں۔“ مارتھا کی بات سنتے ہی اس نے فوراً سائیڈ میز پر گھر چھٹی ڈائری اٹھائی اور تھوڑی سی تلاش کے بعد اسے انکل جوزف کا نمبر مل گیا۔
جوزف انکل سے سلام دعا کے بعد ملنے والی اگلی اطلاع پر موزیکا کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔۔۔

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں انکل۔۔۔“ موزیکا کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی، مارتھا اور اس کی چھوٹی بہن لپک کر اس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئیں، اور ہاتھ کے اشاروں سے اس سے پوچھنے لگیں۔
”چلیں ٹھیک ہے، آپ پلیز ان کے جاننے والوں سے پوچھ کر ضرور بتائیے گا، ہم لوگ پریشان ہو رہے ہیں۔“ موزیکا نے فون بند کیا۔

”کیا کہا انکل جوزف نے۔۔۔“ اس کی بہن نے بے تابی سے پوچھا۔
”پاپا، آج اکیڈمی گئے ہی نہیں۔“ موزیکا نے ماں اور بہن سے نظریں چرا کر وال کلاک کی طرف دیکھا جس پر اب گیارہ کا وقت ہو رہا تھا۔

”یہ کیسے ممکن ہے، وہ خود بتا کر گئے تھے مجھے۔۔۔“ اس کی ماں کی پریشانی بڑھی۔
”آپ سے نہیں اور جانے کا ذکر تو نہیں کیا تھا انہوں نے۔۔۔؟“ موزیکا نے پریشانی سے پوچھا۔
”ہرگز نہیں۔۔۔“ انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

”پھر کہاں جا سکتے ہیں اور نمبر بھی کیوں بند کر رکھا ہے آخر۔۔۔؟“ ان کی چھوٹی بیٹی اٹھ کر پریشانی سے ٹپٹپٹ لگی۔

”خداوند ہی جانتا ہے۔۔۔“ اس کی ماں نے پریشانی سے اپنے تینوں بچوں کو دیکھا، ان کا سب سے چھوٹا بیٹا ابھی صرف تیرہ چودہ سال کا تھا اور وہ رات کے اس پہر اسے بھی باپ کی تلاش میں گھر سے باہر بھیجنے

کارسک نہیں لے سکتی تھیں۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، ان چاروں کے دل میں طرح طرح کے وہم اور اندیشے سر اٹھا رہے تھے۔ بونے بارہ بجے کے قریب موزیکا نے فیصلہ کن انداز میں اپنی چادر اٹھائی۔ اس کی ماں اور بہن نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں دلاور کو لے کر جا رہی ہوں پولیس اسٹیشن۔۔۔“ اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔

”دماغ ٹھیک ہے تمہارا، رات کے اس وقت اکیلی جاؤ گی تم وہ بھی پولیس اسٹیشن۔۔۔“ مارتھا کا مزاج برہم ہوا۔

”مام، ہم گھر میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھ سکتے۔۔۔“ وہ جھنجھلا سی گئی۔۔۔

”آپنی ٹھیک کہتی ہیں، ہمیں بابا کی کشدگی کی رپورٹ لکھوائی چاہیے۔۔۔“ اس کا بھائی ایک دم ہی بڑا بن کر بولا تو اس کی ماں کو جب لگ گئی۔

”لیکن اس سے پہلے ہمیں نشتر ہاسپتال کی ایمرجنسی وغیرہ چیک کر لینا چاہیے۔“ موزیکا کی بہن نے نظریں جڑا کر دھیمے انداز میں مشورہ دیا۔ اسی لمحے گھر کی تیل بجی اور ان چاروں کے چہروں پر زندگی دوڑ گئی۔

”گلتا ہے بابا آگئے۔۔۔۔۔“ دلاور لپک کر گیٹ کی طرف دوڑا۔

”دروازہ پوچھ کر کھولنا پڑا۔۔۔“ اس کی ماں نے پیچھے سے آواز لگائی اور وہ دونوں بہنیں بھی بے تابی سے اٹھیں۔ جیسے ہی وہ باہر نکلیں، سامنے جارج تھکے تھکے انداز میں اپنے بیٹے دلاور کے ساتھ اندر آ رہا تھا۔ اس کے کندھے جھکے ہوئے اور چہرے پر تھکاوٹ کے تاثرات نمایاں تھے۔

”کہاں چلے گئے تھے آپ۔۔۔؟“ کچھ احساس ہے کہ ہم لوگ کتنا پریشان ہو رہے تھے۔۔۔“ مارتھا ایک دم ہی ان پر برس پڑی، موزیکا نے ماں کا ہاتھ دبا کر انہیں تھوڑا اٹھندا ہونے کا اشارہ کیا، لیکن مارتھا غصے میں دوسروں کی ذرا کم ہی سکتی تھیں۔

”بیٹا، ایک گلاس پانی کالاؤ۔۔۔“ انہوں نے اپنی عینک اتار کر سائیڈ میز پر رکھی، موزیکا نے دیکھا۔ ان کے جوتے خاصے گرد آلود تھے۔

”یہ لیں بابا۔۔۔“ موزیکا بھاگ کر پانی کا گلاس لے آئی جسے وہ ایک ہی سانس میں نی گئے۔

ان کے منہوں بچے اور بیوی بہت غور سے ان کے چہرے کے تاثرات سے معاملے کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن جارج نے بھی شاید کچھ نہ بولنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

”آخر کہاں چلے گئے تھے آپ، کچھ پتا بھی تو چلے۔۔۔“ مارتھا نے اپنے شوہر کے تاثرات کو دیکھ کر اب کی بار دانستہ نرمی سے پوچھا۔

”لائٹ بند کر دو، مجھے نیند آرہی ہے، صبح بات کریں گے۔۔۔“ ان کا انداز خاصا پراسرار تھا۔

”کمال کرتے ہیں آپ، ہمیں سینکڑن ہو رہی ہے، کچھ تو بتائیں۔۔۔“ وہ جھنجھلا لیں۔

”موزیکا بیٹا، لائٹ بند کر دو۔۔۔۔۔“ ان کے لہجے میں کوئی پلک نہیں تھی۔

وہ سب کی نیندیں اڑا کر خود رخ موڑ کر لیٹ گئے اور لمبل اور تنک تان لیا، جو اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ

سونے کا تہیہ کر چکے ہیں، مارتھا نے جھنجھلا کر اپنی دونوں بیٹیوں کی طرف دیکھا، لیکن دونوں نے ہی انہیں

آنکھوں ہی آنکھوں میں چپ رہنے کا ایک التجائیہ سا اشارہ کیا جو خلاف توقع مارتھا نے مان لیا تھا لیکن ان کی

اپنی آنکھوں کی نیند اڑ چکی تھی۔۔

☆☆☆

جبل حسین کرپشن کیس وہ جیت چکی تھی۔۔۔

وہ بڑے پروقار انداز میں اپنے ساتھی وکلاء کے ساتھ کمرہ عدالت سے باہر نکلی۔
ایلیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے بہت سے نمائندوں نے اسے ایک ساتھ گھیر لیا تھا، وہ اپنے ازلی
پر سکون انداز میں ان کے سوالات کے فرداً فرداً جوابات دینے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ جبل حسین حکومت
وقت میں تھا، اور ان کے محکمے کی کرپشن نے پورے ملک کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ آج کل جن چند
کلیئر پر کام کر رہی تھی، یہ ان میں سے ایک تھا۔

یہ اس کی پروفیشنل زندگی کا پہلا کامیاب کیس تھا جو اس نے مسز قریشی کی۔ مدد کے بغیر لڑا تھا۔
”دیل ڈن شیرے۔۔۔ ایک اسٹاپ۔۔۔“ سب سے پہلی کال اسے مسز قریشی کی وصول ہوئی جو اس
وقت خاصی خوش دکھائی دے رہی تھیں۔

”تھینک یو ایم۔۔۔“ شہر زاد نے چند منٹ ان سے بات کر کے فون بند کر دیا۔
”مجھے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ آج آپ کے آگے کوئی نہیں ٹھہر سکے گا۔“ اگلی کال ارتضیٰ حیدر کی تھی جو
آج اسے کمرہ عدالت تک چھوڑنے آیا تھا۔

”تھینک یو ارتضیٰ، آپ کی بھرپور سپورٹ کے بغیر یہ ممکن نہیں تھا۔۔۔۔۔“
”آپ بہت آگے جا میں گی شیرے۔۔۔۔“
”تھینکس ارتضیٰ، میں پھر بات کروں گی، بیچ میں مام کی کال آرہی ہے۔۔۔۔“

شہر زاد نے ارتضیٰ حیدر کی کال ڈراپ کر کے ٹیٹا بیگم کو لائن پر لیا جو اس وقت خاصے خوش گوار موڈ میں
تھیں۔

”شیرے! تم نے تو کمال کر دیا، سارے چینلز پر صرف تمہارا ہی چہرہ دکھائی دے رہا ہے، سیف الرحمن
نے بھی تجھے کہا، ناکوں پنے چہرہ دے ہن شیرے نے جبل حسین کے وکیل کو، اور پتا ہے میں نے کیا جواب
دیا۔۔۔“ وہ ایک بلی کو رکیں۔۔۔ ”میں نے کہا سیف الرحمن، آخر شیرے بیٹی کس کی ہے۔“ ان کے لہجے میں چھپا
خبر محسوس کر کے وہ بے ساختہ مسکرا دی۔

”اوکے مام، شام میں گھر پر ڈیٹیل سے بات کریں گے، ابھی مجھے مسز قریشی کے چیمبر جانا ہے۔“

”اوکے جانی، ٹیک کئیر۔۔۔۔۔“

شہر زاد نے جیسے ہی فون بند کر کے گاڑی کی سیٹ سے ٹیک لگائی، اسے ہم زاد یاد آ گیا، اس تمام عرصے میں
اس کی طرف سے ایک سنگل میسج تک اسے موصول نہیں ہوا تھا اور وہ جو ہمیشہ اس کے سامنے ایک ہی قول دہراتا تھا
کہ محنت اتنی خاموشی سے کرو کہ تمہاری کامیابی شور مچا دے۔ اب جبکہ اس کی کامیابی نے ہر طرف شور مچا رکھا تھا
وہی شخص جب کر کے بیٹھ گیا تھا اور اس کی یہ خاموشی آج سے پہلے شہر زاد کو کبھی اتنی بڑی نہیں لگی تھی۔

”آخر تم جھٹکتا کیا ہے خود کو، میں اس کی مبارک باد کے لیے مری جا رہی ہوں۔۔۔ ہونہ۔۔۔ کال کرے
گا بھی تو میں خود سے اس کیس کا تذکرہ نہیں کروں گی۔۔۔۔“ وہ دلی ہی دل میں کئی ارادے باندھ رہی تھی۔
”میم، آفس آگیا ہے۔۔۔“ وہ جو اپنی سوچوں میں الجھی ہوئی تھی، ڈرائیور کی آواز اسے حقیقت کی دنیا

میں لے آئی۔ وہ آفس پہنچی تو مسز قریشی کے دفتر میں ایک چھوٹی سی سیم پر انر پارٹی اس کی منتظر تھی، شہزاد کا دل محبت اور شکر کے گہرے احساس سے بھر گیا، وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کی کامیابی کو اتنے کھلے دل سے سراہا جائے گا۔

”مجھے یقین ہے تم بہت آگے جاؤ گی شیری۔۔۔۔۔“ مسز قریشی نے بے ساختہ اسے گلے سے لگا کر محبت سے پیش گوئی کی۔

”تھینک یو ایم۔ آپ کی سپورٹ چاہیے۔۔۔۔۔“

”بادی نے بھی بیسٹ وشر کا بیج چھجوا دیا ہے تمہارے لیے۔۔۔۔۔“ انہوں نے ایک کانکڑا اس کی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

”میری طرف سے انٹیل ٹھینکس کہہ دیجیے گا انہیں۔۔۔۔۔“ شہزاد نے مسکرا کر جواب دیا۔

”تم نے آج بڑے بڑوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے شیری۔۔۔۔۔“ بیر سٹر رضانے ہنس کر لقمہ دیا۔

”نہیں سیر میری ایسی مجال کہاں۔۔۔۔۔“ وہ مسکرائی۔

وہ اس کی زندگی کی ایک بہترین شام تھی جو اس کے کولیگز اور فرینڈز نے بہت خوبصورت بنا دی تھی، لیکن ان دلکش لمحات میں بھی وہ بار بار اپنا سیل فون اٹھا کر اس آس پر۔ دیکھتی کہ شاید اتنے ہلے گلے میں بیج کی ہپ سنائی نہ دی گئی ہو۔۔۔۔۔

ہو سکتا ہے کہ ہم زاد کی کال آئی ہو اور اسے پتا نہ چلا ہو۔۔۔۔۔ لیکن افسوس ایسا کچھ نہیں ہوا۔ اس کا ان پاس اس کے کولیگز اور فرینڈز کے مبارک باد کے پیغامات سے بھر گیا۔ لیکن بے شمار آنے والی کالز میں کوئی بھی نمبر اس شخص کا نہیں تھا۔

دو گھنٹے بعد اس خوبصورت پارٹی کا اختتام ہوا تو شہزاد نے بھی اپنے تمام کولیگز کا باری باری شکریہ ادا کیا۔ وہ اب اچھا خاصا تھک چکی تھی، ابھی تو سب ہی نے اسے اٹھنے کی اجازت دے دی تھی۔۔۔۔۔

”کیا ہوا گھر نہیں جاؤ گی کیا۔۔۔۔۔؟“ اسے اپنے آفس کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ کر ایڈوکیٹ علیہ نے حیرانی سے دریافت کیا۔

”ایک دوضوری فائلز لے کر جانی ہیں مجھے۔ وہی لینے جا رہی ہوں۔۔۔۔۔“ وہ پھیکے سے انداز میں مسکرا کر اپنے آفس کی طرف بڑھی۔

اس نے جیسے ہی ہینڈل گھما کر اندر قدم رکھا، خوشبوؤں نے اس کا استقبال کیا، پورے کمرے میں ایک مسور کن خوشبو نے اودھم مچا رکھا تھا، اس کی نظر اٹھی اور اسے خوش گواری حیرت کا ایک زوردار جھٹکا لگا، وہ منہ پر دونوں ہاتھ رکھے سخت بے چینی اور حیرت سے اپنے آفس کو دیکھ رہی تھی۔

اس کا چھوٹا سا دفتر بے شمار پھولوں کے رنگ برنگے گلدستوں سے بھرا ہوا تھا، میز، کرسی، ریک، کیبنٹ ہر طرف بکے ہی بکے تھے۔ لگتا تھا کسی نے پوری ہی دکان خرید کر اس کے آفس میں سجا دی تھی۔

”اوہ مائی گاڈ۔۔۔۔۔“ اس نے بے تابانی سے ایک گلدستہ اٹھایا، اس پر لگے گوش کارڈ پر ہم زاد نے اپنی رائٹنگ میں لکھا ہوا تھا۔

”میرے بس میں ہوتا تو آپ کی کامیابی پر میں پوری دنیا کے پھول اس ایک کمرے میں بھر دیتا۔۔۔۔۔“

شہزاد نے غلت بھرے انداز میں دوسرا بکے اٹھایا اس پر لگے گوش کارڈ پر بھی تحریر تھا۔

”پھولوں کی اگر کوئی زبان ہوتی تو آج کے بعد آپ مجھ سے بھی نہ پوچھتیں کہ میں آپ سے کتنی محبت کرتا ہوں۔۔۔“

شہزاد کی تو گویا قوت گویا کی ہی سلب ہو کر رہ گئی تھی، اس کی آنکھیں نہ جانے کیوں نم ہو گئیں، وہ باری باری مختلف بجے اٹھائی اور اس پر لگے و ش کارڈز پر لکھے جملے پڑھتی اور انہیں اتار کر اپنے بیگ میں احتیاط سے رکھتی جاتی۔ اس کا دل و دماغ اب مزید کچھ بھی سوچنے سے قاصر تھا۔۔۔ ہم زاد کی محبت اور چاہت کا اس سے پہلے کبھی اتنا گہرا احساس نہیں ہوا تھا اسے، اور اسے لگتا تھا شاید وہ اب اس موضوع پر اس سے بھی کوئی بات نہ کر سکے، اس نے اسے کچھ بھی کہنے کے قابل ہی کہاں چھوڑا تھا۔

☆☆☆

”جمل حسین کے وکیل کے تو پرچھے اڑا دیے اس دو ٹکے کی بیرسٹر نے۔۔۔“

میر حاکم ابھی ابھی میر مختتم کے ساتھ میر ہاؤس پہنچے تھے، اور ان کی آمد کے ساتھ ہی پورے گھر میں کھلبلی مچ گئی۔ خواتین جو چھٹی کے روز ذرا سستی سے ہی اٹھتی تھیں، صبح سویرے ان دونوں کی آمد کے ساتھ ہی ہر طرف امیر جسی طاری ہو گئی۔

اس وقت سب ہی خواتین بچن اور ڈانٹنگ روم کے چکر لگا رہی تھیں۔ میر حاکم علی کی موجودگی میں شاردہ بیگم اور ندرت بیگم بھی اپنے نمبر بنانے کے لیے خاصی متحرک ہو جاتیں، یہ الگ بات کہ تاج دار بیگم کے سامنے کسی کا بھی چراغ زیادہ دیر تک نہیں جل سکتا تھا۔ میر خاقان بھی خاموشی سے اپنے کمرے سے نکل کر ان کے پاس آکر بیٹھ گئے۔

”خیر بابا جان، دو ٹکے کی بیرسٹر ہوتی تو بھلا جمل حسین کا وکیل و قاص جنجوعہ اسے اپنے آگے ٹھہرنے دیتا۔۔۔“ میر مختتم نے دبے الفاظ میں اسے سراہا۔

”کچھ بھی ہے، ایک دفعہ تو لطف ہی آگیا، خود کو کوئی چیز سمجھنے لگا تھا جمل۔۔۔“ میر حاکم کا موڈ اپنے حریف کی شکست پر خاصا خوشگوار تھا۔

”رہی سہی کسر میڈیا نے پوری کر دی، اچھی طرح سے دھویا ہے اسے۔۔۔“ میر مختتم نے بھی تمسخرانہ انداز میں اپنا حصہ ڈالا۔

”جمل کو اب نا اہل ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا مختتم، لکھ لو تم یہ میری بات۔۔۔۔۔“

”وہ تو ٹھیک ہے بابا جان، لیکن اتنی اندر کی چیزیں اور شہوت باہر نکلے کیسے۔۔۔“ میر خاقان نے پہلی دفعہ اس گفتگو میں حصہ لیا۔

”جیسے تمہارے بھر مافیا کیس میں نکلے تھے، شجاع غنی جیسے مولے کو شاہین بنا کر لاکھڑا کیا تھا اس بیرسٹر شیریں نے۔“ میر حاکم علی نے اپنا سگارس لگاتے ہوئے ساتھ میں اپنے بیٹے کو بھی سلگایا۔ ان کے طنزیہ لہجے پر وہ تو جیسے انگاروں پر جا کھڑے ہوئے۔۔۔

”لیکن نیچہ گیا نکلا، آخر کیا باگاڑ لیا انہوں نے ہمارا۔۔۔۔۔“ خاقان علی نے بمشکل خود پر قابو پاتے ہوئے متحمل انداز میں کہا۔ ویسے بھی اپنے باپ کے سامنے ان کی کہاں چلتی تھی۔

”میری وجہ سے۔۔۔“ حاکم علی نے اپنا سینہ ٹھونک کر کہا۔ ”ورنہ اس چھٹانک بھر لڑکی نے تو تم دونوں بھائیوں کو بھی ایک دفعہ تکی کا ناچ نچا دیا تھا، بھول گئے یہ بات۔۔۔۔“ حاکم علی کا بے رحمانہ انداز میں کیا گیا تبصرہ سن کر خاقان علی دل ہی دل میں تپنملا کر رہ گئے۔

”اب آپ کے تجربے اور دالش مندی کا مقابلہ ہم تو نہیں کر سکتے بابا جان۔۔۔“ میرے مختشم نے خوشامدی انداز اپنایا جبکہ خاقان علی کا موڈ خراب ہو چکا تھا۔ وہ ابھی تک میرے مختشم کی طرح اپنے باپ کی ہاں میں ہاں ملانے کا ہنر نہیں سیکھ سکے تھے، تب ہی تو ان کے اپنے والد کے ساتھ تعلقات اکثر کشیدہ ہی رہتے اور اس بات کا احساس ان کو آج کل شدت سے ہونے لگا تھا۔۔۔

”بابا جان! ناشتہ لگواؤں۔۔۔۔۔“ تاج دار بیگم نے ہال کمرے میں جھانکا اور مسکرا کر پوچھا۔۔۔۔۔
 ”ہاں بھئی اور یہ بیچے نظر نہیں آ رہے، کیا گھر میں کوئی کرفیو لگا رکھا ہے تم نے۔۔۔۔۔“ میرے حاکم کے منہ سے یہ جملہ نکلنے کی دیر تھی، قسمت کا مارا شاہ میرے وہاں گھومتا ہوا آن نکلا۔

اگر اسے ذرہ برابر بھی یہ گمان ہوتا کہ بابا جان اپنی کابینہ کے ساتھ وہاں براجمان ہیں، وہ چھٹی کا سارا دن کمرے میں گزار دیتا لیکن ہال کمرے کا رخ نہ کرتا۔ داجی کی عقابانی نظریں شاہ میر پر پڑیں اور وہ جو وہاں سے کھسنے کے چکر میں تھا رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔

”میاں تم ملک و قوم کی خدمت کے علاوہ کبھی آتے جاتے اپنے بزرگوں کا بھی حال احوال پوچھ لیا کرو۔۔۔“ داجی کے طنز یہ انداز پر شاہ میر شپٹا گیا۔

”السلام علیکم داجی۔ آپ سے ہی ملنے آ رہا تھا میں۔۔۔“ اس نے بوکھلا کر جھوٹ بولا۔
 ”بیٹا، خواخواہ زحمت کی، مجھے بتا دیتے، میں خود حاضر ہو جاتا۔۔۔“ میرے حاکم نے شاہ میر کی طبیعت صاف کی اس کی پیشانی پر لکیروں کا جال گہرا ہوا۔

ڈائننگ روم میں تاج دار بیگم کے ساتھ ناشتہ لگاتی طوٹی نے یہ منظر دلچسپ نگاہوں سے دیکھا۔ وہ پردے کے بالکل پاس آ کر کھڑی ہو گئی جہاں شاہ میر کے علاوہ کوئی بھی اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ اس وقت سر جھکائے میرے ہاؤس کے بڑوں کے سامنے بیٹھا تھا۔ جن کی موجودگی میں ویسے ہی سب دبے پاؤں چلتے اور سرگوشیوں میں بات کرتے تھے۔

”ابھی تک کیپٹن بن کر ہی خواری کاٹ رہے ہو میاں۔۔۔؟“ داجی کی اس دل جلاتی مسکراہٹ کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

”ویسے مختشم! کہنے کو تو تین تین بیٹے ہیں تمہارے لیکن کام کا صرف وہاں ہی نکلا۔۔۔“ میرے حاکم نے حسب عادت لفظوں کے چابک کا استعمال کیا۔

”بس بابا جان۔۔۔۔۔ وہ شرمندگی سے بس اتنا ہی کہہ سکے۔
 ”برہان نے تو ماسٹری کر کے سارے خاندان کی ناک کوا دی اور اس پر مزید چار چاند لگا دیئے شاہ میر نے۔۔۔۔۔“ میرے حاکم علی نے بھی آج سب کا دل جلانے کی قسم کھا رہی تھی۔

”میری مانو چھوڑو، یہ ملک و قوم کی خدمت، سیاست میں آؤ، اپنے باپ دادا سے کچھ سیکھو اور اپنی زندگی بناؤ، اس دو ٹوٹے کی نوکری میں رکھا کیا ہے۔“ حاکم صاحب کی اس بات پر شاہ میر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا۔
 وہ ایک لفظ بھی منہ سے بولے بغیر غصے سے اٹھا اور لاؤنچ سے نکل گیا۔

شاہ میر کی اس حرکت پر سب ہی دم بخود رہ گئے، خود میرے حاکم علی بھی ضبط کے کڑے مراحل سے گزر رہے انہوں نے محض ملامتی نگاہوں سے میرے مختشم کو گھورا۔ جو اپنے بیٹے کی اس حرکت پر ڈھیروں خفت کا شکار دکھائی دے رہے تھے۔ تاج دار بیگم بھی گھبرا کر ہال کمرے میں نکل آئیں۔
 ”یہ تربیت کی ہے تم نے اس کی، سمجھتا کیا ہے یہ خود کو، بلاؤ اسے، معافی مانگے بابا جان سے۔۔۔“ مختشم

علی اپنے بیٹے کی اس حرکت پر آگ بکولہ ہوئے، اور سارا غصہ تاج دار بیگم پر اتا دیا۔۔۔
 ”طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس کی۔۔۔“ تاج دار بیگم نے پریشانی سے بہانہ گھڑا۔

”طبیعت تو اس کی میں سیٹ کرتا ہوں۔۔۔“ میر مختتم لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اس کے کمرے کی طرف بڑھے۔

میر خاقان نے طنزیہ نگاہوں سے اپنی بڑی بھالی تاج دار بیگم کی طرف دیکھا جو ہر اسان نگاہوں سے شاہ میر کے کمرے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

حاکم علی بظاہر خاموش تھے لیکن ان کے چہرے پر پھیلا غیر فطری پتھر یلا پن ظاہر کر رہا تھا کہ وہ اس وقت کس قیامت سے گزر رہے ہیں، ان کی تو آج تک کسی اولاد نے بھی ان کے سامنے سراٹھا کر بات کرنے کی جرات نہیں کی تھی اور کہاں ان کا پوتا احتجاجا ان کے سامنے واک آؤٹ کر گیا۔

شاہ میر تو کافی سالوں سے ان کی آنکھوں میں گھٹک رہا تھا، اس نے بھی تو باب دادا کی بے پناہ مخالفت کے باوجود آرمی جوائن کر کے اپنے اوپر ”باغی“ ہونے کا ٹھپہ لگوا لیا تھا لیکن اپنی خواہش سے دست بردار نہیں ہوا۔۔۔

”بے غیرت، گھٹیا انسان باہر نکلو۔۔۔“ مختتم علی اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے باہر لائے۔ ”یہی سکھایا گیا ہے تمہاری ٹریننگ میں تمہیں۔۔۔“ مختتم علی بلند آواز میں چیخے۔ سب ہی خواتین گھبرا کر ہال کمرے میں اکھڑی ہوئیں۔

درشہوار نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر خوف زدہ انداز سے یہ منظر دیکھا اور طوطی کی تو باقاعدہ ٹانگیں کانپ رہی تھیں، وہ دیوار کا سہارا لیے کھڑی تھی جبکہ انا بیہ کا تو رنگ ہی فق ہو گیا تھا وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے سامنے کا منظر دیکھ رہی تھی۔

”اب تم اپنے بزرگوں کے ساتھ بد تمیزی کرو گے بے غیرت انسان۔۔۔“ مختتم صاحب کے منہ سے بس جھاگ نکلنے کی گس رہ گئی تھی۔

”کچھ بتا بھی تو چلے، میں نے کیا کیا ہے۔۔۔“ شاہ میر باپ کی مضبوط گرفت سے اپنا بازو چھڑانے کی جدوجہد میں حلق پھاڑ کر چیخا۔

”بکو اس بند کرو، جا کر معافی مانگو بابا جان سے۔۔۔“ مختتم علی کا سفاک لہجہ طوطی کی ریڑھ کی ہڈی میں سننا ہٹ پیدا کر گیا۔

”کس چیز کی معافی۔۔۔؟“ شاہ میر کی آنکھوں سے بغاوت چھلکی۔ ”آخر میں نے کیا گستاخی کی ہے؟“ شاہ میر نے طیش سے مغلوب آواز میں کہا۔

”بکو اس کرتے ہو تم بڑوں کے سامنے، اور پھر پوچھتے ہو تم نے کیا کیا ہے۔۔۔“ مختتم علی نے غصے کی انتہا کو چھوتے ہوئے کھما کر ایک زوردار پھٹڑا اپنے بیٹے کے منہ پر دے مارا۔ سب ہی نے سانس روک کر یہ منظر دیکھا۔ درشہوار بھاگ کر برہان کو بلالانی جو خود بھی یہ سین دیکھ کر بوکھلا گئے تھے۔

”بد بخت انسان! باپ دادا کو آنکھیں دکھاتے ہو، آخر تمہاری اوقات ہی کیا ہے۔“ مختتم علی غضب ناک لہجے میں دھاڑے، برہان اور ارسل دونوں ان کے دائیں بائیں آکر کھڑے ہو گئے۔

”بابا جان پلیز کول ڈاؤن۔۔۔“ برہان نے مداخلت کی، جو اسے بھی مہنگی پڑی۔
 ”تم چپ رہو، تم کون سا کسی سے کم ہو، نکلے نکلے کی نوکریاں کر کے میر خاندان کے آباد اجداد کا نام

روشن کر رہے ہو۔“ انہوں نے برہان کو بھی ایک دم جھاڑ دیا اور ان کا چہرہ متغیر ہوا۔ ارسل نے برہان کے بازو پر ہاتھ رکھ کر انہیں خاموش دلاسا دیا۔

”بابا یہ اچھا نہیں کر رہے آپ۔۔۔“ شاہ میر نے انگلی اٹھا کر کہا۔ اس کے روتے میں دُور و نزدیک بھی کوئی۔ چلک نہیں تھی اور یہی بات اس کے باپ کا فشاں خون بلند کرنے کا سبب بن رہی تھی۔

”اب تم مجھے اچھے برے کی تمیز بتاؤ گے۔۔۔“ میر مختشم علی کی آواز ایک دبی دبی سی غراہٹ تھی۔

”شاہ میر بیٹا، جا کر اپنے داجی سے معافی مانگو۔۔۔ جاؤ میرا بیٹا۔۔۔“ تاجدار بیگم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے التجا کی۔

”جب میں نے کچھ کیا ہی نہیں تو معافی کس چیز کی مانگو۔۔۔؟“ شاہ میر نے ہونٹوں کو پھیلا کر استہزاء ایہ انداز سے بوجھا، اور مختشم علی اس باغیانہ انداز پر ایک دفعہ پھر مستعجل ہو کر اس کو مارنے کو لپکے لیکن اس دفعہ انہیں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

”بس بابا جان بس۔۔۔۔“ شاہ میر نے باپ کا ہاتھ درمیان میں ہی روک لیا۔

شاہ میر کی آنٹی گرفت کی مضبوطی پر مختشم تھوڑا ڈھیلے پڑے، اتنا تو وہ بھی جانتے تھے کہ پاک آرمی کی ٹریننگ نے ان کے بیٹے کو جسمانی طور پر خاصا مضبوط بنا رکھا ہے تب ہی تو وہ اچھا خاصا پھٹ کر کھڑا ہو گیا۔

”شاہ میر! اپنے باپ کا ہاتھ چھوڑو۔۔۔“ تاجدار بیگم خوف زدہ انداز میں بولیں تو شاہ میر نے جھٹکے سے باپ کا بازو چھوڑ دیا، وہ ہلکا سا لڑکھائے۔

”بھائی جان! لحاظ کارشتہ قائم رہے تو بہتر ہوگا، جو ان اولاد اور وہ بھی بیٹوں سے بچا لینا کوئی آسان کام نہیں۔۔۔“ میر خاقان کے ہونٹوں پر ایک زہریلے ہنس نے کروٹ لی۔ انہیں پہلی دفعہ بیٹیوں کا باپ ہونے پر فخر ہوا تھا۔

”اے کہو، ابھی اور اسی وقت میرے گھر سے نکل جائے میں ساری زندگی اس بد بخت کی شکل نہیں دیکھوں گا۔“ مختشم علی کا سارا لبہ ان کے چہرے پر سمٹ آیا۔ ان کے اس اعلان پر تاجدار بیگم ٹپ کر آگے بڑھیں۔

”کیا ہو گیا ہے مختشم صاحب، بچہ ہے، میں سمجھا دوں گی۔۔۔۔۔“ انہوں نے بوکھلا کر اپنے شوہر کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن مختشم صاحب اس وقت اپنے حواسوں میں ہی نہیں تھے۔

”یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے، تمہاری بے جا شہ پر یہ سورما بن کر باپ دادا کے سامنے آکھڑا ہوا ہے۔۔۔“ ان کا نفس مزید تیز ہوا۔ ”ایسا کرو تم بھی اس کے ساتھ ہی دفغان ہو جاؤ، میں نہ تمہاری اور نہ تمہاری۔۔۔۔۔“ بد بخت اولاد کی منحوس شکل دیکھنا چاہتا ہوں۔۔۔“

تاجدار بیگم کی رنگت خطرناک حد تک سفید پڑ گئی۔ وہ کسی سلی تجسس کی طرح ساکت ہوئیں۔

شارقہ بیگم اور ان کی سوتن ندرت بیگم کے دلوں میں ایک ساتھ کی چٹھلیاں پھونکیں۔ یہ منظر دیکھنے کی انہیں بہت سیالوں سے حسرت تھی۔ جو آج جا کر پوری ہوئی تھی لیکن میر حاکم علی نے ان کو کھل کر لطف اندوز ہونے کا موقع ہی نہیں دیا۔

”تاجدار! کہیں نہیں جائے گی، جس نے جانا ہے وہ جائے یہاں سے۔۔۔۔۔“ میر حاکم علی نے غضب ناک لہجے میں کمرے میں صورت پھونکا اور لہجے لہجے ڈگ بھرتے ہوئے ہال کمرے سے نکل گئے۔۔۔۔۔

شاہ میر نے اپنے اندر اٹھتی ناگواری کی لہر کو بڑی مشکل سے دبا یا اور ماؤں پٹختا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا، ٹھیک دس منٹ کے بعد وہ اپنا بیگ لیے اندر سے نکلا اور کسی کی طرف بھی دیکھے بغیر میر ہاؤس سے باہر نکل گیا۔ ارسل نے بوکھلا کر اس کا تعاقب کیا۔

☆☆☆

”مجھے لگتا ہے، میر ہاؤس میں کوئی بڑا ہنگامہ ہوا ہے۔۔۔“
سڑک پر جمی ہوئی برف پر مضبوطی سے قدم جماتے ہوئے سعد نے ہادی کی معلومات میں اضافہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔

وہ دونوں اس وقت سی ایم ایچ میں موجود اپنے ایک دوست کی عیادت کر کے واپس آرہے تھے۔ مری میں برف باری کا سلسلہ تو کچھ دیر کے لیے رک چکا تھا، لیکن سردی کی شدت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی اور سڑکوں پر پیدل چلنا بھی انتہائی مشکل تھا کیونکہ جگہ جگہ برف کے ڈھیر جمے ہوئے تھے۔
”خیر سے یہ وحی کب اتری آپ پر، کچھ روشنی ڈالنا پسند کریں گے۔۔۔“
ہادی نے طنزیہ انداز سے سعد کی طرف دیکھا، جس کی خواہشیں کی طرح ٹوہ لینے والی عادت ہادی کو اکثر ناگوار گزرتی تھی۔

”کچھ دیر پہلے ارسل کا کزن شاہ میر اپنا بیگ لیے غصے سے نکلا تھا اور ارسل اسے روکتے ہوئے بار بار کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔“ سعد نے کچھ دیر پہلے کا دیکھا ہوا منظر بیان کیا۔
”تو اس کا یہ مطلب تھوڑی سی کہ اندر کوئی جنگ پلاسی ہوئی ہوگی۔۔۔۔۔“ ہادی نے بیزار سی سر جھٹکا۔
”بے وقوف انسان! کچھ نہ کچھ تو ہوا ہی ہوگا، جو اچھا خاصا نوجوان جس کی اسی علاقے میں پوسٹنگ ہو، وہ اپنا بوریا بستر سیٹ کر اپنا گھر چھوڑ کر نکل آئے“

سعد نے اپنا ماہرانہ تجربہ اس کے سامنے پیش کیا۔

اسی وقت میر ہاؤس سے ایک لینڈ کروزر نکلی، ڈرائیونگ سیٹ پر میر خاقان علی کے ساتھ میر حاکم علی کو دیکھ کر ہادی نے بُرا سا منہ بنایا۔ وہ دونوں اب فٹ پاتھ پر چل رہے تھے۔ میر خاقان گاڑی میزائل کی طرح اڑاتے ہوئے لے کر جا رہے تھے۔۔۔۔۔
”یار کیا فٹسم کی لینڈ کروزر ہے، میرا تو دل آگیا ہے اس پر۔۔۔۔“ سعد نے گاڑی کی طرف دیکھ کر تبصرہ کیا۔

”دھیان سے۔ اس کے ٹائروں کے نیچے آکر کچلا گیا تو اس موسم میں قبر کھودنا بھی مشکل ہو جائے گی“ ہادی نے ہنس کر کہا۔

”دوے ایک بات ہے کہ میر حاکم علی کی پرسنالٹی ہے۔۔۔“ سعد نے کہا ہادی نے بُرا سا منہ بنایا۔
”ان کو دیکھ کر پتا ہے پہلا خیال کیا آتا ہے میرے ذہن میں۔۔۔۔“ ہادی چلتے چلتے رکا۔
”کیا۔۔۔؟؟؟“ سعد نے بتائی سے پوچھا۔

”یہ کہ شیطان کی جسم شکل سو فیصد یہی ہونی چاہیے۔۔۔“ ہادی جل کر بولا اور اس کی اس بات پر سعد نے حلق پھاڑتے ہوئے لگایا۔
”لو ایک اور فلمی سین دیکھ لو، ان محترمہ کو اس موسم میں بھی سکون نہیں۔۔۔“ ہادی کی نظر میر ہاؤس کے گیٹ پر پڑی۔

”یہ تو رو رہی ہے۔۔۔“ سعد بے چین ہوا، ہادی نے بھی غور سے دیکھا، وہ اپنے بازو کی پشت سے مسلسل بہتے ہوئے آنسو بے دردی سے صاف کر رہی تھی اور پھر وہ ان کی مخالف سمت میں چلنا شروع ہو گئی تھی اس لیے سعد اور ہادی کو اب اس کی صرف پشت دکھائی دے رہی تھی، وہ ان سے چند فٹ کے فاصلے پر تھی۔

”ماگل ہو گئی ہو در شہوار، اس وقت جاؤ گی میس، گولی مار دے گا میرا تمہیں۔۔۔“ ارسل اس کے ساتھ چلتے چلتے اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا اور اس نے تو شاید نہ سمجھنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

”تم میری بات سمجھ کیوں نہیں رہی ہو در شہوار۔۔۔“ ارسل نے غصے سے اس کا بازو پکڑ کر رکھا۔ وہ دونوں اب عین ہادی کے گھر کے گیٹ کے سامنے کھڑے بحث کر رہے تھے اور سعد اور ہادی کھڑے ان کی گفتگو سن رہے تھے اور وہ ان کی موجودگی سے ابھی تک بے خبر تھے۔۔۔

”مجھے بس بات کرنی ہے میرا بھیا، ان کو واپس لانا ہے۔۔۔“ وہ بات کرتے کرتے ایک دفعہ پھر رو پڑی۔

”میں فون پر بات کروا دیتا ہوں تمہاری۔۔۔“ ارسل نے نرم لہجے میں ایک نئی تجویز دی۔

”نہیں، میں خود جاؤں گی۔۔۔“ وہ بھی اپنی ضد پر اڑی تھی۔

”دامغ خراب ہو گیا ہے تمہارا، وہاں جا کر نیا تماشا کری ایٹ کرو گی۔۔۔ چلو واپس۔۔۔“ ارسل نے اس دفعہ قدرے سختی سے کہا اور در شہوار کا بازو پکڑ کر اسے زبردستی واپس گھر کی طرف لانے کے لیے مڑا تو ان دونوں کو سامنے دیکھ کر بے حد خجالت کا شکار ہوا۔

در شہوار کا چہرہ آنسوؤں کی زیادتی سے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ اس وقت کسی ذہنی خلفشار کا شکار لگ رہی تھی۔

”ازایوری تھک اؤ کے۔۔۔؟“ سعد نے ہلکا سا جھجک کر پوچھا۔

ہادی کی نظریں پہلی دفعہ شعوری طور پر در شہوار کی طرف اٹھیں، وہ اس وقت اپنا نچال بے دردی سے کاٹ رہی تھی اور اس کا سارا وجود ہلکے ہلکے کانپ رہا تھا، ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی بڑے صدمے سے گزری ہو۔

”آپ لوگ اندر آ جائیں پلیز۔۔۔“ ہادی نے انسانی ہمدردی کے جذبے کے تحت کہا۔ در شہوار نے آنسوؤں سے لمبا لب نظریں اٹھا کر ہادی کی طرف دیکھا، ان میں ہزاروں شکوے چل رہے تھے، وہ بے اختیار نظریں چرا گیا، وہ تیز تیز قدم اٹھائی اپنے گھر کی طرف بڑھ گئی۔

”سب تھیک ہے ناں۔۔۔؟“ سعد نے محتاط انداز میں پوچھا۔

”ہاں یار۔۔۔۔۔ وہ بس۔۔۔۔۔“ ارسل نے اپنے ہاتھ کی دوا انگلیوں سے اپنا ماتھا مسلتے ہوئے بمشکل اتنا ہی کہا۔۔۔۔

”اٹس اوکے، چلو ہماری طرف، ایک کپ کافی کا ہو جائے۔۔۔۔“ سعد نے موضوع بدل کر اس کی مشکل آسان کی تو وہ پھیکے سے انداز میں مسکرا دیا۔

”نہیں یار، پھر سہی، ابھی گھر جانا ہے مجھے۔۔۔۔۔“ وہ کافی پریشان لگ رہا تھا۔

”اوکے۔۔۔!“ سعد نے تھوڑا سا سہت کر اسے جانے کا راستہ دیا، وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اپنے گھر کی طرف چل دیا اور سعد اور ہادی اپنے

گھر کا گیٹ کھول کر اندر داخل ہوئے۔۔۔ مری کے موسم نے ایک دفعہ پھر پلٹا کھایا اور دیکھتے ہی دیکھتے روٹی کے گالوں جیسی برف ایک دفعہ پھر زمین پر سفید رنگ کی چادر بچھانے لگی۔

☆☆☆

ایک بے نام سا اضطراب رومیصہ کے پورے وجود میں چٹکیاں بھر رہا تھا۔ اسے ٹینا ہاؤس میں واپس آئے ہوئے پورے چوبیس گھنٹے ہو چکے تھے اور ابھی تک ارسل نے اس سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا، وہ اسے اپنے گھر کا پی ٹی سی ایل نمبر دے کر آئی تھی اور اس تمام عرصے میں اس کا سیل فون نہیں کھو گیا تھا اور وہ ابھی تک نیا نمبر اور فون خرید نہیں سکی تھی۔

اس نے کچھ سوچ کر ٹینا بیگم کا نمبر ملایا، جو تیسری ہی بیل پر اٹھالیا گیا تھا۔ ”ہاں رومی، بولو۔“ ٹینا بیگم کو اندازہ تھا کہ اس نمبر سے اس وقت رومیصہ ہی نہیں کال کر سکتی ہے۔

”مام پلیز، آپ نے میرا سیل فون اور سم کارڈ لیا۔۔۔“ اس کی بے چینی پر وہ مسکرائیں۔

”ہاں ڈارلنگ۔۔۔ میری گاڑی میں رکھا ہے۔۔۔“

”تو کب آئیں گی آپ واپس۔۔۔؟“

”بس راستے میں ہوں۔ تم نے کھانا کھایا۔۔۔“

”جی۔۔۔“ اس نے بیزارگی سے کہہ کر فون بند کر دیا۔

رومیصہ نے کچھ سوچ کر ارسل کا نمبر ڈائل کیا جو اسے ازبر تھا۔ اس کی کال پہلی ہی بیل پر کاٹ دی گئی، رومیصہ کے دل پر گھونسا سا پڑا۔ اس نے کچھ سوچ کر دوبارہ اس کا نمبر ملایا جو اس دفعہ اٹینڈ کر لیا گیا تھا۔

”ارسل کہاں ہو، رومیصہ بات کر رہی ہوں۔۔۔“ وہ بے تابی سے گویا ہوئی۔

”آئی ایم سوری یار، میں اس وقت ایک اہم مسئلے میں الجھا ہوا ہوں، رات کو اسی نمبر پر کال بیک کروں گا۔۔۔“

ارسل نے مزید اس کی کوئی بھی بات سننے بغیر کال کاٹ دی، جس سے اسے ایک دفعہ پھر دھچکا سا لگا تھا۔۔۔

اس نے بیزارگی سے کارڈ کیس فون کاؤچ پر پھینکا اور لاؤنج میں ٹھیلنے لگی، ٹھیک پانچ منٹ کے بعد لاؤنج کا دروازہ کھلا اور شہزاد کا مسکراتا ہوا چہرہ نظر آیا۔ بلیک جینز پر وہ سرخ کلر کا بڑا اسمارٹ سا سویٹر پہنے ہوئے خاصی اسٹائلش لگ رہی تھی۔

”ہائے رومی، ہاؤ آر یو۔۔۔“ شہزاد نے آگے بڑھ کر بے ساختہ اس کے گالوں پر پیار کیا۔

”فائن۔۔۔“ رومی کا دل اس وقت لفسردگی کے گہرے اثرات کے زیر اثر تھا لیکن پھر بھی وہ زبردستی مسکرا دی۔ اچانک اس کی نظر شہزاد کے پیچھے کھڑے ایک ہینڈسم سے نوجوان پر پڑی، جو پولیس یونیفارم

شائع ہوئے ہیں

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لئے خوبصورت ناول

خوبصورت مردان

خوبصورت عورتیں

مشہور ناول

آفسٹ

☆ تتلیاں، پھول اور خوشبو راحت جبین قیمت: 250 روپے

☆ بھول بھلیاں تیری گلیاں فائزہ افتخار قیمت: 600 روپے

☆ محبت بیاں نہیں لہنی جدون قیمت: 250 روپے

منیوال کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37۔ اردو بازار، کراچی۔ فون: 32216361

میں تھا۔ ”ارتضیٰ! یہ ہے میری کیوٹی سسز رومیصہ۔۔۔“ شہر زاد نے تعارف کی رسم نبھاتے ہوئے اس شخص کو مخاطب کیا۔

”ہائے رومیصہ، کیسی ہیں آپ۔۔۔“ ارتضیٰ حیدر نے دوستانہ انداز میں اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ رومی نے ہلکا سا ہاتھ چھو کر سوالیہ نگاہوں سے شیریں کی طرف دیکھا۔ ارتضیٰ حیدر کے ساتھ یہ اس کی پہلی ملاقات تھی۔

”یہ ارتضیٰ حیدر ہیں، میرے بہت اچھے دوست۔۔۔“ شہر زاد نے مسکرا کر اس کے ان کپے سوال کا جواب دیا۔ ”تمہارا رومیٹ والا کیس یہی فالو کر رہے ہیں، یہ تم سے کچھ سوالات پوچھنا چاہتے ہیں۔“

”کیسے سوال۔۔۔؟“ رومیصہ تھوڑی سی خوف زدہ ہوئی تو دونوں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”ارے آپ کیوں ڈر رہی ہیں انہیں۔ میں ایسا کچھ نہیں کرنے والا۔۔۔۔۔“ ارتضیٰ نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

”رومی، میری بہن ہے، ڈرتی نہیں بلکہ لوگوں کو ڈراتی ہے۔“ شہر زاد نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”رومی! تم ارتضیٰ کو کمپنی دو، میں اپنے ایک دو ڈاکومنٹس لے کر آئی ہوں ابھی۔“

شہر زاد دانستہ اسے ارتضیٰ کے پاس چھوڑ کر اپنے کمرے میں آگئی، وہ جاہتی تھی کہ ارتضیٰ اس سے بے تکلف انداز میں ساری باتیں پوچھ سکے جو اس کے کس میں آئندہ اس کے کام آسکتی تھیں۔

اپنے کمرے میں آ کر وہ بڑے سکون سے فریش ہوئی، بالوں میں برش کر کے اس نے ایک دو ڈاکومنٹس اپنے لیپ ٹاپ سے یو ایس بی میں کاپی کیے اور تقریباً بیس پچیس منٹ کے بعد وہ لاؤنج میں آئی تو ارتضیٰ اکیلا بیٹھا ہوا پر سکون انداز میں چائے پی رہا تھا۔

”ارے، رومی کہاں گئی۔۔۔؟“ وہ حیران ہوئی۔

”اس کی کوئی کال آگئی تھی، ابھی گئی ہے یہاں سے۔۔۔“ اس نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

”کال۔۔۔؟ کہاں پر۔۔۔؟ اس کے پاس تو ابھی سیل فون ہی نہیں۔۔۔۔۔“ وہ چونکی تو ارتضیٰ بھی تھوڑا سنبھل کر بیٹھ گیا۔

”پی پی سی ایل پر۔۔۔۔۔“

”اوہ اچھا۔۔۔ یہ بتائیں کہ کیا نتیجہ نکلا ساری گفت و شنید کا۔۔۔؟“ شہر زاد نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”آپ کو شاید اچھانہ لگے۔۔۔۔۔“ وہ محتاط انداز میں گویا ہوا۔

”مطلب۔۔۔۔۔؟“ وہ الجھئی۔۔۔۔۔

”رومیصہ بہت سی باتوں میں جھوٹ بول رہی ہے۔۔۔“ ارتضیٰ کی بات پر شہر زاد کو شک لگا۔ وہ سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

”ایسا لگتا ہے جیسے وہ اس اغوا کے کیس میں کسی کو دانستہ طور پر بچانا چاہتی ہے۔۔۔“ ارتضیٰ کے منہ سے نکلنے والی اس بات نے شہر زاد پر سکتہ طاری کر دیا تھا۔ اور اسے لگا جیسے کسی نے اس کی قوت گویائی سلب کر لی ہو۔ اس کے دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

حجرتوں کے آئینے

جوں ہی اس نے کھڑکی کھولی، ایک بارگی برف
بار ہواؤں نے اس کے رخساروں کو بوسہ دیا۔ برف
بار ہوا بھی اس کے اندر چمکتی سکتا ہوئی اس آگ کو

رات کا پچھلا پہر تھا۔ بخ بستہ ٹھنڈی ہواؤں
کی سرد سرگوشیاں شرشر رکائوں میں کوئی ایسے راگ
الاپ تھیں۔ جیسے کسی کی صدا کی بازگشت ہو۔ انمول
نے نہاں خانوں میں چمکتی بے چینی کو سوانیزے پر پایا
تو ہراساں ہو کر اچانک کھڑکی کے پاس آ گئی۔
لگتا تھا جیسے اس تنہائی میں رات کی تاریکی میں
ہوا کے دوش پر ہلکورے لپکتی کوئی صدا اُٹھی ہو، اس کو
پکارا ہو۔
”انمول۔ انمول۔“



ٹھنڈا کرنے سے قاصر تھی، کمر میں کپٹی یہ ادا اس راتیں تو اس آگ کو جیسے اور بھڑکا دیتی تھیں۔ ان ہی راتوں میں اس نے پہلی مرتبہ موی کو دیکھا تھا۔
موی کا تصور آتے ہی دل میں اک میٹھی سی کسک اٹھی تھی جو بعد ازاں میس بن گئی تھی۔

میں اپنے بستر پر نیم دراز
خنک آئی ہواؤں سے

پوچھتی ہوں

وہ کیسا ہوگا

نخل برداز مجھے اڑائے لے جاتی ہے

کشاں کشاں

ان ہی درو بام کی جانب

کیوں ویران ہے یہ دل کی چوکھٹ

کسی لپیک کی صدا کو جنتی ہی نہیں

کسی زنجی پرندے کی سستی ہوئی آخری پکار ہو

جیسے

دو گرم سیال آنسو اس کی آنکھوں سے چھلک کر

رخساروں پر ڈھلک سے گئے تھے۔ سوچ پر لگائے

کشاں کشاں اسے ماضی کی پگڈنڈیوں پر لے جانے

لگی تھی۔

☆☆☆

عالم حیات وضع دار اور اصول پسند انسان

تھے۔ انہوں نے بیٹوں اور بیٹیوں کے زندگی

گزارنے کے الگ الگ معیار کے پیمانے مقرر کر

رکھے تھے۔ شملہ ادنچا تھا۔ دوسروں کی نظریات کی

عینک لگا کر جیتے رہے۔ والدہ حیات نے انہیں ایک بڑی

آپاکلکھم تھیں جنہوں نے ساری زندگی بھائی کو اپنے

اشاروں پر چلایا تھا اور یہی سبق پڑھایا تھا کہ بیوی کو

سر پر نہیں بٹھایا جاتا بلکہ بیوی تو پاؤں کی جوتی ہوتی

ہے جب چاہو پہن لو اور جب چاہو اتار کر دوسری

پہن لو۔

نامعلوم اس معاملے میں وہ کیوں مار کھا گئی

تھیں کہ بھابھی کو ہر طرح کی تکلیف اور اذیت سے

دو چار کرنے کے باوجود سوکن کا دکھ نہ دے پائی تھیں
اور اپنے بھائی کو عقد ثانی پر کسی طور آمادہ نہ کر سکی
تھیں۔ یہ بھی ایک معرہ ہی رہا۔ بیوہ بہن بیٹیں بھائی
کے گھر رہائش پذیر تھیں۔ اگر چہ توہ لینے کی عادت
سے مجبور ہو کر بہنوں اور چھوٹے بھائی کے گھر کے بھی
چکر لگاتی رہتی تھیں۔

ہر طرف لگائی بھائی اور مصیبت تباہی لانے کی

منطق پر عمل پیرا تھیں۔ کئی بار کے آزمودہ حربے

آزما تیں اور سرشاری کی کیفیت سے دو چار فاح عالم

بن کر لوٹ آتی تھیں۔

عالم حیات کے فیصلوں کی ڈڈر کلثوم کے ہاتھ

میں تھی۔ جدھر چاہتیں موڑ دیتی تھیں۔ عالم حیات بھی

وہیں مڑ جاتے تھے۔

زہرہ بیگم کے تین لعل تین بیٹے تھے۔ عامر،

حاشر اور ذاکر، مگر یکے بعد دیگرے آغاز میں تین

بیٹیوں کی پیدائش ان کے گلے کا طوق بن چکی تھی۔

پھر وہ دوبارہ سراٹھا کر نہ دیکھ سکی تھیں۔ اگر کبھی تین

بیٹوں اور سپوتوں کے زعم میں سراٹھانا بھی چاہا تو ان

کی گردن جھٹک دی گئی۔

اسی صف میں ردا اور صبا تھیں اور آخر میں سب

سے چھوٹی انمول تھی۔ اگرچہ حیات عالم بیٹیوں کو

پاؤں کی زنجیر تصور کیا کرتے تھے۔ نند اور بھابھی کی

ردائی چپقلش میں بیٹیوں کی کوئی وقعت نہ رہی تھی،

کلثوم آپا کی تعصب کی نظریات کی عینک لگا کر عالم

حیات بیٹیوں کو پاؤں کی جوتی تصور کیا کرتے تھے۔

کلثوم آپا کسی طور خوش ہونے والوں میں سے تھیں ہی

نہیں۔ بہنیں شروع سے ہی اپنے بھائیوں کے مقام

کے فرق سے بخوبی واقف تھیں، مگر انمول چھوٹی تھی۔

جب بیٹی بھر کر آموں کی لٹائی جاتی اور دان کے طور پر

چند بچی بھی گٹھلیاں آتی تھیں۔ باقی بہنیں راضی

خوش کھالیتی تھیں، مگر انمول ناک بھوں چڑھانی

تھی۔

”میں نہیں کھاؤں گی اور نہ ہی یہ خیرات مجھے

گوارا ہے۔“ انمول کا منہ بن جاتا تھا۔

”کم عقل! میری بہن کی سسرال کی تعریفوں

کے ڈنگے ہر سو بچتے ہیں۔ آخر میری بہن کا سسرال ہے، تم اپنی ناقص عقل اپنے پاس ہی رکھو۔“

یوں صبا کی شادی کی تیاریاں۔۔۔ عروج پہ تھیں۔ صبا کم صمی کیفیت سے دو چار تھی۔ شادی میں سب اہل خانہ خوش باش تھے سوائے خود صبا اور زہرہ بیگم کے۔ ایک خوف سا حائل تھا دل کی خوشی میں نامعلوم، کیسے لوگ ہوں گے، یہ بھی کسی بدلے کی باداں میں تجویز کردہ سزا تو نہیں۔ کوئی سازش تو نہیں چلشوم آیا؟

لا تعداد سوالات، اور خوف و ہراس تھا دل کے

نہاں خانوں پر دستک دیتا ہوا۔ جس گھر میں بھئی کی جلتی رنگ بھی گناہ کے مترادف تھی۔ آج ڈھولک رچی گئی تو سب سے چھپ کر راگ الاپنے والی بہنوں کو بھی علی الاعلان ڈھولک کی لے پر سر بکھیرنے کا موقع مل گیا۔

سبز اور پیلے کا دلانی کپڑوں میں وہ غضب ڈھا رہی تھی۔ وہ پوری ترنگ میں تھی جب لڑکے والوں کے مہندی لے کر آنے کا شور اٹھا تھا۔ پھر لڑکے والوں اور لڑکی والوں میں گیت سنگیت کی مقابلہ بازی شروع ہوئی۔ نامعلوم کیوں انمول کو یوں لگا کہ وہ کسی کی نظروں کی حصار میں ہے۔ اس نے کئی بار پلٹ کر دیکھا تھا، مگر اس غالب احساس سے چھٹکارا حاصل نہیں کر پا رہی تھی۔ خاموشی سے ڈھولک ردا کو تھا کر رفو چکر ہو گئی تھی۔

وہ لان کے عقبی جانب آ گئی تھی۔ کرسی پر بیٹھی کچھ طو لسی تھی۔ بہنیں کس قدر جلد پرانی ہو جاتی ہیں تب ہی آہٹ پر چونک کر اس نے دیکھا۔ گہری ڈارک براؤن آنکھوں میں جگنوؤں کے دیپ جلتے ہوئے لودیتے ہوئے، محبت کا کوئی انوکھا اعتراف کر رہے تھے۔ وہ ششیاں لگی تھی۔ قبل اس کے کہ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ مقابل میں سامنے آ گیا تھا۔

”سنیں، آپ واقعی اس کس قدر حسین ہیں یا

روتی بسورتی صورت دیکھ کر اماں اسے چپکے سے بچن کا اشارہ کرتی تھیں اور چھپا کر رکھا ہوا پورا لقمہ اس کو دے دیتی تھیں اور وہ بھی چپکے سے کھا لیتی تھی اور امی اس کی محبت میں وارے صدقے جانی تھیں۔ عامر بڑے تھے اور بھوہوا کی روش پر قدم بہ قدم چلتے ہوئے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تھا۔ ذرا جو کوئی تہن کھلکھلا کر ہنس لیتی تو وہیں اسے جڑ دیتے تھے۔ پھوپھو کلشوم کا سمجھایا تھا کہ بھائی چھوٹے ہوں تو بھی وہی بڑے اور مختار کل ہوا کرتے ہیں اور بہنوں کے ہر طرح کے اچھے برے فیصلوں کے مجاز ہوا کرتے ہیں۔

اما اپنے ہونہار سپوت کے تیور دیکھ کر دل ہی دل میں کھل اٹھتے تھے، مگر سردمہری کی چادر اوڑھے رکھتے تھے کہ ان کی بے تحاشا خوشی ہی ان کے چہرے پر ہلکی سی نرمی لپاتی تھی۔

ابا کی سردمہری کے باوجود گھر میں واحد انمول ہی تھی جو خوشی اور طراری سے ادھر سے ادھر تپتی کی مانند اڑتی پھرتی تھی۔ ابا کے سامنے وہ بھی جب کی مہر لبوں پر زبنت لیے سر جھکائے پھرتی تھی۔ گھر میں وہی دن خوشیوں سے پر ہوا کرتے تھے جب پھوپھو چھوٹے چاچو کی طرف جاتی تھیں۔ نامعلوم وہاں کیا حالات رونما ہوتے تھے، مگر یہاں راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔

☆☆☆

آج کل بھی پھوپھو، چاچو کی طرف تھیں۔ گھر بھر میں جیسے خوشیوں نے ڈیرہ جیمایا ہو، مگر پھوپھو کی واپسی کسی دھماکے سے کم نہ تھی۔ وہ صبا کے لیے اپنی نند کے بیٹے کا رشتہ لانی تھیں، چونکہ یہ رشتہ پھوپھو کا منتخب کردہ رشتہ تھا تو انکار کوئی جواز ہی نہ تھا۔ اس دھماکا خیز خبر نے گھر کی خاموش فضا میں ارتعاش سا پیدا کیا تھا۔ اماں نے مبہم انداز میں تحقیق کروانے کو کہا تو ابانے انہیں کم عقل گردانتے ہوئے ایسے طعنے دیے کہ وہ کہہ کر خود ہی شرمندہ ہوئیں۔

مجھے ہی اتنی حسین دکھائی دے رہی ہیں۔“
وہ سخت متعجب ہوئی تھی تب ہی ردا کی آمد پر وہ
پلٹ گیا تھا۔

”موسیٰ نام ہے میرا اور آپ کا؟“ وہ جیسے اس
کے پلٹ جانے کی ہی جیسے منتظر تھی جھٹ تیزی سے
بھاگی تھی۔

گہری ڈارک براؤن آنکھیں، گندی رنگت،
اونچا قد، دل نشیں خدوخال کا مالک موسیٰ بے حد
وجہ بہ وجہ صورت تھا۔ یہ اس کی موسیٰ سے پہلی
ملاقات تھی۔ مہندی کی پوری تقریب میں وہ موسیٰ کی
نظروں کی پیش سے گھبرائی اور شرماتی رہی۔ وہ ایک
لڑکی تھی اور صنف نازک کو رب العزت نے یہ خوبی
ودیعت کی ہے کہ وہ نظروں کا بھید بھاؤ خوب جانتی اور
پہچانتی تھی۔

سیاہ ستاروں کی جھلجھل کرتی فراک میں اس کا
دمکتا روپ بھل سا گیا تھا۔ موسیٰ کی گہری ڈارک
براؤن کے حصار میں رہنا نامعلوم کیوں اسے خوش
لگائی میں مبتلا کرنے لگا تھا۔

کوئی تو ایسا ہے جو صرف اس کا خواستگار ہے۔
اس کی چاہت کا متنی ہے۔ اس کے روپ کو سراہتا
یہ ہے۔ اب اس کی آنکھیں بھی ان دیکھے خوابوں کی
تعبیر کی خواہاں تھیں۔

اگلے دن رخصتی کے دن سیاہ کا مڈار سوٹ پر
سفید ستاروں والی کپکپاشاں نے اس کے چہرے پر بھی
دھنک رنگ بکھیرے ہوئے تھے۔ موسیٰ بے حد

جذب کی کیفیت سے دوچار انمول کے حسن جاواں
میں کھوسا گیا تھا۔ سارے چہرے فقط اس ایک
چہرے کی رعنائی کے سامنے کس قدر پھیکے اور
دھندلا سے گئے تھے۔ موسیٰ، پرویز بھائی کا دور کا عزیز
تھا، مگر پرویز بھائی کا گہرا دوست تھا۔

کھٹ کھٹ کھٹ، کئی تصاویر وہ لمحہ بھر میں
انمول کی لے چکا تھا۔ ہنستے ہوئے، کلکلاتے ہوئے
انفرادی و حزن سیٹھے چہرے پر وہ انمول تھی۔ وہ حقیقتاً
موسیٰ کے لیے بے حد انمول تھی۔ رخصتی کے وقت

انمول سسک سسک کے روئی تھی۔ بہن کی جدائی
کا غم اسے ستا رہا تھا۔ موسیٰ اس کے کان کے پاس
آ کر ہو لے سے بولا۔

”مانا کہ روتے ہوئے بہت حسین لگتی ہیں، مگر
اب بس بھی کر دیں۔ دل کو گراں گزر رہا ہے آپ
رونا۔“

وہ ہڑبڑا کر رونا دھونا سب بھول بھال گئی تھی۔
پھر صبا امی اور ابا کی دعاؤں کے حصار میں رخصت
ہو کر روئی ہوئی پیا کے گھر سدھار گئی تھی۔
الوداعی منظر میں موسیٰ کی آنکھوں کا ارتکا
آخری لمحے تک انمول کو حصار میں لیے رہا۔

☆☆☆

سب ہی اداس اہل خانہ کل دعوت ولیمہ کے
خیال سے نئے عزم کے ساتھ کھو خواب ہو چکے تھے۔
تحفہ انمول کی آنکھوں سے نیند روٹھ سی گئی تھی۔ اس
نے کسل مندی سے کروٹ لی تھی اور آنکھیں موندی
تھیں۔

دو گہری ڈارک براؤن آنکھیں اس کو مسکراتے
ہوئے تک رہی تھیں۔ انمول نے گھبرا کر آنکھیں
کھول دی تھیں۔ محبت یوں ہی بسا اوقات اپنا وار
چلائی ہے کہ کوئی جائے پناہ نہیں ملتی وہ۔ ساری رات
گھٹکاش کا شکار رہی پھر خود کو اسیر محبت ہونے سے
روکتے روکتے تھک پاری گئی اور دل کو انکار کرتے
کرتے غڈ حال سی ہو گئی اور پھر اس نے رات کے
پچھلے پہر خاموشی سے موسیٰ کی محبت پر لبیک کہہ دیا تھا۔

محبت نے انمول کو لاچار بنا ڈالا تھا اور موسیٰ
کے اظہار محبت پر اس نے اقرار کی مہر ثبت کر ڈالی
تھی۔ شرماتی گھبرائی وہ کس قدر حسین لگ رہی تھی۔
”کل میں واپس جا رہا ہوں۔ جاتے ہی اماں
کو بتاؤں گا کہ میں نے اس کے لیے ایک حسین کر
بہو تلاش کر لی ہے۔“

محبت انسان کو نڈر بنا دیتی ہے۔ وہ سب کو
مصروف دیکھ کر موسیٰ کے ساتھ شادی۔ ہال کے
دروازے سے دوسرے حصے میں آ گئی تھی جہاں کس

اور ہی شادی کا فکشن چل رہا تھا۔ جدائی کے احساس نے انمول کو بے حد آرزو کر دیا تھا۔

موسیٰ بنا کہے اس کے چہرے پر بکھرے حزن کے رنگ پہچان گیا تھا اور درحقیقت محبت کا ہی اعجاز تھا کہ محبت بنا کہے بنا بولے ہی محبوب کے ہر احساس سے آشنا کر دیا کرتی ہے۔

”دیکھو پلیز..... اداس مت ہو۔ انمول محبت اتنی کمزور تو نہیں ہوتی۔ میں جلد آؤں گا کوئی جھوٹی تسلی اور دلاسہ نہیں بلکہ یہی سچ ہے۔ یہ میرا کائناتیک نمبر ہے۔ تم جب چاہو مجھے پکار لیتا۔“

موسیٰ کی محمور آواز جذبات کی شدت سے بھاری ہو رہی تھی۔ وہ اسے بہلانے کے جتن کر رہا تھا اور وہ دل گرفتہ سی نم آنکھیں لیے بیٹھی تھی۔

موسیٰ نے بڑھ کر اس کی نم آنکھوں سے آنسو پونچھ ڈالے تھے۔ موسیٰ کی آنکھوں میں آس کے دیپ تھے جنہیں انمول نے بڑھ کر تمام لیا تھا۔ پھر موسیٰ انمول کو روتا بلکتا چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

موسیٰ اپنے وعدوں کی پاس داری میں سچا تھا۔ اسی آس و نواس کے عجیب منہ میں ابھی انمول اپنی محبت کا تاج محل سجانی سنواری رہتی تھی۔ تب ہی صا شادی کے بعد پہلی مرتبہ گھر آئی تھی۔ گھر بھر میں چہل پہل تھی۔ صا کی شرمیلیں مسکراہٹ بات بے بات مسکراتے لب اور کسی بات پر اچانک چونک جانا اس کے چہرے پر ————— انوکھے رد پہلے رنگ بھرے تھے۔

انمول بھی تو ست رنگی پھوار میں بھگ رہی تھی۔ وہ کمرے میں گہری سوچ میں ڈوبی چہرے پر دل شیں مکان سجائے موسیٰ کے خیالات میں گم تھی جب صبا آگئی۔ صا کی کھوجتی نظروں میں اسرار تھا۔ تذبذب کی کیفیت تھی۔ یوں جیسے الفاظ تراش رہی ہو۔ مدعا بیان کرنے سے قبل لفظوں کو سنوار رہی ہو۔

”کیا سوچ رہی ہو انمول جو اس قہر حسین رنگ تمہارے چہرے پر بکھر گئے ہیں۔“ انمول بری طرح چونک گئی تھی۔ یوں جیسے اس کی محبت کی چوری

پکڑی گئی ہو۔

”نہیں تو، مجھے بھلا کیا سوچتا ہے؟“ انمول نے جھٹ انکار کر دیا۔

”اچھا باہر پرویز کے ساتھ کوئی اور بھی آیا ہے۔ پوچھو گی نہیں کون ہے وہ۔“ صبا کے انداز پر انمول کا دل دھڑک اٹھا۔

”کون؟“ انمول کو اپنی آواز کی بازگشت سنائی دی۔

”وہی جس کو تم نے سہانے سینے دکھائے ہیں۔ آس دلائی ہے۔ تم لڑکیاں چار لفظ کیا پڑھ لیتی ہو۔ خود کو عقل کل سمجھنے لگی ہو۔ جانتی ہونا ابازات سے باہر شادی بیاہ کرنے کے قابل نہیں ہیں اور پھر بھی تم محبت کا سودا کر بیٹھیں۔“ صبا نے بھی دو ٹوک بات کرنے کی ٹھان لی تھی۔ اس وقت تمام اہل خانہ پرویز اور موسیٰ کی آؤ بھگت میں لگے تھے۔

”آپا! کیا آپ کو وہ سچا نہیں لگتا؟ کیا یہی دلیل کافی نہیں ہے اس کی محبت کی سچائی کو ثابت کرنے کے لیے کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ آپا! میری آنکھوں سے رو پہنی کرنوں والے خواب مت چھینو۔ ابھی تو ان آنکھوں نے محبت کے تاج محل میں رنگ بھرنے شروع کیے ہیں۔ ابھی سے ان رنگوں کو مت چھینو۔“ انمول سسک اٹھی تھی۔

”بہت بچکانہ رویہ ہے تمہارا۔ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینے سے حقیقت چھپ نہیں سکتی اور میں تمہاری خیر خواہ ہوں، دشمن ہوتی تو ابا کو بتا چکی ہوتی۔“ صبا نے اس کے لرزتے وجود کو تھما تھا۔

اس کی لہو رنگ آنکھیں اس کی چاہت کی شدت کی غماز تھیں۔ صبا نے تاسف سے بہن کے افسردہ چہرے کو دیکھا۔ سچ ہے کہ محبت پر کوئی زور نہیں چلتا ہے۔ وہ اپنی چھوٹی بہن انمول کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ یہاں صرف بابا جان ہی حائل نہ تھے بلکہ پھوپھو کا بھی مسئلہ تھا اور پھر اس کے بعد عامر کا محاذ بھی۔ باقی تھا۔ وہ کہاں کہاں انمول کے اس محاذ میں اس کے ساتھ صف آرا ہوئی؟ صبا نے اس کا

ہاتھ محبت سے تھاما۔

”اٹھو کھانا کھا لو۔“ بہن کی بات پر وہ بھی اثبات میں سر ہلاتی باہر کی جانب آئی تھی۔

”آجاء۔ وہ فقط اتنی دور سے نہیں ایک نظر دیکھنے کے لیے آیا بیٹھا ہے پھر واپس بھی جاتا ہے۔“

صبا کی بات پر وہ دل کو سنبھالتی لاؤنج سے گزری تھی۔ کوئی آپ کی ایک جھلک پانے کے لیے

انتابے قرار ہو تو دل از خود تفاخر کے احساس سے بھر جاتا ہے، مگر یہاں تو معاملہ دوطرفہ تھا۔ دونوں فریقین

محبت کی پیاس میں دیدار کی آس لیے تڑپ رہے تھے۔ وہ جانے کب آیا بیٹھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی

اس کا بچھا ہوا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ موسیٰ کی نگاہوں میں مدھم امید کے جگنو جل اٹھے تھے۔ یک بارگی

تمناؤں نے کروٹ لی تھی اور محبت نے انمول کے چہرے پر دھنک رنگ بکھیر دی تھی۔ موسیٰ کی آنکھوں میں جگنوؤں کی تعداد بڑھنے لگی تھی۔

”اچھا آئی اب میں چلتا ہوں۔“ پرویز نے موسیٰ کو اشارہ کیا تھا۔ جس کی نگاہیں انمول کے

مبہوت کردینے والے حسن سے خیرہ ہو رہی تھیں۔ موسیٰ، فاختہ اور اشعر کا اکلوتا بیٹا تھا اور انہیں

موسیٰ سے بے حد توقعات وابستہ تھیں۔ موسیٰ اسیر محبت ہو چکا تھا اور پھر اس نے اپنی والدہ سے انمول

کی بات کی تھی۔ والدہ نے بہ خوشی اس رشتے کے لیے آمادگی ظاہر کر دی تھی۔ موسیٰ نے انمول کو اس کے گھر

اپنے والدین کو بھیجنے کی بابت بتا دیا تھا۔ پرویز نے اس معاملے میں حیات عالم سے درخواست کی تھی کہ

ایک نظر ہی سہی وہ اس رشتے پر ایک بار غور کر لیں گے۔ وہ اگلے دن ہی حیات عالم کے گھر میں موجود

تھے۔ حیات عالم کا بنگلہ شان دار تھا۔ بے حد قیمتی فرنیچر اور بیش قیمت سجاوٹی چیزوں سے سجا بہ وسیع و

عریض ڈرائنگ روم اہل خانہ کے عمدہ ذوق کی اعلیٰ ترجمانی کر رہا تھا۔ وہ بے حد مرعوب ہوئے تھے۔ وہ واقعی خاندانی تھے۔ جدی پشتی رئیس تھے تب ہی

حیات عالم ڈرائنگ روم میں آئے تھے۔

”خوش آمدید۔ کہیے جناب کیسے آنا ہوا؟“ حیات عالم دو ٹوک بات کرنے کے قائل تھے۔ باقی

سب ان کے نزدیک فضولیات اور لغو باتیں تھیں۔ خواہ ان کا ایسا رویہ دوسروں کے لیے کتنا ہی گراں

ہوتا۔ ”ہم آپ کی بیٹی انمول کو اپنے گھر کی بہو بنانے کی خواہش لے کر حاضر ہوئے ہیں۔“ اشعر

صاحب نے مناسب لفظوں کا چناؤ کرتے ہوئے اپنا مدعا بیان کیا تھا مگر یہ سنتے ہی حیات عالم کی

تیوریوں پر ٹل پڑ گئے تھے۔ ”دیکھیے، میرے داماد کے حوالے سے آپ

لوگ قائل قدر ہیں، مگر ہم اول تو انمول کو ابھی بچی گردانتے ہیں دوسرے ہم برادری سے باہر شادی کے

قائل نہیں ہیں۔ ہم خاندانی ہیں اور رشتے تاتے کے لیے بھی خاندانی لوگوں کو ہی اولین ترجیح دیں گے۔“

حیات عالم نے بے مروتی کی انتہا کر دی تھی۔ چہرے پر ناگوار سی بجائے بیٹھے تھے۔

فاخرہ بات کو ابھی تک سنبھالے جانے کی خواہش لیے بولی تھیں۔ ”آپ لوگ خدا را برامت

مائیں۔“ ”بس جی، ہمیں کوئی شادی وادی نہیں کرنی ہے اپنی بچی کی اور میں صاف بات کرنے کا قائل

ہوں۔ اس کی کیا اوقات ہے، بیگم کو بھی اجازت حاصل نہیں کہ میرے معاملات میں چوں چوں

کرے۔ آپ لوگوں کو رخصت کے لیے دروازہ کا راستہ میری آیا دکھا دیں گی۔ کیوں کلثوم آپ؟“

حیات عالم یہ کہہ کر دہنگ انداز میں وہاں سے چلے گئے تھے پیچھے مابوسی کی فضا چھوڑ گئے تھے۔

”اب اٹھو، باقی کیا سننا رہ گیا ہے؟“ اشعر صاحب نے اپنی بیگم کی جانب دیکھ کر کہا۔

”جی سننے کی بات نہ ہی کریں تو بہتر ہے۔ آپ جیسے ٹ پوچھوں سے ہم بھلا کیوں رشتا جوڑنے

لگے۔ اجنبی بچی کے لیے میں خود ہیرالٹ کا ڈھونڈوں

خاموش رہتے تھے۔ شاید وہ خود اپنے بیٹے کی اس حرکت پر خود سے جنگ لڑ رہے تھے یہ وہ بیٹا تھا جس کو فوقیت دے کر انہوں نے اپنی بیٹیوں کو بھڑ بکری کی طرح سمجھ رکھا تھا، مگر اسی بیٹے نے آج اپنی بیوی کے ہاتھوں ان سب کی عزت و کوڑی کی کر کے رکھ دی تھی۔

”میں آج کھانے میں بریانی کھاؤں گی۔“
مصباح حکیمہ انداز میں کلثوم آپا سے بولی تھی۔
”ارے تو اپنی ساس کو کہو۔ میرے منہ نہ لگو۔“
کلثوم پھوپھو کے طور بڑ گئے تھے۔

”ان کی تو طبیعت میرے آتے ہی ناساز رہنے لگی ہے اور پھر اس دن آپ نے جو بریانی بنائی تھی مجھے تو وہی کھانی ہے۔ اگر اس گھر میں رہنا ہے تو پھر بنا کر دیں۔“ مصباح کا انداز فظ ان کو نیچا دکھانا تھا۔ مغلوب کرنا تھا کیونکہ اس گھر میں واحد وہی تھیں جو اس پر بھاری پڑ سکتی تھیں۔

”لڑکی بات سنو عقل تو ٹھکانے پر ہے۔ تم ہوتی کون ہو مجھے اس گھر سے نکالنے والی۔“ کلثوم پھوپھو کا طیش سے برا حال تھا۔

”وہ تو آج عامر ہی بتائیں گے۔ ذرا شام ہو لینے دے بڑھیا۔“ وہ بھی دوہر دوہر بولی تھی۔

تب شام کو یہ عقدہ کھلا کہ حیات عالم کی خاموشی کا اصل سبب کیا تھا۔ انہوں نے اپنی ساری جائیداد عامر کو کسی اچھے موڈ میں دان کر دی تھی۔ یہ بنگلہ بھی عامر کی ہی ملکیت تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب عامر بیوی کو لایا تو وہ اسے عاق نہ کر سکے۔ آج تو وہ خود عامر کے دست نگر تھے۔ بیٹے کو مان دے کر انہوں نے خود کو ہی گرا دیا تھا۔

عامر نے دھکے دے کر پھوپھو کو نکالنا چاہا۔ تو ردا اور انمول کے ساتھ ماں اور باپ نے خاموشی سے گھر کی دہلیز پار کر لی تھی۔

”اب کہاں جائیں گے۔ ہم یہ سب آپ کا کیا دھرا ہے۔ کیا ضرورت تھی آپ کو ساری جائیداد اس کے نام کرنے کی۔ اس بنگلے کو تو چھوڑ دیا ہوتا اب

گی۔“ کلثوم آپا نے مزید لکڑا لگا تھا۔
”مگر شاید وہ آپ کی بیٹی کا منظور نظر نہ ہو۔“
اشعر صاحب بھی اب چپ نہ رہ سکے تھے۔

”کیا مطلب ہے آپ کی بات کا؟“ کلثوم پیچھے کے تو کان کھڑے ہو گئے تھے یعنی یہ رشتہ ان کی بیٹی کی منشا سے آیا تھا۔ بات بہت بڑی تھی جس سے وہ اپنی بھانج کا چہنچا بھی دو بھر کر سکتی تھیں۔

”نبی کہ خاندانی کھانا آسان ہے، اپنی بیٹی کو تو قابو میں کریں پہلے۔“ اشعر صاحب کا لہجہ ہر خند تھا۔
پردے کی اوٹ سے دیکھتی انمول دھڑام۔

سے فرش بوس ہو گئی تھی۔ اس کے ارمانوں کا تاج محل ٹوٹ کر چکنا چور ہو گیا تھا اور — مسمار ہو جانے کے بعد کر چیاں دل میں بیوست ہو چکی تھیں۔ صاف انکار کے بعد محبت کی داستان بھی جیسے ختم ہو چکی تھی، مگر نہیں۔ اٹھتے بیٹھتے انمول کو طعنہ ملنے لگا تھا۔ موسیٰ کے نام کا طعنہ، ہر لحظہ اس پر کڑی نگاہ رکھی جاتی تھی۔ پھر عامر نے خاندانی ہونے کا اچھا ثبوت دیا تھا۔ پڑوس کی لڑکی سے خفیہ نکاح رچا کر خاموشی سے بیوی کو پکڑ کر گھر لے آیا تھا۔ اباتھر تھر رہے تھے۔ غصیلہ انداز میں گرج رہے تھے۔

”تمہاری اٹنی جرأت کیسے ہوئی۔ کم عقل“
ناخبر۔

”ابا جان خاندان کے چکر میں مجھے کوئی لڑکی اپنی ہم پلہ نہ ملتی تو میں کیا کنوارا رہتا؟ جانے دیں ابا جان یہ خاندان کے ڈھکوسلے تو آپ فظ اپنی بیٹیوں کے لیے بچا رکھیں۔“ عامر نے بے خوفی سے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بدتمیزی سے کہا اور اپنی بیوی کو کمرے میں لے گیا اور باپ کا دل ڈوب گیا تھا۔

عامر کی بیوی کے آتے ہی گھر بھر پر اس کا تسلط ہو گیا تھا۔ کلثوم آپا کو اپنی اصل اوقات کا تواب احساس ہوا تھا۔ جب ہر بات پر وہ کلثوم آپا کو طعنوں بھرے جملوں سے نوازتی تھی۔ کلثوم آپا اگر شکایتی انداز میں بھائی سے کہتیں تو بھی حیات عالم

کہاں درد رکھی ٹھوکریں کھائیں گے۔“ کلثوم کی زبان کو کہاں قرار حاصل تھا۔

”چپ ہو جائیں خدا کے لیے آپا، یہ سب آپ کی لگائی ہوئی آگ ہے جس میں آج ہم سب جل رہے ہیں۔ آپ نے ہی تو سبق پڑھایا تھا کہ بیٹے کو اپنا اثاثہ سمجھو۔ اس کے منہ سے نکلی ہر بات کو پورا کرو۔ تو دیکھ لیں آپا آج میں نے اس کے منہ سے نکلی ہر بات پوری کر دی ہے اور خود سڑک پر آ گیا ہوں۔“ ایک لمبی چپ کے بعد حیات عالم سڑک کے پیچوں پیچ دو جوان بیٹیوں کو لیے کھڑے نم دیدہ بولے تھے۔

تب ہی اچانک پرویز کی نگاہ ان لوگوں پر پڑ گئی تھی۔ وہ ملنے کے ارادے سے آیا تھا۔ ساتھ میں وہ دشمن جاں بھی تھا جسے بھلانے کی ہر سعی بے کار گئی تھی۔ پھر ان لوگوں کو موسیٰ نے اپنے ایک فلیٹ میں پناہ دی تھی۔ حیات عالم اس کے اتنے ملنسار رویے پر آج تادم سے تھے، مگر لب کشائی نہ کی تھی۔

کلثوم آپا نے در بدری سے بچنے پر شاید زیست میں پہلی مرتبہ رب کریم کا شکر ادا کیا تھا۔ سب کے دل اداس تھے۔ عرصہ دراز پہلے کیے گئے اپنے فیصلوں پر وہ ہچکچاتا رہے تھے۔

”بابا جان! پریشان نہ ہوں۔ ہم ہیں ناں آپ کا بازو۔“ ذکر کرنے انہیں تسلی دی تھی۔ وہ رو پڑے تھے۔

”بابا جان! میں آپ کی طرح سخت مزاج نہ بن۔“ جس کا گلہ آپ نے ہمیشہ کیا ہے، مگر امی جان کی طرح نرم دل ضرور بن گیا ہوں۔ میں نے جاب کے لیے ایلانی کیا ہے۔ میری جاب لگ گئی ہے۔ تنخواہ بھی اچھی ہے اور رہی بات عامر کی اب اتنی آسانی سے وہ ساری جائیداد پر قابض نہیں ہو سکتا۔ میں نے کیس فائل کر دیا ہے۔“

پھر ذکر کرنے واقعی بنیا بن کر دکھایا تھا اور جس دن یہ لوگ کیس جیت گئے۔ ذکر کے گلے لگ کر بے حد روئے تھے۔ حیات عالم کا زعم کا بت ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو چکا تھا۔

”ابا جان آج میں آپ سے دو چیزیں مانگوں

گا۔ اب امید ہے انکار نہیں کریں گے۔ میں چاہتا ہوں آپ میری بہنوں کے مستقبل کا فیصلہ مجھے کرنے دیں۔ دوسرا ابا اب سارے معاملات میں خود دیکھوں گا آپ کے آرام کے دن ہیں۔ ہر فیصلہ آپ کا ہی ہوگا۔ صرف مشقت بھرے ہاتھ میرے ہوں گے۔“

ذاکر نے پھر ردا کی شادی ماموں کی طرف طے کر دی تھی۔ جس پر ابا چاہہ کبھی نہ بول سکے تھے اور کلثوم پھوپھو خوب جلی کڑھی تھیں کہ زندگی جانب بچی جائے ان کو کب گوارا تھا اور تب تو رد ہی پڑیں جب اشعر کے گھر والے موسیٰ کے رشتہ کی بابت آئے اور موسیٰ کے لیے ذکر کرنے ہاں کر دی تھی۔

مگر حیات عالم ٹھوکر کھا کر سنبھل چکے تھے انہوں نے بڑھ کر اپنے بیٹے کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا، یہ رشتہ تو خدا نے آسمانوں پر ہی طے کر رکھا تھا جسے ہونا ہی تھا۔ جن کو ملنا ہو وہ مل ہی جاتے ہیں اور واقعی جب انمول ماں باپ کی دعاؤں کے حصار میں روتی ہوئی وداع ہو کر موسیٰ کے گلشن کو مہکانے آئی تو موسیٰ کی خوشی دیدنی تھی۔ خود انمول کا دل بے قابو تھا۔ اسے ڈر تھا شاید اسے خود ہی اپنی خوشی کی شدت سے نظر نہ لگ جائے اور موسیٰ نے جب اس کا چہرہ ہاتھ سے اونچا کیا تو اس کا شرم سے برا حال تھا۔

”کتنی شدت سے اس بیل کی آرزو کی تھی میں نے، یہاں اس گھر میں اکثر تم کو خیا لوں میں چلتے پھرتے دیکھا ہے۔ اس کمرے میں تم سے لاتعداد مرتبہ حال دل کہا ہے اور آج تم میری ہو، بالکل میری اپنی۔ آج وہ خواب ٹوٹے گا نہیں کیونکہ تم حقیقت بن کر میری زیست میں آ گئی ہو۔“

موسیٰ کا لہجہ ٹھنڈا تھا۔ اس نے انمول کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ وہ نظریں جھکائے اپنے مجازی خدا کی محبت سے معمور دل لیے اپنے حقیقی خدا کی شکر گزاری میں اپنے دل کو سجدہ ریز پارہی تھی۔ محبتوں کے نصیب میں ملنا ہی ہوتا ہے اگر ان کی صداقت میں ذرہ بھر کھوٹ نہ ہو۔



اس وقت جو دریا ہے

ہم تم بھی نہیں ہوں گے، یہ پل بھی نہیں ہوگا
 اس وقت جو دریا ہے، کل صبح تپیں ہوگا
 آنسو کی طرح لٹے، پلکوں پہ لرزتے ہیں
 بھڑکتے کے دریا میں اس طرح اترتے ہیں
 پہنٹائی صحرا میں
 جس طرح کوئی ذرہ
 بے نام و نشان ہو جائے
 ہونے کا گمان ہو جائے
 یہ جتنا ہوا آنسو، یہ ٹھہرا ہوا لمحہ
 اک جمیل سی ہے جس میں
 اک وصل رسیدہ کے کچھ بھول چکے ہیں،
 کچھ عکس لرزتے ہیں
 یہ عکس لرزنے دے، یہ بھول چکے دے
 اس جمیل کے ساحل پہ اس چاند کو چھنے دے
 آنکھوں سے گرا آنسو ٹوٹا ہوا پرچم ہے
 ساحل کے ادھر ہر سو اک ہجر کا موسم ہے
 اس ہجر کے موسم میں
 یہ جمیل کہیں ہوگی، یہ چاند کہیں ہوگا
 اس وقت جو دریا ہے، کل صبح نہیں ہوگا!!

اس کا سوچا بھی تھا اب کے جو تنہا گزری
 وہ قیامت ہی غنیمت تھی جو یک جا گزری

آگے تجھ کو لگا لوں مرے پیارے دشمن
 اک مری بات نہیں، تجھ پہ بھی کیا کیا گزری

میں تو صحرا کی پیش، تشنہ لبی بھول گیا
 جو مرے ہم نفسوں پر لب دریا گزری

آج کیا دیکھ کے بھرا آئی ہیں تیری آنکھیں
 ہم پہ اے دوست یہ ساعیت تو ہمیشہ گزری

میری تنہا سفری میسر اقدار تھی فراز
 ورنہ اس شہرِ تمنا سے تو دنیا گزری

احمد فراز

احمد اسلام آباد

عشق میں تازگی ہی رہتی ہے
وہ نظر چھیرتی ہی رہتی ہے

جانے کیا ہو پلک جھپکنے میں
زندگی جاگتی ہی رہتی ہے

لاکھ وہ بے نیاز ہو جائیں
حسن کی دلکشی ہی رہتی ہے

جھوٹے وعدوں کی لذتیں نہ پوچھ
آنکھ درسے لگی ہی رہتی ہے

دردِ خود آگہی نہ ہو جب تک
کائنات اجنبی ہی رہتی ہے

کچھ نئی بات تو نہیں قابل
ہجر میں بے کلی ہی رہتی ہے
قابلِ اجمیری

براہِ راست اثر ڈالتے ہیں پیار کے بول
کسی دلیل سے منوانے تھوڑی ہوتے ہیں

جو لوگ آتے ہیں ملنے ترے حوالے سے
نئے تو ہوتے ہیں، اُن جلنے تھوڑی ہوتے ہیں

اسی زمیں کے غزالوں سے ہوتے ہیں آباد
دلوں کے دشت پری خانے تھوڑی ہوتے ہیں

ہمیشہ ہاتھ میں رہتے ہیں پھول ان کے لیے
کسی کو بھیج کر منگوانے تھوڑی ہوتے ہیں

مزاج پوچھتے ہیں کس تپاک سے ہر بار
اگر چہ وہ ہمیں پہچانے تھوڑی ہوتے ہیں

کسی عزیز کو زخمی کرے کہ قتل کرے
نگاہِ ناز پہ جرمانے تھوڑی ہوتے ہیں

شعور تم نے خدا جلنے کیا کیا ہو گا
ذرا سی بات کے اقلانے تھوڑی ہوتے ہیں
انور شعور

دل جلا

”تم ٹھیک کہتے ہو.....! میں واقعی اس کی کمی شدت سے محسوس کروں گا۔“ کرکٹ کے شائق نے غم زدہ ہوتے ہوئے کہا۔
موسیقی

دو دوست ایک محفل میں شریک تھے۔ ایک دوست نے دوسرے دوست کو کہنی مارتے ہوئے کہا۔

”دیکھو، وہ سامنے سیٹ پر بیٹھا ہوا شخص موسیقی سے لطف اندوز ہونے کے بجائے سو رہا ہے۔“
دوسرا دوست بگڑتے ہوئے بولا۔ ”یار! چھوڑو بھی، اتنی سی بات کے لیے مجھے جگانے کی کیا ضرورت تھی۔“

ستم ظریفی

ٹرین کے ڈبے میں ایک صاحب کو سرگرم لگاتے دیکھ کر ان کے سامنے والی نشست پر بیٹھی ہوئی عورت نے نرمی سے ان سے کہا۔ ”تمباکو کے دھوئیں سے میری طبیعت خراب ہونے لگتی ہے۔“
وہ صاحب ایک گہرا کش لگا کر دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے بولے۔
”محترمہ! ایسی صورت میں تو میں آپ کو یہ ہی مشورے دے سکتا ہوں کہ آپ تمباکو نوشی نہ کیا کریں۔“

مجبوری

پاکل خانے کے دورے پر آئی ہوئی ایک خاتون وہاں کے سپرنٹنڈنٹ کے ساتھ ایک راہ داری سے گزریں تو راستے میں کھڑی ایک خاتون کا چہرہ اور تاثرات دیکھ کر کانپ گئیں، کچھ آگے جا کر

ٹرین نہایت سست رفتاری سے چل رہی تھی۔ اس دوران گاڑی ایک کمپارٹمنٹ میں آیا اور بولا۔ ”جو مسافر نصیب نگر جا رہے ہیں، انہیں نہایت افسوس سے اطلاع دی جا رہی ہے کہ وہاں کاریلوے اسٹیشن جاہ ہو گیا ہے، وہاں آگ لگ گئی ہے۔“
ایک لمحہ کو خاموشی رہی، پھر ایک مسافر دوسرے کو تسلی دینے کے انداز میں بولا۔ ”ریشانی کی کوئی بات نہیں ہے، جب تک ہم نصیب نگر پہنچیں گے، اسٹیشن دوبارہ تعمیر ہو جائے گا۔“

ٹریفک جام

کراچی کی ایک سڑک پر مسافر بس شام سے لے کر صبح تک ٹریفک جام میں پھنسی رہی۔ سورج نکلا تو ایک صاحب بس سے اترے اور تھکے تھکے انداز میں فری پبلک فون تک پہنچے۔ انہوں نے ایک نمبر ملایا اور بولے۔
”کون..... چوکیدار..... ہاں، میں صفدر بات کر رہا ہوں۔ صاحب آئیں تو انہیں بتا دینا کہ آج دفتر نہیں پہنچ سکوں گا کیونکہ کل رات کو میں گھر ہی میں نہیں پہنچ سکا تھا۔“

کمی

کرکٹ کے ایک جنونی شائق نے اپنے دوست کو بتایا۔ ”میری بیوی کہتی ہے کہ اگر میں نے کرکٹ کو ترک نہ کیا تو وہ مجھے چھوڑ کر چلی جائے گی۔“
”ہاں واقعی، یہ تو بہت برا ہوگا۔“ اس کے دوست نے افسوس سے کہا۔

انہوں نے بچی اور خوف زدہ سی آواز میں سپرنٹنڈنٹ سے کہا۔ ”خدا کی پناہ! کیسی خوف ناک صورت تھی۔ کیا یہ خطرناک ہے؟“

”کبھی کبھی ہو جاتی ہے۔“ سپرنٹنڈنٹ نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

”آپ اسے کوٹھری میں بند نہیں رکھتے، کیا یہ آپ کے قابو میں نہیں آتی؟“

”نہیں..... اسے کوٹھری میں بند نہیں کیا جاسکتا اور نہ یہ کسی کے قابو میں آتی ہے۔“

”لیکن کیوں؟“ خاتون نے جاننا چاہا۔

”کیونکہ وہ میری بیوی ہے۔“ سپرنٹنڈنٹ صاحب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

آپ اپنے دام میں

”بیگم! تم نے شام کا اخبار آج پڑھا؟“ شوہر نے بیوی کو مخاطب کیا۔ ”آج تک ہمارے ملک کا

نظام نہ سدھر سکا۔ کچھ بھی نہ بدلا، نہ کوئی ایسی جگہ ہے،

جہاں باعزت آدمی سکون سے بیٹھ سکے۔ اب مجھے

ہی کچھ کرنا ہوگا۔ ایک محبت وطن شہری ہونے کے

ناتے میرا فرض بنتا ہے کہ میں ملک کے قوانین

درست کرنے میں معاونت کروں۔“

”پہلے آپ اپنی حالت تو درست

کر لیجیے.....!“ بیگم نے تنک کر کہا۔ ”الٹا پا جامہ پہن

کمرنگ سے ادھر ادھر ہوم پھر رہے ہیں۔“

مثالی پروفیسر

پروفیسر صاحب دوپہر سے رات گئے تک ایک

صاحب کے گھر میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

آخر کار میزبان بولا۔ ”مجھے کہتے ہوئے اچھا تو نہیں

لگ رہا، لیکن مجھے اٹھ کر علی الصبح اسلام آباد کے

لیے فلائٹ پکڑنی ہے۔ آئیے میں آپ کو دروازے

تک چھوڑنے چلوں۔“

”خدا کی پناہ!“ پروفیسر صاحب یک دم

گہرا کرکھڑے ہو گئے۔ ”میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ تم

مجھ سے ملنے میرے گھر آئے ہو۔“

سنہری موقع

ایک آدمی کو پاگل کتے نے کاٹ لیا۔ وہ ڈاکٹر

کے پاس گیا تو اس نے کہا۔ ”آپ فوراً ٹیکے لگوائیں،

ورنہ آپ پاگل ہو جائیں گے، لوگوں کو کاٹیں گے اور

وہ مر جائیں گے۔“

آدمی نے کہا۔ ”برائے مہربانی مجھے ایک کاغذ

اور قلم دے دیجیے۔“

ڈاکٹر نے پوچھا۔ ”کیا آپ وصیت لکھنا

چاہتے ہیں؟“

آدمی نے جلدی سے کہا۔ ”نہیں ڈاکٹر

صاحب! میں تو ان لوگوں کی فہرست بنانا چاہتا ہوں،

جنہیں میں کاٹنا چاہوں گا۔“

وجہ تسمیہ

ایک صاحب نے دفتر میں اپنے ساتھی کو بتایا۔

”میرے اور میری بیوی کے درمیان پانچ ماہ بے حد

خوشیوں بھرے گزرے، مگر آج سے ہمارے درمیان

زوردار جھگڑے شروع ہو گئے ہیں۔“

دوست نے پوچھا۔ ”اس تبدیلی کی وجہ.....؟“

ان صاحب نے جواب دیا۔ وہ پانچ ماہ کے

بعد آج ہی اپنے نیکے سے واپس آئی ہے۔“

نسخہ شادمانی

بیوی! دیکھو نا! ہمارے پڑوسی نے پچاس انچ کا

ایل سی ڈی، ٹی وی خریدا ہے، آپ بھی خریدا لائیے

نا!“

شوہر! ”ارے ڈارلنگ، جس کے پاس

تمہارے جیسی خوب صورت بیوی ہو، وہ کیونکر فالتو کا

وقت ٹی وی دیکھنے میں برباد کرے۔ بیوی!“ اوہ

آپ بھی نا.....!“

”میں ابھی آپ کے لیے پکوڑے بنا کر لاتی

ہوں۔“

خالد بیگ لالی کی سیریں کا مجموعہ

سیدہ لویا سجاد ————— کھر وڑ پکا
غلوں و مہر و وفا لوگ کر چکے ہیں بہت
میرے خیال میں اب ارد کوئی کام کریں
جدا ہوئے ہیں بہت لوگ ایک تم ملی سہی
اب اپنی بات پہ کیا زندگی حرام کریں

نوال افضل گھمن ————— کراچی
جو خیال تھے نہ قیاس تھے وہی لوگ مجھے بھڑکے
جو محبتوں کے اساس تھے وہی لوگ مجھے بھڑکے
یہ خیال سارے ہیں عارضی یہ غلاب سارے ہیں کاغذی
گل آرزو کی جو باس تھے وہی لوگ مجھ سے بھڑکے
فرہ، آفر ————— کراچی

دیکھا جو تیر کھلے کہیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی
خانیہ اعوان ————— آخون باندی
جو گرم گرم میں نے کیا ہے تو بتایا جانے
ایسے چپ چاپ نہ سولی پہ جڑھایا جانے
یہ عدالت کی فضا اس کیسے آئی ہے
کیوں نہ ایک دیپ محبت کا جلایا جانے

مسرت الطاف احمد ————— کراچی
تھا میرا آغاز ہی سے راستہ اپنا غلط
اس کا اندازہ سفر کی رائیگانی سے ہوا
اتقی ناصر ————— گلستان جوہر

ہم فقر وں کو کم نظر آئے
اس نگر میں تھے شہر یاد بہت
اس نے مجھ کو کر دیا ود نہ
ہم کو خود پر تھا اختیار بہت

شازیہ سحاب ————— لیہ
کئی دلوں کا مقدّر مذاب ہوتا ہے
ہمارا دل بھی ان ہی میں شمار ہے شاید

عظمیٰ غلام نبی ————— کراچی
دوبے ہیں جس میں میرے شہر کے کئی اہل ہنر
تو میرے حکم کو ان پسماندگیوں کے بھنور میں نہ ڈال
نادیر اشرف ————— رائے وند
مصلحت کا جبر ایسا تھا کہ چپ رہنا پڑا
ود نہ اسلوب زمانہ پر ہنسی آئی بہت

عائشہ جہانگیر مرالی ————— کیر والا
تو نے ہی کہا تھا کہ میں کشتی پہ بوجھ ہوں
آنکھوں کو اب نہ ڈھانپ مجھے دھرتا بھی دیکھ
اقرا عزیز ————— گھاؤں دیر باغان جلیانی
ہر کوئی دو کر دکھائے یہ ضروری تو نہیں
شعلہ آنکھوں میں بھی سیلاب ہوا کرتے ہیں

تحریم اکرم چودھری ————— ملتان
اس نے اپنے خط میں مجھ کو کتنے درد سے کھاہے
اب تو گاؤں آیا کرنا اب تو سڑکیں پٹی ہیں
مدد کھو نہیں مہک ————— برنالی

بربادی دل جبر نہیں فیض کسی کا
وہ دشمن جان ہے تو بھلا کیوں نہیں دیتے

نداء فیض ————— فیصل آباد
چیز کر دی ہے مگر دھوپ سے بچنے کے لیے
نیم کا پیڑ بھی آنگن میں لگایا لیتے ہیں لوگ
خزیمہ ریاض ————— گاؤں سدوکی

دھل چکا ہے وہ خواب کا موسم
دل پہ گزرا ہے اک مذاب کا موسم



راول خوراک

لوگوں سے سوال کرنے کی نسبت اچھا ہے۔

فساد کی سزا

بنی اسرائیل میں ایلاف نامی بادشاہ آیا تو اللہ نے ان کے ایلینا نامی پہاڑ میں برکت دی۔ یہاں

کوئی دشمن داخل نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی وہ کسی کے محتاج ہوتے تھے۔ خوش حالی کا یہ عالم تھا کہ کوئی شخص مٹی سا ڈھیر لیتا اور وہاں بیج ڈال دیتا تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے اور اس کے اہل و عیال کے لیے خوراک پیدا کر دیتے۔ اسی طرح اگر کوئی اپنے پاس موجود زمینوں کے پھل کو پھونکتا تو اس کے اور اس کے اہل و عیال کے لیے تیل نکلتا لیکن جب ان میں فسادات کی کڑی ہوئی تو انہوں نے اللہ سے کیے ہوئے وعدے کو بھلا دیا تو دشمن نے ان پر حملہ کر دیا۔ انہیں شکست ہوئی یا انہیں قتل کیا گیا اور ان کے بیوی بچوں کو غلام بنا لیا گیا۔

ایلیس کا دوست اور دشمن

نقل ہے کہ حضرت یحییٰ ابن ذکر یا علیہ السلام نے ایلیس کو دکھا اور اس سے پوچھا۔
”تیرا بڑا دشمن کون ہے اور زیادہ دوست کون ہے؟“

ایلیس نے جواب دیا ”زاہد بخیل میرا سب سے بڑا دوست ہے کیونکہ وہ محنت برداشت کرتا ہے اور بندگی بجالاتا ہے لیکن اس کا بھل اس کی عبادت کو برباد اور ناچیز بنا دیتا ہے اور فاسق سخی میرا سب سے بڑا دشمن ہے کیونکہ وہ اچھا کھاتا ہے اور اچھا پہنتا ہے اور اچھی طرح زندگی بسر کرتا ہے مجھے یہ ڈر ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی عبادت کے باعث اس پر رحم فرمائے اور اس کو توبہ کی توفیق مرحمت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔
”کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر فتنہ یا کفر کی تہمت نہ لگائے کیونکہ اگر وہ ایسا نہ ہو تو تہمت اسی کی طرف لوٹ آتی ہے۔“

فائدہ ۱۔
مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص کسی مسلمان کی بابت یہ کہے کہ وہ تو فاسق یا کافر ہے جبکہ وہ فاسق یا کافر نہیں ہے تو خود کہنے والا عند اللہ فاسق یا کافر قرار پائے گا۔ اس لیے اس قسم کے دعووں سے بچنا چاہیے۔

حضرت علیؑ نے فرمایا

- ۱۔ غلویت میں تو کاہل رہتا ہے (عمل نہیں کرتا) اور لوگوں کے سامنے حجت دجالا۔
- ۲۔ جب اس کی تعریف کی جاتی ہے تو بڑھ چڑھ کر بات کرتا ہے۔
- ۳۔ تیسری یہ کلامت اور سرزدنش سے اپنے عمل کم کر دیتا ہے۔

عندنا ناصر، اقصیٰ ناصر، کراچی

بے کاری

حضرت عروہ جب کسی کو کوئی ظاہری حالت میں خوش حال دیکھتے تو دریافت فرماتے۔
”کیا یہ شخص کسی پیشے سے وابستہ ہے؟“

جب لوگ کہتے کہ ”نہیں“
تو آپ فرماتے ”یہ شخص میری نظر سے گر گیا“
ان کا کہنا تھا کوئی بھی کام خواہ کتنا ہی معمولی ہو

فرمائے۔

خوف خدا کی برکت

شیخ شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے۔
”کوئی روز ایسا نہیں ہوا جس میں مجھ پر خوف خدا غالب ہوا اور اس دن حکمت و عبرت کا دروازہ مجھ پر نہ کھلا ہو۔“

اعتدال

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے فرزند سے فرمایا کہ ”کبھی کبھار گوشت کھا لیا کرو۔ ایک بار روغن استعمال کرو، ایک بار دودھ، ایک بار سرکہ، ایک بار بغیر سالن کے روٹی کھاؤ۔“ (اس کو اپنا معمول بنالو)

عمل

شیخ ابو عثمان حیري رحمۃ اللہ علیہ کو ایک دعوت میں بلایا گیا تاکہ ان کے حق کی آزمائش کی جائے۔ چنانچہ جب وہ صاحب خانہ کے یہاں پہنچے تو اس نے ان کو اندر نہیں جانے دیا اور کہا کہ کھانا ختم ہو چکا ہے۔ یہ سن کر آپ واپس تشریف لے آئے۔ آپ نے ابھی کچھ راستے طے کیا تھا کہ صاحب خانہ آپ کے پیچھے پہنچا اور آپ کو واپس لے آیا لیکن پھر لوٹا دیا۔ اسی طرح کئی بار آپ کو بلایا اور واپس کر دیا۔ آخر کار صاحب خانہ نے کہا۔

”واقعی آپ ایک عظیم جوان مرد ہیں۔“

آپ نے اس شخص سے کہا۔
”یہ جو کچھ تم نے دیکھا یہ تو کتنے کی عادت ہے کہ کہ جب اس کو بلاتے ہیں وہ بلائے پر آ جاتا ہے اور جب اس کو دھتکار تے ہیں تو واپس ہو جاتا ہے۔ پس یہ کوئی قابلِ قدر بات تو نہیں۔“

عرفانی کا سامان

حضرت نوح علیہ السلام نے بانس کا کھربنایا تو لوگوں نے کہا۔
”آپ اگر اینٹوں کا کھربناتے تو کیا حرج ہوتا؟“

حضرت نوح علیہ السلام نے جواب دیا۔
”جس کے لیے مرنا ضروری ہے اس کے لیے یہ بانس کا کھربن بھی بہت ہے۔“

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شام کے سفر میں ایک بختہ عمارت اینٹوں سے بنی ہوئی دیکھی۔ اسے دیکھ کر آپ فرماتے گئے۔

”مجھے ہرگز یہ خبر نہیں تھی کہ اس امت میں لوگ ایسی عمارتیں بھی بنوائیں گے جیسی ہامان نے فرعون کے لیے تیار کی تھی۔ اس لیے کہ فرعون نے ہی سب سے پہلے بختہ اینٹ بنوائی تھی اور ہامان سے کہا تھا اے ہامان میرے لیے گارے پر آگ روشن کر یعنی اینٹ بنا۔“

حضرت حسن بصریؒ نے کہا ہے کہ ”رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کے مکانات میں ہاتھ چھتوں میں لگتا تھا۔“
(مکافول کی چھتیں اتنی بچی ہوتی تھیں)

شیخ فیصل بن عیاضؒ فرماتے ہیں۔
”مجھے اس بات سے تعجب نہیں ہے کہ کوئی شخص مکان بنائے اور اس کو چھوڑ دے بلکہ مجھے اس بات کا تعجب ہے کہ کوئی شخص یہ دیکھے اور اس سے عبرت حاصل نہ کرے۔“

اللہ کی رضا پر راضی

ایک گروہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا کہ آپ خداوند تعالیٰ سے پوچھیے کہ وہ کیا چیز ہے جس سے تیری رضا حاصل ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی۔

”(اے ان سے کہہ دو) میرے علم پر تم راضی رہو میں تم سے راضی رہوں گا۔“
حضرت داؤد علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی۔
”میرے دوستوں کو دنیا کے غم سے کیا کام کہ وہ مناجات کی لذت کو اپنے دل سے دور کرے گا۔“

یاد رکھیے

ہر سب سے بڑا گناہ وہ ہے جو اس کے کرنے والے

کی نظر میں چھوٹا ہو۔
 (حضرت اکرم صلی اللہ علیہ وسلم)
 ہر جب عقل کامل ہو جاتی ہے تو کلامِ کم ہو جاتا ہے۔
 (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)
 ہر انسان کی فطرت اس کے چھوٹے چھوٹے کاموں سے معلوم ہوتی ہے۔ (افلاطون)
 ہر ظاہر پر نہ جا۔ آگ دیکھنے کو سرخ ہوتی ہے لیکن اس کا جلایا ہوا سیاہ ہو جاتا ہے۔
 (شیخ سعدی)
 ہر مجھے اعتدال پسندوں سے نفرت ہے اور انتہا پسندوں سے محبت۔ اعتدال پسندوں نے کامیابی اور ناکامی کے درمیان راہیں تلاش کر رکھی ہیں جو کم نائی کے گڑھے میں لے جاتی ہیں۔
 (علیل جبران)

غمرہ، اقرار۔ کراچی
 (مستفہ صہین تارڈ)

قرآن کی سچائی

ممتاز مغربی دانش ور گیری ملیہ نے بڑی دلچسپ بات لکھی ہے۔ لکھتا ہے۔
 حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ایک چچا تھا۔ اس کا نام ابو لہب تھا۔ ابو لہب کو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے شدید عداوت تھی۔ اس کی زندگی کا واحد مقصد اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلانا تھا۔ وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھڑکایا کرتا تھا۔ جہاں بھی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) جاتے وہ پیچھے پیچھے جاتا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہر بات جھٹلاتا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے یہ جہیز سفید ہے تو وہ جھٹ بول اے عتقا۔ نہیں یہ تو کالی ہے۔ اگر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے کہ دن ہے تو وہ کہتا نہیں رات ہے۔

قرآن میں ابو لہب کا بھی ذکر آیا ہے کہ وہ دوزخ کی آگ میں جلے گا۔ دوزخ کی آگ میں جلتا اس کا مقصد ہے۔ مطلب یہ کہ وہ بھی اسلام قبول نہیں کرے گا۔ کافر ہی ہے گا۔

”گیر ی ملکہ لکھتا ہے۔“
 ”اس آیت کے نازل ہونے کے بعد ابو لہب دس سال زندہ رہا۔ اس کے لیے قرآن کو جھٹلانا بہت آسان تھا۔ اگر وہ مسلمانوں سے کہتا۔
 ”دوستو! میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔ مجھے مسلمان بنالو“
 اور جب وہ مسلمان بنالیتے تو کہتا۔ ”وہ بھی تمہارا قرآن چھوٹا ثابت ہو گیا۔ اب بولو“
 لیکن ابو لہب نے ایسا نہیں کیا۔ حالانکہ اس کی زندگی کا مقصد یہ ہی تھا کہ وہ قرآن کو جھوٹا ثابت کرے۔ وہ قرآن کو جھوٹا ثابت نہیں کر سکا۔

علاج

علامہ نندری فرماتے ہیں، ہمارے شیخ عبد اللہ حاکم کے چہرے پر پھنسیاں نکل آئی تھیں۔ بہت سے علاج کیے مگر پھنسیاں ختم نہیں ہوئیں۔ تقریباً سال بھر اس تکلیف میں مبتلا رہنے کے بعد وہ جمعہ کے دن امام ابو عثمان صابونی کی مجلس میں پہنچے اور ان سے دعا کی درخواست کی۔ امام صابونی نے ان کے لیے دعا کی حاضرین نے آمین کہی۔

اگلے جمعہ کو ایک عورت نے امام صابونی کی محفل میں ایک پرچا بھجوا یا۔ اس میں لکھا تھا۔
 ”میں نے اپنے چچا کو شیخ عبد اللہ حاکم کی دعا کے صحت کے بعد نہیں گھبراہٹ۔ وہاں جا کر بھی میں نے ان کی صحت کے لیے بہت دعا کی۔ اسی رات مجھے خواب میں رسول کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زیارت ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ عبد اللہ سے کہو وہ مسلمانوں کے لیے دعوت کے ساتھ پانی پہنچانے کا انتظام کریں۔“

شیخ حاکم کو جب یہ معلوم ہوا تو انہوں نے اپنے گھر کے دروازے پر ایک بیل بنا دی جس سے لوگ خراب پانی پیتے تھے۔ اس واقعے کو ایک ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ شیخ پر شفا کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ پھنسیاں ختم ہو گئیں اور جہر پہلے کی طرح صاف اور خوبصورت ہو گیا۔ اس کے بعد وہ کئی سال زندہ رہے۔



خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: shuuaa@khawateendigest.com

نے اتنا جامع اور بہترین لکھا ہے کہ بے ساختہ دل شاباش دینے کو چاہا "ویلدن"۔

ج: پیاری عائشہ! بہت خوش ہوئی آپ نے شعاع پراتنا اچھا تبصرہ کیا۔ تمام سلسلوں کے بارے میں لکھا اور ہر کہانی کے تمام کرداروں پر تبصرہ کیا۔ امید ہے آئندہ بھی ہمیں خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرنی نہیں گی۔

صدرہ انور کوٹ محمد حسین سے لکھتی ہیں
ہمارا گاؤں منڈی فیض آباد سے 5 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے اور ہر مہینے کا ڈائجسٹ ہمیں 15 تاریخ کو ملتا ہے جس پر کہوں گی کہ شعاع جیسا ڈائجسٹ کہیں ہے اور نہ ہی ہوگا۔ عفت جی اور صائمہ جی آپ جب بھی آتی ہیں چھا جاتی ہے اور لائل رضا جی سرخ آندھی کے ساتھ روح میں اتر گئی ہیں آپ۔ اور میں نے لاگ کے نام کی ایک اسٹوری بھیجی تھی پلیز بتادیں کہ وہ قابل اشاعت ہے کہ نہیں۔

ج: پیاری صدرہ! ہمیں احساس ہے کہ بہت سے شہروں میں پرچا بہت تاخیر سے پہنچتا ہے تو ایسے میں پرچا

آپ کے خط اور ان کے جواب لیے حاضر ہیں۔
اللہ رب العزت آپ کو، ہم کو صحت، عافیت اور دائمی خوشیاں عطا فرمائے۔ ہر دکھ، تکلیف اور پریشانی سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

اب آتے ہیں آپ کے خطوط کی طرف نظر
پہلا خط اورنگی ٹاؤن سے عائشہ باب کا ہے۔ لکھتی ہیں سرورق اچھا لگا۔ حسب عادت، حسب معمول پہلی شعاع سے شروع کیا۔ حالات حاضرہ پر بڑی گہرائی سے تجزیہ کیا گیا ہے۔ پھر حمد و نعت کی طرف آئی۔ "پیارے نبی کی پیاری باتیں"، ہمیشہ کی طرح اندھیری رات میں جگنوؤں کی طرح راستہ دکھاتی ہوئی تھیں۔ "بندھن" میں شہزاد شیخ کا انزو پو اچھا لگا ان کے تمام جوابات قدرتی سے لگے۔ "صنع ہے پاک" خط آپ کے "وہ سلسلہ ہے۔ جسے غلطی سے بھی نہیں چھوڑتی میں اس بار "صائمہ مشتاق" کا خط بیٹ آف دامتھ تھا۔ دل کی باتیں صفحوں میں بھری ہوئی نظر آئیں۔

خواب ششے کا پڑھا، کہانی تو بس ایک بندگلی میں جھٹکے کھاتے، راستہ ٹٹولتے دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں ٹکرس کھا رہی ہے۔ "شہزاد" پھر غائب۔ لگتا ہے مصنفہ پانچ سال سے پہلے ختم نہیں کرنا چاہتیں۔ افسانوں میں "تمنا" سب سے بہترین لگا۔ "دل برائے فروخت"، "پیاز زندگی"، بھی زندگی کی حقیقتیں آشکار کرتی کہانیاں تھیں۔ "سودوزیاں کا حساب" اختتام بہت ہی دلچسپی کر دینے والا تھا۔ "ناولٹ" میں "کبھی روشنی" گھریلو سی روایتی سی کہانی اچھی لگی۔ سچ کہوں تو ثانیہ میں مجھے اپنی جھلک نظر آئی۔ "یہ جہاں" عطیہ خالد کچھ متاثر نہیں کر سکیں۔ "سنوٹم لوٹ آنا"، کچھ بھی نیا نہیں تھا اس کہانی میں۔ مکمل ناول میں "سنہری دھوپ" کا ذکر کیا جائے تو دعا کا کردار ہی غصہ دلانے والا ہے۔ عمیر کا اپنے والد سے جھوٹ پوننا بالکل بھی سچ قدم نہیں ہے۔ اتنی سی بات "اچھی تحریر تھی"۔ سہاگ رات کو بی زارا کی بہاری ہضم نہیں ہوئی، "کچھ خواب ہیں ان آنکھوں میں"۔ صدرہ، حیات نے بہت ہی کمال کا لکھا ہے۔ ختم نہ ہونے سے باوجود اختتام تک ناول نے اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ اس کے ساتھ ساتھ سب سے آخری کہانی جس کا فہرست میں ذکر ہی نہیں ہے۔ "یہ کہانی نہیں" شازیہ الطاف باشی

پڑھ کر تبصرہ لکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ آپ کی تحریر ابھی پڑھی نہیں گئی۔ آپ کی تجویز اچھی ہے۔ ہم غور کریں گے۔ حافظہ فوزیہ اسد نے چیچک وطنی صلیح سہیوال سے شرکت کی ہے ہمتی ہیں

انشاجی کے صاحبزادے روی انشا کی وفات کا بہت دکھ ہوا۔ دکھ اور شدید صدمہ مجھے اس سال بھی ہوا تھا جب انکل جی محمود ریاض صاحب کے دو جوان بیٹوں کی وفات ہوئی تھی۔ اس سال میں نئی نئی قاری بنی تھی اب تو میری اپنی بیٹیاں اس ایج میں ہیں، وقت بھی کیسے کیسے ہیروں کوئی میں دن کر گیا۔

راشدہ رفعت کا حقیقت سے قریب افسانہ پڑھ کر دل خوش ہوا یسے بھی راشدہ جب بھی لکھتی ہیں کمال لکھتی ہیں! عفت سحر طاہر کا ناول بہت بہت زبردست ناول ہے عفت کا انداز بیان بہت اچھا ہے۔

ناولٹ سب ہی زبردست تھے آخر شعاع میں شائع ہوئے ہیں تو اعلیٰ ہوں گے نا!

شازیہ جمال اور نعیمہ ناز نے اپنے قدم جمایا لیے۔ ”سنہری دھوپ“ میں سلوی ہٹ جزئیات نگاری سے ان کے مشاہدے کی باریکی کا اندازہ ہوتا ہے!۔ ”تاریخ کے جھروکوں“ کا سلسلہ بہت زبردست

ہے۔ شاعری دل کو بھانے والی لکھا کریں نہ سمجھ میں آنے والے شعر شائع کر دیتے ہیں۔

ج: پیاری فوزیہ! ایک طویل مدت سے شعاع نے آپ کو باندھ رکھا ہے۔ یہ جان کر دلی مسرت ہوئی۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

مریم اسد اور منزہ اسد کو ہماری جانب سے پیار اور دعائیں۔

کوثر خالد جزا نوالہ سے رونق محفل ہیں، لکھا ہے پانچ دنوں کی نمازیں آج قضا پڑھیں کیونکہ ایک دن لاہور والے آئے۔ نند، عمرے کے لیے جاری ہے 19 کو تو بیٹا بہو اور میری ماں بھی ملنے آئیں گیں۔ ہمارا شرم دوست کی کار خود چلا کر آیا۔ پندرہ دن قبل بھی یہ لوگ آئے تھے۔ کیونکہ میری عزیز بہن کی زائیدہ (جو سب کی پہلی تھی) وفات پائی۔ ہمارے خالد کی طرح طویل بیماری مگر ہمت نہ ہاری۔ پرسوں اور کل دو لحاف تیار کیے، سردیاں

ہیں۔ نہانا مشکل ہو گیا۔ ہمت بھی دن بدن کم ہو رہی ہے۔ لہذا رسالے پڑھنا اب جرم لگتا ہے۔ سرسری کہانیاں پڑھتے ہوئے جو لکھناری دلچسپ لکھیں۔ ”خواب شیشے کا“ کے علاوہ۔ ان کے نام سدرہ حیات، فشاخص اور تبیر الافضا اول رہیں۔ شازیہ جمال کا قلم بھی اچھا رہا۔ ”خط آپ کے“ بہنوں! بیٹیوں اور بھائیوں! آپ نہیں خالہ اماں۔ دادی جو مرضی نہیں منظور ہے۔ بھئی دوستی میں تو بچوں کو باجی بھی کہا جاسکتا ہے اور دادی کو کا کی بھی کہہ سکتے ہیں۔ بچے ٹیوشن کے لیے آنے والے ہیں۔ آج اتنا ہی کافی سمجھیں۔ آئندہ کا بھی خدا جانے۔ اللہ حافظ۔

ج: پیاری کوثر! ہمیں آپ کی مصروفیات کا بخوبی اندازہ ہے۔ بیمار اور بوڑھی ساس کی خدمت کے ساتھ ساتھ آپ دوستی اور رشتہ داریاں بھی خوب نبھاتی ہیں۔ پھر ماشاء اللہ سکھ بھی اتنی کر لیاں رضا یوں تک خود تیار کرتی ہیں۔ اتنی مصروفیات میں وقت نکال کر شعاع پڑھنا اور پھر ہمیں خط لکھنا واقعی بہت ہمت کی بات ہے۔ اللہ آپ کو صحت اور ہمت دے۔ آمین۔

امامہ ملک نے چنگی باندی ہری پور ہزارہ کے لکھا ہے پچھلا اور پہلا خط تو آپ نے شائع کیا نہیں، غصہ بہت تھا پراب پھر اس امید پر لکھنے بیٹھ گئی کہ شاید ردی کی نوکری کا پیٹ بھر گیا ہو اور وہ سو رہی ہو۔

سب سے پہلے تو میرے گاؤں کا تعارف..... چنگی باندی جو کہ اپنے نام کی طرح ہی چنگا ہے ہری پور شہر کے شمال مشرق میں واقع ہے..... پندرہ ہزار کے قریب آبادی والے ہمارے گاؤں میں سوائے گیس کے ہر سہولت موجود ہے الحمد للہ..... چھ پرائمری اسکول، ایک گرلز مل اسکول اور ایک بوائز ہائی اسکول ہے۔ لڑکیوں کا ہائی اسکول گاؤں سے باہر سرائے صالح میں ہے اور ڈگری کالج بھی..... پرائیویٹ اسکول کا تو شمار ہی نہیں..... پانی کے دھنوب دیل بھی ہیں جو اگرچہ پورے گاؤں کے لیے ناکافی ہیں مگر گاؤں کے زیادہ تر گھروں میں بورنگ ہوئی ہوئی ہے اس لیے کی نہیں ہوتی..... گاؤں کی خوب صورتی کو چار چاند لگائی نہ ہیں ہیں اور آمد رلوکٹ کے باغات ہیں..... گاؤں کے لوگ سختی ہیں اور زیادہ تر سرکاری ملازمتوں سے وابستہ ہیں..... سرکاری ملازمتوں

والے بھی تقریباً سب ہی لوگ ٹچنگ، پولیس اور آرمی نیوی کے شعبے میں ہیں۔ حنا سلیم ابوان کے گاؤں آخون بانڈی کے مغرب میں اور اقصیٰ طیب الرحمن کے گاؤں مونن کے سامنے شمال مشرق میں چٹلی بانڈی واقع ہے۔ یہ تو تھا ہمارے گاؤں کا تعارف۔

اب آتے ہیں شعاع کی طرف، ماذل بہت پیاری لگ رہی ہے ”شہر زاد“ کو نہ پا کر ”خواب شیشے کا“ کی طرف بھاگے..... مہرماہ کی عقل پر انفسوس ہوا..... پھر ”خط آپ کے“ میں آئے..... آہ..... (خوشی والی آہ) یہ کیا؟؟؟ پورے اکتیس خطوط..... ویسے یہ سیدہ نسبت زہرہ شاید بیرون ملک پڑھنے گئی تھیں نا؟ ابھی تک واپسی نہیں ہوئی کیا؟؟؟ اور یہ کیا آپ نے نئی بات نکالی ہے راہ چلتے رشتے؟؟؟ اب اگر اپنی امی، دادی کی عمر کی عورت سے میں دوستی کروں تو اس کو نام سے تو نہیں بلاؤں گی نا۔ کہانیوں پہ تبصرہ راشدہ رفعت کا ”زندگی کبھی تیرگی“ اچھا لگا موضوع پرانا تھا ویسے، ہماری بھی دعا ہے ایک عدد ہدایت ہمیں بھی مل جائے۔ عطیہ خالد نے اچھا لکھا اور کہتی ہے کردار نے بہت متاثر کیا۔ حمیرا فاضل کا نام فہرست میں سمیرا فاضل لکھا تھا۔ حمیرا نے ایک نئے حقیقت بیان کی۔

سدرہ حیات اچھا مکتبی ہیں۔ ”کچھ خواب ہیں ان آنکھوں میں“ بہت اچھی لگی جہلی قسط۔ قراۃ العین نے بھی بہترین لکھا۔ دانیال کے ساتھ اس سے زیادہ براسلوک

ہونا چاہیے تھا۔ اسٹوری آف دی منٹھ کا اعزاز دیا جاتا ہے ”اتنی سی بات“۔ زبردست کہانی تھی۔ ویسے زارا کے پاس ایک مصطفیٰ بھائی تھا۔ میرے پاس پانچ مصطفیٰ جیسے بھائی ہیں اور ابو کے ساتھ ساتھ دادا کا بیلیج فری۔ اگلی دفعہ جب خط لکھوں گی (اور پتہ نہیں کب لکھوں گی) تو اپنی امی کا ”نانا جوڑا“ سروے بھی بھجواؤں گی! ام ایمان قاضی نے بھی اچھا لکھا اور افسانوں میں شاز یہ الطاف ہاشمی کا ”یہ کہانی نہیں“ بازی لے لے گیا۔

امتل آئی آپ جو مواد لکھتی ہیں اس کا حوالہ دیا کریں کہ کہاں سے لیا ہے۔

ح: پیاری امام! آپ کے خط ہمیں موصول نہیں ہوئے یا تاخیر سے موصول ہوئے ہوں گے اس لیے شامل نہیں ہو سکے۔ ویسے اطمینان رکھیں تاخیر سے موصول

ہونے والے خط بھی ہم پوری توجہ سے پڑھتے ہیں۔ جن تاریخی واقعات کا آپ نے پوچھا ہے وہ ”تاریخ طبری“ سے لیے گئے ہیں۔ یہ اسلامی تاریخ کی مستند کتابوں میں شمار ہوتی ہے۔ تاریخ کی کتابیں ضروری نہیں مذہبی لحاظ سے بھی مستند ہوں۔ مختلف تاریخ دانوں نے ایک ہی واقعہ کو مختلف انداز سے لکھا ہے۔ اس لیے غلطی کا احتمال بھی ہو سکتا ہے۔ آئی کہنا یاد دہانی آپ کی مرضی پر منحصر ہے ویسے بڑی عمر کی خاتون کو بھابھی یا آپلی بھی کہہ سکتے ہیں۔ تم از کم کسی کو آئی کہنا ہمیں تو پسند نہیں ہے ویسے آپ کو اجازت ہے آپ چاہیں تو ہمیں آئی کہہ سکتی ہیں۔ ہمیں قطعاً اعتراض نہیں ہوگا۔ آپ کے گاؤں کا احوال جان کر دلی خوشی ہوئی ہے۔ بے اختیار دل چاہا کہ کبھی موقع ملا تو آپ کے مہمان ضرور رہیں گے۔

مریم مسعود احمد نے حافظ آباد سے لکھا ہے ضلع حافظ آباد کے چاول پورے پاکستان میں مشہور ہیں۔ شعاع کے ساتھ داسکتی کو تقریباً آٹھ سال ہو چلے ہیں۔ زندگی کے بہت سے رموز و اسرار ہم نے اس ذالجنس کی بدولت حاصل کیے۔ اس ماہ ماکمل خوب صورت تھا۔ ”شہر زاد“ کو نہ پا کر مایوسی ہوئی۔ ”اتنی سی بات“ عمدہ کاوش تھی۔ زارا اور حبشید کے کردار پسند آئے۔ کبھی روشنی، ناولٹ بہت خوب۔ ثانیہ ایک مثالی کردار ہے سب لڑکیوں کے لیے۔ ”یہ جہاں“ بہترین تحریر تھی۔

سنوتم لوٹ آنا بھی بہت پسند آئی۔ یہ بات واقعی ماننے والی ہے کہ شعاع آج بھی اپنا معیار ویسے ہی برقرار رکھے ہوئے ہے۔ جیسا آج سے سالوں پہلے تھا۔ ح: پیاری مریم! ہم نے حافظ آباد کے آم تو کھائے ہیں، وہاں کا چونہ واقعی بہت مزے دار ہوتا ہے۔ چاول کے بارے میں پہلی بار سنا ہے۔ یقیناً مزے دار ہوتے ہوں گے۔ پاکستان کی ہر چیز ہی بہت عمدہ ہوتی ہے، پھل، سبزیاں، دالیں، چاول۔ ایک بار پیاز کی قلت ہوئی تو انڈیا سے پیاز آئی تھی۔ تب اندازہ ہوا کہ ہماری پیاز تک ان کی پیاز کے مقابلے میں سو گنا بہتر ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم نے اپنے ملک کی کبھی قدر نہیں کی۔

شعاع کی قدردانی کے لیے شکریہ آپ کے افسانے ابھی پڑھے نہیں گئے۔

ایمان زہرہ شیرازی نے ڈھڈیال سے لکھا ہے
میں شعاع 6th کلاس میں تھی تب سے پڑھ رہی

ہوں اسی سے چھپ کر پڑھتی تھی پڑھنے کا چسکا اسکول سے بڑا جب میری ایک کلاس فیلو ڈائجسٹ لے کر آئی تھی۔ میں کہانیاں بھی لکھتی ہوں مگر لکھ کر اپنی الماری میں رکھ دی ہیں کبھی ہمت ہی نہیں ہوتی کہ بیچ دوں۔ کیا میں اپنی کہانی بیچ دوں۔

ج: پیاری زہرہ! آپ سے کس نے کہا کہ آپ کی لکھائی اچھی نہیں ہے ہمیں تو تحفوں کی لکھائی میں لکھے ہوئے خط بھی موصول ہوتے ہیں اور ہم وہ بھی پڑھ لیتے ہیں۔

افسانے لکھنا زیادہ مشکل کام ہے جو آپ انجام دے ہی چکی ہیں تو بھوانے میں کیا مسئلہ ہے۔ تھوڑی ہمت کی ہی تو ضرورت ہے۔ بھجوادیں۔ آپ نانا جوڑا ہے کہ سلسلے میں

لکھنا چاہتی ہیں۔ ضرور لکھیں پوچھنے کی کیا ضرورت ہے بلکہ ہر سلسلے میں لکھیں۔ ہم نے یہ سلسلے اپنی قارئین کے لیے ہی تو شروع کیے ہیں، سلسلوں کی تحریریں بھی آپ ایک ہی لفاظ میں افسانے کے ساتھ بھجوا سکتی ہیں۔

ناظمہ زیدی نے چمک اعظم سے محفل کو رونق بخشی ہے، لکھتی ہیں

راشدہ رفعت کی کہانی بہت خوب، صبر کا اجر مل ہی گیا۔ ”تمنا“، فلمی سا افسانہ اچھا نہیں لگا۔ ”دل برائے فروخت“، بھی خاص متاثر نہ کر سکا۔ ”عطیہ خالد“ نے اچھا لکھا۔ کہاں تو بہر و صاحب کیتی کے پیچھے پاگل تھے اور

کہاں بیٹی پر نظر۔ خیر خوب جواب دیا کیتی نے ”پیاز زندگی“ نے اداس کر دیا۔ ”سنہری دھوپ“ آگے بڑھا۔ مجھے اپنا اندازہ صحیح لگتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ دعا اور حسن والا۔ پلیز بتادیں صحیح ہوں کہ غلط۔

”سدرہ حیات“ اچھا ناول ہے کچھ ہٹ کے بہت خوب۔ ”اتنی سی بات“ اچھا ناول تھا۔ گڈ شاز یہ جمال۔

”سنوٹم لوٹ آنا“ سب سے بہترین ناول۔ ناول آف دی منٹھ۔ دیہاتی ماحول اور کزنز کی نوک جھونک۔ پڑھ کر بہت اچھا لگا۔

”شاز یہ الطاف“ کی کہانی اچھی تھی مگر مجھے ہیروئن پر اعتراض ہے کہ اگر اولاد نہ ہو تو مرد کو باندھنے کا کیا فائدہ؟ خود

ہی دوسری شادی کروا دیتی۔ یہ تو اس کا شرعی و جائز حق ہے۔ ”باتوں سے خوشبو“ بہترین ماشاء اللہ ”ناتا“ اس مرتبہ قدرے اچھا تھا۔ سکون سا ملا پڑھ کے ”تاریخ“ زبردست باقی تمام مستقل سلسلے بہت خوب تھے۔

آخر میں لکھاری بہنوں سے ایک درخواست ہے کہ پلیز بہن، بہن یا کزن، کزن کے تقابلی جائزوں والی کہانیاں نہ لکھا کریں۔ ایک کے ساتھ برا اور ایک کے ساتھ اچھا۔ ایسے قارئین کے ذہن میں بھی منفیامانہ جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

میری طبیعت پچھلے چند ماہ سے علیل ہے۔ تمام بہنوں سے درخواست ہے کہ میری صحت یابی کے لیے دعا کریں۔

خواتین کے ایڈ میں، افسانے کی فہرست میں اپنا نام دیکھ کر کبھی کچھ نہیں ہوتا۔ نہ ہی، نہ شائع پر خود سوزی کی کوشش۔ اب تو ایسا لگتا ہے جیسے مٹی بھر شیریں بادام کھاتے کھاتے، دانت کے نیچے کوئی کڑوا بادام آجائے۔ جسے نہ نگل سکیں نہ باقی تھوک نکلیں۔

ج: پیاری ناظمہ! بادام ایک ایک کر کے کھایا کریں۔ یہ تو اچھی بات ہے کہ اب صبر کرنا سیکھ لیا ہے۔

منفیمانہ جذبات دالی کسی حد تک درست ہے تقابلی تو گھر گھر کی کہانی ہے۔ لیکن اسے ہوا نہیں دینا چاہیے۔ آئندہ خیال رکھیں گے۔ غصہ نفرت، انتقام کے ساتھ محبت مروت، ایثار و قربانی بھی ہے۔ یہ سارے رنگ مل کر جو تصویر بناتے ہیں۔ اسی کا نام زندگی ہے۔ اتل آپ کی علالت کا سن کر بہت افسردہ ہیں، ان کا کہنا ہے۔ ناظمہ جی

نے کون سے سخت میچ کا ذکر کیا ہے۔ ناظمہ تو بہت اچھے میچ کرتی رہی ہیں۔ ان کی آپ سے بات بھی ہو چکی ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کو صحت اور ڈھیر ساری خوشیاں دے۔ اقراء ممتاز نے سرگودھا سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

آج مجھے جس چیز نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا ہے وہ ہے ”تاریخ کے جھروکے“ ہر دفعہ کوئی نہ کوئی واقعہ بغض بائیں ایسی ہیں جو ہمیں معلوم ہی نہیں۔

بندھن میں شہزاد شیخ اور اس کی مسز حنا شیخ سے ملاقات اچھی رہی خط آپ کے میں سب بہنوں کو پڑھا۔

ناولٹ زندگی کبھی تیرگی۔ کبھی روشنی اچھی اسٹوری تھی۔ ہدایت اللہ ایک اچھا مرد ثابت ہوا۔

”ادافروش“ واہ کیا موضوعات چنتی ہیں یہ ”ساغر“ کا کردار اور ادا فروش کی ”ماڈل“ ان کے احساسات، حساسیت اور مسائل کس خوبی سے انہوں نے بیان کیے وہ قابل تعریف ہے اور سب سے بڑھ کر ان کے موضوعات مختلف ہونے کے ساتھ ساتھ یکسانیت سے عاری ہوتے ہیں۔

”پیاز زندگی“ ہر لڑکی کی زندگی کی عکاسی کرتی یہ کہانی انتہائی منفرد انداز سے لکھی گئی ہے۔ انجام میں اس کہانی کی خوب صورتی پنہاں ہے۔ حمیرا فضا بہت خوب اور جس کہانی کے اختتام نے لبوں پر آسودہ مسکراہٹ بکھیری وہ انمول تحریر تھی ام ایمان قاضی کی ”سنوٹم لوٹ آتا“۔ ”زندگی بھی روٹی بھی تیر کی“ کے نام کے بالکل حسب توقع ہدایت کی زبان میں ایک تہذیب، شائستگی اور دانائی نظر آتی وہیں ثانیہ کا کردار بے مثال لگا۔

ممکن ہے حقیقت میں کسی نے ایسا کردار نہ دیکھا ہو، میرے لیے ایسے جیتے جاگتے مثالی کردار میری زندگی میں میری دو ممانیوں کی صورت موجود ہیں۔ جنہوں نے میری مائی کی (جن کی حالت بھی بتول بیگم جیسی تھی) اپنی سگی ماں کی طرح خدمت کی اور ان کی وفات پر ایسے ہی آنسو بہائے جیسے ان کی اپنی ماں ہوں۔ بلاشبہ ثانیہ کا کردار ہم سب قارئین کے لیے ایک مثال ہے ”یہ جہاں“ تلخ حقیقت پر مبنی ایک اہم پیغام دیتی کہانی عطیہ خالد بہترین اضافہ ہیں۔ بہت عمدہ شیار یہ الطاف باغی کی یہ کہانی نہیں ہم اہم پیغام دیتی تحریر ”دل برائے فروخت“ سادہ سی تحریر مگر انداز اچھا تھا۔ مجھے نام اچھے لگے ”سول“ اور ”فنی“ اور انداز بیان بہت خوب ”سودو زیاں کا حساب“ اور انجام بالکل پرفیکٹ۔ ”اشی سی بات“ بھی اچھی تھی۔ اس بار شمارہ پورا ہی زبردست تھا، ہر کہانی دوسری سے مختلف۔

ج: چاری زہرہ! بڑے خوب صورت انداز میں آپ نے رائٹر کو سراہا۔ شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ موضوع یکساں ہوئے ہوں۔ ہم تو ہمیشہ ایسی کہانیوں کا انتخاب کرتے ہیں جو مختلف موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ گھریلو موضوعات کے ساتھ سماجی، رومانوی، سبق آموز، تفریحی اور دستیاب ہو تو مزاحیہ کہانی کو بھی ضرور جگہ دیتے ہیں۔ آپ عالم نہیں پڑھ رہیں شاید وہ پیر فینٹسی بھی ہے

افسانہ ”دل برائے فروخت“ کیا واقعی ہی نیلی آنکھوں والے لوگ بے وفا ہوتے ہیں۔ منشا حسن علی نے اس اسٹوری میں نام کیسے رکھے ہیں۔

ناولٹ ”یہ جہاں“ زوہیر کی سوچ اتنی گھٹیا نکلی۔ مکمل ناول اتنی سی بات کیا مکالمات اسٹوری بھی۔ جشیہ نے ثابت کر دیا کہ سب مرد ایک جیسے نہیں ہوتے۔

ناولٹ سنوٹم لوٹ آتا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ام ایمان قاضی کی کوئی اسٹوری نہ پسند کی جائے۔

ہما نواب سے ملاقات اچھی رہی آپ جی آپ سے پوچھنا ہے کہ شعاع کا تبصرہ کس تاریخ تک آپ کو پہنچ جانا چاہیے فاطمہ شریف اگر تمہارے پاس شعاع جولائی 2017ء یا خواتین جنوری 2013ء کا ہے تو کوئل شہزادی کو دے دینا میں اس سے لے لوں گی۔ ضرور دینا۔

ج: پیاری اقراء! ہم نے سیاہ، نیلی، بھوری، سنہری سبز ہر رنگ کی آنکھوں والے لوگوں کو بے وفا دیکھا ہے۔ یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ نیلی آنکھوں والے با وفا ہوتے ہیں یا بے وفا۔ ویسے بھی کوئی کلیہ نہیں بنایا جا سکتا۔ کہ نیلی آنکھیں ہوں گی تو لازماً بے وفا ہوں گے اور سیاہ آنکھوں والے با وفا ہوں گے۔

خفا اس طرح بھجوائیں کہ 16 تاریخ تک ہمیں موصول ہو جائے۔

کراچی سے سیدہ زہرہ جمال نے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں ”کچھ خواب ہیں ان آنکھوں میں“ بہترین جملے، کردار، منظر نگاری اور سب سے بڑھ کر کہانی (یعنی پلاٹ) اس کہانی کی تعریف کے لیے اتنا کہنا کافی ہے کہ

کچھ کہانیاں ایسے چونکا دیتی ہیں کہ میں باقاعدہ صفحات پلٹ کر خاص طور سے رائٹر کا نام دیکھتی ہوں اور پھر وہ رائٹر میری پسندیدہ رائٹر کی لسٹ میں شامل ہو جاتی ہیں کہ اب سے ان کی کہانیاں (اگلی، پچھلی) ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھنی ہیں تو اس شمارے میں وہ رائٹر سدرہ حیات ہیں۔ بس یہی کہانی اور رائٹر کی تعریف ہے۔

پھر فہرست میں موجود اپنی پسندیدہ رائٹر نعیمہ ناز کے نام پر نظر پڑی۔

”ہم صورت گر کچھ خوابوں کے“ یہ وہ تحریر تھی جس نے نعیمہ ناز کی جانب توجہ مبذول کروائی تھی، پھر

اس میں سسپنس اور مسرہ بھی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک پیغام بھی دے رہی ہے۔ اور ہم نے بھی اپنی رائے کو پابند بھی نہیں کیا کہ وہ صرف ساس بندوں پر لکھیں۔ وہ معاشرے کی جراحی کے لیے اپنے قلم کو بطور نشتر ضرور استعمال کریں۔ ہمارے صفحات حاضر ہیں۔ پرچے کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

نویسین نے باغ خورد دانگ سے لکھا ہے
کافد کی ناؤ بھی ہے کھلونے بھی ہیں بہت
بچپن سے پھر بھی ہاتھ ملانا محال ہے

آہ وہ بیٹا ہوا بچپن، کاش کہ گزرا ہوا وقت واپس آ سکتا۔ اگر گذرا وقت واپس نہیں آ سکتا تو یوں کیوں نہیں ہوتا کہ ماضی کے نقوش ذہن سے مٹ جائیں۔

آج دل بے حد اداس ہے، ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا، ویرانی ہی ویرانی ہے۔ سوچا آپ سے حال دل کہہ کر دل کا بوجھ کچھ ہلکا کر لوں۔

ج: پیاری ٹوپی! انسان ہمیشہ ماضی اور مستقبل میں جیتا ہے اور یہی اس کی غلطی ہے۔ جو گزرا گیا وہ گزر گیا اور جو ہوگا وہ ہو کر رہے گا تو کیوں نہ حال میں جیا جائے۔

آج کی خوشیاں، آج کی بختیں یاد رہیں۔ محبت کرنے سے ہی محبت ملتی ہے۔ اچھے دوست بھی اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہیں جو ہمارا دکھ بانٹتے ہیں ہمارا حوصلہ بڑھاتے ہیں۔ اندھیروں اور مایوسی میں ہمارا ہاتھ تھامے رہتے ہیں۔ آپ نے ہمیں اس قابل سمجھا کہ اپنے دل کا بوجھ ہم سے بانٹنا چاہا اس کے لیے شکر گزار ہیں۔

مقدس آصف رائے وندھل لاہور سے لکھتی ہیں
نومبر کا ٹائٹل پسند آیا۔ سادہ سا انداز تھا مائل کا۔

”شہزاد“ کو نہ پا کر مایوسی ہوئی۔ ”خواب شخے کا“ عفت جی ہر کردار کے ساتھ انصاف کر رہی ہیں۔ سدرہ حیات کا مکمل ناول بہت زبردست آئندہ ماہ دیکھ کے حلق تک کڑوا ہو گیا۔ اقدس کا کردار بہت اچھا ہے۔ پلیز اقدس کو رلائیے گا مٹ۔ ”سنہری دھوپ“ بالکل پسند نہیں ہے۔

افسانوں میں ”یہ کہانی نہیں“ نمبرون پہ رہا۔ راشدہ رفعت جی نے بہت اچھا لکھا۔ واقعی رشتوں کو نبھانا آرٹ ہے۔ ”تاریخ کے جھروکے“ ہر بار کی طرح زبردست تھے۔ باقی سارا رسالہ ہی زبردست ہے۔ قاری بہنوں

جی ہر کردار کے ساتھ انصاف کر رہی ہیں۔ سدرہ حیات کا مکمل ناول بہت زبردست آئندہ ماہ دیکھ کے حلق تک کڑوا ہو گیا۔ اقدس کا کردار بہت اچھا ہے۔ پلیز اقدس کو رلائیے گا مٹ۔ ”سنہری دھوپ“ بالکل پسند نہیں ہے۔

افسانوں میں ”یہ کہانی نہیں“ نمبرون پہ رہا۔ راشدہ رفعت جی نے بہت اچھا لکھا۔ واقعی رشتوں کو نبھانا آرٹ ہے۔ ”تاریخ کے جھروکے“ ہر بار کی طرح زبردست تھے۔ باقی سارا رسالہ ہی زبردست ہے۔ قاری بہنوں

جی ہر کردار کے ساتھ انصاف کر رہی ہیں۔ سدرہ حیات کا مکمل ناول بہت زبردست آئندہ ماہ دیکھ کے حلق تک کڑوا ہو گیا۔ اقدس کا کردار بہت اچھا ہے۔ پلیز اقدس کو رلائیے گا مٹ۔ ”سنہری دھوپ“ بالکل پسند نہیں ہے۔

افسانوں میں ”یہ کہانی نہیں“ نمبرون پہ رہا۔ راشدہ رفعت جی نے بہت اچھا لکھا۔ واقعی رشتوں کو نبھانا آرٹ ہے۔ ”تاریخ کے جھروکے“ ہر بار کی طرح زبردست تھے۔ باقی سارا رسالہ ہی زبردست ہے۔ قاری بہنوں

جی ہر کردار کے ساتھ انصاف کر رہی ہیں۔ سدرہ حیات کا مکمل ناول بہت زبردست آئندہ ماہ دیکھ کے حلق تک کڑوا ہو گیا۔ اقدس کا کردار بہت اچھا ہے۔ پلیز اقدس کو رلائیے گا مٹ۔ ”سنہری دھوپ“ بالکل پسند نہیں ہے۔

تاریخ کے جھروکوں سے بہت اچھا تھا۔ موسم کے پکوان کچھ نہ کچھ ٹرائی کرتی رہتی ہوں ناظمہ حماد (چکوال) کو میرے ہاتھ کی بنی بریانی بہت پسند ہے۔

ہر دوسرے خط میں قاری فرینڈز در شہوار کو چھپھوری کہہ رہی ہیں۔ مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی۔ بھئی در شہوار ہادی کو پسند کرتی ہے شاید محبت بھی۔ ہر ایک کی اپنی اپنی مرضی ہے کہ وہ اس رشتے کو کیسے ہینڈل کرے۔

کوثر جی کو بہت سارا سلام اور نئے مہمان (پوتے) کوڈھیروں پیار۔

ایک ریگولیوٹ سے بنت سحر اور سمیرا حمید سے کوئی اچھا سا ناول لکھوائیں۔ انہی شمس کوثر جی، شمینہ جی کو میرے خط کا انتظار رہتا ہے۔ شاید آپ کو بھی پتا نہیں یہ میری خوش فہمی ہے یا غلط فہمی۔ چار دن سے دانت میں درد ہے۔ سمجھ سے بالاتر ہے کہ دل کا درد زیادہ ناقابل برداشت ہوتا ہے یا دانت کا۔ ویسے دانت کا درد نانی یاد کروادیتا ہے۔

خیر تمام قاری دوستوں (خالہ، آغنی، بہن) کہنے پر پابندی ہے (بھئی) کے تبصرے اچھے تھے اور آپ کے تو کیا ہی کہنے ہیں مجال ہے جو کسی کو بخش دیں۔

چار فحشوں کا خط چار لفظوں میں بیان کر دیتی ہیں ویسے ہی جیسے ٹیلر کو سوٹ کا کپڑا دیں تو ڈیزائننگ کے نام پر آدھا کپڑا غائب ہو جاتا ہے۔

ج: پیاری فوزیہ! ہمارے دل میں درد ہو یا دانت میں ہمیں تو بس اللہ یاد آتا ہے۔ محبت تو واقعی چھپھوری نہیں ہوتی مگر محبت کرنے والی چھپھوری ہے۔

بالکل فوزیہ آپ کے اتنے جامع اور دل چسپ خط کا ہمیں بھی انتظار رہتا ہے۔ اور یہ قاری فرینڈز کی اصطلاح تو بہت پسند آئی۔ بہن کہنے پر ہمیں ہر گز

اعتراض نہیں لیکن خالہ، آغنی، وادی، اماں ہمیں واقعی پسند نہیں ہے۔ اچھی خاصی عمر کی خاتون جو خود وادی، نانی بن چکی ہوں جب وہ اپنی ہم عمر کو باجی یا آغنی کہتی ہیں تو سامنے والی کے تاثرات دیکھنے کے قابل ہوتے ہیں۔ آپ کے ہاتھ کی بریانی مزے دار ہوتی ہے یا نہیں اب اس کا فیصلہ تو بریانی کھا کر ہی کر سکتے ہیں۔

مریم سعود احمد حافظ آباد سے تشریف لائی ہیں لکھا ہے

آج کے اس جدید ٹیکنالوجی کے دور میں بھی آپ کے ادارے کے ڈائجسٹ ماشاء اللہ اپنی اہمیت اور افادیت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اللہ پاک آپ کی ان پر خلوص کاوشوں کے لیے اجر عظیم عطا کرے۔ اور اس کے ساتھ تین افسانے بھی ہیں۔

ج: پیاری مریم! بہت نوازش کہ آپ نے ہماری کوششوں اور کاوشوں کو سراہا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس ادارے کی ترقی میں آپ قارئین کا بھی بہت بڑا حصہ ہے آپ نے ہماری پذیرائی کی۔ حوصلہ افزائی کی تو ہم آج اس مقام تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔

افسانے ابھی پڑھیں گے۔
طہ مصطفیٰ فاروق آباد سے شرکت کر رہی ہیں، لکھا ہے شعاع سے جو تعلق وابستگی ہے، ٹوٹ، خوب صورت مستقل۔ سوچا کیوں نہ آدھی ملاقات کر لی جائے۔ تو جناب اک عاجزانہ سوال ہے کہ ایسا کون سا ذخیرہ الفاظ استعمال کیا جائے کہ ہم بھی آپ کے سوئے من موئے ڈائجسٹ میں لکھاری کہلائے جا سکیں۔

شہزاد کے ہم زاد سے معارف کروادیں؟ باقی سلسلے زبردست تھے۔ تو آپ بتا دیں میں کب اپنی کارگزاری سمجھوں کیونکہ مصنفہ نثار اخاب ہے بلکہ جنون ہے۔

ج: پیاری طہ! کہانی اگر ذخیرہ الفاظ سے وجود میں آتی تو تمام ڈشٹریاں اور لغات کہانیاں ہوتیں۔ کہانی کے لیے مضبوط پلاٹ، جان دار مکالمے، اور کلائمکس ضروری ہے پھر کہانی کو سہارا دینے کے لیے منظر کشی اور کرداروں کی نشست و برخاست بھی اپنی جگہ پر ہے۔ اس تفصیل کو لکھنے کا مقصد ان تمام قاری بہنوں کی رہنمائی کرنا ہے جو کہانی لکھنا چاہتی ہیں۔ لکھتی بھی ہیں مگر کہیں نہ کہیں ان میں سے کسی ایک اصول کو چھوڑ دیتی ہیں پھر کہانی میں دلچسپی کا عنصر بھی ضروری ہے۔ ان تمام باتوں کو ذہن میں رکھ کر کوئی خوش گوار انجام کا بلاک پھلکا سا افسانہ لکھیں۔

مہناز یوسف نے اورنگی ٹاؤن کراچی سے شرکت کی ہے دکھتی ہیں

پہلی شعاع میں لکھی گئی باتوں سے سو فیصد متفق ہوں۔ واقعی ہمارے معاشرے میں عدم برداشت کا رجحان تیزی سے پروان چڑھ رہا ہے اللہ تعالیٰ ہم پر اپنا

آپ نے پہلا افسانہ لکھا تو ہمیں بہت خوشی ہوئی کہ ہمیں ایک ایسی مصنف مل گئی ہے جو مزاح بھی لکھ سکتی ہے۔ لیکن اس کے بعد آپ نے خاموشی اختیار کر لی۔ آپ کوئی ہنسی مسکراتی تحریر لکھیں، ہم انتظار کر رہے ہیں۔

سعدیہ کنول نے جو ملی لکھا ہے لکھا ہے کہیں پڑھا تھا کہ قلم تب اٹھاؤ جب علم ٹھکنے لگے اور ایسا تو پتا نہیں بھی ہو گا یا نہیں، اس لیے اور کوئی تحریر تو نہیں لکھ سکی آپ کی محفل میں شامل ہو رہی ہوں۔ شعاع اپنی باجی کو دیکھ کر پڑھنا شروع کیا امید ہے آگے بھی پڑھتی رہوں گی۔ حالانکہ اب شعاع میں پہلے جیسی بات نہیں رہ گئی۔ وقت، معاشرہ اور حالات بدلنے کے ساتھ شعاع بھی دیا تو نہیں رہ سکتا تھا۔ پھر بھی دل تو چاہتا ہے نا کہ رنگوں کی، خوشبو کی باتیں ہوں امید کے جگنوؤں کی کہانیاں ہوں رواداری اور رشتوں کی روشنیوں سے سچی ہوئی۔ لیکن دنیا بہت فاسٹ ہو گئی ہے اس لیے کچھ نئی رائیٹرز بھی کم وقت میں زیادہ لکھنا چاہتی ہیں شاید اسی لیے ڈراموں میں سے اور ادھر ادھر سے نئی پرانی کہانیوں سے لائیں لے کر ناول لکھ لیے جاتے ہیں لیکن بہت سی نئی رائیٹرز واقعی اچھا لکھ رہی ہیں صائمہ مشتاق کے خط کو اگر لیٹر آف دی ملٹھ نہیں تو بے جا نہ ہو گا۔ میں نے بھی وہ سب ڈائجسٹ پڑھے ہوئے (مجھے اتنا پرانامت سمجھیں پرانے ڈائجسٹ ڈھونڈنے اور کچھ باجی کے پڑھے ہوئے) کیا منظر نگاری ہوتی تھی کہ گرمیوں میں کوئی دمپر جنوری کا شمارہ ملا تو منظر اور مکالمے بڑھ کے بے اختیار دھوپ میں بیٹھ کے مالے اور مونگ پھلی کھانے کو دل چاہا اسی طرح سخت سردی میں جون، جولائی کا شمارہ ملا تو بارش انجوائے کرنے اور آم کھانے کو دل کرنے لگا۔ پرانی رائیٹرز تو توئی دی تھی اتنی مصروف ہو گئی ہیں کہ ڈائجسٹ کو بھول ہی گئیں انہیں نہیں کہ کچھچھ رہ جانے والوں کو بھولائیں کرتے۔

ن: پیاری سعدیہ! اتنا اچھا خط لکھ سکتی تھیں تو اتنی تاخیر کیوں کی۔ پہلے رشتوں میں رواداری ہوتی تھی یہ درست ہے مگر محبت اور رواداری اب بھی ہے۔ بس پہلے جیسی فراغت نہیں رہی ہے محبتیں تو ہیں لیکن ان کے اظہار کے لیے مل بیٹھنے کے لیے، وقت نہیں ہے۔ رنگوں اور روشنیوں کی باتیں اب بھی اچھی لگتی ہیں لیکن وہ سکون

کرم فرمائے آئین۔
ذہین، شرارتی، ناراض اور محبتوں والی بہنوں کے خطوط سے سچی یہ محفل مزہ دے گئی۔ تمام خطوط زبردست مگر صائمہ مشتاق کے خط نے تو محفل ہی لوٹ لی۔ شازیہ الطاف کے افسانے ہر بار ایک ہی نشست میں ختم کیے۔ شازیہ بہت اچھا لکھتی ہیں۔

نصیحہ ناز کا تماشا دیکھا۔ خاصا دلچسپ اور حقیقی لگا۔ شازیہ جمال ہوں اور انہیں نہ پڑھا جائے یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔

سدرہ حیات کا مکمل ناول پڑھنا شروع کیا تو آغاز پر ہی اقدس کے دلچسپ ڈائلاگز پر مسکراہٹ میرے لبوں کو چھو جاتی۔ بہت دیر بعد سوچا کہ دیکھوں کہ کتنے صفحے رہ گئے اختتام میں، تو آف..... مین صفحوں بعد ”دوسری اور آخری قسط آئندہ ماہ“ پڑھ کر شدید ترین کوفت ہوئی۔ شازیہ جمال طارق نے کمال کا ناول لکھا۔ خاص طور سے اختتام۔ عطیہ خالد کا ناول کمال تھا۔ مگر اختتام بہت جلدی میں کیا گیا کچھ واضح کر کے لکھنا تھا۔ دراصل اچھا اچھا لکھنے والی مصنفائیں بہت ذہین ہوتی ہیں۔ مگر ہم جیسے نا تجربہ قاری کا بھی کچھ خیالی رکھنا چاہیے نا۔

جیسے فرزانہ کھل بہت عمدہ لکھتی ہیں۔ ان کے لکھے ڈائلاگز بہترین ہوتے ہیں۔ مگر پچھلی دو تین کہانیاں ان کی لکھی میرے سر سے گزر گئیں۔ اتنا تجسس اتنا الجھاؤ۔ آج کل کہانی میں تجسس پر رقرار رکھنے پر بھی خاصا زور ہے رائیٹرز کا ”پچھلی بار“ انت بھلا سب بھلا، بہت اچھی لگی۔ اس ماہ ایسی کوئی ہنسی مسکراتی تحریر دکھائی نہیں دی۔ اس بار کے شعاع میں ایک بھی تحریر ایسی نہیں جسے کہا جاسکے کہ ”بس عام سی تھی“ بہت خوشی کی بات ہے کہ بدلتے وقت کے ساتھ بھی شعاع اپنا معیار برقرار رکھے ہوئے ہے۔

راشدہ رفعت کا ناول۔ واہ بھی کیا کہنے۔ ایسی ہی تحاریر تو ہیں جو لڑکیوں میں شعور پیدا کرنی ہیں۔ قرۃ العین سکندر نے بھی بہت مختلف اور اچھا افسانہ لکھا۔ خواب شیشے کا زبردست چارہ ہے۔

ن: پیاری مہناز یہ بتائیں کہ آپ نے افسانے لکھنا کیوں چھوڑ دیا ہے۔ آپ کو ہنسی مسکراتی تحریریں پسند ہیں۔ ہمیں بھی ایسی ہی تحریریں اچھی لگتی ہیں جب

کہاں کہ ان باتوں سے بیٹھ کر لطف اندوز ہو سکیں۔ تفریح کے بے شمار ذرائع، سینکڑوں ٹی وی چینلوں انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا یہ ایک نئی دنیا ہے۔ جس میں داخل ہو تو وقت گزرنے کا پتا نہیں چلتا۔ پھر بڑے شہروں کے مسائل آپ تو کراچی میں رہتی ہیں جانتی ہوں گی یہاں کی سڑکوں اور ٹراپسپورٹ کا جو حال ہے۔ کسی سے ملنے جائیں تو چار گھنٹوں میں سے تین گھنٹے تو سڑک پر ہی گزرتے ہیں اب راترنگوں، روشنیوں اور موسموں کی باتیں کیسے کر سکتی ہیں۔

شازیہ فیصر نے گاؤں نروال تحصیل

سرائے عالمگیر سے لکھا ہے

شہزادہ نہ پا کر بڑی مایوسی ہوئی ”خواب ششے کا“ ویسے شروع میں جتنا انٹرٹیننگ تھا اب عفت سحر جی براست مانجے گا، نہایت بور کر رہی ہیں اور ”کچھ خواب ہیں“ سدرہ حیات کا پڑھ کر اچھا لگا لیکن آخر میں باقی آئندہ دیکھ کر پھر ایسے لگا جیسے کڑوا کر یاد رکھا ہوا۔

فہرست میں شازیہ لطاف کا ذکر نہیں تھا لیکن آگے کہانی تھی۔ شازیہ جی کی یہ خوبی ہے وہ چھوٹے افسانوں کے ذریعے بہت بڑی بات کرتی ہیں۔ شاعری سے مجھے کوئی خاص شغف نہیں اور ”تاریخ کے جھروکے“ اور لطیف میرے ہارٹ فیورٹ ”حضرت آدم و حوا“ کے بارے میں اتنی معلومات دینے پر بہت شکریہ۔ ہمیں ہر مہینہ سہرا حمید کا انتظار رہتا ہے لیکن یہ خواتین میں تو دھڑا دھڑکتی ہیں۔

ج: پیاری شازیہ بہت معذرت کہ آپ نے دو سلسلوں کے لیے اپنی تحریریں بھجوائیں اور دونوں ہی شائع نہ ہو سکیں۔ ”شعاع کے ساتھ ساتھ“ کا سلسلہ ختم نہیں کیا گیا۔ کبھی کوئی ناول طوالت اختیار کر جاتا ہے کبھی قسط لیٹ موصول ہوتی ہے۔ اس بنا پر ہم اس سلسلے کو شامل نہیں کر پاتے ہیں۔ تاہم جوڑا ہے میں ان شاء اللہ آپ کی تحریر ضرور شائع ہوگی۔ بہت طویل تحریریں جو کئی اقساط پر ہوں ہمیں بھی بالکل پسند نہیں۔ لیکن کسی اچھی تحریر کو صرف

اس بنا پر تو رنجش نہیں کیا جاسکتا کہ وہ طویل ہے۔ مجبوراً اسے دو سسطوں میں شائع کرنا پڑتا ہے۔

شبنم حنیف لاہور سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

شعاع میٹرک کے پیپر سے فارغ ہونے کے بعد اپریل 2013ء سے پڑھنا شروع کیا۔ اگرچہ گھر میں رسالے پڑھنا منع تھے پھر بھی ہم تین ہفتے 300 روپے پاکٹ منی سے جوڑ کر تینوں رسالے منگواتے۔ 150 کے رسالے آتے اور 150 کر لیتا۔ بھائی کو تین بار جانا پڑتا۔ میرا بڑا بھائی محمد رفیق جس کی ایک ٹانگ میں فالج ہے پھر بھی وہ دو سال تک ہمارے لیے رسالے لاتا رہا۔ لیکن ایف کے بعد کوئی پابندی نہ رہی اب عمران بھائی خود ہر ماہ لا دیتے ہیں بس ایک بیج کرتی ہوں اور رسالے حاضر۔ اب تو چھوٹے بھائی نے خط لکھنے کے لیے لفافے بھی لا دیے ہیں۔ میں اپنے تینوں بھائیوں اسپیشلی بڑے بھائی کو اس خط کے ذریعے تنہک پوچھنا چاہوں گی۔ اب آتے ہیں اکتوبر کے شمارے کی جانب ناڈل اچھی لگی شہزادہ بہت اچھا جا رہا ہے ”خواب ششے کا“ عفت جی ویل ڈن ”سنہری دھوپ“ بھی اچھا لگتا ہے۔

ج: پیاری شبنم! آپ خوش نصیب ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو محبت کرنے والے بھائی دیے۔ ہمیں تو سب ہی بھائیوں پر جان بچھاو کر رہتی ہیں لیکن بھائی بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو بہنوں کا خیال رکھتے ہیں ویسے آپ بھی بہت اچھی بہن ہیں جو بھائیوں کی محبت کی قدر کرتی ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے بارے میں جان کر خوشی ہوئی لیکن تبصرہ بہت مختصر کیا۔ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔

صائمہ مشتاق نے بھاگنپالہ نوالہ سرگودھا سے

شرکت کی ہے، مہتی ہیں

شعاع میں نے 2005ء میں پڑھنا شروع کیا تھا جب میں 5th کلاس میں تھی اور آٹھ سال کی تھی اب آپ خود ہی اندازہ لگائیں کہ شعاع سے وابستگی پرانی ہے۔

ج: پیاری صائمہ! اتنی طویل رفاقت نبھانے کے لیے ممنون ہیں۔ اللہ کا کرم ہے کہ قارئین ہمیشہ، زندگی کے ہر اتار چڑھاؤ سے گزرنے کے باوجود شعاع کے ساتھ ہیں۔ اپنی کزن اقرا ممتاز کا بھی ہماری طرف سے شکریہ ادا کر دیں۔

عائشہ مرزا لکھتی ہیں

سورق پر براجمان دو شیزہ کے لفٹ نہ کروانے پر

(ارے بھئی وہ سنگھار میں بڑی تھیں) ہم سلسلوں کی جانب بڑھے ”پہلی شعاع“ چند الفاظ میں بہت کچھ سمجھا دیا۔ ”حمد و نعت“

اور ”بیارے نبی کی پیاری باتیں“ سبحان اللہ۔ ”گلر پز“ میرا مطلب ”شہرِ اذیت“ سے ملاقات کی بے حد خوشی ہوئی لیکن حنا شیخ کچھ زیادہ دل نہ جیت سکیں۔ ”جب تجھ سے نانا جوڑا“ اس دفعہ ”ط۔ی۔ الف“ کو پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ ہماری تو باجیاں یا آجیاں جو اپنے شادی کے بعد کے حالات دھتی ہیں جن پر بہت ظلم ہوا۔ میرے خیال میں ان کو اسی وقت ظلم کے آگے ڈٹ جانا چاہیے تھا۔ ظلم سہنے والا کرنے والے سے زیادہ سزا کا مستحق ہوتا ہے۔ اگر وہ اس وقت کچھ نہیں کر سکیں تو آج بھی اپنا دل برانہ کر دیں وہ سب یاد کر کے اور خود کسی کے ساتھ وہ سب نہ کریں جو ہمیں آپ کے ساتھ ہو چکا۔

ج: پیاری عائشہ! ظلم کے خلاف واقعی ڈٹ جانا چاہیے مگر شادی شدہ خواتین اپنے گھر کو ٹھٹھے سے بچانے کے لیے یا اپنی اولاد کے لیے ہر طرح کا سمجھوتا کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ جہاں تک یاد کر کے دل برا کرنے کی بات ہے تو یہ سلسلہ کسی کو برا کہنے یا دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے نہیں شروع کیا گیا بلکہ اس سلسلے کا مقصد یہ ہے کہ ان لوگوں کے احساس کو جگایا جائے جو دوسروں پر زیادتی کرتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتیں جو بظاہر معمولی ہوتی ہیں۔ دلی پر کتنے گہرے داغ چھوڑ جاتی ہیں۔ ان باتوں کا خیال رکھیں۔

ناہید تنویر سمندری نے اشرف آباد سے لکھا ہے ۲۰۰۲ء میں شادی ہوئی تو میرے شوہر تنویر صاحب نے میرا شوق دیکھتے ہوئے مجھے بھی شعاع اور بھی خواندین لا کر دیے۔ پھر تو کسی اور ڈائجسٹ کی طرف دھیان ہی نہیں گیا۔ میرے میاں سعودی میں ہوتے ہیں۔ ایک ہی بیٹا ہے ماشاء اللہ آٹھویں میں پڑھتا ہے احمد تنویر۔ اگر خط شامل ہو گیا تو پھر جب تجھ سے نانا جوڑا میں شریک ہوں گی۔

ج: پیاری ناہید! سب سے پہلے تو آپ کے میاں صاحب کی تعریف کریں گے جنہوں نے آپ کا شعاع اور خواتین سے تعارف کرایا اور پھر ہر ماہ لا کر دیتے رہے اور یہ

بات سمجھ میں نہیں آئی ”تجھ سے نانا جوڑا“ کا خط کی اشاعت سے کیا تعلق؟ آپ اس سلسلے میں بلکہ شعاع کے ہر سلسلے میں شرکت کریں اتنے طویل عرصے سے شعاع کی قاری ہیں تو آپ کو خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار بھی کرنا چاہیے۔

جو یہ یہ صدف گلزار نے جوتی سے لکھا ہے

کہانی سے بات شروع کروں؟ چلیں پہلے حال کا حال کہہ دیا جائے پھر ماضی میں جھانکیں گے۔ نمرہ احمد اور سمیرا حمید دونوں ہی بہت زور قلم رکھتی ہیں۔ بہت اعلیٰ عمدہ اور شاندار طرزِ تحریر کی مالک ہیں۔ ان کی تو ہر تحریر پر الگ الگ تعریفی و تنقیدی مضمون لکھا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ بلاشبہ شعاع کا ہر سلسلہ بہت اچھا، پراثر اور معلوماتی ہوتا ہے۔ اب میں ان رائٹرز کی بات کروں گی جو اب نہ جانے کہاں کھو گئی ہیں۔ جس سسٹمز، فرحت اشتیاق، فائزہ افتخار، گنبت سیما، نمرہ بخاری، ان سب کو میں بہت مس کرتی ہوں۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ ان سب کے لیے ”میرے گم شدہ“ کے عنوان سے ایک مضمون نمائندگیوں جس میں ان سب کی بہترین تحریروں کو مختصراً ہراؤں جو اگر چہ کئی برس پہلے پڑھی تھیں مگر اب تک حافظے میں محفوظ ہیں اور مضمون کے عنوان سے ہی آپ کو اندازہ ہو جائے کہ میں فائزہ جہیں کو کتنا یاد کرتی ہوں کہ یہ ان کی ایک کہانی کا عنوان تھا۔ ان سب پیاری رائٹرز کے پرانے ناولز کو ہر مہینے شعاع یا خواتین میں دوبارہ شائع کروں۔

ج: پیاری جویریہ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید آپ نے بہت اچھا کیا کہ اپنی رائے کا اظہار کیا ”میرے گمشدہ“ مضمون ضرور لکھیں۔ یقیناً بہت دلچسپ ہوگا۔ آپ کی تجویز بہت اچھی ہے، ہم پرانی مصنفین کی تحریروں ضرور شائع کریں گے۔

خواب

عاصم کو آپ آج کل شوکت تھانوی کے ناول پر مبنی سیریل ”پگلی“ میں دیکھ رہے ہیں۔ اس سے پہلے عاصم اظہر گلوکاری کے میدان میں بھی اپنے آپ کو منوا چکے ہیں۔ گزشتہ دنوں عاصم اظہر نے اپنی والدہ کے ساتھ ایک ایک ایوارڈ شو میں شرکت کی۔ جو ان کا دیرینہ خواب تھا۔ عاصم اظہر اس بارے میں کہتے ہیں کہ میرا خواب سچ ہو گیا ہے، یہ زیادہ پرانی بات نہیں ہے، جب میں ہاتھ میں اپنا ہیز برش لے کر آئینہ کے سامنے کھڑا ہوتا تھا۔ (تو آپ بھی عاصم!) اور کسی ایوارڈ شو میں پرفارم کرنے کی اداکاری کرتا تھا۔ بھی کسی کو ایوارڈ دینے کی اداکاری کرتا تھا۔ (اور ایوارڈ لینے کی..... بھی اداکاری۔) اور آج یہ سب سچ ہو گیا ہے۔ مجھے یہ اعزاز دیا گیا کہ



اہلیت

ہانیہ عامر کو شو بزم میں آئے ابھی صرف دو برس بھی مکمل نہیں ہوئے ہیں۔ راول پنڈی سے تعلق رکھنے والی ہانیہ نے کم عمری اور کم وقت میں بہت زیادہ کامیابیاں حاصل کر لی ہیں۔ انہیں حال ہی میں ایک فلم میں سپورٹنگ اداکارہ کا ایوارڈ بھی ملا ہے۔ ہانیہ اس بارے میں کہتی ہیں کہ ”کم وقت میں زیادہ شہرت نے ان کا مزاج تبدیل نہیں کیا۔ (یہ تو آپ کو جاننے والے ہی بتا سکتے ہیں۔) وہ سمجھتی ہیں کہ انہیں جو کچھ مل گیا ہے، وہ ان کی اہلیت سے زیادہ ہے۔ (اچھا.....؟) ہانیہ عامر مزید کہتی ہیں کہ انہیں آڈیشن کے اگلے روز ہی منتخب ہونے کی نوید سنائی گئی۔ انہوں نے مزید کہا کہ انہیں اپنے نوآموز ہونے کا بھی کمپلیکس نہیں رہا۔ وہ سب کے ساتھ دوستانہ بنیادوں پر کام کرتی ہیں۔ (اور دوسرے آپ کے ساتھ.....؟)



میں ایوارڈ میں سب سے آخری پرفارمنس پیش کروں اور پوری شو بزانڈسٹری کے لوگ میرے پیچھے کھڑے تھے۔ اس کا تو میں نے کبھی خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ میرے سامنے وہ خاتون بھی بیٹھی تھیں، جنہوں نے مجھے زندگی میں چلنا سکھایا۔ وہ میری پیاری امی تھیں۔ میں آپ سب کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنہوں نے آج مجھے اس مقام تک پہنچایا۔ میں اپنے مداحوں کے بغیر کچھ نہیں۔ (سو تو ہے)

معیار اونچا ہو گیا ہے۔ (پہلا خیال زیادہ اچھا ہے بھی)۔ یا یہ کہ وہ مختلف انداز کا سینما دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ (نہیں جناب! ایسی فلمیں تو وہ پڑوسیوں کی بھی..... دیکھ لیتے ہیں، آئٹم نمبر والی۔) بہر حال ناکامی کی وجہ جو بھی ہو، لیکن میں کم از کم اتنا جانتا ہوں کہ لوگ اب اتنے سمجھ دار ہو چکے ہیں کہ وہ معیاری اور غیر معیاری فلم کا فرق کر سکتے ہیں۔ (یعنی پہلے لوگ.....؟)

لگن

گلوکارہ مسکان بے کنتی ہیں۔ ”میں سمجھتی ہوں کہ ٹیکنالوجی نے بہت سے لوگوں کو گلوکار بنا دیا ہے۔ (جیسے کہ آپ.....؟) پہلے لوگ کئی کئی گھنٹے ریاض کرتے تھے، محنت کرتے تھے۔ پھر عوام کے سامنے پرفارم کرتے تھے۔ اب کوئی ریاض کرے نہ کرے لیکن سی ڈی ریکارڈنگ کر داکے گلوکار بن جاتے ہیں۔ (تجربہ ایسی کو کہتے ہیں)۔ میں ذاتی طور پر لائیو گلوکاری کو پسند کرتی ہوں۔ (جی! لائیو میں گلوکارہ کم اداکاری زیادہ ہوتی ہے۔ بلکہ اچھل کود اور.....) لیکن کبھی کبھی شوز میں یا کسی تکنیکی اعتبار سے مجبوری کے باعث سی ڈی استعمال کرنا پڑتی ہے۔ (جی ہاں! آواز کی کوالٹی یا سر کی کمی کے باعث بھی) مسکان بے نے مزید کہا کہ ”جس پر قسمت کی دیوی مہربان ہو، اسے محنت اور لگن کی ضرورت نہیں رہتی۔ (اوہ..... واہ..... بلے بلے۔ کیا سوچ ہے۔) بہت سے فن کار محنت اور لگن سے کام میں لگے رہتے ہیں لیکن قسمت کی دیوی ان پر مہربان نہیں ہوتی۔

☆☆☆

ادھر ادھر سے

جنرل پرویز مشرف خود کچھ بھی کہتے رہیں۔ ان کے وزیر خارجہ خورشید محمود قصوری نے اپنے ٹویٹر اکاؤنٹ سے جنوری 2012ء میں خود اس غلطی کا اعتراف ان الفاظ میں کیا۔

فرق

فلموں کے حوالے سے محسن عباس کا نام اب کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ فلموں کے حوالے سے محسن عباس کہتے ہیں۔ ”میرا خیال ہے کہ انڈین فلموں پر پابندی لگائے جانے کے بعد ہم نے بہت سے فلم بین کھو دیے ہیں۔ یہ اقدام اس لحاظ سے مزید برا ثابت ہوا کہ ہمارے ہاں اچھی فلمیں نہیں بن رہیں۔“ (تو آپ کی فلم کیا ہے؟) انہوں نے مزید کہا کہ ویسے اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ فلم میکیز اچھی فلمیں نہیں بنا رہے یا فلم بینوں کا



تخریروں تک رہے تو خوب میلہ لگا رہتا ہے۔

(اخبار جہاں جولائی 2014ء)

☆ میں آپ کے سامنے زندہ مثال بیٹھا ہوں۔ جس نچ جاوید عاصم نے مجھے سزا دی تھی، اس نے اخبار نویسوں سے کہا کہ کیس میں تو کچھ نہیں لیکن میں نے جو فیصلہ دیتا ہے۔ وہ میری دراز میں پڑا ہے۔

(صدیق الفاروق)

☆ صرف اہل بصیرت کی بات نہیں، میرے اللہ نے جس کسی کو بھی تھوڑا بہت علم آنے والے دنوں کا عطا کیا ہے، وہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ 2012ء کا سورج پاکستان کا سورج ہے۔

(حرف راز۔ 2008ء اور یا مقبول جان)



”مجھے بے قصور عافیہ صدیقی کو امریکیوں کے حوالے کرنے کا گہرا صدمہ ہے، یہ میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔“

(مظفر اعجاز..... قلم رو)

☆ برسوں پر محیط سفر اس کے ہزاروں نشیب و فراز اور لاتعداد قربانیوں کے باوجود بھی لگتا ہے پاکستانی جمہوریت ریت کی دیوار ہے۔ اس میں ارتعاش پیدا کرنے کے لیے دو چار کنفیوژن پھیلانے والے بیانات اور چند جذباتی تقریریں ہی کافی ہیں۔ لانگ مارچ اور دھرنے تو اسے ہلا کر رکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بحرانوں، سازشوں، مار دھاڑ، جلاؤ، گھیراؤ میں خود فیصل سماج میں کیک چھوٹا ہے اور اسے جلدی جلدی کھانے کے خواہش مند زیادہ ہیں۔ یہ ہی وجہ ہے کہ ہر وقت سازشی تھیوریاں اسلام آباد میں پچھل چائے رکھتی ہیں اور سیاسی پنڈت نئے نئے سامنے لاتے رہتے ہیں۔ بات تجزیوں اور

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے 4 خوبصورت ناول

ایک میں
اور ایک تم



تزیلہ ریاض
قیمت - 350 روپے

اُجالوں کی بستی



فاخرہ جبین
قیمت - 400 روپے

کسی راستے کی
تلاش میں



میمونہ خورشید علی
قیمت - 350 روپے

میرے خواب
لوٹا دو



نکیت عبد اللہ
قیمت - 400 روپے

فون نمبر:
32735021

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی

متواہ
کاتبہ

موسم کے پکوان

خالہ جیلائی

اسٹیشل فروٹی کیمیر

لال مرچ ڈال کر بھونیں۔ ہری مرچ، دھنیا، ڈالیں اور ٹھنڈا کر لیں۔ سلائس کو بیلن سے چپٹا کر کے اس کے کناروں پر انڈا لگائیں۔ پیسے کا مکسچر رکھ کر چاروں طرف سے فولڈ کر کے بائرنالیں اور فریج میں رکھ دیں۔ میدے میں نمک، سیاہ مرچ اور تھوڑا سا پانی ملا کر پتلا سا آمیزہ بنالیں۔ سینڈوچ بائز کو میدے والے آمیزے میں ڈبو کر گہرے گرم تیل میں فرائی کریں۔ ٹشو پیپر نکال کر اضافی چکنائی جذب کریں اور کھجپ کے ساتھ شام کی چائے پر پیش کریں۔

آدھا، آدھا کپ	آم انناس
دو کاؤ	دودھ
دو کپ	چینی
ایک چوتھائی کپ	چاول
آدھا پکٹ	فریش کریم
سجاوٹ کے لیے	پتے، بادام
	ترکیب :

دودھ کو ابال لیں اور ملکی آئیچ پر پکے دیں۔ چاول دو گھنٹے بھگوئے کے بعد پیس کر دودھ میں ڈال دیں اور ملکی آئیچ پر پکے دیں۔ ساتھ ساتھ چمچے ضرور چلائی رہیں۔ پس الائیجی بھی ڈال دیں۔ جب کھیر کا ڈھی ہو جائے تو اتار لیں۔ ٹھنڈی ہونے پر کریم اور تمام فروٹس کی بورز میں کاٹ کر شامل کر لیں۔ کترے ہوئے پتے، بادام اور چاندی کے ورق سے سجائیں اور خوب ٹھنڈی کر کے پیش کریں۔

فرائیڈ بائز سینڈوچ

جزا برائے دو چٹیل مسالا :	
پیاز (درمیانہ سائز) 1 عدد	
نمٹاڑ (درمیانہ سائز) 2 عدد	
شملہ مرچ (درمیانہ سائز) 1 عدد	
ہرا دھنیا	چوتھائی گڈی
ہری پیاز (صرف پتے) 1 عدد	
لسن پیسٹ	1 کھانے کا چمچ
ثابت دھنیا	1 کھانے کا چمچ
ثابت زیرہ	1 کھانے کا چمچ
کٹی لال مرچ	1 کھانے کا چمچ
نمک	حسب ذائقہ
کوکنگ آئل	3 کھانے کے چمچ
جزا	
بکری کی چانپ	1 کلو
کوکنگ آئل	1 کپ
لسن پیسٹ	1 کھانے کا چمچ
اورک پیسٹ	1 کھانے کا چمچ
ثابت لال مرچ	15 دانے
نمک	حسب ذائقہ

جزا :	
چکن قیمہ	ایک کپ
لسن پیسٹ	ایک چائے کا چمچ
ہرا دھنیا، مرچ	حسب ضرورت
میدہ	ایک کپ
ڈبل روٹی	چھ سلائس
انڈا	ایک عدد
پیاز	ایک عدد
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت
ترکیب :	

پیاز اور لسن سنہری کر کے چکن قیمہ، نمک اور کٹی

ترکیب :

ایک کڑھائی میں چنانچہ پانی، کوکنگ آئل، لہسن پیسٹ، اورک پیسٹ، ثابت لال مرچ اور نمک ڈال کر پکائیں یہاں تک کہ پانی خشک ہو جائے اور صرف تیل باقی رہ جائے۔ اسی تیل میں چنانچہ کو اچھی طرح فرائی کر کے علیحدہ برتن میں نکال لیں۔

اب پیاز، نمٹا، شملہ مرچ، ہر ادھنیا اور ہری پیاز کے پتوں کو نارمل سائز میں کاٹ لیں۔ کڑھائی میں تین کھانے کے چمچ کوکنگ آئل گرم کریں۔ اس میں زیرہ، دھنیا اور لہسن پیسٹ ڈال کر اتنا پکائیں کہ لہسن کا کچا پن ختم ہو جائے۔ اب تمام سبزیاں، نکلی لال مرچ اور نمک ڈال کر کڑھائی کو ڈھانپ دیں اور درمیانی آگ پر اتنا پکائیں کہ سبزیاں نرم ہو جائیں اب دبجشیل مسالا

میں فرائیڈ چنانچہ اور ثابت مرچ مکس کر دیں اور 4-5 منٹ تک پکائیں۔ سبجے مزیدار فرائیڈ مسالا چنانچہ تیار ہے۔ ابلے ہوئے چاولوں کے ساتھ پیش کریں اور گھر والوں کا دل جیت لیں۔

سیاہ مرچ چکن مسالا

اجزا :

چکن نمٹا، لہسن، اورک پیسٹ، ثابت لال مرچ، وہی پیاز، سبز مرچ، سبز دھنیا، پودینہ، زیرہ، اجوائن، خشک دھنیا، کالی مرچ، نمک، گھی، ترکیب :

پیاز کو لچھوں کی صورت میں کاٹ کر رکھ دیں اور نمٹا، نمٹے موٹے گول شکل میں ایک دیکھی میں گھی

گرم کریں اور پیاز ڈال کر چمچ چلاتی رہیں۔ ہلکا سنہرا ہونے کے بعد چکن، اورک، لہسن پیسٹ ڈال کر بھوننا شروع کریں۔ دوسری طرف تو بے پرکالی مرچ، سرخ مرچ، زیرہ، اجوائن اور دھنیا بھون کر پشیں۔ یقین کریں اس مسالے کی خوشبو انسان کو پاگل کر دے گی۔ پسپا ہوا مسالا اور نمک وہی میں ڈال کر گس کریں۔ سبز دھنیا اور پودینہ باریک کاٹ لیں اور سبز مرچ لمبائی میں کاٹ کر علیحدہ رکھ دیں۔ اب جگن میں وہی ڈال کر

اچھی طرح پکائیں۔ جب وہی کا پانی خشک ہو جائے اور مسالا گھی چھوڑنے لگے تو نمٹا اور ہر مسالا ڈال کر ڈھکن بند کر دیں۔ تاکہ ہوا نہ جائے۔ آج نیم کر کے پانچ منٹ بعد چلو ہا بند کر دیں۔ سرو کرتے ہوئے تیل سے ہر مسالا اور نمٹا مکس کر کے گرم گرم روٹی کے ساتھ پیش کریں۔ امرانی تیکے

اجزا :

گوشت، ایک کلو، ہلکا گرم مسالا، لیموں کا رس، دو کھانے کے چمچ، تھک مسالا، سرکہ، نمٹا، کیچپ، پیاز، نمک، تیل، حسب ذائقہ و ضرورت

ایک پیالی میں لیموں کا رس، گرم مسالا اور تھک مسالا ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں۔ فرانک پان میں تیل گرم کر کے پیاز بھل کر نکال لیں۔ پھر اسی تیل میں اوپر والا مکسچر، نمک اور سرخ مرچ ڈال کر بھونیں، پھر نمٹا، کیچپ ڈال کر ساتھ ہی تلی ہوئی پیاز بھی شامل کر کے تھوڑی دیر بھونیں اور چولے سے اٹار لیں۔ گوشت کی پسندے ہوئی بھولیں اور اچھی طرح دھو کر سرکے اور اوپر والے مسالے میں مکس کر کے چار گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ پھر تیخ میں پرو کر کوئلے پر سینکھیں۔ تھوڑا، تھوڑا تیل لگاتے جائیں۔ پچھے دار پیاز اور چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔





آگ..... آگ..... آگ.....

سادھے بیٹھے ہیں۔ دفعتاً شیر کی سی دھاڑ سے حکم دیتا ہے کہ شراب حاضر کی جائے۔

خدا میں ایک شخص یونانی تھا جو اپنے آقا کے وطن ایتھنز سے بھاگ کر یہاں آیا اور جسے نیرو نے شراب خانے کا داروغہ بنا دیا تھا، اس کا نام تھا ”دیوموس“۔

نیرو نے غلاموں کو حکم دیا کہ آج کے دن آگ کے خوب صورت مناظر نے مجھے بہت خوش کیا ہے۔

لہذا حاضرین کو خوب جام بھر کر شراب پلاؤ۔ جام بھر کر سب کو دیے جانے لگے، سب بدست ہو رہے تھے کہ اچانک نیرو کو خیال آیا کہ دیوموس نہیں ہے۔

اس نے پوچھا کہ دیوموس نظر نہیں آ رہا، کہاں ہے؟ جواب ملا کہ باہر انتظام میں مصروف ہے۔

یہ سن کر نیرو نے چٹکھڑا کر کہا۔ ”میں نے دیوموس کو حکم نہیں دیا تھا کہ دعوتوں میں مجھے ہمیشہ اسی کے ہاتھ سے شراب پینی ہے۔ جاؤ اس ملعون یونانی کو پکڑ کر میرے حضور پیش کر دو۔“

دیوموس ہانپتا ہانپتا ہوا آیا، قدموں میں گر کر معافی مانگی اور بولا۔ ”میں نے عمدائے خطائیں کی بلکہ میں باہر کے انتظام میں اس قدر مصروف تھا کہ حاضری کا خیال دل سے نکل گیا۔“

لیکن نیرو نے جس کے سر پر خون سوار تھا آؤ دیکھا، نہ تاؤ۔ اپنا عصائے شاہی اٹھایا اور اس زور سے سر پر مارا کہ اس کا سر پھٹ گیا اور خون کا فوارہ جاری ہو گیا۔ نیرو نے حکم دیا کہ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر کونے میں ڈال دو، جب دعوت ختم ہوئی اور شراب سب کے دماغوں پر چڑھ گئی تو حکم دیا کہ دیوموس کو سامنے لایا جائے، پھر جلا دیا کہ حکم دیا کہ

یہ ہی ایک کلمہ تھا جو ہزاروں خشک زبانوں پر جاری تھا۔ تین سمجھنے آتشزدگی کو ہو چکے تھے، آگ نے شہر کے تمام مکانوں، ممبروں کو اندر باہر چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ مکانوں کی چھتیں دھاکوں سے گر رہی تھیں۔ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کی چیخیں مل کر ہیبت ناک منظر پیش کر رہی تھیں جسے کوئی سکون سے نہیں دیکھ سکتا۔

یہ واقعہ 67ء جب روم پر حکومت کرتے نیرو کو گیارہ سال ہو چکے تھے اور یہ قربانی، آگ و خون کی ہولی، گویا زمین کے سب سے بڑے دیوتا ”نیرو“ کے سامنے دی گئی۔

جب یہ تماشا ختم ہوا تو نیرو مسکراتا اور اٹھ کھلیاں کرتا ہوا مصر میں داخل ہوا اور اپنی مشہور زمانہ بائسری (جس کے سرخ اطلس کو فیضیاء کی لڑکیوں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔) رکھ کر مند پر بیٹھ کر امر اور بار سے مخاطب ہوا۔

”آج میں نے شہر روم کو سیاہ خاک کر کے واقعات عالم میں ایسے واقعہ کا اضافہ کیا ہے جو تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ جلی حروف میں لکھا جائے گا، لیکن اسی خاک پر میں ایک عظیم روم تعمیر کروں گا، جس کی عظمت کے سامنے تم سب قدیم روم کو بھول جاؤ گے۔“

کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں کبھی لطف و کرم سے کام نہیں لیا، مگر صرف ایک بار لیکن اس کرم نوازی کا وہ کتنا بڑا معاوضہ پہلے ہی وصول کر چکا تھا، اس کا حال اس واقعے سے معلوم ہوگا۔

نیرو اپنے تخت پر جلوہ افروز ہے، سب امراء دم

کرن

دسمبر 2017 کا شمارہ شائع ہو گیا

”کرن کا دسترخوان“

اب ہر ماہ کرن کے ساتھ مفت ماسل کریں

✽ فنکار ”اسد محمود“ سے شاپن رشیدی ملاقات،

✽ ”آواز کی دنیا سے“ اس ماہ مہمان ہیں ”جمیل احمد“،

✽ اداکارہ ”حنالطاف“ کہتی ہیں ”میری بھی سنیے“،

✽ اس ماہ ”آمنہ“ کے ”مقابل ہے آئینہ“،

✽ ”ہوائیں رخ بدل گئیں“ نگہت عبد اللہ

کانیا سلسلہ وار ناول،

✽ ”من مورکھ کی بات نہ مالا“ آسیہ مرزا کا سلسلہ وار ناول

اپنے اختتام کی طرف،

✽ ”ضروری تو نہیں“ صدف ریحان کا مکمل ناول،

✽ ”جنوں مائل“ نادیہ احمد کا مکمل ناول،

✽ ”مہجور ٹیشن“ مصباح علی سید کا مکمل ناول اپنے اختتام کی طرف،

✽ ”احساس سے گندے لوگ“ ام ایمان قاضی کا ناول،

✽ ”حصار ذات میں اترے تو“ یمنی اختر کا ناول،

✽ نظیر فاطمہ، نزہت جبین اور انعم خان کے افسانے

اور مستقل سلسلے،

اس کے دونوں ہاتھ کاٹ دیے جائیں۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔ ہاتھ کاٹ دیے گئے۔ دیوموس تکلیف سے چیخ رہا تھا۔ سب قہقہے لگا رہے تھے۔

نیرو نے پوچھا۔ ”کیا تمہیں بہت تکلیف ہو رہی ہے؟“

”ہاں، یہ اذیت ناقابل برداشت ہے۔ میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے مار ڈالو، تاکہ اس عذاب سے مجھے چھٹکارا ملے۔“

نیرو نے جواب دیا۔ ”میں ایسا نہیں کر سکتا۔“ جب دیوموس کے ہاتھ کاٹے گئے تو اس نے اپنے ایک ساتھی افریقی غلام سے کہا کہ تم مجھے ہلاک کر ڈالو۔ ایسی زندگی سے موت بہتر ہے، لیکن اس

نے ایسا نہیں کیا، بلکہ قصر کے ایک گوشے میں جا کر اس کی عیادت شروع کر دی، یہاں تک کہ اس کے زخم اچھے ہو گئے۔ رفتہ رفتہ وہ تمام کام اپنے پاؤں سے کرنا سیکھ گیا۔

نیرو ابھی کھار قصر کے مختلف گوشوں میں گھوما پھر ا کرتا تھا۔ ایک دن اتفاق سے اس کا گزر دوہاں سے ہوا جہاں دیوموس پاؤں سے برتن دھور ہا تھا۔ نیرو اسے بھول چکا تھا۔

حیران ہو کر پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟“ محل کے داروغہ نے ڈرتے ہوئے بتایا کہ یہ آپ کا غلام دیوموس ہے جس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم آپ نے دیا تھا۔ موت اس کی قسمت میں نہ تھی، اس لیے بچ گیا لیکن بدستور اپنے آقا کی خدمت میں مصروف ہے۔

نیرو بہت متاثر ہوا اور حکم دیا کہ دیوموس کو حاضر کیا جائے۔

نیرو نے دیوموس کو مخاطب کر کے کہا۔ ”اے میرے بھائی! اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے تمہارے ساتھ بہت برا کیا ہے۔ امید ہے تم مجھے معاف کر دو گے۔“

دیوموس اس کے قدموں میں گر پڑا اور بولا۔

”اے آقا! میری جان کے مالک کل بھی آپ تھے اور آج بھی آپ ہی ہیں۔ آپ نے کل جو کیا، وہ بھی حق تھا اور جو آپ آج کر رہے ہیں، وہ بھی حق ہے۔“

نیرو نے کہا۔ ”آج میں نے تمہیں آزاد کیا اور اپنے قصر کا محافظ مقرر کیا۔“

یہ کہہ کر دیوموس کو رخصت کیا اور متعدد غلام اس کی خدمت پر مامور کیے۔

اس کے بعد دس سال تک دیوموس زندہ رہا اور اس نے پاؤں سے کام کرنے کی ایسی عادت بنائی کہ پورے روم میں اس کی ٹکر کا نقاش اور بت تراش کوئی نہ تھا۔ اس نے نیرو کا بھی ایک مجسمہ تیار کیا جو ہر وقت نیرو کی خواب گاہ میں پڑا رہتا۔ جب 68ء میں نیرو کا انتقال ہوا تو یہ مجسمہ ٹوڑ دیا گیا لیکن دیوموس بت تراش و نقاشی میں مصروف رہا کیونکہ سارا روم اس کی صلاحیتوں کا معترف تھا۔

نہ اب..... نیرو باقی ہے نہ دیوموس لیکن ایک کے ظلم و ستم، دوسرے کا صبر تحمل، کیا یہ ایک مثال نہیں ہے؟

ممکن ہے نیرو کی روح اب بھی اس بات پر نازاں ہو کہ اس کی وجہ سے روم کو اتنا بڑا صاحب کمال سنگ تراش و نقاش میسر ہوا۔

(مسز عذرا عمران..... ملتان)

منوسمرتی یا میناس سمرتی

ہندوؤں کی مذہبی کتاب ”منوسمرتی“ ہے۔ کیا یہ ناممکن ہے کہ اس کتاب کا اصلی نام ”میناس سامری“ یا ”مینا سمیری“ ہو اور ہزاروں برس کے اندر آہستہ آہستہ بدلتا ہوا ”منوسمرتی“ بن گیا ہو؟

پرانے ہندوؤں کی کوئی تاریخ ہمیں موجود نہیں ہے لیکن مصر کی تاریخ بتاتی ہے کہ وہاں ایک بہت بڑا بادشاہ میناس کے نام سے گزرا ہے۔ اسی بادشاہ کو تمام مورخ ابھی حال تک پورے مصر کا پہلا فرعون مانتے رہے۔ بہت ممکن ہے کہ سامری نے ہندوستان آ کر

اسی مصری فرعون کی طرف اپنی کتاب منسوب کر دی ہو اور اپنی یاد بھی باقی رکھنے کے لیے اس کا نام ”میناس سامری“ رکھ دیا ہو۔

پرانے زمانے کا مصر تمدن دہندیب میں تو بہت آگے بڑھا ہوا تھا مگر مذہب اور روحانیت میں بہت پیچھے تھا۔ مصریوں کے پاس نہ تو کوئی مذہبی کتاب تھی اور نہ لکھی ہوئی دینی شریعت تھی۔ فرعون اور مندروں کے مہنت جو کچھ کہتے تھے، اسی کو شریعت اور دینی حکم سمجھا جاتا تھا۔ جب تک فرعونوں میں زور رہا، مصری ان ہی کو زمین پر دیوتاؤں کا منظر یا دیوتا مانتے رہے۔ فرعون امن دیوتا کا براہ راست سگایا سمجھا جاتا تھا۔ اس کی پوجا ہوتی تھی۔ جیتے جی بھی اور مرنے پر بھی فرعون کی اطاعت کرنا اور ہر ممکن طریقے سے اس کی خوشنودی حاصل کرنا، اسی طرح فرض خیال کیا جاتا تھا جس طرح توحید والوں کے ہاں اللہ کی اطاعت کرنا اور خوشنودی حاصل کرنا فرض سمجھا جاتا ہے۔

مصری بت پرست تھے۔ بہت سے دیوتا پوجتے تھے۔ ہر شہر بلکہ ہر گاؤں کا دیوتا الگ تھا اور وہاں صرف اسی کو پوجا جاتا تھا۔ وہی آبادی کا بچانے والا مانا جاتا تھا۔ جب کوئی آدمی اپنے گاؤں یا شہر سے چلا جاتا تھا تو اسے دیوتا کو بھی چھوڑ جاتا تھا اور نئی جگہ کے دیوتا کی پوجا کرنے لگتا تھا کیونکہ سمجھتا تھا کہ اب دوسرے دیوتا کی عملداری میں آ گیا ہے اور یہی دیوتا کام آ سکتا ہے۔

مصریوں کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ دیوتا ان کی طرف سے لڑتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس جگہ کے مصری زیادہ لڑائیاں جیت لیتے تھے، وہاں کا دیوتا زیادہ مشہور ہو جاتا تھا۔ تھیسس شہر کے شاہی خاندان نے مصر کو دوبارہ آزادی دلائی تھی اور بہت بڑی سلطنت کھڑی کر دی تھی، اس لیے تھیسس کا دیوتا امن سب سے بڑا دیوتا مان لیا گیا تھا کیونکہ اس دیوتا جیسی فتوحات کسی اور دیوتا کو نصیب نہ ہو سکتی تھیں۔ پھر امن، فرعون کا خاص دیوتا بھی تھا اور سگا باپ بھی تھا،

اس لیے مصر میں سب سے اونچا نام اسی کا ہو کیا اور ہر جگہ پوجا جانے لگا۔ اگرچہ مقامی دیوتا بھی اپنی اپنی گدی پر بیٹھ رہے۔

غیب بات یہ ہے کہ مصریوں کے خیال میں آدمیوں کی طرح دیوتاؤں کو بھی دھوکا دینا آسان تھا، اس خیال کی تفصیل تو ہم آگے چل کر دیں گے مگر صاف ظاہر ہے کہ جو قوم خود اپنے معبودوں کو ایسا سمجھتی ہو اس کے اخلاق کا کیا حال ہوگا۔ یہ بات نہیں ہے کہ مصر کے تمام باشندے برائیوں اور بدکاریوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ لیکن تاریخ بتاتی ہے کہ پرانے مصر میں اعلا اخلاق کی کمی تھی۔ لوگ اس بھروسے پر کہ مرنے کے بعد دیوتاؤں کو کسی نہ کسی طرح دھوکا دے کر سزا سے بچ جائیں گے۔ برائیوں میں پڑ جاتے تھے۔

مصری، مہنتوں اور فرعونوں کے احکامات پر

چلتے تھے۔ آہستہ آہستہ یہ حکم ایک طرح کا اخلاقی ضابطہ یا قانون بن گئے تھے، جن کو اخلاقی مصنف اور معلم اپنی کتابوں میں لکھ کر قوم کے سامنے پیش کیا کرتے تھے۔ ان کتابوں کے کچھ کچھ کڑے مل گئے ہیں مگر ان سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ مصر کے باشندوں کا اخلاق اعلان تھا۔

ایک مصری مصنف کا نام ”انی“ تھا، اس کا زمانہ معلوم نہیں ہو سکا لیکن بہت پرانے وقتوں میں تھا۔ بہت بوڑھا بھی تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کے لیے مکالمے کی صورت میں ایک کتاب لکھی تھی۔ اس کتاب کے ان حصوں سے بھی جو آج تک بیانی ہیں۔ ظاہر ہوتا ہے کہ مصر کی اخلاقی حالت اچھی نہ تھی۔ ”انی“ اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے لکھتا ہے۔

”اس عورت سے ہشیار رہو جو اپنے گھر سے چوری چھپے نکل کر شہر میں ماری ماری پھرتی ہے۔ نہ اس عورت کا پیچھا کر نہ اس جیسی کسی اور عورت کا۔ ایسی عورتوں کا تجربہ کرنا ایسا ہے جیسے کوئی ایسے سمندر میں جانے کا تجربہ کرے جس کی گہرائی کا حال کسی کو

معلوم نہیں ہوا۔

”وہ عورت جس کا مرد گھر سے دور ہے، تجھے خط پر خط بھیجتی ہے اور روز اپنے پاس بلاتی ہے مگر اسی وقت جب اکیلی ہوتی ہے۔ خبردار! وہ تجھے اپنے جال میں پھانس لے گی۔ یاد رکھ، یہ ایک ایسا جرم ہے جس کے پھلتے ہی موت کی سزا ہو جاتی ہے۔ چاہے آدمی نے بے وقوفی کا کام نہ بھی کیا ہو اور یہ سزا اس لیے دی جاتی ہے کہ اکیلے میں ایسی ترغیب اور بوجھ کے ہوتے ہوئے آدمی ہر قسم کا گناہ اور جرم کر سکتا ہے۔“

”انی“ کی ان سطور سے ظاہر ہوتا ہے کہ پرانے مصر میں مکاری کا دور تھا، عورتوں میں بے حیائی بڑھی ہوئی تھی۔ مردوں کو خود بلاتی تھیں، ساتھ ہی یہ مصری قانون بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اکیلے گھر میں عورت سے ملنا چاہے کسی ارادے سے ہو، یہت بڑا جرم تھا اور اس جرم پر موت کی سزا دی جاتی تھی۔ یہ سخت قانون اسی لیے بنایا گیا ہوگا کہ ایسے جرم عام

ہو چکے تھے۔ آگے چل کر بوڑھا ”انی“ اپنے بیٹے سے کہتا ہے۔

”شراب خانوں میں جھگڑا نہ کرنا اور نہ تجھے ان لفظوں میں برا کہا جائے گا جو بے ہوشی کی حالت میں تیرے منہ سے نکل جائیں گے۔ بہت نشہ ہو جائے گا تو کر پڑے گا۔ تیرے گھر والے بے سہارا ہو جائیں گے اور خود تجھے سنبھالنے کے لیے کوئی ہاتھ بھی نہ بڑھے گا۔ تیرے جانی دوست بھی جو تیرے ساتھ ہوں گے، چلا اٹھیں گے۔“ نکالو اس بد بخت کو۔ یاد رکھو تو پیدا ہوا ہے، کچھ کام کرنے کے لیے مگر تو پایا گیا ہے لڑھکتا ہوا زین پر نہنے۔ بچوں کی طرح۔“

یہ نصیحت بھی ظاہر کرتی ہے کہ مصریوں کا اخلاق زیادہ اچھا نہ تھا۔ شراب خانوں میں بدست ہو کر لڑتے تھے اور گہرے دوست بھی وقت پر ساتھ چھوڑ دیا کرتے تھے۔



موسم سرما میں جلد کی حفاظت کیجیے
مطلوبہ کو اپنے ہاتھوں، پیروں اور چہرے کی جلد پر
بلور موچر انزرا استعمال کر سکتی ہیں۔

جلد خشک اور جھٹکا شروع ہو جاتی ہے۔ اگر سردیوں
کے آغاز سے اپنی جلد کی نگہداشت و حفاظت
شروع کر دیں، جلد کی حالت اتنی خراب نہ ہونے
پائے۔

ہم موسم سرما میں جلد کے پیدا ہونے والے
مسائل اور ان سے نجات کا طریقہ بتا رہے ہیں۔

جس پر عمل کر کے آپ سردیوں میں نکھر نکھر اور
تر و تازہ سراپا پا سکتی ہیں۔

موچر انزرا کا استعمال

خشک ہوا کے باعث جلد پر روکھا پن اور
ناہمواری پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے نجات کا سب
سے بہترین اور موثر طریقہ یہ ہے کہ جلد کی نمی کو برقرار
رکھا جائے۔ ہر بار چہرہ یا ہاتھ منہ دھونے کے بعد جلد
پر موچر انزرا کریم یا لوشن ضرور اچلائی کریں۔ روزانہ
رات کو سونے سے قبل اپنی
روٹین میں
شامل کر لیں کہ چاہے سردی ہو یا گرمی موچر انزرا
اپنے چہرے پر ضرور لگاتا ہے۔ اس سے جھریاں و
باریک واضح لکیریں بھی قبل از وقت نمودار نہیں ہوں
گی۔ آپ قدرتی و گھریلو طریقے بہ عمل کرتے ہوئے
گھر پر بھی موچر انزرا تیار کر سکتی ہیں۔ کیلے، شہد،
دودھ، دہی اور جنی کے آٹے سے تیار کردہ آمیزہ
آپ کی جلد کو نرم و ملائم اور شاداب انداز عطا کرنے
میں مدد فراہم کر سکتا ہے۔ گلیسرین ایک علائقہ کی
موچر انزرا تک ایجنٹ ہے۔ پانی اور گلیسرین کی برابر
مقدار ایک بوتل میں بھر کر کس کر لیں۔ اب آپ اس

جلد کی صفائی

دن بھر چہرے پر نمی دھول، نمی، گرد و غبار،
ٹریفک کا دھواں، دھیرہ چہرے کی جلد پر تھکن کی صورت
میں جم جاتے ہیں۔ خواتین رات کو سونے سے پہلے
معیاری اور جلد کی حفاظت سے مطابقت رکھتا ہوا
کلینزر استعمال کریں۔ آپ گھر میں قدرتی اشیاء کا
استعمال کر کے بہترین قسم کا کلینزر ریتیار کر سکتی ہیں۔

دودھ ایک علائقہ قدرتی کلینزر ہے۔ آپ دودھ
کو ایک پیالی میں ڈال کر اس میں چند قطرے
گلیسرین کے شامل کر دیں۔ اور روٹی اس کچھر میں
بھگو کر پورے چہرے پر لگائیں۔ آپ دیکھیں گی
تمام میل روٹی پر آ جائے گا۔ تھوڑی دیر آپ اس کو
چہرے پر لگا رہنے دیں، اس کے بعد چہرہ دھو لیں۔

اس عمل کو روزانہ دہرانے سے آپ کی جلد
شگفتہ و تر و تازہ ہو جائے گی اور رنگت بھی کھل جائے
گی۔